منتخباتِ اردو

دوسری جلد

حصّۂ نثر

ایم-اے (اردو) کورس کے مطابق
۲۰۰۹ء سے نافذ العمل

مؤلفہ

شہناز نبی

صدر، شعبۂ اُردو، کلکتہ یونیورسٹی

کلکتہ یونیورسٹی
۸۷/۱، کالج اسٹریٹ، کولکاتا - ۷۰۰۰۷۳

منتخباتِ اردو

دوسری جلد

حصّۂ نثر

منتخباتِ اردو

دوسری جلد

حصّۂ نثر

ایم-اے (اردو) کورس کے مطابق
۲۰۰۹ء سے نافذالعمل

مؤلفہ
شہناز نبی
صدر، شعبۂ اُردو، کلکتہ یونیورسٹی

کلکتہ یونیورسٹی
۸۷/۱، کالج اسٹریٹ، کولکاتا - ۷۰۰۰۷۳

فہرست

مضمون / مقالات

انشائیے

طنز و مزاح

رومانی ادب/ادب لطیف

سفر نامے

خود نوشت سوانح

خاکے

ڈراما

افسانے

پیش لفظ

ایم-اے اردو (دو سالہ کورس) کے نصاب میں پچھلی بار ۱۹۹۱ء میں ترمیم کی گئی تھی۔ اس وقت سے اب تک اردو ادب کا ذخیرہ نہ صرف وسیع تر ہوا ہے بلکہ اس کے معیار میں بھی خاطر خواہ تبدیلی آئی ہے۔ ایم-اے کورس کو جب سمسٹر (Semester) نظام کے تحت لانے کی بات چلی تو یہ ضروری سمجھا گیا کہ سمسٹر نظام قائم کرنے کے ساتھ ساتھ نصاب کو بھی مناسب ردّ و بدل سے گذارا جائے۔ اس مقصد کے تحت ایم-اے اردو کے نصاب کو نئے سرے سے ترتیب دیا گیا لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہ تھا کہ پرانے نصاب کو یکسر باطل قرار دیا جائے۔ لہٰذا ایک طرف پچھلے نصاب میں شامل اردو کے تمام اہم قلم کاروں کی تخلیقات کو اگر جوں کا توں رکھنے کی سعی کی گئی تو دوسری طرف ان مضامین کو خارج کر دیا گیا جن کے نام تو پچھلے نصاب میں شامل تھے لیکن متن دستیاب نہ تھا۔ علاوہ ازیں اردو ادب کا نیا انتخاب بھی داخل کیا گیا تا کہ جدید اور مابعد جدید مواد سے بھی طلباء کو فیضیاب ہونے کا موقع مل سکے۔ گروپ پیپرز میں ایک نیا گروپ 'ترجمے کی روایت' کے نام سے داخل کیا گیا ہے تا کہ اردو اور دیگر زبانوں کے تراجم کے مطالعے کے مواقع بھی ہاتھ آسکیں اور عملی ترجمہ سے بھی واقفیت ہو سکے۔

طلباء و طالبات کی ضرورتوں کے مدنظر کورس میں شامل متون کی اشاعت کو ضروری تصور کرتے ہوئے 'منتخباتِ اردو' کو ترتیب دینے کا کام شروع کیا گیا۔ اردو کے کلاسیکی ادب کی عدم

دستیابی کی وجہ سے پریشانیاں پیش آرہی تھیں۔ انہیں بھی مختلف لائبریریوں سے حاصل کر کے منتخباتِ اردو میں شامل کیا گیا۔

زیرِ نظر انتخاب دو حصوں پر مشتمل ہے— پہلے حصے میں منظومات ہیں، جب کہ دوسرا حصہ نثری فن پاروں پر مشتمل ہے۔ مواد کی فراہمی کے سلسلے میں شعبہ کے اساتذہ نے بھرپور تعاون کیا ہے، اس کے لئے ان کا بے حد شکریہ۔

اس ضمن میں، میں کلکتہ یونیورسٹی کے عزت مآب وائس- چانسلر پروفیسر سورنجن داس کا خصوصی شکریہ ادا کرنا چاہوں گی، جن کی منظوری اور تعاون کے بغیر اس کتاب کا منصۂ شہود پر آنا تقریباً ناممکن تھا۔

شہناز نبی

صدر، شعبۂ اُردو

کلکتہ یونیورسٹی

۲۵ر دسمبر، ۲۰۰۹ء

سب رس

مُلا وجہی

تمام مصحف کا معنی الحمدللہ میں ہے مستقیم، ہور تمام الحمدللہ کا معنی بسم اللہ میں ہے قویم، ہور تما، بسم اللہ کا معنی بسم اللہ کے ایک نقطے میں رکھیا ہے کریم۔ سچ دیکھ خاطر لیا اتال، حدیث بھی یوں آئی ہے کہ اَلعِلم نُقطۃٌ و کثرھا جھال یعنی علم یک نقطہ ہے جاہلاں اسے بڑھاے، جہالت کوں اس حد لگن لیاے۔ ہور فارسی کے دانش منداں، جنوں سمجھتے ہیں باتاں کے بنداں، انوں کوں یوں بھایا ہے، انوں میں بھی یوں آیا ہے کہ "اگر درخانہ کس است، یک حرف بس است۔" ہور گوالیر کے چاتراں، گن کے گراں، انوں بھی بات کوں کھولے ہیں یوں بولے ہیں۔ فرد:

پوتی تھی سو کھوٹی بھئی پنڈت بھیا نہ کوے
ایکھی اچھر پیم کا پھیرے سو پنڈت ہوے

قدرت کا دھنی سہی، جو کرتا سو سب وہی۔ خدا بڑا خدا کی صفت کرے کوئی کتیک، وَحدہٗ لاشَریک۔ ماں نہ باپ، آپیں آپ۔ پروردگار، سنسار کا سرجنہار۔ جیتی جیکوئی قدرت دھرتا ہے صفت اس کی اپنے پرتے کرتا ہے۔ وو بے حد، اس کی صفت کوں کاں ہے حد۔ احد، صَمَد، لم

یَلِد وَلَم یُولد۔ بیت:

کسے ہے حد جو خدا کی صفت کی حد پاوے
ہر ایک بال کوں گر سو ہزار ، جیب آوے

جس کی نانوں خدا ہے، دوسب سوں ملیا ہورسب سوں جدا ہے۔کوئی کیوں اسے کہے ہے کہ یوں ہے، خدا ہے، جیوں کہیں گے تیوں ہے۔کون سمج سکتا خدا کی گت، ایک اپے لاک صفت۔ ہزاراورایک اس کا نانوں، اس کی معرفت ٹھاویں ٹھاوں۔ بیت:

جہاں جکچھ ہے وہاں سب اہے ظہور اس کا
ہر ایک شے منے دیتا ہے جلوہ نور اس کا

خدا قادر، خدا حاضر، خدا ناظر، خدا سکتا، جسے جیوں منگتا اسے دوں رکھتا۔ سات زمین سات آسمان میں اس کا کھیل۔ جو کچھ دو کرے سو ہوے، اس کے حکم کوں کون سکے ٹھیل۔ آپیں آپ جل جلال، دم مارنے یاں کسے نیں مجال۔ بیت:

اس ٹھار پر کسے ہے نظر جو نظر سٹے
گر جبرئیل ہوے تو یاں بال وپر سٹے

عجب عجب اس کے کام، انسان کیا کر سکے فا۔ پیدا کیا زمین پیدا کیا آسمان، سب دانایاں سب دانش منداں حیراں۔ کیا ولی کیا نبی، سجدہ کیے اس ٹھار سبھی۔ قادر قدرت کا دھنی، غنی، مستغنی۔ ہوتا سب خدا کا بھاتا، ہوکنے میں ہوجاتا۔ یاں چرا نہ چوں، جیوں عربی میں کتا ہے۔ کُن فَیَکُون۔ شعر:

دھنی جو دھرتی دھر یا ہور بھی دھرے سو ہوے
کسی کے کرنے تے کیا ہوے خدا کرے سو ہوے

عاشق کوں عشق، معشوق کوں حسن دیا، ان دونوں میں اپنا بھید پرگٹ کیا۔ یکس کوں کیا پرس، ایکس کوں کیا ناری، ایکس کوں کیا پیارا، ایکس کوں کیا پیاری۔ نہ ہوں اسے دیکھیا نہ دو اسے جانے، ایکس کوں دیکھ ایک ہوتے دیوانے۔ دو دل ایک دل ہوتیں، جھٹ تے، سراں تے گزرتے جیواں پر اٹھتے۔ سرجیایوں کچھ سر جنہار، کریم رحیم مہروان کرتار۔ بیت:

یوں خاصیت ہے عشق کی یاں کوئی کیا کرے
بیگانے کوں یو عشق بلا آشنا کرے

بہوت لطافت سوں پیدا کیا حسن، عشق میں رکھیا اپنے خاصے گن چن چن۔ شان نہ گمان جان نہ پہچان، ایکس کوں دیکھ ایکس پر ایک حیران، پریشان، سرگردان۔ دیکھے نہ دکھلاے، ایکس کوں ایک بھاے۔ دل سو دل، پران سو پران، جانو قدیم آشنا جانو قدیم جان پہچان۔ ایکس کی خاطر ایک تلملتے جیتے، ایکس کی خاطر ایک ترستے تپتے۔ بیت:

دوڑیا ہے عشق جس پر لھوا کھینچ باندکر
ایکس کے ہاں یکس کوں دیا ہات باندکر

سگے ماں باپ سو ہوتے بیزار، جس یار سوں جیو لگیا اس یار سوں اختیار۔ ماں باپ پال جنم کھوتے، یوں سو آخر کسی اور کے ہوتے۔ جیو لگیا ادھر، بچارے ماں باپ اتال کدھر۔ ماں باپ کوں سمجے جیوں خیال ہور خواب، بھای تو بچارا کس میں حساب۔ انو نے اپنا نفا کھینچے، ماں باپ اپنی خاطر کو جفا کھینچے۔ عشق نے کھیل یوں کھیلیا ٹھاریں ٹھار، اس کھیل کو نادک نادیس نہ ہانک نہ پکار، ہر یکس کوں ہر۔ یکس سوں قول قرار، سب اپس میں اپے یار۔ پیار دل بھیتر، موں پر لوگاں کا ڈر۔ ایسے پیار کوں کون سنبھال رکھتا، دل بھیتر کون کسے منا کرسکتا۔ اپنے دل میں ہر ایکس کوں ہے پادشاہی وہاں دوسرے کی نہیں پھر سکتی دورائی۔ بیت:

پاوے بقا جو عشق میں ایسے فنا کرے
یو ٹھار نیں ہے وو جو کسے کوئی منا کرے

عشق ہم باطن ہم ظاہر، عشق سب جاگا حاضر ناظر۔ عشق نڈر، عشق پادشاہ، عشق کوں کس کا ڈر۔ عشق ہم مست ہم ہوشیار ہم بے خبر ہم باخبر۔ عشق سلطان، چھتر اس کا رسوائی، عشق کا تخت استغنائی، عشق کا چشم بے پروائی۔ عشق لاوبالی، عشق سب ٹھار بھریا ہے عشق کیں نیں خالی۔

عشق ہرگز کسے جدا نہ دھرے عشق دو کوں ملا کے ایک کرے
عشق سر مست لا ابالی ہے عشق اپ بادتا خیالی ہے

ایک عشق اس کے ایتے رنگاں، ایتیاں صورتاں، ایک اپے اپنیاں ایتیاں مورتیاں۔ عشق

دو کے دلاں میں سٹیا غلبلا، دونو کے دلاں میں عشق کی بلا۔ عشق ہے تو حسن دستا خوب، عشق ہے تو نظر تلے محبوب۔ عشق ہے تو ہر یک کام کا لگتا دھندا، عشق ہے تو کوئی صاحب ہوتا کوئی بندا۔ عشق کدھیں عاقل کدھیں دیوانہ ہوتا، کدھیں ہنستا کدھیں ہنس ہنس روتا۔ فرد:

عشق سا ندی ہے عشق سری چ
کدھیں کچھ ہے کدھیں سو کچھ کا کچ

اپس سوں اپے لگا لیا، کسے کیا کہے کنے کیا کیا۔ آپی کیا اسے کیا علاج، جیسا پڑے ویسا سو سے باج۔ ادھر بھی اپے ادھر بھی اپے۔ اپے ترستے، اپے تپتے۔ اپے اپس کوں دیکھے دکھلاوے، اپے اپس تے اپس کوں چھپاوے۔ اپس کنے اپنی کرے فریاد، اپے دیوے اپنی داد۔ دین و دنیا کوں دیا عشق نے آرایش، پیدا کرنہارے نے یوں پیدا کیا پیدایش۔ فرد:

سب میں وو ہے تو دل ہے سب کا شاد
سب میں وو ہے تو سب میں ہے یو سواد

عشق میں اپے ہے تو اس میں ہیں ایتے چالے، عشق میں اپے ہے تو اس میں ہیں یو مستی یو خوشی یوا ولالے۔ عشق میں اپے ہے تو اسے سب ٹھار گزر، عشق میں اپے ہے تو اسے سب جاگا کی خبر۔ بے نہایت ریل چھیل، ایک کھیلتا ایتے کھیل۔ باٹاں بہوت ولے ٹھار ایک، کھیلاں بہوت ولے کھیلنہار ایک۔ عشق کی صورت کیسی ہے کر کیوں کہیا جاتا، معنی بیچونی بے چگونی پر آتا۔ عشق خدا کی ذات ہے چھپا رہتا، جو کوئی یو باٹ پایا وو آخر یونچہ کہتا۔ یہاں جسم کوں دیکھنا مشکل ہے جان کوں کیوں دیکھیا جاتا، تخت کوں دیکھنے نہ پاوے سلطان کیوں دیکھیا جاتا۔ جسم ہور جان کا ایک مانا۔ ولے اتن اہے جو یو باٹ ٹک سمجے جانا۔ عشق ہور خدا کچھ جدا نہیچ، بات جدا پن بھید و ہیچ۔ عشق ہوتا ہے جہاں تمام، وہانچہ خدا ہے بلکہ وو چہ خدا ہے والسلام۔ واصلاں نے بولے ہیں واللہ، اِذا تم **العشق فھو اللہ**۔ رباعی:

دیتا ہے نفایہ رہتا ہے جس رے ٹک — دو میں تے اسے جان نہ دے تسرے ٹک
گر پِؤ سوں مل پِؤ چہ ہونے منگتا ہے — تو یاد کرنس پیو کوں اپس بسرے ٹک

کربل کتھا

فضل علی فضلی

جب مرض حضرت کے نے شدت کی تب مسجد میں سدھار، نماز ادا فرما، بلال کوں حکم کیا کہ ندا کر جو تمام اصحاب اور اسلام جمع ہوویں۔ چاہتا ہوں کہ وصیت کروں کیونکہ یہ وصیت آخری ہے۔ بلال نے ندا کی اور سب اصحاب مسجد میں آئے تب حضرت ممبر پر چڑھ فرمائے، اے گروہِ اسلام معلوم کرو کہ اجل میری نزدیک آ پہنچی ہے، دیکھتا ہوں کہ گویا تم سب مجھ سے جدا ہو اور میں تم سے جدا۔ پھر فرمایا اے یارو، کیسا پیغمبر تھا۔ میں کہ تم سے جہاد کیا، حتیٰ کہ دانت میرے توڑے اور منہ میرا لہو سے بھرے۔ جاہلانِ قوم سے ظلم اینچا اور بھوک سے پتھر پیٹ پر باندھا۔ سب اصحاب نے کہا درست ہے۔ قسم خدا کی توں صابر تھا اور ہم کوں طرف حق کے توں دعوت کیا، اور برائیوں سے امان میں رکھا خدا تعالیٰ تجھ کو جزائے خیر دیوے۔ پھر حضرت نے فرمایا کہ خدا نے بزرگوار نے اپنی بزرگی کی قسم یاد کی ہے کہ ظالم کے ظلم سے نہ گزرے۔ پس میں بھی قسم اس خدائے لاشریک لہٗ کی دیتا ہوں کہ جس کو میں نے ستایا ہوئے یا آزاردہ کیا ہوئے، اوٹھ اور مجھ سے بدلا لے۔ دوست میرا وہ کوئی کہ حق مجھ پر رکھتا ہوئے، سو گردن میری سے ادا کرے، تا خوش نفس طرف حق کے پھروں۔ تب

ایک مرد عکاشہ نام اٹھا، اور کہا یا رسول اللہ اگر اس قدر مبالغہ نہ فرماتے تو میں نہ کہتا، لیکن از بس کہ بہت مبالغہ فرمایا، پس عرض کرتا ہوں کہ بیچ سفر تبوک کے تازیانہ آپ نے نکالا کہ مرکب پر لگاویں سو میرے کاندھے پر لگا، اور مجھے بہت درد اس سے پہونچا۔ بدلہ اس کا چاہتا ہوں۔ حضرت نے فرمایا، جزاک اللہ خیرا، اے عکاشہ خوب کیا کہ بدلہ آخرت پر نہ رکھا، کہ میں بدلہ دنیا میں دوست رکھتا ہوں۔ اے عکاشہ جانتا ہے کہ وہ تازہ یانہ کون سا تھا، کیا خرما کا۔ حضرت نے فرمایا، اے سلمان، وہ کوڑا فاطمہ کے گھر ہے، جا اور لا۔ مسلمان چلا اور پوکارا کہ اے لوگو کون ہے کہ انصاف نفس اپنے سے آپ چاہے، پیش از قیامت، لیکن جب سلمان حجرۂ فاطمہ علیہا السلام پاس پہونچا، کہا: السلام علیک یا اھل بیت النبوۃ حضرت فاطمہ نے آواز سلمان کی پہچان جواب دیا۔ سلمان نے کہا، کہ یا سیّدۃ النسا، باپ تیرا منبر پر ہے اور خلق کوں رخصت کرتا ہے، کہ جس کا حق مجھ پر ہے طلب کرے۔ شاید ایک دن تازیانہ ناقہ مارتا تھا، عکاشہ کے کاندھے پر لگا۔ اب وہ تیرے باپ سے بدلہ مانگتا۔ جوں حضرت فاطمہ نے یہ بات سونی، رونے لگیں اور کہیں اے سلمان، قسم خدا کی تجھے کہ اس شخص کو کہ میرے باپ پر رحم کرے، کیونکہ وہ رنجور اور ضعیف ہے بیمار اور نحیف۔ سلمان تازیانہ لے کر گیا۔ اور حضرت فاطمہ نے حسن اور حسین کوں بولا کر کہا اے جاناں مادر، نانا تمہارے کوں مسجد میں ایک شخص تازیانہ چاہتا مارے، جاو اور عوض جدّ ے سوسو تازیانے قبول فرماؤ، کہ نانا تمہارا بیمار ہے اور بدلہ دینے نے لاچار طاقت تازیانے کی نہیں رکھتا اور لاعلاج وہ ضرب رسہتا۔ حسین مسجد طرف چلے لیکن جوں سلمان مسجد میں پہنچا۔ فغان وامصیبتاہ اصحابوں سے بلند ہوا کہ اتنے میں حسنین روتے ہوئے آئے اور جد بزرگوار کے پاؤں پر گرا عرض کئے یا جداہ ہم نے سونا کہ کوئی تم سے بدلہ مانگتا ہم آئے کہ ہر ایک عوض ایک تازیانہ کے سوتازیانے قبول کرے۔ بیت، ترجمہ:

رکھتے یہ اُمید ہم جو قد تیرا اب خم نہوئے
سایہ تیرے لطف کا سر سے ہمارے [کم] نہوئے

حضرت نے فرمایا اے جانان جد، تازیانہ میں نے مارا، تم سے کیونکر بدلہ لے پھر پیشانی دونو کی چوم، رخصت کئے اور فرمائے، اے عکاشہ اوٹھ اور بدلہ لے۔ عکاشہ نے کہا، یا رسول اللہ اس روز کاندھا میرا ننگا تھا۔ حضرت نے بھی پیرہن اتارا کہ خروش واویلا ملائکہ سے اوٹھا اور شور وامصیبتا،

اصحابوں سے لیکن جوں عکاشہ نے دوش مبارک اور مہر نبوت کوں دیکھا بوسہ اس مہر نبوت پر دے، مونہہ دونوں شانوں میں رکھ، کہا ریارسول اللہ، غرض میرا بدلہ سے نہ تھا بلکہ مراد میری یہ تھی کہ مہر نبوت کوں دیکھوں اور بعضے اعضاء تمہارے کوں مس کروں۔ بموجب فرمودۂ شریف من مس جلدی لق تمسہ النار یعنی جو کوئی بدن میرے کومس کرے آگ دوزخ کی اوسے مس نہ کرے تب حضرت محل میں سدھارے اور بیماری کی نہایت شدت پر ہوئی۔

سیر پہلے درویش کی

میر امن دہلوی

پہلا درویش دوزانو ہو بیٹھا اور اپنی سیر کا قصہ اس طرح سے کہنے لگا۔

"یا معبود اللہ! ذرا ادھر متوجہ ہو اور ماجرا اس بے سروپا کا سنو!

یہ سرگزشت میری ذرا کان دھر سنو!
مجھ کو فلک نے کر دیا زیر و زبر سنو!
جو کچھ کہ پیش آئی ہے شدت میرے تئیں
اس کا بیان کرتا ہوں ، تم سر بہ سر سنو!

اے یاراں! میری پیدائش اور وطن بزرگوں کا، ملک یمن ہے، والد اس عاجز کا، ملک التجار خواجہ احمد نام، بڑا سوداگر تھا۔ اس وقت میں کوئی مہاجن یا بے پاری ان کے برابر نہ تھا۔ اکثر شہروں میں کوٹھیاں اور گماشتے، خرید وفروخت کے واسطے مقرر تھے، اور لاکھوں روپے نقد اور جنس ملک ملک کی۔ گھر میں موجود تھی۔ ان کے یہاں دو لڑکے پیدا ہوئے ایک تو یہی فقرہ، جو کفنی سیلی جیتے جی، اور شہر کے سوداگر بچے سے شادی کردی تھی۔ وہ اپنی سسرال میں رہتی تھی۔ غرض جس کے گھر میں اتنی

دولت اور ایک لڑکا ہو، اس کے لاڈ پیار کا کیا ٹھکانا ہے؟ مجھ فقیر نے بڑے چاؤ چوزے ماں باپ کے سائے میں پرورش پائی اور پڑھنا لکھنا، سپاہ گری کا کسب فن، سوداگری کا یہی کھاتا، روزنامچہ سیکھنے لگا۔ چودہ برس تک نہایت خوشی اور بےفکری میں گزرے کچھ دنیا کا اندیشہ دل میں نہ آیا۔ یک بہ یک ایک ہی سال میں والدین قضائے الٰہی سے مر گئے۔

عجب طرح کا غم ہوا، جس کا بیان نہیں کر سکتا۔ ایک بارگی یتیم ہو گیا۔ کوئی سر پر بوڑھا بڑا نہ رہا۔ اس مصیبت ناگہانی سے سے رات دن رویا کرتا۔ کھانا پینا سب چھوٹ گیا۔ چالیس دن جوں توں کو کٹے۔ چہلم میں اپنے بیگانے چھوٹے بڑے جمع ہوئے جب فاتحہ سے فراغت ہوئی، سب نے فقیر کو باپ کی پگڑی بندھوائی اور سمجھایا اور دنیا میں سب کے ماں باپ مرتے آئے ہیں اور اپنے تئیں بھی ایک روز مرنا ہے بس صبر کرو، اپنے گھر کو دیکھو۔ اب باپ کی جگہ تم سردار ہوئے، اپنے کاروبار لین دین سے ہوشیار ہو۔ تسلی دے کر رخصت ہوئے گماشتے کاروباری، نوکر چاکر جتنے تھے آن کر حاضر ہوئے، نذریں دیں اور بولے "کوٹھی نقد و جنس کی، اپنی نظر مبارک سے دیکھ لیجئے۔" ایک بارگی جو اس دولت بےانتہا پر نگاہ پڑی، آنکھیں کھل گئیں۔ دیوان خانے کی تیاری کر کر حکم کیا فراشوں نے فرش فروش بچھا کر چھت، پردے، چلونیں، تکلف کی، لگا دیں اور اچھے اچھے خدمت گار، دیدہ رو نوکر رکھے، سرکار سے روزق برق کی پوشاکیں بنوا دیں۔ فقیر مسند پر تکیہ لگا کر بیٹھا ویسے ہی آدمی غنڈے بھانکڑے، مفت پر کھانے پینے والے، جھوٹے خوشامدی، آ کر آشنا ہوئے اور مصاحب بنے۔ ان سے آٹھ پہر صحبت رہنے لگی، ہر کہیں کی باتیں اور زٹلیں، واہی تباہی ادھر ادھر کی کرتے اور کہتے "اس جوانی کے عالم میں کیتکی کی شراب یا گل گلاب کھنچوائیے، نازنین معشوقوں کو بلوا کر ان کے ساتھ پیجئے اور عیش کیجئے۔"

غرض آدمی کا شیطان آدمی ہے، ہر دم کے کہنے سننے سے اپنا بھی مزاج بہک گیا۔ شراب ناچ اور جوئے کا چرچا ہوا۔ پھر تو یہ نوبت آئی کہ سوداگری بھول کر تماش بینی کا اور دینے لینے کا سودا ہوا۔ اپنے نوکر اور رفیقوں نے جب یہ غفلت دیکھی، جو جس کے ہاتھ پڑا، الگ کیا، گویا لوٹ مچا دی۔ کچھ خبر نہ تھی کتنا روپیہ خرچ ہوتا ہے کہاں سے آتا اور کدھر جاتا ہے۔ مالِ مفت دلِ بےرحم۔ اس درخرچی کے آگے، اگر گنج قارون کا ہوتا تو بھی وفا نہ کرتا۔ کئی برس کے عرصے میں ایک بارگی یہ

حالت ہوئی کہ فقط ٹوپی اور لنگوٹی باقی رہی۔ دوست آشنا جو دانت کاٹی روٹی کھاتے تھے اور چمچہ بھر خون اپنا، ہر بات میں نثار کرتے تھے، کافور ہوگئے۔ بلکہ راہ باٹ میں اگر کہیں بھینٹ ملاقات ہوجاتی تو آنکھیں چرا کر منھ پھیر لیتے۔ اور نوکر چاکر، خدمت گار، بہلیے، دھلیت، خاص بردار، ثابت خانی۔ سب چھوڑ کر کنارے لگے۔ کوئی بات کا پوچھنے والا نہ رہا جو کہے ''یہ کیا تمہارا حال ہوا۔'' سوائے غم اور افسوس کے کوئی رفیق نہ ٹھہرا۔

اب دمڑی کی ٹھڈیاں میسر نہیں جو چبا کر پانی پیوں۔ دو تین فاقے کڑاکے کھینچے۔ تاب بھوک کی نہ لاسکا۔ لاچار، بے حیائی کا برقعہ منھ پر ڈال کر یہ قصد کیا کہ بہن کے پاس چلئے۔ لیکن یہ شرم دل میں آتی تھی کہ قبلہ گاہ کی وفات کے بعد، نہ بہن سے کچھ سلوک کیا۔ نہ خالی خط لکھا بلکہ اس نے خط خطوط ماتم پرسی اور اشتیاق کے جو لکھے، ان کا بھی جواب اس خواب خرگوش میں نہ بھیجا۔ اس شرمندگی سے جی تو نہ چاہتا تھا، پر سوائے اس گھر کے اور کوئی ٹھکانا نظر میں نہ ٹھہرا۔ جوں توں، پا پیادہ، خالی ہاتھ، گرتا پڑتا، ہزار محنت سے وہ کئی منزلیں کاٹ کر ہمیشہ کے لئے شہر میں جا کر اس کے مکان پر پہنچا۔ وہ ماں جائی میرا یہ حال دیکھ کر بلائیں لین اور گلے مل کر بہت روئی تیل، مالش اور کالے ٹکے، مجھ پر سے صدقے کئے کہنے لگی ''اگر چہ ملاقات سے دل بہت خوش ہوا لیکن بھیا، تیری یہ کیا صورت بنی؟ اس کا جواب میں کچھ نہ دے سکا۔ آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا کر چپکا ہو رہا۔ بہن نے جلدی، خاصی پوشاک سلوا کر حمام میں بھیجا۔ نہا دھو کر وہ کپڑے پہنے۔ ایک مکان اپنے پاس۔ بہت اچھا تکلف کا، میرے رہنے کو مقرر کیا۔ صبح کو شربت اور لوازمات، حلوا سوہن، پستہ، مغزی ناشتے کو، اور تیسرے پہر میوے، خشک وتر، پھل پھلاری، اور رات دن دونوں وقت پلاؤ، نان، قلیے، کباب، تحفہ تحفہ، مزے دار منگوا کر، اپنے روبرو کھلا کر جاتی۔ سب طرح خاطر داری کرتی۔ میں نے دیسی تصدیع کے بعد جو یہ آرام پایا، خدا کی درگاہ میں ہزار ہزار شکر بجالایا۔ کئی مہینے اس فراغت سے گزرے کہ پاؤں اس خلوت سے باہر نہ رکھا۔

ایک دن، وہ بہن جو بجائے والدہ کے میری خاطر رکھتی تھی، کہنے لگی ''اے بیرن! تو میری آنکھوں کی پتلی اور ماں باپ کی سوئی مٹی کی نشانی ہے۔ تیرے آنے سے میرا، کلیجہ ٹھنڈا ہوا۔ جب تجھے دیکھتی ہوں، باغ باغ ہوتی ہوں۔ تو نے مجھے نہال کیا، لیکن مردوں کو خدا نے کمانے کے لئے

بنایا ہے۔ گھر میں بیٹھے رہنا ان کو لازم نہیں۔ جو مرد نکھٹو ہو کر گھر سیتا ہے، اس کو دنیا کے لوگ طعنہ دیتے ہیں۔ خصوصاً اس شہر کے آدمی چھوٹے بڑے، بے سبب تمہارے رہنے پر کہیں گے، اپنے باپ کی دولت دنیا کھو کھا کر بہنوئی کے ٹکڑوں پر آپڑا۔ یہ نہایت بے غیرتی اور میری تمہائی ہنسائی اور ماں باپ کے نام کو سبب لاج لگنے کا ہے۔ نہیں تو میں اپنے چمڑے کی جوتیاں بنا کر تجھے پہناؤں اور کلیجے میں ڈال رکھوں اب یہ صلاح ہے کہ سفر کا قصد کرو۔ خدا چاہے تو دن پھریں اور اس حیرانی و مفلسی کے بدلے خاطر جمعی اور خوشی حاصل ہو تو یہ بات سن کر مجھے بھی غیرت آئی۔ اس کی نصیحت پسند کی۔ جواب دیا ''اچھا اب تم ماں کی جگہ ہو، جو کہو سو کروں۔'' یہ میری مرضی پا کر، گھر میں جا کے، پچاس توڑ سے اشرفی کے اصل لونڈیوں کے ہاتھوں میں لے کر میرے آگے لا رکھے اور بولی ''ایک قافلہ سوداگروں کا دمشق کو جاتا ہے تم ان روپوں سے جنس تجارت کی خرید کرو۔ ایک تاجر ایمان دار کے حوالے کر کے، دست آویز پکی لکھوا لو، اور آپ بھی قصد دمشق کا کرو۔ وہاں جب خیریت سے جا پہنچو، اپنا مال مع منافع سمجھ بوجھ لیجیو یا آپ بیچیو۔'' میں وہ نقد لے کر بازار میں گیا۔ اسباب سوداگری کا خرید کر کر، ایک بڑے سوداگر کے سپرد کیا۔ نوشت، وخواند سے خاطر جمع کر لی۔ وہ تاجر دریا کی راہ سے جہاز پر سوار ہو کر روانہ ہوا۔ فقیر نے خشکی کے راستے چلنے کی تیاری کی۔ جب رخصت ہونے لگا، بہن نے ایک سری پاؤ بھاری اور ایک گھوڑا اجڑاؤ ساز سے تواضع کیا اور مٹھائی پکوان ایک خاصدان میں بھر کر ہرنے سے لٹکا دیا اور چھاگل پانی کی شکار بند میں بندھوا دی۔ امام ضامن کا روپیہ میرے بازو پر باندھا، دہی کا ٹیکا ماتھے پر لگا کر آنسو پی کر بولی ''سدھارو! تمہیں خدا کو سونپا، پیٹھ دکھائے جاتے ہو، اسی طرح جلد اپنا منہ دکھائیو، میں نے فاتحہ خیر کی پڑھکر کہا ''تمہارا بھی اللہ حافظ ہے، میں نے قبول کیا۔'' وہاں سے نکل کر گھوڑے پر سوار ہوا، خدا کے توکل پر بھروسہ کر کے، دو منزل کی ایک منزل کرتا ہوا دمشق کے پاس جا پہنچا۔

غرض جب شہر کے دروازے پر گیا، بہت رات ہو چکی تھی۔ دربان اور نگاہ بانوں نے دروازہ بند کیا تھا میں نے بہت منت کی کہ ''مسافر ہوں، دور سے دھاوا مارے آتا ہوں اگر کواڑ کھول دو، شہر میں جا کر دانے گھاس کا آرام پاؤں۔'' اندر سے گھر ک کو بولے ''اس وقت دروازہ کھولنے کا حکم نہیں۔ کیوں اتنی رات گئے تم آئے؟'' جب میں جواب صاف ان سے سنا، شہر پناہ کی دیوار کے

تلے، گھوڑے پر سے اتر، زین پوش بچھا کر بیٹھا۔ جاگنے کی خاطر ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔ جس وقت آدھی رات ادھر اور آدھی رات ادھر ہوئی، سنسان ہو گیا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ ایک صندوق قلعے کی دیوار سے نیچے چلا آتا ہے۔ یہ دیکھ کر میں اچنبھے میں ہوا کہ یہ کیا طلسم ہے؟ شاید خدا نے میری حیرانی و پریشانی پر رحم کھا کر خزانہ غیب سے عنایت کیا۔ جب وہ صندوق زمین پر ٹھہرا، ڈرتے ڈرتے میں پاس گیا۔ دیکھا تو کاٹھ کا صندوق ہے۔ لالچ سے اسے کھولا۔ ایک معشوق خوبصورت، کامنی سی عورت جسکے دیکھنے سے ہوش جاتا رہے) گھایل، لہو میں تربتر، آنکھیں بند کیئے، پڑی کلبلاتی ہے آہستہ آہستہ ہونٹ ہلتے ہیں اور یہ آواز منھ سے نکلتی ہے۔ ''اے کم بخت بے وفا! اے ظالم پر جفا! بدلا اس بھلائی اور محبت کا، یہی تھا جو تو نے کیا؟ بھلا ایک زخم ار بھی لگا میں نے اپنا تیرا انصاف خدا کو سونپا۔'' یہ کہہ کر اسی بے ہوشی کے عالم میں، دوپٹے کا آنچل منھ پر لے لیا۔ میری طرف دھیان نہ کیا۔

فقیر اس کو دیکھ کر اور یہ بات سن کر سن ہوا۔ جی میں آیا۔ ''کسی بے حیا ظالم نے کیوں ایسے نازنین صنم کو زخمی کیا؟ کیا اس کے دل میں آیا؟ اور ہاتھ اس پر کیوں کر چلایا؟ اس کے دل میں تو محبت اب تلک باقی ہے، جو اس جان کندنی کی حالت میں اس کو یاد کرتی ہے۔'' میں آپ ہی آپ یہ کہہ رہا تھا، آواز اس کے کان میں گئی، ایک مرتبہ کپڑا منھ سے سرکا کر مجھ کو دیکھا۔ جس وقت اس کی نگاہیں میری نظروں سے لڑیں، مجھے غش آنے اور جی سنسنانے لگا۔ بہ زور اپنے تئیں تھانبا، جرأت کر کے پوچھا۔ ''سچ کہو، تم کون ہو اور یہ کیا ماجرا ہے؟ اگر بیان کرو تو میرے دل کو تسلی ہو۔'' یہ سن کر، اگرچہ طاقت بولنے کی نہ تھی آہستے سے کہا ''شکریہ ہے۔ میری حالت زخموں کے مارے یہ کچھ ہو رہی ہے، کیا خاک بولوں؟ کوئی دم کی مہمان ہوں، جب میری جان نکل جاوے تو خدا کے واسطے، جواں مردی کر کے، مجھ بد بخت کو اسی سندوق میں کسی جگہ گاڑ دیجو، تو میں بھلے برے کی زبان سے نجات پاؤں اور تو داخل ثواب کے ہو۔'' اتنا بول کر چپ ہوئی۔

رات کو مجھ سے کچھ تدبیر نہ ہو سکی۔ وہ صندوق اپنے پاس اٹھا لایا، اور گھڑیاں گننے لگا کہ کب اتنی رات تمام ہو تو فجر کو شہر میں جا کر جو کچھ علاج اس کا ہو سکے بہ مقدور اپنے کروں۔ وہ تھوڑی سی رات ایسی پہاڑ ہو گئی کہ دل گھبرا گیا۔ بارے خدا خدا کر، صبح جب نزدیک ہوئی مرغ بولا۔ آدمیوں کی آواز آنے لگی۔ میں نے فجر کی نماز پڑھ کر، صندوق کو خورجی میں کسا۔ جونہی دروازہ کھلا،

میں شہر میں داخل ہوا۔ ہر ایک آدمی اور دکان دار سے حویلی کرائے کی تلاش کرنے لگا۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے ایک مکان خوش قطع، نیا، فراغت کا، بھاڑے لے کر جا اترا۔ پہلے اس معشوق کو صندوق سے نکال کر روئی کے پہلوں پر ملائم بچھونا کر کے، ایک گوشے میں لٹایا، اور آدمی اعتباری وہاں چھوڑ کر فقیر جراح کی تلاش میں نکلا۔ ہر ایک سے پوچھتا پھرتا تھا کہ اس شہر میں جراح کاریگر کون ہے اور کہاں رہتا ہے؟ ایک شخص نے کہا ''ایک حجام جراحی کے کسب اور حکیمی کے فن میں یکہ ہے، اور اس کام میں نپٹ پکا ہے۔ اگر مردے کو اس کے پاس لے جاؤ، خدا کے حکم سے ایسی تدبیر کرے کہ ایک بار وہ بھی جی اٹھے۔ وہ اس محلّے میں رہتا ہے اور عیسیٰ نام ہے۔''

میں یہ مژدہ سن کر بے اختیار چلا۔ تلاش کرتے کرتے، پتے سے اس کے دروازے پر پہنچا۔ ایک مرد سفید ریش کو دہلیز پر بیٹھا دیکھا، اور کئی آدمی مرہم کی تیاری کے لئے، کچھ پیس پاس رہے تھے، فقیر نے مارے خوشامد کے، ادب سے سلام کیا اور کہا ''میں تمہارا نام اور خوبیاں سن کر آیا ہوں۔ ماجرا یہ ہے کہ میں اپنے ملک سے تجارت کے لئے چلا۔ قبیلے کو بہ سبب محبت کے، ساتھ لیا۔ جب نزدیک اس شہر کیا آیا، تھوڑی سی دور رہا تھا کہ شام پڑ گئی۔ ان دیکھے ملک میں رات کو چلنا مناسب نہ جانا، میدان میں ایک درخت کے تلے اتر پڑا۔ پچھلے پہر ڈاکا آیا، جو کچھ مال اسباب پایا لوٹ لیا، گہنے کیلا لچ سے اس بی بی کو بھی گھائل کیا۔ مجھ سے کچھ نہ ہو سکا۔ رات جو باقی تھی، جوں توں کاٹی۔ فجر ہی شہر میں آن کر ایک مکان کرائے لیا۔ ان کو وہاں رکھ کر میں تمہارے پاس دوڑا آیا ہوں۔ خدا نے تمہیں یہ کمال دیا ہے، اس مسافر پر مہربانی کرو۔ غریب خانے تشریف لے چلو، اس کو دیکھو، اگر اس کی زندگی ہوئی تو تم کو بڑا جس ہوگا، اور میں ساری عمر غلامی کروں گا۔'' عیسیٰ جراح بہت رحمدل اور خدا پرست تھا میری غریبی کی باتوں پر ترس کھا کر، میرے ساتھ اس حویلی تک آیا۔ زخموں کو دیکھتے ہی میری تسلی کی۔ بولا کہ ''خدا کے کرم سے۔ اس بی بی کے زخم چالیس دن میں بھر آویں گے۔ غسل شفا کا کروا دوں گا۔''

غرض اس مرد خدا نے سب زخموں کو، نیم کے پانی سے دھو دھا کر، صاف کیا۔ جو لائق ٹانکوں کے پائے، انہیں سیا۔ باقی گھاؤں پر، اپنی کھیسے سے ایک ڈبیا نکال کر، کتنوں میں پٹی رکھی اور کتنوں پر پھائے چڑھا کر، پٹی سے باندھ دیا اور نہایت شفقت سے کہا ''میں دونوں وقت آیا

کروں گا، تو خبردار رہیو ایسی حرکت نہ کرے جو ٹانکے ٹوٹ جائیں، مرغ کا شوربا بجائے غذا اس کے حلق میں چوائیو اور اکثر عرق بید مشک گلاب کے ساتھ دیا کیجیو جو قوت رہے۔" یہ کہہ کر رخصت چاہی۔ میں نے بہت منت کی اور ہاتھ جوڑ کر کہا، "تمہاری تشفی دینے سے میری بھی زندگی ہوئی، نہیں تو سوائے مرنے کے کچھ سوجھتا نہ تھا۔ خدا تمہیں سلامت رکھے۔" عطر پان دے کر رخصت کیا، میں رات دن خدمت میں اس پری کے حاضر رہتا۔ آرام اپنے اوپر حرام کیا۔ خدا کی درگاہ سے روز روز اس کے چنگے ہونے کی دعا مانگتا۔

اتفاقاً وہ سوداگر بھی آ پہنچا، اور میرا مال امانت میرے حوالے کیا۔ میں نے اسے اونے پونے بیچ ڈالا، اور دارو درمن میں خرچ کرنے لگا۔ وہ مرد جواح ہمیشہ آتا جاتا تھوڑے عرصے میں سب زخم بھر کر انگور کر لائے۔ بعد کئی دن کے غسل شفا کا کیا، عجب طرح کی خوشی حاصل ہوئی۔ خلعت اور اشرفیاں عیسیٰ حجام کے آگے دھریں اور اس پری کو مکلف فرش بچھا کر، مسند پر بٹھایا فقیر نے غریبوں کو بہت سی خیر خیرات کی۔ اس دن گویا بادشاہت ہفت اقلیم کی، اس فقیر کے ہاتھ لگی اور اس پری کا شفا پانے سے ایسا رنگ نکھرا کہ مکھڑا سورج کی مانند چمکنے اور کندن کی طرح دمکنے لگا۔ نظر کی مجال نہ تھی جو اس کے جمال پر ٹھہرے۔ فقیر بہ سر و چشم اس کے حکم میں عار نہ رہتا ہو فرماتی سو بجالاتا۔ وہ اپنے حسن کے غرور اور سرداری کے دماغ میں، جو میری طرف کبھو دیکھتی تو فرماتی "خبردار، اگر تجھے ہماری خاطر منظور ہے تو ہرگز ہماری بات میں دم نہ ماریو۔ جو ہم کہیں، سو بلا عذر کیے جاؤ، اپنا کسی بات میں دخل نہ کریو، نہیں تو پچھتاوے گا۔" اس کی وضع سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ حق، میری خدمت گزاری اور فرماں داری کا، اسے البتہ منظور ہے۔ فقیر بھی اس کی بے مرضی ایک کام نہ کرتا۔ اس کا فرمانا بہ سر و چشم بجالاتا۔

ایک مدت اسی راز و نیاز میں کٹی۔ جو اس نے فرمائش کی دونہیں میں لا کر حاضر کی۔ اس فقیر پاس جو کچھ جنس اور نقد اصل و نفع کا تھا۔ سب صرف ہوا۔ اسی بیگانے ملک میں کون اعتبار کرے جو قرض دام سے کام چلے؟ آخر تکلیف روز مرے کے خرچ کی ہونے لگی۔ اس سے دل بہت گھبرایا۔ فکر سے دبلا ہوتا چلا۔ چہرے کا رنگ کلجھواں ہو گیا، لیکن کس سے کہوں؟ جو کچھ دل پر گزری ہو گذری، قہر درویش بر جان درویش۔ ایک دن اس پری نے اپنے چور سے دریافت کر کے کہا "اے فلانے

''تیری خدمتوں کا حق ہمارے جی میں نقش کالحجر ہے، پر اس کا عوض بالفعل ہم سے نہیں ہوا سکتا۔ اگر واسطے خرچ ضروری کے، کچھ درکار ہو تو اپنے دل میں اندیشہ نہ کر۔ ایک ٹکڑا کاغذ اور قلم دوات حاضر کر۔'' میں نے تب معلوم کیا، کسی ملک کی پادشاہ زادی ہے جو اس دل ودماغ سے گفتگو کرتی ہے فی الفور قلم دان آگے رکھ دیا۔ اس نازنین نے ایک شقہ بدستخط خاص سے لکھ کر میرے حوالے کیا اور کہا ''قلعے کے پاس ترپولیا ہے، وہاں اس کوچے میں ایک حویلی بڑی سی ہے، اس مکان کے مالک کا نام سیدی بہار ہے۔ تو جا کر اس رقعے کو، اس تلک پہنچا دے۔''

فقیر، موافق فرمانے اس کے، اسی نام ونشان پر منزل مقصود تک جا پہنچا۔ دربان کی زبانی کیفیت خط کی، کہلا بھیجی، وہ نہیں سنتے ہی ایک حبشی جواں، خوبصورت ایک پٹیا طرح دار سجے ہوئے، باہر نکل آیا۔ اگر چہ رنگ سانولا تھا، پر گویا تمام نمک بھرا ہوا۔ میرے ہاتھ سے خط لے لیا۔ نہ بولا، کچھ پوچھا۔ انہیں قدموں پھر اندر چلا گیا۔ تھوڑی دور میں گیارہ کشتیاں، سربہ مہر زربفت کی۔ توروپوش پڑے ہوئے، غلاموں کے سر پر دھرے، باہر آیا، کہا ''اس جوان کے ساتھ جا کر چوگوشے پہنچا دو میں بھی سلا کر کر، رخصت ہوا۔ اپنے مکان میں لایا۔ آدمیوں کو دروازے کے باہر سے رخصت کیا۔ وہ تشفیاں، امانت حضور میں اس پری کے گزرانیاں دیکھ کر فرمایا۔ ''یہ گیارہ بدرے اشرفیوں کے لے اور خرچ میں لا۔ خدا رزاق ہے۔ فقیر اور نقد کو لے کر ضروریات میں خرچ کرنے لگا۔ اگر چہ خاطر جمع ہوئی، پر دل میں یہ خلش رہی آیا الٰہی یہ کیا صورت ہے۔ بغیر پوچھے کچھے اتنا مال ناآشنا صورت اجنبی نے، ایک پرزے کاغذ پر، میرے حوالے کیا۔'' اگر اس پری سے بھید پوچھوں تو اس نے پہلے ہی منع کر رکھا تھا۔ مارے ڈر کے دم نہیں مار سکتا تھا۔

بعد آٹھ دن کے، وہ معشوقہ مجھ سے مخاطب ہوئی، ''حق تعالیٰ نے آدمی کو انسانیت کا جامہ عنایت کیا ہے کہ نہ پھٹے نہ میلا ہو۔ اگر چہ پرانے کپڑے سے اس کی آدمیت میں فرق نہیں آتا۔ پر ظاہر میں خلق اللہ کی نظروں میں اعتبار نہیں پاتا۔ دو توڑے اشرفی کے ساتھ لے کر، چوک کے چوراہے پر یوسف سوداگر کی دکان میں جا اور کچھ رقم جواہر کے بیش قیمت اور دو خلعتیں زرق برق کی مول لے آ۔ فقیر دو نہیں سوار ہو کر اس کی دکان پر گیا۔ دیکھا تو ایک جوان شکیل، زعفرانی جوڑا پہنے، گدی پر بیٹھا ہے، ۔ اور اس کا یہ عالم ہے کہ ایک عالم دیکھنے کیلئے، دکان سے بازار تک کھڑا ہے۔ فقیر کمال شو

سے نزدیک جا کر سلام علیک کر کر بیٹھا اور جو جو چیز مطلوب تھی طلب کی۔ میری بات چیت اس شہر کے باشندوں کی سی نہ تھی، اس جوان نے گرم جوشی سے کہا ''جو صاحب کو چاہئے موجود ہے، لیکن یہ فرمایئے کس ملک سے آنا ہوا؟ اور اس اجنبی شہر میں رہنے کا کیا باعث ہے؟ اگر اس حقیقت سے مطلع کیجئے تو مہربانی سے بعید نہیں۔'' میرے تئیں اپنا احوال ظاہر کرنا منظور نہ تھا کچھ بات بنا کر اور جواہر پوشاک لے کر اور قیمت اس کی دے کر رخصت چاہی، اس جوان نے روکھے پھیکے ہو کر کہا ''اے صاحب! اگر تم کو ایسی ہی نا آشنائی کرنی تھی۔ تو پہلے دوستی، اتنی گرمی سے کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ بھلے آدمیوں میں صاحب سلامت کا پاس بڑا ہوتا ہے۔'' یہ بات اس مزے اور انداز سے کہی، بے اختیار دلکو بھائی اور بے مروت ہو کر وہاں سے اٹھنا انسانیت کے مناسب نہ جانا۔ اس کی خاطر پھیر بیٹھا اور بولا ''تمہارا فرمانا سر آنکھوں پر، میں حاضر ہوں۔''

اتنے کہنے سے بہت خوش ہوا۔ ہنس کر کہنے لگا۔ ''اگر آج کے دن غریب خانے پر کرم کیجئے تو تمہاری بدولت، مجلس خوشی کی جما کر، دو چار گھڑی دل بہلا دیں، اور کچھ کھانے، پینے کا شغل باہم بیٹھ کر کریں۔'' فقیر نے اس پری کو، کبھو اکیلا نہ چھوڑا تھا، اس کی تنہائی یاد کر کر، چندور چند عذر کیئے، پر اس جوان نے ہرگز نہ مانا۔ آخر وعدہ، ان چیزوں کو پہنچا کر، میرے پھر آنے کا لے کر اور قسم کھلا کر رخصت کر دی۔ میں دکان سے اٹھ کر، جواہر اور خلعتیں اس پری کی خدمت میں لایا۔ اس نے قیمت جواہر کی اور حقیقت جوہری کی پوچھی۔ میں نے سارا احوال مول تول کا اور مہمانی کے بجد ہونے کا کہہ سنایا۔ فرمانے لگی ''آدمی کو اپنا قول قرار پورا کرنا واجب ہے ہمیں خدا کی نگہبانی میں چھوڑ کر اپنے وعدے کو وفا کر رضا یافت قبول کرنی، سنت رسول کی ہے۔ تب میں نے کہا ''میرا دل چاہتا نہیں کہ تمہیں اکیلا چھوڑ کر جاؤں اور حکم یوں ہوتا ہے۔ لاچار جاتا ہوں جب تلک آؤں گا دل یہیں لگا رہے گا۔'' یہ کہہ کر پھر اس جوہری کی دکان پر گیا۔ وہ مونڈھے پر بیٹھا میرا انتظار کھینچ رہا تھا۔ دیکھتے ہی بولا آؤ مہربان بڑی راہ دکھائی۔''

وہیں اٹھ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا اور چلا جاتے جاتے ایک باغ میں لے گیا۔ وہ بڑی بہار کا باغ تھا۔ حوض اور نہروں میں فوارے چھوٹتے تھے، میوے طرح بہ طرح کے پھل رہے تھے۔ ہر ایک درخت مارے بوجھ کے جھوم رہا تھا۔ رنگ برنگ کے جانور ان پر بیٹھے چہچہے کر رہے تھے۔ اور

ہر مکان عالیشان میں فرش ستھرا بچھا تھا، وہاں، لبنہر، ایک بنگلے میں جا کر، بیٹھا، ایک دم کے بعد آپ اٹھ کر چلا گیا۔۔ پھر دوسری پوشاک معقول پہن کر آیا میں نے دیکھ کر کہا "سبحان اللہ چشم بدور۔" سن کر مسکرا دیا اور بولا "مناسب یہ ہے کہ صاحب بھی اپنا لباس بدل ڈالیں۔" اس کی خاطر میں نے بھی دوسرے کپڑے پہنے، اس جوان نے بڑی ٹیپ ٹاپ سے تیاری ضیافت کی، اور سامان خوشی کا جیسا چاہئے موجود کیا اور فقیر سے صحبت بہت گرم کر، مزے کی باتیں کرنے لگا۔ اتنے میں ساقی، صراحی و پیالہ بلور کا لے کر حاضر ہوا اور گزک کئی قسم کی، لا کے رکھی۔ نمکدان چن دیئے۔ دور شراب کا شروع ہوا۔ جب و جام نوبت پہنچی چار لڑکے امرود، صاحب جمال، زلفیں کھولے ہوئے مجلس میں آئے۔ گانے بجانے لگے۔ یہ عالم ہوا اور ایسا سما بندھا، اگر تان سنگھ اس گھڑی ہوتا تو اپنی تان بھول جاتا اور بیجو باؤرا سن کر باؤلا ہو جاتا۔ اس مزے میں یک بارگی وہ جوان آنسو بھر لایا۔ دو چار قطرے بے اختیار نکل پڑے اور فقیر سے بولا "اب ہماری تمہاری دوستی" جانی ہوئی۔ پس دل کا بھید دوستوں سے چھپانا کسی مذہب میں درست نہیں۔ ایک بات بے تکلف آشنائی کے بھروسے کہتا ہوں اگر حکم کرو تو اپنی معشوقہ کو بلوا کر اس مجلس میں تسلی اپنے دل کی کروں۔ اس کی جدائی سے جی نہیں لگتا۔"

یہ بات ایسے اشتیاق سے کہی کہ بغیر دیکھے بھالے، فقیر کا دل بھی مشتاق ہوا۔ میں نے کہا" مجھے تمہاری خوشی درکار ہے۔ اس سے کیا بہتر؟ دیر نہ کیجئے، سچ ہے، معشوق بن کر کچھ اچھا نہیں لگتا" اس جوان نے چلون کی طرف اشارت کی۔ وونہیں ایک کالی کلوٹی، بھوتنی سی، جس کے دیکھنے سے انسان بے اجل مر جاوے، جوان کے پاس آ بیٹھی۔ فقیر اس کے دیکھنے سے ڈر گیا۔ دل میں کہا" یہی بلا محبوبہ ایسے جوان پری زاد کی ہے جس کی اتنی تعریف اشتیاق ظاہر کیا!" میں لاحول پڑھ کر چپ ہو رہا۔ اسی عالم میں تین دن رات مجلس شراب اور راگ رنگ کی، جمی رہی۔ چوتھی شب کو غلبہ نشے اور نیند کا ہوا۔ میں خواب غفلت میں بے اختیار سو گیا۔ جب صبح ہوئی، اس جوان نے جگایا۔ کئی پیالے خمار شکنی کے پلا کر اپنی معشوقہ سے کہا" اب زیادہ تکلیف مہمان کو دینی خوب نہیں۔"

دونوں ہاتھ پکڑے اٹھے میں نے رخصت مانگی۔ خوشی بہ خوشی اجازت دی۔ تب میں نے جلد اپنے قدیمی کپڑے پہن لئے۔ اپنے گھر کی راہ لی اور اس پری کی خدمت پر جا کھڑا ہوا مگر ایسا اتفاق کبھو نہ ہوا تھا کہ اسے تنہا چھوڑ کر شب باش کہیں ہوا ہوں۔ اس تین دن کی غیر حاضری سے خجل

ہو کر عذر کیا، اور قصہ ضیافت کا اور اس کے نہ رخصت کرنے کا سارا عرض کیا۔ وہ ایک دانہ زمانے کی تھی، تبسم کر کے بولی۔ ''مضائقہ'' اگر ایک دوست کی خاطر رہنا ہوا! تو ہم نے معاف کیا۔ تیری کیا تکصیر ہے؟ آدمی کسو کے گھر جاتا ہے تب اس کی مرضی سے پھر آتا ہے لیکن یہ مفت کی مہمانیاں کھا پی کر چپکے ہور ہو گے یا اس کا بدلہ بھی اتار گے؟ اب یہ لازم ہے کہ جا کر اس سوداگر بچے کو اپنے ساتھ لے آؤ، اور اس سے دو چند ضیافت کرو اور اسباب کا کچھ اندیشہ نہیں، خدا کے کرم سے ایک دم میں سب لوازمہ تیار ہو جاوے گا اور بخوبی مجلس ضیافت کی، رونق پاوے گی'' فقیر موافق حکم کے جوہری کے پاس گیا اور کہا ''تمہارا فرمانا تو میں سر آنکھوں سے بجالایا، اب تم بھی مہربانی کی راہ سے میری عرض قبول کرو''۔ اس نے کہا ''جان و دل سے حاضر ہوں''۔

تب میں نے کہا ''اگر اس بندے کے گھر تشریف لے چلوں تو عین غریب نوازی ہے۔''

اس جوان نے بہت عذر اور حیلے کیے، پر میں نے پنڈ نہ چھوڑا، جب تلک وہ راضی ہوا ساتھ ہی ساتھ اس کو اپنے مکان پر لے چلا۔ لیکن راہ میں یہی فکر کرتا تھا کہ اپنے تئیں مقدور ہوتا تو ایسی تواضع کرتا کہ یہ بھی خوش ہوتا اب میں اسے لئے جاتا ہوں، دیکھئے کیا اتفاق ہوتا ہے اسی حیص بیص میں گھر کے نزدیک پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ دروازے پر دھوم دھام ہو رہی ہے۔ گلیارے میں جھاڑ و دے کر چھڑکاؤ کیا ہے۔ یسادل اور غصے بردار کھڑے ہیں۔ میں حیران ہوا لیکن اپنا گھر جان کر قدم اندر رکھا دیکھا تو تمام حویلی میں فرش مکلف لائق ہر مکان کے جا بجا بچھا ہے اور مسندے لگی ہیں۔ پان دان، گلاب پوش، عطر دان، پیک دان، چنگیری، نرگس دان قرینے سے دھرے ہیں۔ طاقوں پر رنگترے، کملیں، نارنگیاں اور گلابیاں، رنگ برنگ کی چنی ہیں۔ ایک طرف رنگ آمیز ابرق کی ٹٹیوں میں چراغاں کی بہار ہے، ایک طرف جھاڑ اور سرد، کنول کے، روشن ہیں۔ اور تمام دالان شانشینوں میں طلائی شمع دانوں پر کافوری چنے چڑھی ہے اور جڑاؤ فانوسیں اوپر دھری ہیں۔ سب آدمی اپنے اپنے عہدوں پر مستعد ہیں، باورچی خانے میں دیگیں ٹھنٹھنا رہی ہیں۔ آبدار خانے کی ویسی ہی تیاری ہے۔ کوری کوری ٹھلیاں، روپے کی گھڑونچیوں پر، صافیوں سے بندھیں اور بکروں سے ڈھکی رکھی ہیں۔ آگے چوکی پر ڈونگے، کٹورے، بمع تھالی، سرپوش دھرے، برف کے آبخورے لگ رہے ہیں۔ اور مشورے کی صراحیاں ہل رہی ہیں۔

غرض سب اسباب پادشاھانہ موجود ہے اور دو کنچنیاں، بھانڈ، بھگتیے کلاوت، قوال، اچھی پوشاک پہنے، ساؤ کے سر ملائے، حاضر ہیں۔ فقیر نے اس جوان کو لے جا کر مسند پر بٹھایا اور دل میں حیران تھا کہ یا الٰہی اتنے عرصے میں یہ سب تیاری کیوں کر ہوئی؟ ہر طرف دیکھتا پھرتا تا لیکن اس پری کا نشان کہیں نہ پایا۔ اسی جستجو میں ایک مرتبہ باورچی خانے کی طرف جا نکلا، دیکھتا ہوں تو وہ نازنین ایک مکان میں، گلے میں کُرتی، پانوں مُس تہہ پوشی، سر پر سفید رمالی اوڑھے ہوئے مساوی خوزادی بن گہنے پاتے، بنی ہوئی:

نہیں محتاج زیور کا جسے خوبی خدا نے دی
کہ جیسے خوش نما لگتا ہے دیکھو چاند بن گہنے

خبر گیری میں ضیافت کے لگ رہی ہے اور تاکید ہر ایک کھانے کی کر رہی ہے کہ خبردار بامزہ ہو اور آب و نمک، بو باس درست رہے۔ اس محنت سے وہ گلاب سا بدن سارا پسینے پسینے ہو رہا ہے۔

میں پاس جا کر تصدق ہوا اور اس شعور ولیاقت کو سراہ کر دعائیں دینے لگا۔ یہ خوشامد سن کر تیوری چڑھا کر بولی" آدمی سے ایسے کام ہوتے ہیں کہ فرشتے کی مجال نہیں۔ میں ایسا کیا کیا ہے، جو تو اتا حیران ہو رہا ہے؟ بس بہت باتیں بنانی مجھے خوش نہیں آتیں۔ بھلا کہہ تو، یہ کون آدمیت ہے کہ مہمان اکیلا بٹھلا کر ادھر ادھر پڑے پھرے؟ وہ اپنے جی میں کیا کہتا ہوگا؟ جلد جا مجلس میں بیٹھ کر مہمان کی خاطر داری کر اور اس کی معشوقہ کو بھی بلوا کر اس کے پاس بٹھلا۔" فقیر دو نہیں اس اس جو ان کے پاس گیا اور گرم جوشی کرنے لگا۔ اتنے میں دو غلام، صاحب جمال، صراحی اور جام جڑاؤ ہاتھ میں لئے روبرو آئے، شراب پلانے لگے۔ اتنے میں دو غلام، صاحب جمال، صراحی اور جام جڑاؤ ہاتھ میں لئے روبرو آئے، شراب پلانے لگے۔ اس میں، میں نے اس جوان کو کہا" میں سب طرح مخلص اور خادم ہوں، بہتر یہ ہے کہ وہ صاحب جمال کہ جس کی طرف دل صاحب کا مائل ہے تشریف لاوے تو بڑی بات ہے۔ اگر فرماؤ تو آدمی بلانے کی خاطر جاوے۔" یہ سنتے ہی خوش ہو کر بولا" بہت اچھا اس وقت تم نے میرے دل کی بات کہی۔" میں نے ایک خوجے کو بھیجا جب آدھی رات گئی وہ پڑیل خاصی چوڈول پر سوار ہو کر بدلے نا کہانی سی آ پہنچی۔

فقیر نے لاچار، خاطر سے مہمان کی، استقبال کر کر نہایت تپاک سے اس جوان کے پاس

بٹھایا جوان اس کو دیکھتے ہی ایسا خوش ہوا، جیسے دنیا کی نعمت ملی۔ وہ پھپتی بھی اس جوان زار کے گلے لپٹ گئی۔ سچ مچ یہ تماشا ہوا، جیسے چودھویں رات کے چاند کو گہن لگتا ہے تتنے مجلس میں آدمی تھے۔ اپنی اپنی انگلیاں دانتوں میں دابنے لگے کہ کیا کوئی بلا اس جوان پر مسلط ہوئی؟ سب کی نگاہ اسی طرف تھی۔ تماشا مجلس کا بھول کر اس کا تماشا دیکھنے لگے۔ ایک شخص کنارے سے بولا" یارو! عشق اور عقل میں ضد ہے۔ جو کچھ عقل میں نہ آوے۔ یہ کافر عشق کر دکھاوے۔ لیلیٰ کو مجنوں کی آنکھوں سے دیکھو" سبھوں نے کہا" آمنا؟ یہی بات ہے۔"

یہ فقیر، بہ موجب حکم کے مہمان داری میں حاضر تھا، ہر چند جوان، ہم پیالہ ہم نوالہ ہونے کو مجوز ہوتا تھا، پر میں ہرگز اس پری جے خوف کے مارے اپنا دل، کھانے پینے یا سیر تماشے کی طرف رجو نہ کرتا تھا۔ اور عذر مہمان داری کا کر کے اس کے شامل نہ ہوا۔ اسی کیفیت سے تین شبانہ روز گزرے چوتھی رات وہ جوان، نہایت جوشش سے مجھے بلا کر کہنے لگا" اب ہم بھی رخصت ہوں گے، تمہاری خاطر اپنا سب کاروبار چھوڑ چھاڑ کر تین دن تمہاری خدمت میں حاضر ہیں تم بھی تو ہمارے پاس ایک دم بیٹھ کر ہمارا دل خوش کرو۔" میں نے اپنے جی میں خیال کیا" اگر اس وقت کہا، اس کا، نہیں مانتا تو آزردہ ہوگا پس نئے دوست اور مہمان کی خاطر رکھنی ضرور ہے۔" تب یہ کہا " صاحب کا حکم بجالانا منظور کہ الامر فوق الادب" سنتے ہی اس کو جوان نے پیالہ تواضع کیا اور میں نے پی لیا۔ پھر تو ایسا پیہم دور چلا کہ تھوری دیر میں سب آدمی مجلس کے، کیفی ہو کر بے خبر ہو گئے ار میں بھی بے ہوش ہو گیا۔

جب صبح ہوئی اور آفتاب دو نیزے بلند ہوا تب میری آنکھ کھلی تو دیکھا میں نے نہ وہ تیاری ہے نہ وہ مجلس، نہ وہ پری، فقط حویلی خالی پڑی ہے۔ مگر ایک کونے میں کمبل لپٹا ہوا ادھرا ہے جو اس کو کھول کر دیکھا تو وہ جوان اور اس کی رنڈی دونوں سر کٹے پڑے ہیں۔ یہ حالت دیکھتے ہی حواس جاتے رہے، عقل کچھ کام نہیں کرتی کہ یہ کیا ہے اور کیا ہوا؟ حیرانی سے ہر طرف تکتا تھا اتنے میں ایک خواجہ سرا دھبے ضیافت کے کام کاج میں دیکھا تھا نظر پڑا۔ فقیر کو اس کے دیکھنے سے کچھ تسلی ہوئی احوال اس واردات کا پوچھا۔ اس نے جواب دیا" تجھے اس بات کی تحقیق کرنے سے کیا حاصل، جو تو پوچھتا ہے؟" میں نے بھی اپنے دل میں غور کی کہ سچ تو کہتا ہے پھر ایک ذرا تامل کر کے میں بولا

''خیر نہن کہو بھلا یہ تو بتاؤ وہ معشوقہ کس مکان میں ہے؟'' تب اس نے کہا ''البتہ جو میں جانتا ہوں سو کہہ دوں گا۔ لیکن تجھ سا آدمی عقل مند، بے مرضی حضور کے، دودن کی دوستی پر بے محابہ بے تکلف ہوکر صحبت مے نوشی کی باہم رمز کرے، یہ کیا معنی رکھتا ہے؟''

فقیر اپنی حرکت اور اس کی نصیحت سے بہت نادم ہوا۔ سوائے اس بات کے، زبان سے کچھ نہ نکلا ''فی الحقیقت اب تو تقصیر ہوئی معاف کیجئے۔'' بارے، محلی نے مہربان ہوکر اس پری کے مکان کا نشان بتایا اور مجھے رخصت کیا۔ آپ ان دونوں زخمیوں کے گاڑنے داینے کی فکر میں رہا۔ میں تہمت سے اس فساد کی الگ ہوا اور اشتیاق میں، اس پری کے ملنے کے، گھبرایا ہوا گرتا پڑتا، ڈھونڈتا شام کے وقت اس کوچے میں، اس پتے پر، جا پہنچا اور نزدیک دروزے کے، ایک گوشے میں ساری رات تلپھتے کٹی۔ کسو کی آمد و رفت کی آہٹ نہ ملی، اور کوئی احوال پرساں میرا نہ ہوا اسی بے کسی کی حالت میں صبح ہوگئی، جب سورج نکلا، اس مکان کے بالا خانے کی ایک کھڑکی سے وہ ماہ رو میری طرف دیکھنے لگی۔ اس وقت عالم خوشی کا جو مجھ پر گزرا او دل ہی جانتا ہے۔ شکر اخدا کا کیا۔

اتنے میں ایک خوجے نے میرے پاس آکر کہا ''اس مسجد میں تو جا کر بیٹھ، شاید تیرا مطلب اسجگہ برآوے اور اپنے دل کی مراد پاوے۔'' فقیر فرمانے سے اس کے وہاں سے اٹھ کر اسی مسجد میں جا رہا۔ لیکن آنکھیں دروازے کی طرف لگ رہی تھیں کہ دیکھئے پردہ غیب سے کیا ظاہر ہوتا ہے؟ تمام دن جیسے روزہ دار شام ہونے کا انتظار کھینچتا ہے، میں نے بھی وہ روز دیسی ہی بے قراری میں کاٹا۔ ہارے جس تس طرح سے شام ہوئی اور دن پہاڑ سا، چھاتی پر ت ٹلا ایک بارگی وہی خواجہ سرا (جن نے اس پری کے مکان کا پتہ بتا دیا) مسجد میں آیا۔ بعد فراغت نماز مغرب کے میرے پاس آکر اس شفیق نے (کہ سب راز و نیاز کا محرم تھا، نہایت تسلی دے کر ہاتھ پکڑ لیا اور اپنے ساتھ لے چلد۔ رفتہ رفتہ ایک باغیچے میں مجھے بٹھا کر کہا ''یہاں رہو، جب تک تمہاری آرزو آوے'' اور آپ رخت جو کہ شاید میری حقیقت حضور میں کہنے لگا۔ میں اس باغ کے پھولوں کی پہاڑ اور چاندنی کا عالم اور حوض نہروں میں فوارے، ساون بھادوں کے، اچھلنے کا تماشا دیکھ رہا تھا۔ لیکن جب پھولوں کو دیکھتا تب اس گلی بدن کا خیال آتا۔ جب چاند پر نظر پڑتی ہے تب اس مہ رو کا مکھڑا یاد کرتا۔ یہ سب بہار اس کے بغیر میری آنکھوں میں خار تھی۔

بارے خدا نے اس کے دل کو مہربان کیا۔ ایک دم کے بعد وہ پری دروازے سے، جیسے چودھویں رات کا چاند، بناؤ کیے گلے میں لشواز بادلے کی بحف موتیوں کا درداس ٹکا ہوا اور سر پر اوڑھنی جس پر آنچل، پلو، لہر۔ گوکھر و لگا ہوا، سر سے پاؤں تک موتیوں میں جڑی، روش پر آ کر کھڑی ہوئی۔ اس کے آنے سے تر و تازگی نئے سر سے، اس باغ کو اور فقیر کے دل کو ہوگئی۔ ایک دم ادھر ادھر سیر کر کر شہہ نشیں میں مغرق مسند پر تکیہ لگا کر بیٹھی۔ میں دوڑ کر پروانے کی طرح جیسے شمع کے گرد پھرتا ہے، تصدق ہوا اور غلام کے مانند دونوں ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہوا اس میں وہ خوجہ میری خاطر، بہ طور سفارش کے عرض کرنے لگا۔ میں نے اس محلی سے کہا ''بندہ گنہ گار تقصیر دار ہے۔ جو کچھ سزا میرے لائق ٹھہرے سو ہو۔'' وہ پری از بسکہ ناخوش تھی بد دماغی سے بولی کہ ''اب اس کے حق میں یہی بھلا ہے کہ سو توڑے اشرفی کے لیوے اپنا اسباب درست کر کے وطن کو سدھارے۔''

میں یہ بات سنتے ہی کاٹھ ہوگیا اور سوکھ گیا کہ اگر کوئی میرے بدن کو کاٹے تو ایک بوند لہو کی نہ نکلے اور تمام دنیا آنکھوں کے آگے اندھیری لگنے لگی، اور ایک آہ نامرادی کی، بے اختیار جگر سے نکلی۔ آنسو بھی ٹپکنے لگے، سوائے خدا کے اس وقت کسو کی توقع نہ رہی۔ مایوس محض ہو کر اتنا بولا ''بھلا، ٹک اپنے دل میں غور فرمائیے، اگر مجھ کم نصیب کو دنیا کا لالچ ہوتا تو اپنا جان و مال حضور میں نہ کھوتا۔ کیا ایک بارگی حق، خدمت گزاری اور جاں نثاری، کا عالم سے اٹھ گیا، جو مجھ سے کم بخت پر اتنی بے مہری فرمائی؟ خیر اب میرے تئیں بھی زندگی سے کچھ کام نہیں، معشوقوں کی بے وفائی سے بے چارے عاشق نیم جاں کا نباہ نہیں ہوتا۔''

یہ سن کر تیکھی ہو، تیوری چڑھا کر، خفگی سے بولی ''چہ خوش! آپ ہمارے عاشق ہیں! مینڈک کو بھی زکام ہوا! اے بے وقوف! اپنے حوصلے سے زیادہ باتیں بنانی خیال خام ہے۔ چھوٹا منہ بری بات، بس چپ رہ، یہ نکمی بات چیت مت کر۔ اگر کسی اور نے یہ حرکت بے معنی کی ہوتی، پروردگار کی سوں، اس کی بوٹیاں کٹوا، چیلوں کو بانٹتی۔ پر کیا کروں؟ تیری خدمت یاد آتی ہے! اسی میں بھلائی ہے کہ اپنی راہ لے۔ تیری قسمت کا دانہ پانی ہماری سرکار میں یہیں تلک تھا۔'' پھر میں نے روتے بسورتے کہا ''اگر میری تقدیر میں یہی لکھا ہے کہ اپنے دل کے مقصد کو نہ پہنچوں اور جنگل پہاڑ میں سر ٹکراتا پھروں تو لاچار ہوں۔'' اس بات سے بھی دق ہو کہنے لگی۔ ''میرے تئیں یہ پھساھندے

چوچلے اور رمز کی باتیں پسند نہیں آتیں۔ اس اشارے کی گفتگو کی جو لائق ہو اس سے جا کر کر پھر اسی خفگی کے عالم میں اٹھ کر اپنے دولت خانے کو چلی۔ میں نے بہترا سر پٹکا متوجہ نہ ہوئی۔ لاچار میں بھی اس مکان سے اداس اور نا امید ہو کر نکلا۔

غرض چالیس دن تک یہی نوبت رہی۔ جب شہر کی کوچہ گردی سے اکتاتا، جنگل میں نکل جاتا، جب وہاں سے گھبراتا، پھر شہر کی گلیوں میں دیوانہ سا آتا۔ نہ دن کو کھاتا نہ رات کو سوتا، جیسے دھوبی کا کتا نہ گھر کا نہ گھاٹ کا۔ زندگی انسان کے کھانے پینے سے ہے، آدمی اناج کا کیڑا ہے طاقت بدن میں مطلق نہ رہی، اپاہج ہو کر اسی مسجد کی دیوار تلے جا پڑا کہ ایک روز وہی خواجہ سرا جمعے کی نماز پڑھنے آیا۔ میرے پاس سے ہو کر چلا، میں یہ شعر آہستہ ناطاقتی سے پڑھ رہا تھا:

اس دردِ دک سے موت ہو یا دل کو تاب ہو
قسمت میں جو لکھا ہو الٰہی شتاب ہو

اگرچہ ظاہر میں، صورت میری، بالکل تبدیل ہوگئی تھی۔ چہرے کی یہ شکل بنی تھی کہ جن نے مجھے پہلے دیکھا وہ بھی نہ پہچان سکتا کہ یہ وہی آدمی ہے لیکن وہ محل، آواز درد کی سن کو متوجہ ہوا۔ میرے تئیں بہ غور دیکھ کر، افسوس کیا اور شفقت سے مخاطب ہوا کہ آخر یہ حالت اپنی پہنچائی۔ میں نے کہا ''اب تو جو ہوا سو ہوا، مال سے بھی حاضر تھا، جان بھی تصدق کی، اسکی خوشی یونہی ہوئی تو کیا کروں؟''

یہ سن کر ایک خدمت گار میرے پاس چھوڑ کر مسجد میں گیا۔ نماز اور خطبے سے فراغت کر کر، جب باہر نکلا، فقیر کو ایک میانے میں ڈال کر اپنے ساتھ، خدمت میں اس پری بے پروا کی لے جا کر، چق کے باہر بٹھایا۔ اگرچہ میری روہٹ کچھ باقی نہ رہی تھی، پر مدت تلک شب و روز اس پری کے پاس اتفاق رہنے کا ہوا تھا، جان بوجھ کر بے گانی ہو کر پوچھنے لگی؟ ''یہ کون ہے؟'' اس مرد آدمی نے کہا ''یہ وہی کم بخت، بدنصیب ہے حضور کی خفگی اور عتاب میں پڑا تھا۔ اسی سبب سے اس کی یہ صورت بنی ہے۔ عشق کی آگ سے جلا جاتا ہے، ہر چند آنسوؤں کے پانی سے بجھاتا ہے پر وہ روئی بھڑکتی ہے۔ کچھ فائدہ نہیں ہوتا، علاوہ، اپنی تقصیر کی خجالت سے موا جاتا ہے'' پری نے ٹھٹھولی سے فرمایا۔ ''کیوں جھوٹ بکتا ہے؟ بہت دن ہوئے اس کی خبر، وطن پہنچنے کی خرداروں نے دی ہے۔ واللہ اعلم، یہ کون ہے اور تو کس کا ذکر کرتا ہے؟'' اس دم خواجہ سرا نے ہاتھ جوڑ کر التماس کیا ''اگر جان

کی امان پاؤں تو عرض کروں۔'' فرمایا'' کہہ، تیری جان تجھے بخشی۔'' خوجا بولا وہ آپ کی ذات قدر دان ہے۔ واسطے خدا کے، چلون کو درمیان سے اٹھوا کر پہنچانیے اور اس کی بے کسی کی حالت پر رحم کیجئے۔ ناحق شناسی خوب نہیں۔ اب اس کے احوال پر جو کچھ ترس کرائیے، بجا ہے اور جائے ثواب ہے۔ آگے حد ادب، جو مزاج مبارک میں آوے سو ہی بہتر ہے۔''

اتنے کہنے پر مسکرا کر فرمایا'' بھلا کوئی ہو، اسے دارالشفا میں رکھو۔ جب بھلا چنگا ہوگا تب اس کے احوال کی پرستش کی جائے گی۔'' خوجے نے کہا'' اگر اپنے دست خاص سے گلاب اس پر چھڑکیے اور زبان سے کچھ فرمائیے تو اس کو اپنے جینے کا بھروسہ بندھے۔ ناامیدی بری چیز ہے دنیا بہ امید قائم ہے؟'' اس پر بھی اس پری نے کچھ نہ کہا۔ یہ سوال و جواب سن کر، میں بھی اپنے جی سے اکتا رہا تھا، ندھڑک بول اٹھا کہ'' اب اس طور کی زندگی کو دل نہیں چاہتا۔ پاؤں تو گور میں لٹکا چکا ہوں۔ ایک روز مرنا ہے اور علاج میرا پادشاہ زادی کے ہاتھ میں ہے۔ کریں یا نہ کریں وہ جانیں۔'' بارے، مقلب القلوب نے اس سنگ دل کے دل کو نرم کیا۔ مہربان ہو کر فرمایا'' جلد پادشاہ حکیموں کو حاضر کرو۔'' وہ نہیں طبیب آ کر جمع ہوئے۔ نبض قارورہ دیکھ کر بہت غور کی۔ آخرش، تشخیص میں ٹھہرا کہ یہ شخص کہیں عاشق ہوا ہے۔ سوائے وصل معشوق کے اس کا کچھ علاج نہیں۔ جس وقت وہ ملے، یہ صحت پاوے۔ جب حکیموں کی زبانی بھی یہی مرض میرا ثابت ہوا حکم کیا'' اس جوان کو گرمابے میں لے جاؤ۔ نہلا کر خاصی پوشاک پہنا کر حضور میں لے آؤ۔'' دو نہیں مجھے باہر لے گئے۔ حمام کروا، اچھے کپڑے پہنا خدمت میں پری کی حاضر کیا۔ تب وہ نازنین تپاک سے بولی'' تو نے مجھے بیٹھے بٹھائے ناحق بدنام اور رسوا کیا۔ اب اور کیا کیا چاہتا ہے؟ جو تیرے دل میں ہے، صاف صاف بیان کر۔''

یا فقیر!! اسوقت یہ عالم ہوا کہ شادی مرگ ہو جاؤں۔ خوشی کے مارے ایسا پھولا کہ جامے میں نہ سماتا تھا اور صورت شکل بدل گئی۔ شکر خدا کا کیا، اور اس سے کہا'' س دم ساری حکیمی آپ پر ختم ہوئی کہ مجھ سے مردے کو ایک بات میں زندہ کیا۔ دیکھو تو اس وقت سے اس وقت تک میرے احوال میں کیا فرق ہو گیا'' یہ کہہ کر تین بار گرد پھرا اور سامنے آ کر کھڑا ہوا اور کہا'' حضور سے یوں حکم ہوتا ہے کہ جو تیرے جی میں ہو سو کہہ، بندے ہفت اقلیم کی سلطنت سے زیادہ یہ ہے کہ غریب نوازی کر کر،

اس عاجز کو قبول کیجئے اور اپنی قدم بوسی سے سرفرازی دیجئے۔'' ایک لحہ تو سن کر غوطے میں گئی۔ پھر کن انکھیوں سے دیکھ کر کہا ''بیٹھو، تم نے خدمت اور وفاداری ایسی ہی کی ہے جو کچھ کہو سو پھبتی ہے اور اپنے بھی دل پر نقش ہے۔ خیر ہم نے قبول کیا۔''

اسی دن اچھی ساعت، شبھ لگن میں چپکے چپکے قاضی نے نکاح پڑھ دیا۔ بعد اتنی محنت اور آفت کے، خدا نے یہ دن دکھایا کہ میں نے اپنے دل کا مدعا پایا، لیکن جیسی دل میں آرزو اس پری سے ہم بستر ہونے کی تھی ویسی ہی جی میں بے کلی اس واردات عجیب کے معلوم کرنے کی تھی کہ آج تک میں کچھ نہ سمجھا کہ یہ پری کون ہے؟ اور وہ حبشی سانولا سجیلا، جس نے ایک پرزے کاغذ پر اتنی اشرفیوں کے بدلے میرے حوالے کئے، کون تھا؟ اور تیاری ضیافت کی پادشاہوں کے لائق ایک پہر میں کیوں کر ہوئی؟ اور وہ دونوں بے گناہ اس مجلس میں کس لئے مارے گئے؟ اور سبب خفگی اور بے مروتی کا ربوجود خدمت گزاری اور ناز برداری کے) مجھ پر کیا ہوا؟ اور پھر ایک بارگی عاجز کو یوں سربلند کیا؟ غرض اسی واسطے، بعد رسم ورسومیات عقد کے، آٹھ دن تلک باوصف اس اشتیاق کے، قصد مباشرت کا نہ کیا۔ رات کو ساتھ سوتا، دن کو یونہی اٹھ کھڑا ہوتا۔

ایک دن غسل کرنے کے لئے میں نے خواص کو کہا کہ ''تھوڑا پانی گرم کردے تو نہاؤں۔'' ملکہ مسکرا کر بولی ''کس برتے پرتا پانی؟'' میں خاموش ہو رہا۔ لیکن وہ پری میری حرکت سے حیران ہوئی۔ بلکہ چہرے پر آثار خفگی کے نمود ہوئے۔ یہاں تلک کہ ایک روز وہ بولی ''تم بھی عجیب آدمی ہو، یا اتنے گرم یا ایسے ٹھنڈے اس کو کیا کہتے ہیں؟ اگر تم میں قوت نہ تھی تو کیوں ایسی کچی ہوس پکائی؟'' اس وقت میں نے بے دھڑک ہو، کہا اے جانی! منصفی شرط ہے، آدمی کو چاہئے کہ انصاف سے نہ چوکے'' بولی ''اب کیا انصاف رہ گیا ہے؟ جو کچھ ہونا تھا سو ہو چکا'' فقیر نے کہا ''واقعی بڑی آرزو اور مراد یہی تھی، سو مجھے ملی۔ لیکن دل میرا دبدہے میں ہے اور دودلے آدمی کی خاطر پریشان رہتی ہے۔ اس سے کچھ ہو نہیں سکتا، انسانیت سے خارج ہو جاتا ہے۔ میں نے اپنے دل میں یہ قول کیا تھا کہ بعد اس نکاح کے (کہ عین دل کی شادی ہے) بعض بعضی باتیں (جو خیال میں نہیں آتیں اور نہیں کھلتیں) حضور میں پوچھوں گا کہ زبان مبارک سے اس کا بیان سنوں تو جی کو تسکین ہو۔'' اس پری نے چیں بہ چیں ہو کر کہا ''کیا خوب ابھی سے بھول گئے؟ یاد کرو، بارہا ہم نے کہا ہے کہ ہمارے

کام میں ہرگز دخل نہ کیجیو، اور کسی بات کے معترض نہ ہوجیو۔ خلاف معمول یہ بے ادبی کرنی کیا لازم ہے؟" فقیر نے ہنس کر کہا "جیسی اور بے ادبیاں معاف کرنے کا حکم ہے، ایک یہ بھی سہی۔" وہ پری نظریں بدل کر تیہے میں آ کر، آگ کا بگولہ بن گئی اور بولی "اب تو بہت سر چڑھا! جا اپنا کام کر، ان باتوں سے تجھے کیا فائدہ ہوگا؟" میں نے کہا "دنیا میں اپنے بدن کی شرم سے زیادہ ہوتی ہے، لیکن ایک دوسرے کا واقف کار ہوتا ہے بس جب ایسی چیز دپر روا رکھی، تو اور کون سا بھید چھپانے کے لائق ہے؟"

میری اس رمز کو وہ پری، وقوف سے دریافت کر کر، کہنے لگی "یہ بات سچ ہے، پر جی میں یہ سوچ ک آتا ہے کہ اگر مجھ نگوڑی کا راز فاش ہو تو بڑی قیامت مچے۔" میں بولا "یہ کیا مذکور ہے؟ بندے کی طرف سے یہ خیال دل میں نہ لاؤ، اور خوشی سے ساری کیفیت جو بیتی ہے، فرماؤ ہرگز ہرگز، میں دل سے زبان تک نہ لاؤں گا۔ کسو کے کان پڑنا کیا امکان ہے!" جب اِس نے دیکھا کہ اب سوائے کہنے کے، اس عزیز کے، چھٹکارا نہیں، لاچار ہو کر بولی "ان باتوں کے کہنے میں بہت سی خرابیاں ہیں۔ تو خرابیاں ہیں، تو خواہ نخواہ درپے ہو خیر یہ تیری خاطر عزیز ہے، اس لئے اپنی سر گزشت بیان کرتی ہوں۔ تجھے بھی اس کا پوشیدہ رکھنا ضرور ہے، خبر شرط۔"

غرض بہت سی تاکید کر کر کہنے لگی کہ "میں بدبخت ملک دمشق کے سلطان کی بیٹی ہوں اور دو سلاطینوں سے بڑا بادشاہ ہے۔ سوائے میرے کوئی لڑکا بالا اس کے یہاں نہیں ہوا۔ جس دن سے میں پیدا ہوئی، ماں باپ کے سائے میں ناز و نعمت اور خوشی، خرمی سے پلی۔ جب ہوش آیا تب اپنے دل کو خوب صورتوں اور نازنینوں کے ساتھ لگایا۔ چنانچہ ستھری ستھری، پری زاد ہمجولی، امرا زادیاں مصاحبت میں، اور اچھی اچھی، قبول صورت ہم عمر خواصیں سہیلیاں، خدمت میں رہتی تھیں۔ تماشا ناچ اور راگ رنگ کا ہمیشہ دیکھا کرتی۔ دنیا کے بھلے برے سے کچھ سروکار نہ تھا، اپنی بے فکری کے عالم کو دیکھ کر، سوائے خدا کے شکر کے، کچھ منھ سے نہ نکلتا تھا۔

اتفاقاً طبیعت خود بخود ایسی بے مزہ ہوئی کہ نہ مصاحبت کسو کی بھاوے نہ مجلس خوشی کی خوش آوے۔ سودائی سا مزاج ہو گیا۔ دل اداس اور حیران۔ نہ کسو کی صورت اچھی لگے، نہ بات کہنے سننے کو جی چاہئے، میری یہ حالت دیکھ کر دائی دا چھوچھو، انگا سب کی سب متفکر ہوئیں اور قدم پر گرنے

لگیں۔ یہی خواجہ سرا، نمک حلال، قدیم سے میرا محرم اور ہم راز ہے۔ اس سے کوئی بات مخفی نہیں۔ میری وحشت دیکھ کر بولا کہ "اگر پادشاہ زادی تھوڑ سا شربت ورق الخیال کا نوش جان فرمادیں تو اغلب ہے کہ طبیعت بحال ہوجاوے اور فرحت مزاج میں آوے، اس کے اس طرح کے کہنے سے مجھے بھی شوق ہوا۔ تب میں نے فرمایا جلد حاضر کر۔

"محلی باہر گیا اور ایک صراحی، اس شربت کی تکلف سے بنا کر برف میں لگا کر لڑکے کے ہاتھ لوا کر آیا۔ میں نے پیا اور جو کچھ اس کا فائدہ بیان کیا تھا ویسا ہی دیکھا۔ اسی وقت، اس خدمت کے انعام میں، ایک بھاری خلعت خوجے کو عنایت کی اور حکم کیا کہ ایک صراحی ہمیشہ اسی وقت حاضر کیا کر۔ اس دن سے یہ مقرر ہوا کہ خواجہ سرا صراحی اسی چھوکرے کے ہاتھ لوالاوے اور بندی پی جاوے۔ جب اس کا نشہ طلوع ہوتا، تو اس کی لہر میں اس لڑکے سے ٹھٹھا مزاخ کر کر، دل بہلاتی تھی۔ وہ بھی جب ڈھیٹ ہوا، تب اچھی اچھی میٹھی باتیں کرنے لگا اور اچنبھے کی نقلیں لانے بلکہ آہ، واہی بھی بھرنے سسکیاں لینے۔ صورت تو اس کی، طرح دار، لائق دیکھنے کے تھی بے اختیار جی چاہنے لگا۔ میں دل کے شوق سے اور اٹھکیلیوں کے ذوق سے ہر روز انعام بخشش دینے لگی، پر وہ کم بخت انہیں کپڑوں سے جیسے ہمیشہ پہن رہا تھا حضور میں آتا بلکہ وہ لباس بھی میلا کچیلا ہوجاتا۔

"ایک دن پوچھا کہ، تجھے سرکار سے اتنا کچھ ملا، تو نے اپنی صورت ویسی کی ویسی ہی پریشان بنا رکھی۔ کیا سبب؟ وے روپے کہاں خرچ کیے؟ یا جمع کر رکھے؟ لڑکے نے خاطر داری کی باتیں جو سنیں، اور مجھے احوال پرساں پایا، آنسو ڈبڈبا کر کہنے لگا 'جو کچھ آپ نے اس غلام کو عنایت کیا، سب استاد نے لے لیا۔ مجھے ایک پیسہ نہیں دیا، کہاں سے دوسرے کپڑے بناؤں، جو پہن کر حضور میں آؤں؟ اس میں میری تقصیر نہیں، میں لاچار ہوں، اس غریبی کے کہنے پر اس کے، ترس آیا وونہیں خواجہ سرا کو فرمایا کہ، آج سے اس لڑکے کو اپنی صحبت میں ربیت کر، اور اچھا لباس تیار کروا کر پہنچا، اور لونڈوں میں بے فائدہ کھیلنے کودنے نہ دے بلکہ اپنی خوشی یہ ہے کہ آداب لائق حضور کی خدمت کے سیکھے اور حاضر رہے، خواجہ سرے، موافق فرمانے کے بجالایا، اور میری مرضی جو ادھر دیکھی، نہایت اس کی خبر گیری کرنے لگا۔ تھوڑے دنوں میں فراغت اور خوش خوری کے سبب سے اس کا رنگ روغن کچھ سے کچھ ہوگیا۔ اور کنچلی سی ڈال دی۔ میں اپنے دل کو ہر چند سنبھالتی پر اس

کافر کی صوررت دل میں ایسی کھپ گئی تھی یہی جی چاہتا کہ مارے پیار کے اسے کلیجے میں ڈال رکھوں اور اپنی آنکھوں سے ایک پل جدا نہ کروں۔

''آخر اس کو مصاحبت میں داخل کیا۔ خلعتیں طرح بہ طرح کی، اور جواہر رنگ بہ رنگ کے پہنا کر دیکھا کرتی۔ بارے اس کے نزدیک رہنے سے آنکھوں کو سکھ، کلیجے کو ٹھنڈک ہوئی۔ ہر دم اس کی خاطر داری کرتی، آخر کو میری یہ حالت پہنچی کہ اگر ایک دم، کچھ ضروری کام کو، میرے سامنے سے جاتا تو چین نہ آتا۔ بعد کئی برس کے وہ بالغ ہوا۔ مسیں بھیگنے لگیں، چھب تختی درست ہوئی۔ تب اس کا چرچا باہر درباریوں میں ہونے لگا۔ دربان اور رونے، میوڑے، باری دار، اور لسیا دل، چوب دار اس کو محل کے اندر آنے جانے سے منع کرنے لگے۔ آخر اس کا آنا موقوف ہوا۔ مجھے تو اس بغیر کل نہ پڑتی تھی، ایک دم پہاڑ تھا۔ جب یہ احوال، ناامیدی کا سنا، ایسی بدحواس ہوگئی گویا مجھ پر قیامت ٹوٹی۔ اور یہ حالت ہوئی کہ نہ کچھ کہہ سکتی ہوں، نہ اس بن رہ سکتی ہوں۔ کچھ بس نہیں چل سکتا، الٰہی کیا کروں! عجب طرح کا قلق ہوا، مارے بے قراری کے اسی محلی کو (جو میرا بھید و تھا) بلا کر کہا کہ 'مجھے غور اور پرداخت اس لڑکے کی منظور ہے، بالفعل صلاح وقت یہ ہے کہ ہزار اشرفی پونجی دے کر، چوک کے چاراہے میں دکان جوہری کی کروادو، تو تجارت کر کے اس کے نفع سے اپنی گزران فراغت سے کیا کرے اور میرے محل کے قریب ایک حویلی اچھے نقشے کی رہنے کے لئے بنوادو۔ لونڈی غلام، نوکر چاکر، جو ضرور ہوں، مول لے کر، اور درماہا مقرر کر کر' اس کے پاس رکھوا'' کہ کسو طرح بے آرام نہ ہو۔ خواجہ سرا نے بود و باش کی، اور جوہری پنے اور تجارت کی، سب کی تیاری کر دی۔ تھوڑے عرصے میں اس کی دکان ایسی چمکی اور نمود ہوئی کہ جو خلعتیں فاخرہ اور جواہر بیش قیمت سرکار میں پادشاہ کی اور امیروں کی درکار مطلوب ہوتے، اسی کے یہاں بہم پہنچتے آہستہ آہستہ یہ دکان جمی کہ جو تحفہ ہر ایک ملک کو چاہیے، وہیں ملے۔ سب جوہریوں کا روزگار اس کے آگے مند ہوگیا۔ غرض اس شہر میں کوئی برابری اس کی نہ کر سکتا۔ بلکہ کسی ملک میں ویسا کوئی نہ تھا۔

''اسی کاروبار میں اس نے تو لاکھوں روپے کمائے، پر جدائی اس کی روز بہ روز، نقصان میرے تن بدن کا، کرنے لگی۔ کوئی تدبیر نہ بن آئی کہ اس کو دیکھ کر اپنے دل کو تسلی کروں۔ ندان، صلاح کی خاطر واقف کار محلی کو بلایا اور کہا کہ، کوئی صورت بن نہیں آتی کہ ذرا میں صورت اس کی

دیکھوں اور اپنے دل کو صبر دوں مگر یہ طرح ہے کہ ایک سرنگ اس کی حویلی سے کھدوا کر محل میں ملوا دو۔ حکم کرتے یہ تھوڑے دنوں میں ایسی نقب تیار ہوئی کہ جب سانجھ ہوتی چپکے ہی وہ خواجہ سرا اس جوان کو اسی راستے سے لے آتا۔ تمام شب شراب و کباب و عیش و عشرت میں کٹتی، میں اس کے ملنے سے آرام پاتی، وہ میرے دیکھنے سے خوش ہوتا۔ جب فجر کا تارا نکلتا اور مؤذن اذان دیتا، محلی اسی راہ سے اس جوان کو اس کے گھر پہنچا دیتا۔ ان باتوں سے سوائے اس خوجے کے اور دوائیوں کے (جنھوں نے مجھے دودھ پلایا اور پالا تھا) چوتھا آدمی کوئی واقف نہ تھا۔

''مدت تلک اس طرح سے گذری۔ ایک روز یہ اتفاق ہوا کہ موافق معمول کے خواجہ سرا جو اس کو بلانے گیا، دیکھے تو وہ جوان فکر مند سا چپکا بیٹھا ہے۔ محلی نے پوچھا آج خیر ہے کیوں ایسے دل گیر ہو رہے ہو؟ چلو حضور میں یاد فرمایا ہے۔ اس نے ہرگز کچھ جواب نہ دیا۔ زبان نہ ہلائی۔ خواجہ سرا اپنا سا منھ لے کر، اکیلا پھر آیا اور احوال، اس کا عرض کیا۔ میرے تئیں، شیطان جو خراب کرے، اس پر بھی محبت اس کی دل سے نہ بھولی، اگر یہ جانتی کہ عشق اور چاہ، ایسے نمک حرام بے وفا کی، آخر کو بدنام اور رسوا کرے گی اور ننگ و ناموس سب ٹھکانے لگے گا تو اسی دم اس کام سے باز آتی اور توبہ کرتی۔ پھر اس کا نام نہ لیتی نہ اپنا دل بے حیا کو دیتی۔ پر ہونا تو یوں تھا ، اس لئے حرکت بے جا اس کی خاطر میں نہ لائی اور اس کے نہ آنے کو معشوقوں کا چوچلا اور ناز سمجھا۔ اس کا نتیجہ یہ دیکھا کہ اس سرگزشت سے، بغیر دیکھے بھالے، تو بھی واقف ہو، نہیں تو میں کہاں اور تو کہاں؟ خیر جو ہوا سو ہوا۔ اس خود دماغی پر اس گدھے کی خیال نہ کر۔ دوبارہ خوجے کے ہاتھ پیغام بھیجا کہ ''اگر تو اسوقت نہیں آوے گا تو میں کسو نہ کسو ڈھب سے وہیں آتی ہوں لیکن میرے آنے میں بڑی قباحت ہے اگر یہ راز فاش ہو) تو تیرے حق میں برا ہے۔ تب ایسا کام نہ کر جس میں سوائے رسوائی کے اور کچھ پھل نہ ملے۔ بہتر یہی ہے کہ جلد چلا آ نہیں تو مجھے پہنچا جان، جب یہ سندلیا گیا اور اشتیاق میرا نپٹ دیکھا، بھونڈ لیسی صورت بنائے ہوئے ناز نخرے سے آیا۔

''جب میرے پاس بیٹھا تب میں نے اس سے پوچھا کہ' آج رکاوٹ اور خفگی کا کیا باعث ہے؟ اتنی شوخی اور گستاخی تو نے کبھو نہ کی تھی، ہمیشہ بلا عذر حاضر ہوتا تھا، تب اس نے کہا کہ' میں گمنام غریب حضور کی توجہ سے اور دامن دولت کے باعث، اس مقدور کو پہنچا۔ بہت آرام سے زندگی کٹتی

ہے، آپ کی جان و مال کو دعا کرتا ہوں، یہ تقصیر پادشاہ زادی کے معا کرنے کے بھروسے، اس گنہہ گار سے سرزد ہوئی، امیدوار عفو کا ہوں۔" میں تو جان و دل سے اسے چاہتی تھی اس کی بناوٹ کی باتوں کر مان لیا اور شرارت پر نظر نہ کی۔ بلکہ پھر دلداری سے پوچھا کہ 'کیا تجھ کو ایسی مشکل کٹھن پیش آئی جو ایسا متفکر ہو رہا ہے؟ اس کو عرض کر، اس کی بھی تدبیر ہو جائے گی۔'

غرض اس نے اپنی خاکساری کی راہ سے یہی کہا کہ "مجھ کو سب مشکل ہے، آپ کے روبرو سب آسان ہے، آخر اس کیک فحوائے کلام اور بت کہاؤ سے، یہ کھلا کر، ایک باغ نہایت سرسبز اور عمارت عالی، حوض تالاب کنوی پختہ سمیت، غلام کی حویلی کے نزدیک، ناف شہر میں بکاؤ ہے۔ اور اس باغ کے ساتھ ایک لونڈی بھی گائن، کہ علم موسیقی میں خوب سلیقہ رکھتی ہے۔ یہ دونوں باہم بکتے ہیں نہ اکیلا باغ جیسے اونٹ کے گلے میں بلی۔ جو کوئی وہ باغ لیوے اس کنیز کی بھی قیمت دیوے اور تماشا یہ ہے کہ باغ کا مول پانچ ہزار روپے اور باندی کا بہا پانچ لاکھ۔ فردی سے اتنے روپے بالفعل سرانجام نہیں ہو سکتے، میں نے اس کا دل بہت بے اختیار شوق میں ان کی خریداری کے پایا کہ اسی واسطے دل حیران اور خاطر پریشان تھا۔ باوجود دیکھ روبرو میرے بیٹھا تھا، تب بھی اس کا چہرہ ملین اور جی ادس تھا۔ مجھے تو خاطر داری اس کی ہر گھڑی اور ہر پل منظور تھی، اسی وقت خواجہ سرا کو حکم کیا کہ کل صبح کو قیمت اس باغ کی، لونڈی سمیت چکا کہ قبالہ باغ کا، اور خط کنیز کا، لکھوا کر اس شخص کے حوالے کر دو اور مالک کو زر قیمت خزانہ عامرہ سے دلوا دو۔

"اس پروانگی کے سنتے ہی، جوان نے آداب بجالایا اور منہ پر روہٹ آئی۔ ساری رات اسی قاعدے سے جیسے ہمیشہ گزرتی تھی۔ ہنسی خوشی سے کٹی۔ فجر ہوتے ہی وہ رخصت ہو گیا۔ خوجے نے موافق فرمانے کے اسی باغ اور لونڈی کو خرید کر دیا۔ پھر وہ جوان رات کو موافق معمول کے آیا جایا کرتا۔ ایک روز بہار کے موسم میں مکان بھی دلچسپ تھا۔ بدلی گھمنڈ رہی تھی، پھوئیاں پڑ رہی تھیں، بجلی بھی کوندر ہی تھی، اور ہوا نرم نرم بہتی تھی۔ غرض عجیب کیفیت اس دم تھنچ رہی رنگ بہ رنگ کے حباب اور گلابیاں، طاقوں پر چنی ہوی، نظر پڑیں، دل للچایا کہ ایک گھونٹ لوں۔ جب دو تین پیالوں کی نوبت پہنچی دو بس۔ خیال اس باغ نو خرید کا گذرا۔ کمال شوق ہوا کہ ایک دم، اس عالم میں، وہاں کی سیر کیا چاہئے۔ کم بختی جو آوے اونٹ چڑھے کتا کاٹے اچھی طرح بیٹھے بٹھائے ایک

دائی کو ساتھ لے کر سرنگ کی راہ سے اس جوان کے مکان کو گئی وہاں سے باغ کی طرف چلی۔ دیکھا تو ٹھیک اس باغ کی بہار، بہشت کی برابری کر رہی ہے۔ قطرے مینہ کے، درختوں کے سبز سبز پتوں پر، جو پڑے ہیں، گویا زمرد کی پٹریوں پر موتی جڑے ہیں اور سرخی پھولوں کی، اس بر میں ایسی اچھی لگتی ہے جیسے شام کو شفق پھولے ہے اور نہریں لبالب، مانند فرش آئینے کے، نظر آتی ہیں اور موجیں لہراتی ہیں۔

''غرض اس باغ میں ہر طرف سیر کرتی پھرتی تھی کہ دن ہو چکا، سیاہی شام کی نمود ہوئی۔ اتنے میں وہ جوان ایک روش پر نظر آیا اور مجھے دیکھ کر بہت ادب اور گرم جوشی سے آگے بڑھ کے میرے ہاتھ کو اپنے ہاتھ پر دھر کر، بارہ دری کی طرف لے چلا۔ جب میں وہاں گئی تو وہاں کے عالم نے سارے باغ کی کیفیت کو سے بھلا دیا۔ یہ روشنی کا ٹھاٹھ تھا: جا بجا قمقمے، سرو چہ، نماں، کنول اور فانوس خیال، شمع مجلس حیراں، اور فانوسیں روشن تھیں کہ شب برات، باوجود چاندنی اور چراغاں کے ،اس کے آگے اندھیری لگتی۔ ایک طرف آتش بازی، پھلجھڑی، انار داؤدی، بھنچپا، مروارید، مہتابی، ہوائی، خرچی، ہتھ پھول، جاہی، جوہی پٹاخے ستارے چھٹتے تھے۔

''اس عرصے میں بادل پھٹ گیا اور چاند نکل آیا بعینہ جیسے نافرمانی جوڑا پہنے ہوئے کوئی معشوق نظر آ جاتا ہے۔ بڑی کیفیت ہوئی۔ چاندنی چھٹکتے ہی جوان نے کہا کہ ''اب چل کر باغ کے بالا خانے پر بیٹھیے، میں ایسی احمق ہو گئی تھی کہ جو وہ نگوڑا کہتا کہتا، سو میں مان لیتی۔ اب یہ ناچ نچایا کہ مجھ کو اوپر لے گیا۔ وہ کوٹھا ایسا بلند تھا کہ تمام شہر کے مکان اور بازار کے چراغاں گویا اس کے پائیں باغ تھے۔ میں اس جوان کے گلے میں بانہہ ڈالے ہوئے، خوشی کے عالم میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اتنے میں ایک رنڈی نہایت بھونڈی سی، صورت نہ شکل، چولھے میں سے نکل۔ شراب کا شیشہ ہاتھ میں لئے ہوئے، آ پہنچی مجھے اس وقت اس کا آنا نپٹ برا لگا اور اس کی صورت دیکھنے سے دل میں ہول اٹھی۔

''تب میں نے گھبرا کر جوان سے پوچھا کہ ''یہ تحفہ علت کون ہے؟ تو نے کہاں سے پیدا کی، وہ جوان ہاتھ باندھ کر کہنے لگا کہ 'یہ وہی رنڈی ہے جو اس باغ کے ساتھ حضور کی عنایت سے خرید ہوئی۔ میں نے معلوم کیا کہ اس احمق نے بڑی خواہش سے اس کو لیا ہے، شاید اس کا دل اس پر

مائل ہے۔ اسی خاطر سے پیچ تاپ کھا کر میں چپکی ہو رہی۔ لیکن دل اسی وقت سے مکدر ہوا، اور ناخو شی مزاج پر چھا گئی۔ بس پر قیامت، اس ایسے تسے سے، یہ کی کہ ساقی اسی چھنال کو بنایا۔ اس وقت میں اپنا لہو پیتی تھی اور جیسے طوطی کو کوئی کوے کیساتھ ایک پنجرے میں بند کرتا ہے، نہ جانے کی فرصت پاتی تھی اور نہ بیٹھنے کو جی چاہتا تھا۔ قصہ مختصر ''شراب، بوند کی بوند تھی جس کے پینے سے دمی حیوان ہو جاوے دو چار جام، پے درپے، اسی تیز اب کے، جوان کو دیئے اور آدھا پیالہ، جوان کی منت سے میں نے زہر مار لیا۔ آخر وہ پشت بے حیا بھی، بدمست ہو کر، اس مردود سے بے ہودہ ادائیں کرنے لگی اور وہ چبلا بھی نشے میں بے لحاظ ہو چلا اور نامعقول حرکتیں کرنے لگا۔

''مجھے یہ غیرت آئی، اگر اس وقت زمین پھاٹے تو میں سما جاؤں۔ لیکن اس کی دوستی کے باعث میں بلبلی اس پر بھی چپ ہو رہی۔ پر وہ تو اصل کا پاجی تھا، میرے اس درگزر کرنے کو نہ سمجھا۔ نشے کی لہر میں اور بھی دو پیالے چڑھا گیا کہ رہتا سہتا ہوش جو تھا، وہ بھی گم ہوا اور میری طرف سے مطلق دھڑکا جی سے اٹھا دیا۔ بے شرمی سے، شہوت کے غلبے میں، میرے روبرو اس بے حیا نے اس بنڈور سے صحبت کی۔ اور وہ پچھلی پائی بھی، اس حالت میں نیچے، پڑی ہوئی نخرے تلے کرنے لگی اور دونوں میں چوما چاٹی ہونے لگی۔ نہ اس بے وفا میں وفا، نہ اس بے حیا میں حیا، جیسے روح ویسے فرشتے، میری اس وقت یہ حالت تھی جیسے اوسر چوکی ڈومنی گاوے تال بے تال۔ اپنے اوپر لعنت کرتی تھی کہ کیوں تو یہاں آئی۔ جس کی یہ سزا پائی؟ آخر کہاں تک سہوں، میرے سر سے پاؤں تک آگ لگ گئی اور انگاروں پر لوٹنے لگی، غصے اور اس طیش میں یہ کہاوت، بیل نہ کود کودی گون، یہ تماشہ دیکھے کون، کہتی ہوئی وہاں سے اٹھی۔

''وہ شرابی اپنی خرابی دل میں سوچا کہ، اگر پادشاہ زادی اس وقت ناخوش ہوئی تو کل میرا کیا حال ہوگا اور صبح کو کیا قیامت مچے گی؟ اب یہ بہتر ہیکہ شاہ زادی کو مار ڈالوں، یہ ارادہ، اس غیبانی کی صلاح سے، جی میں ٹھہرا کر، گلے میں پٹکا ڈال، میرے پاؤں آپڑا، اور پگڑی سر سے اتار کر منت وزاری کرنے لگا۔ میرا دل تو اس پر لٹو ہو رہا تھا، جیدھر لئے پھرتا تھا پھرتی تھی اور چکی کی طرح میں اس کے اختیار میں تھی۔ جو کہتا تھا سو کرتی تھی، جوں توں مجھے پھسلا بنڈ ہلا کر پھر بٹھایا اور اسی شراب دو آتشہ کے دو چار پیالے بھر بھر کر آپ بھی پیئے اور مجھے بھی دیئے۔ ایک تو غصے کے مارے جل بھن

کر کباب ہورہی تھی، دوسرے ایسی شراب پی۔ جلد بے ہوش ہوگئی، کچھ حواس باقی نہ رہے۔ تب اس بے رحم، نمک حرام کٹر، سنگ دل نے تلوار سے مجھے گھائل کیا بلکہ اپنی دانست میں مار چکا۔ اس دم میری آنکھ کھلی تو منھ سے یہی نکلا۔ 'خیر' جیسا ہم نے کیا، ویسا پایا لیکن تو، اپنے تئیں میرے اس خون سے بچائیو۔

مباد ہو کوئی ظالم تر گریباں گیر
مرے لہو کو تو دامن سے دھو، ہوا سو ہوا

کسی سے یہ بھید ظاہر نہ کیجیو۔ ہم نے تجھ سے جان تک بھی درگزر نہ کی۔ پھر اس کو خدا کے حوالے کر کر، میرا جی ڈوب گیا، مجھے اپنی سدھ بدھ کچھ نہ رہی۔ شاید اس قصائی نے مجھے مردہ خیال کر، اس صندوق میں ڈال کر، قلعے کی دیوار تلے لٹکا دیا۔ سو تو نے دیکھا، میں کسو کا برا نہ چاہتی تھی لیکن یہ خرابیاں قسمت میں لکھی تھیں۔ مٹتی نہیں کرم کی ریکھا، ان آنکھوں کے سبب یہ کچھ دیکھا۔ اگر خوبصورتوں کے دیکھنے کا دل میں شوق نہ ہوتا، تو وہ بدبخت میرے گلے کا طوق نہ ہوتا۔ اللہ نے یہ کام کیا کہ تجھ کو وہاں پہنچا دیا اور سبب میری زندگی کا کیا اب حیا جی میں آتی ہے کہ ری رسوائیاں کھینچ کر اپنے تئیں جیتا نہ رکھوں، یا کسو کو منھ نہ دکھاؤں۔ پر کیا کروں، مرنے کا اختیار اپنے ہاتھ میں نہیں، خدا نے مار کر پھر جلایا، آگے دیکھئے کہ کیا قسمت میں بدا ہے۔ ظاہر میں تو تیری دوڑ دھوپ اور خدمت کام آئی جو ویسے زخموں سے شفا پائی۔ تو نے جان و مال سے میری خاطر کی اور جو اپنی بساط تھی، حاضر کی۔ ان دنوں تجھے بے خرچ اور دو لادیکھ کر وہ شقہ سیدی بہار کو (جو میرا خزانچی ہے) لکھا، اس میں یہی مضمون تھا کہ میں خیر و عافیت سے اب فلانے مکان میں ہوں، مجھ بد طالع کی خبر، والدۂ شریفہ کی خدمت پہنچائیو۔

''اس نے تیرے ساتھ وہ کشتیاں نقد کی، خرچ کی خاطر بھیج دیں اور جب تجھے خلعت اور جواہر خریدنے کو یوسف سوداگر بچے کی دکان کو بھیجا، مجھے یہ بھروسہ تھا کہ وہ کم حوصلہ ہر ایک سے جلد آشنا ہو بیٹھتا ہے، تجھے بھی اجنبی جان کر اغلب ہے کہ دوستی کرنے کے لئے، اترا کر، دعوت اور ضیافت کرے گا۔ سو میرا منصوبہ ٹھیک بیٹھا، جو کچھ میرے دل میں خیال آیا تھا اس نے ویسا ہی کیا، تو جب اس سے قول اقرار، پھر آنے کا کر کر، میرے پاس آیا اور مہمانی کی حقیقت اور اس کا بجد ہونا مجھ

سے کہا، میں دل میں خوش ہوتی کہ جب تو اس کے گھر جا کر کھاوے پیوے گا۔ تب اگر تو بھی اس کو مہمانی کی خاطر بلاوے گا،۔ وہ دوڑا چلا آوے گا۔ اس لئے تجھے جلد رخصت کیا۔ تین دن کے پیچھے جب تو وہاں سے فراغت کر کے آیا اور میرے روبرو عذر، غیر حاضری کا، شرمندگی سے لایا، میں نے تیری تشفی کے لئے فرمایا، کچھ مضائقہ نہیں، جب اس نے رضادی تب تو آیا، لیکن بے شرمی خوب انہیں کہ دوسرے کا احسان اپنے سر رکھئے اور اس کا بدلہ نہ کیجئے، اب تو جا کر اس کی استدعا کر اور اپنے ساتھ ہی ساتھ لے آ، جب تو اس کے گھر گیا تب میں نے دیکھا کہ یہاں کچھ اسباب مہمان داری کا تیار نہیں، اگر وہ آ جاوے تو کیا کروں؟ لیکن یہ فرصت پائی کہ اس ملک میں قدیم پادشاہوں کا یہ معمول ہے کہ آٹھ مہینے کاروباری ملکی اور مالی کے واسطے ملک گیر میں باہر رہتے ہیں اور چار مہینے موسم برسات کے قلعہ مُبارک میں جلوس فرماتے ہیں۔ ان دنوں دو چار مہینے سے پادشاہ یعنی دل، نعمت مجھ بد بخت کے، بندوبست کی خاطر، ملک میں تشریف لے گئے تھے۔

''جب تک تو، اس جوان کو ساتھ لے کر آوے کہ سیدی بہار نے میرا، احوال خدمت پادشاہ بیگم کی (کہ والدہ مجھ ناپاک کی ہیں) عرض کیا۔ پھر میں اپنی تقصیر اور گناہ سے خجل ہر کران کے روبرو جا کر کھڑی ہوئی اور جو سرگزشت تھی، سب بیان کی۔ ہر چند انہوں نے میرے غائب ہونے کی کیفیت، دور اندیشی اور مہر مادری سے چھپا رکھی تھی کہ خدا جانے اس کا انجام کیا ہو، ابھی یہ رسوائی ظاہر کرنی خوب نہیں۔ میرے بدلے میرے عیبوں کو، اپنے پیٹ میں رکھ چھوڑا تھا لیکن میری تلاش میں تھیں۔ جب مجھے اس حال میں دیکھا اور سب ماجرا سنا، آنسو بھر لائیں اور فرمایا ''اے کم بخت ناشدنی! تو نے جان بوجھ کر نام ونشان، بادشاہت کا سارا کھویا۔ ہزار افسوس اور اپنی زندگی سے بھی ہاتھ دھویا۔ کاش کہ تیرے عرض میں پتھر جنتی تو صبر آتا! اب بھی توبہ کر جو قسمت میں تھا سو ہوا۔ اب آگے کیا کرے گی؟ جیو سوگی یا مرے گی؟'' میں نے نہایت شرمندی سے کہا کہ ''مجھ بے حیا کے نصیبوں میں یہی لکھا تھا جو اس بدنامی اور خرابی میں، ایسی ایسی آفتوں سے بچ کر، جیتی رہوں اس سے مرنا ہی بھلا تھا، اگر چہ کلنک کا ٹیکہ میرے ماتھے پہ لگا، پر ایسا کام نہیں کیا جس میں ماں باپ کے نام کو عیب لگے، اب یہ بڑا دکھ ہے کہ دے دونوں بے حیا، میرے ہاتھ سے بچ جاویں اور آپس میں رنگ رلیاں مناویں اور میں ان کے ہاتھوں سے یہ دکھ دیکھوں۔ حیف ہے کہ مجھ سے کچھ نہ ہو سکے۔

یہ امیدوار ہوں کہ خان سامان کو پروانگی ہو، تو اسباب ضیافت کا، بخوبی تمام، اس کم بخت کے مکان میں تیار کرے تو میں دعوت کے بہانے سے ان دونوں بدبختوں کو بلوا کر، ان کے عملوں کی سزا دوں اور اپنا عوض لوں، جس طرح اس نے مجھ پر ہاتھ چھوڑا اور گھائل کیا، میں بھی دونوں کے پرزے پرزے کردوں۔ تب میرا کلیجہ ٹھنڈا ہو۔ نہیں تو اس غصے کی آگ میں پھک رہی ہوں۔ آخر جل بل کر بھوبھل ہو جاؤں گی۔ یہ سن کر اماں نے آتما کے درد سے مہربان ہو کر میری عیب پوشی کی، اور سارا لوازمہ ضیافت کا، اسی خواجہ کے ساتھ (جو میرا محرم ہے) کردیا سب اپنے اپنے کارخانے میں آکر حاضر ہوئے۔ شام کے وقت تو اس موئے کو لے کر آیا، مجھے اس قحبہ باندی کا بھی آنا منظور تھا۔

''چنانچہ پھر تجھ کو تقلید کر کر، اسے بھی بلوایا۔ جب وہ بھی آئی اور مجلس جمی، شراب پی پی کر سب بدمست اور بے ہوش ہوئے اور ان کے ساتھ تو بھی کیفی ہو کر مردہ سا پڑا۔ میں نے قلماقنی کو حکم کیا کہ ان دونوں کا سر تلوار سے کاٹ ڈال۔ اس نے دونہیں ایک دم، شمشیر نکال کر دونوں کے سر کاٹ، بدن لال کر دیئے اور تجھ پر غصے کا یہ باعث تھا کہ میں نے، اجازت ضیافت کی دی تھی، نہ دو دن کی دوستی، پر اعتماد کر کے شریک مے خوری کا ہو۔ البتہ یہ تیری حماقت اپنے تئیں پسند نہ آئی، اس واسطے کہ جب تو پی پا کر بے ہوش ہو، تب توقع رفاقت کی تجھ سے کیا رہی؟ پر تیری خدمت کے حق، ایسے مری گردن پر ہیں کہ تجھ سے ایسی حرکت ہوتی ہے تو معاف کرتی ہوں۔ لے، میں نے اپنی حقیقت ابتدا سے انتہا تک کہہ سنائی اب بھی دل میں کچھ اور ہوس باقی ہے؟ جیسے میں نے تیری خاطر کر کے تیرے کہنے کو سب طرح قبول کیا، تو بھی میرا فرمانا اسی صورت سے عمل میں۔ صلاح وقت یہ ہے کہ اب اس شہر میں رہنا میرے اور تیرے حق میں بھلا نہیں۔ آگے تو مختار ہے۔''

یا معبود اللہ! شہزادی اتنا فرما کر چپ رہی۔ فقیر تو دل و جان سے اس کے حکم کو سب چیز پر مقدم جانتا تھا۔ اور اس کی محبت کے جال میں پھنستا تھا، بولا ''جو مرضی مبارک میں آوے سو بہتر ہے، یہ فدوی بے عذر بجالاوے گا۔'' جب شہزادی نے میرے تئیں، فرمانبردار، خدمت گار اپنا، پورا سمجھا فرمایا ''دو گھوڑے چالاک اور جانباز (کہ چلنے میں ہوا سے باتیں کریں) پادشاہ کے خاص اصطبل سے منگوا کر تیار رکھ۔'' میں نے ویسے ہی پری زاد، چار گردے کے گھوڑے چن کر، زین بندھوا کر منگوائے۔ جب تھوڑی سی رات باقی رہی اور بادشاہ زادی مردانہ لباس پہن اور پانچوں ہتھیار باندھ کر،

ایک گھوڑے پر سوار ہوئی اور دوسرے مرکب پر میں مسلح ہو کر چڑھ بیٹھا اور ایک طرف کی راہ لی۔

جب شام تمام ہوئی اور پرچھا ہونے لگا تب ایک پوکھر کے کنارے پہنچے۔ اتر کر منھ ہاتھ دھوئے۔ جلدی جلدی کچھ ناشتہ کر کے پھر سوار ہو کر چلے۔ کبھو ملکہ کچھ کچھ باتیں کرتی، اور یوں کہتی کہ ''ہم نے تیری خاطر، شرم حیا، ملک مال، ماں باپ، سب چھوڑا۔ ایسا نہ ہو کہ تو بھی، اس ظالم بے وفا کی طرح سلوک کرے۔'' کدھو میں کچھ احوال ادھر ادھر کا راہ کٹنے کے لئے کہتا اور اس کا جواب بھی دیتا کہ ''پادشاہ زادی! سب آدمی ایک سے نہیں ہوتے۔ اس پاجی کے نطفے میں کچھ خلل ہوگا جو اس سے ایسی حرکت واقع ہوئی اور میں نے تو جان و مال تم پر تسدق کیا اور تم نے مجھے ہر طرح سے سرفرازی بخشی۔ اب میں بندہ، بغیر داموں کا، ہوں۔ میرے چمڑے کی اگر جوتیاں بنوا کر پہنو تو میں آہ نہ کروں۔'' ایسی ایسی باتیں باہم ہوتی تھیں۔ اور رات دن چلنے سے کام تھا کبھو جو، ماندگی کے سبب، کہیں اترتے تو جنگل کے چرند پرند شکار کرتے۔ حلال کر کے نمک دان سے لون نکال، چقمک سے آگ جھاڑ، بھون بھان کر کھا لیتے اور گھوڑوں کو چھوڑ دیتے وے اپنے منہ سے گھاس پات چر چگ کر اپنا پیٹ بھر لیتے۔

ایک روز ایسے کف دست میں جا نکلے کہ جہاں بستی کا نام نہ تھا اور آدمی کی صورت نظر نہ آتی تھی۔ اس پر بھی، پادشاہ زادی کی رفاقت کے سبب سے دن عید اور رات شب برات معلوم ہوتی تھی۔ جاتے جاتے، ان چیت، ایک دریا (کہ جس کے دیکھنے سے کلیجہ پانی ہو) راہ میں ملا کنارے پر کھڑے ہو کر جو دیکھا تو جہاں ملک نگاہ نے کام کیا، پانی ہی تھا کچھ تھل بیڑا نہ پایا۔ الٰہی! اب اسی سمندر سے کیوں کر پار اتریں ایک دم اسی سوچ میں کھڑے رہے۔ آخر یہ دل میں لہر آئی کہ ملکہ کو یہیں بٹھا کر میں تلاش میں، ناؤ نواڑے کی جاؤں۔ جب تلک اسباب گزارے کا ہاتھ آوے، تب تلک وہ نازنین بھی آرام پاوے۔ تب میں نے کہا کہ ''اے ملکہ! اگر حکم ہو تو گھاٹ باٹ، اس دریا کا دیکھو۔ فرمانے لگی ''میں بہت تھک گئی ہوں اور بھوکی پیاسی ہو رہی ہوں، میں ذرا دم لے لوں جب تئیں تو پار چلنے کی کچھ تدبیر کر۔''

اس جگہ ایک درخت پیپل کا تھا۔ بڑا چھتر باندھے ہوئے کہ اگر ہزار سوا آوے تو، دھوپ اور مینہ میں، اس کے تلے آرام پاوے۔ وہاں اس کو بٹھا کر، میں چلا اور چاروں طرف دیکھتا تھا کہ

کہیں بھی زمین پر یا دریا میں، نشان انسان کا پاؤں۔ بہتیرا سر مارا پر کہیں نہ پایا۔ آخر مایوس ہو کر وہاں سوے پھر آیا تو اس پری کو پیڑ کے نیچے نہ پایا۔ اس وقت کی حالت کیا کہوں کہ سرت جاتی رہی۔ دیوانہ باؤلا ہو گیا۔ کبھو درخت پر چڑھ جاتا اور ڈال ڈال، پات پات پھرتا۔ کبھو ہاتھ پاؤں چھوڑ کر زمین پر گرتا اور اس درخت کی جڑ کے آس پاس تصدق ہوتا۔ کدھو چنگھاڑ مار کر اپنے بے بسی پر روتا۔ کبھو پچھم سے پورب کو دوڑا جاتا، کدھو اتر سے دکھن کو پھر آتا۔ غرض بہتیر خاک چھانی لیکن اس گوہر نایاب کی نشانی نہ پائی۔ جب میرا کچھ بس نہ چلا، تب روتا اور خاک سر پر اڑاتا ہوا تلاش ہر کہیں کرنے لگا۔

دل میں یہ خیال آیا کہ شاید کوئی جن اس پری کو اٹھا لے کر گیا اور مجھے یہ داغ دے گیا، یا اس کیملک سیکوئی اس کے پیچھے لگا چلا آیا تھا۔ اس وقت اکیلا پا کر، منا منو کر، پھر شام کی طرف لے ابھرا۔ ایسے خیالوں میں گھبرا کر، کپڑے وپڑے پھینک پھانک دیئے۔ ننگا متنگا فقیر بن کر شام کے ملک میں صبح سے شام تلک ڈھونڈتا پھرتا اور رات کو کہیں پڑ رہتا۔ سارا جہاں روند مارا، پر اپنی بادشاہ زادی کا نام ونشان، کسی سے نہ سنا۔ نہ سبب غائب ہونے کا، معلوم ہوا۔ تب دل میں یہ آیا کہ جب اس جان کا تو نے کچھ پتہ نہ پایا تو اب جینا بھی حیف ہے۔ کسی جنگل میں ایک پہاڑ نظر آیا، تب اس پر چڑھ گیا اور یہ ارادہ کیا کہ اپنے تئیں گرادوں کہ ایک دم میں، سر منہ پتھروں سے ٹکراتے ٹکراتے پھوٹ جاوے گا، تو ایسی مصیبت سے جی چھوٹ جاوے گی۔

یہ دل میں کہہ کر چاہتا ہوں کہ اپنے تئیں گراؤں۔ بلکہ پاؤں بھی اٹھ چکے تھے کہ کسو نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ اتنے میں ہوش آ گیا، دیکھتا ہوں تو ایک سوا سبز پوش، منہ پر نقاب ڈالے، مجھے فرماتا ہے کہ "کیوں تو اپنے مرنے کا قصد کرتا ہے؟ خدا کے فضل سے ناامید ہونا کفر ہے، جب تک سانس ہے، تب تلک آس ہے۔ اب تھوڑے دنوں میں روم کے ملک میں تین درویش تجھ سار کے۔ ایسی ہی مصیبت میں پھنسے ہوئے اور ایسے ہی تماشے دیکھے ہوئے، تجھ سے ملاقات کریں گے اور وہاں کے پادشاہ ک آزاد بخت نام ہے، اس کو بھی ایک بڑی مشکل درپیش ہے۔ جب وہ بھی تم چاروں فقیروں کے ساتھ ملے گا، تو ہر ایک کے دل کا مطلب اور مراد جو ہے بخوبی حاصل ہو گی۔

میں نے رکاب پکڑ کو بوسہ دیا اور کہا "اے خدا کے ولی! تمہارے اتنے ہی فرمانے سے

میرے دل پر اضطرار کو تسلی ہوئی، لیکن خدا کے واسطے فرمایئے کہ آپ کون ہیں اور ہم شریف کیا ہے۔تب انہوں نے فرمایا کہ "مرتضیٰ علی میرا نام ہے، اور میرا یہی کام ہے کہ جس کو جو مشکل کٹھن پیش آوے تو میں اس کو آسان کردوں۔" اتنا فرما کر نظروں سے پوشیدہ ہوگئے۔ بارے اس فقیر نے، اپنے مولا مشکل کشا کی بشارت ہے، خاطر جمع کر، قصد قسطنطنیہ کا کیا۔ راہ میں جو کچھ مصیبتیں قسمت میں لکھی تھیں، کھینچتا ہوا اس پادشاہ زادی کی ملاقات کے بھروسے، خدا کے فضل سے یہاں تک آ پہنچا اور اپنی خوش نصیب سے تمہاری خدمت میں مشرف ہوا۔ ہمارے تمہارے آپس میں ملاقات تو ہوئی، باہم صحبت اور بات چیت معتبر آئی، اب چاہیے کہ پادشاہ آزاد بخت سے بھی روشناس اور جان پہچان ہو۔ بعد اس کے، مقرر، ہم پانچوں اپنے مقصد دل کو پہنچیں گے۔ تم بھی دعا مانگو اور آمین کہو۔

یا ہادی! اس حیران، سرگردان کی سرگزشت یہ تھی، جو حضور میں درویشوں کی، کہہ سنائی۔
اب آگے دیکھیئے، کب یہ محنت اور غم ہمارا، پادشاہ زادی کے ملنے سے، خوش و خرمی سے بدل ہوا۔"

آزاد بخت ایک کونے میں چھپا ہوا۔ چپکا دھیان لگائے، پہلے درویش کا جراسن کر خوش ہوا۔ پھر دوسرے درویش کی حقیقت کو سننے لگا۔

مذہبِ عشق

نہال چند لاہوری

آغاز داستان

کہتے ہیں کہ پورب کے شہروں میں سے کسی شہر کا ایک بادشاہ تھا۔ زین الملوک نام۔ جمال اس کا جیسے ماہ منیر۔ عدل وانصاف اور شجاعت میں بے نظیر۔ اس کے چار بیٹے تھے۔ ہر ایک علم وفضل میں علامۂ زمان اور جواں مردی میں رستمِ دوراں۔ خدا کی قدرتِ کاملہ سے ایک اور بیٹا آفتاب کی طرح جہاں کا روشن کرنے والا اور چودھویں رات کے چاند کی مانند دنیا کے اندھیرے کا دور کرنے ہارا پیدا ہوا۔ ابیات

جبیں اس کی سے مہہ نے داغ کھایا — دھنک نے دیکھ اَبرو سر جھکایا
اگر چینِ جبیں اس کی بناوے — مصور چین کا چیں مان جاوے
بلا انگیز آنکھیں جادو آمیز — دو ساغر بے خودی سے جیسے لبریز
وہ گھونگریالی اس کی دیکھ کاکل — پریشان آج تک ہے حالِ سنبل
جہاں مجروح ہو تیغِ نگہہ سے — پلک ہر ایک کج خنجر سی جھلکے

وہ مکھڑا ماہ جسکو دیکھ للچاوے پڑے خورشید کی نظر اس پر تو جل جاوے
عجب انداز سے تل گال پر تھا کہ گنجِ حسن پر کالا ہو بیٹھا
وہ سینہ تختۂ بلور سا صاف کہے تو بلکہ ایک ہیرا تھا شفاف
بباغِ حسن وہ سرو سر افراز غرض سر تا پا تھا غرق در ناز

بادشاہ نے باغ باغ ہوکر بڑی خوشی منائی اور نجومیوں کو بلا کر فرمایا کہ اس کی جنم لگن دکھائی۔ ہر ایک نے لگن کنڈلی کھینچ نام اس کا تاج الملوک رکھ دیا اور کچھ انگلیوں پر گن گنا کر عرض کی کہ یہ باغ عالم میں گل تازہ ہے۔ اس کے نصیبوں میں دولت دنیوی بے اندازہ ہے۔ صاحب ہمت ایسا آج تک نہ کوئی ہوا ہے نہ ہوگا۔ انسان تو کیا بلکہ عالمِ جنات بھی چاہے کہ اس کا مطیع اور فرماں بردار ہو۔ مگر ایک قباحت بھی اس کے ساتھ ہے کہ جب بادشاہ کی نظر اس پر پڑے تو فوراً بادشاہ کی آنکھوں سے بینائی جاوے۔ بادشاہ نے کچھ کچھ شاد کچھ ناشاد ہوکر ان کو تو رخصت کیا اور وزیر کو یہ فرمایا کہ ایک محل میں بہ تفاوت تمام ہماری گزرگاہ سے اس کی ماں سمیت کسی مکان میں رکھو۔ چنانچہ بموجب ارشاد کے وزیر عمل میں لایا۔

بعد چند سال کے وہ نہال باغِ سلطنت کا کمال ناز و نعمت پرورش پا کر ساتھ علم و ہنر کے سرسبز ہوا۔

ایک روز اس کو شکار کی خواہش ہوئی۔ سوار ہوکر جنگل میں گیا۔ اور ایک شکار کے پیچھے گھوڑا اٹھایا۔ سچ ہے ہونے والی بات بے ہوئے نہیں رہتی۔ ع۔ تقدیر کے لکھے کو امکان نہیں دھوتا۔ اتفاقاً بادشاہ بھی اسی دن شکار کو سوار ہوئے تھے۔ ایک ہرن کے پیچھے گھوڑا ڈالے ہوئے کہیں اسی طرف نکل آئے۔ مثل مشہور ہے "کانے چوٹ کنوڈ سے بھینٹا۔" جوں ہی شہزادے پر شاہ کی نظر جا پڑی وہیں آنکھوں کی بصارت جاتی رہی۔

ارکان دولت نے شہزادے کو دیکھ کر بادشاہ کے نابینا ہونے کا سبب دریافت کیا۔ حضرت نے فرمایا کہ لازم تو یوں تھا جو بیٹے کو دیکھ کر باپ کی آنکھیں اور روشن ہوں۔ یہ طرفہ ماجرا ہے کہ برعکس ظہور میں آیا۔ بس اب بہتر یہ ہے کہ اس کو میرے ممالک محروسہ سے نکال دو اور اسے ماں کے واسطے خدمت جاروب کشی کی مقرر رکھو۔ یہ فرما کر وہیں الٹے پاؤں تخت گاہ کو پھرے اور اسے دیس نکالا دیا۔ پھر بڑے بڑے حکیم مسیحا خصلت و بوعلی طبیعت آنکھوں کے علاج کے لئے بلائے۔ سب

نے متفق ہو کر عرض کی کہ بجز گل بکاؤلی کے اور کسی دارو سے ممکن نہیں کہ خود بدولت اچھے ہوں۔ اگر کسی صورت سے گل بکاؤلی پیدا ہو تو بادشاہ کیا بلکہ اندھا مادرزاد بھی آنکھیں پائے۔

یہ سن کر بادشاہ نے اپنے تمام ملک میں منادی پھرادی کہ جو کوئی گلِ بکاؤلی پیدا کرے یا اس کی خبر لائے تو اس کو بہت انعام واکرام دے کر نہال کروں۔

اس طرح بادشاہ نے ایک مدت تک اس کی انتظاری میں رو رو کر یعقوب کی طرح اپنی گئی آنکھوں کو سفید کیا۔ اور اس غم میں مانندِ ایوب کے اپنے تئیں گھلا دیا۔ ہر چند کہ خونِ جگر پیا لیکن کسو طرف سے کچھ اس کا سراغ نہ ملا۔

ایک روز چاروں بیٹوں نے بادشاہ کی خدمت میں دست بستہ ہو کر عرض کی کہ سعادت مند وہی لڑکا ہے کہ جس سے ماں باپ کی خدمت بن آوے اور اگر سعی و کوشش میں جان تک بھی جاوے تو وہ دین دنیا کی نجات اس میں سمجھے۔ اس واسطے ہم امیدوار ہیں کہ ہمیں رخصت فرمایئے تو گلِ بکاؤلی کی تلاش کو نکلیں۔

بادشاہ نے فرمایا کہ ایک تو آگے ہی میں اپنی آنکھیں کھو بیٹھا ہوں۔ اس کا داغ اب تک جگر سے نہیں گیا۔ دوسرے فرزند جو گھر کے چراغ ہیں ان کو برباد کس طرح سے ہونے دوں؟ یہ صدمہ تو اٹھایا ہی نہ جائے گا۔

شہزادوں نے پھر مکرر عرض کیا۔ جب چار ناچار بادشاہ نے وزیروں سے کہہ فرمایا کہ اسباب سفر کا جو چاہیئے سو تیار کردیں۔ چنانچہ انہوں نے بہ موجب حکم کے نقد و جنس و دواب و خیمہ و لشکر سے لیکر جتنا کہ چاہیئے تھا، موجود کردیا۔ تد (تب) بادشاہ سے رخصت ہو کر وے روانہ ہوئے۔

داستان دوسری

کہتے ہیں کہ شہزادے منزل بہ منزل جاتے تھے۔ اتفاقاً تاج الملوک کہ جس کو باپ نے شہر بدر کیا تھا۔ آوارگی کے جنگل کو پریشانی کے قدم سے ناپتے ناپتے ان سے دوچار ہوا اور کسی سے پوچھا کہ یہ کون ہیں اور کہاں جاتے ہیں؟

اس نے بادشاہ کے اندھے ہونے کا قصہ اور سبب ان کے سفر کا گلِ بکاؤلی کی تلاش کے واسطے تاج الملوک سے بیان کیا۔

شہزادے نے دل میں کہا۔ مصرع: کہ اٹھ بخت کو تو بھی اب آزما۔ مصلحت نیک تو یہ ہے کہ میں بھی بھائیوں کے ساتھ گل بکاؤلی کی جستجو کروں اور اپنی قسمت کے زر کو امتحان کی کسوٹی پر جانچوں۔ اس میں اگر اپنے دامن کو مراد کے پھولوں سے بھروں تو فھو المراد نہیں تو اس وسیلے سے باپ کے ملک سے باہر نکلوں۔ یہ دل میں ٹھان کر ایک سردار کے پاس کہ نام اس کا سعید تھا، گیا اور بہ ادب تمام سلام کیا۔

اس کی نظر جو شہزادے پر پڑی تو دیکھا کہ اسکی پیشانی کی چمک خورشید کی روشنی کے ساتھ برابری کر رہی ہے۔ اور چاند سے رخسارے زلفِ شب رنگ کے سائے میں ماہ تمام کے سے جلوے لے رہے ہیں۔ پوچھا تو کون ہے اور کہاں سے آنا ہوا؟

تاج الملوک نے چند گوہرِ سخن درجِ لعل دہن سے نکالے کہ بے چارہ غریب مسافر بے کس ہوں۔ نہ کوئی غم خوار کہ غم خواری کرے، نہ یار کہ شرط یاری کی بجالائے۔

سعید نے اس یوسف ثانی کی شیریں زبانی سے محظوظ ہو کر بصد آرزو و خواہش اپنی رفاقت میں رکھا اور ہر روز الطاف زیادہ کرتا۔

کہتے ہیں کہ شہزادے ایک مدت میں شہر فردوس کے بیچ کہ تخت نشیں وہاں کا رضوان شاہ تھا، پہنچے اور شام کے وقت دریا کنارے اس ارادے (کہ) سے کچھ چند روز یہاں ٹھہریں، خیمے ایستادہ کروائے۔

جب مسافر آفتاب ملک مغرب کی سیر کو گرم رفتار ہوا اور سیاح ماہتاب رات کے مشکی گھوڑے پر سوار ہو کر مشرق کی طرف باگ اٹھا الغاروں چلا تب چاروں طرف شہزادے اپنے اپنے (سمند) بادرفتار پر سوار ہو کر بہ طریق سیر شہر میں آئے اور ادھر ادھر گشت کرنے لگے۔ اس میں ایک محل منقش اور مکلف زر بافی جس کے ہر ایک مکاں کے آگے پردے پڑے ہوئے تھے، نظر آیا۔

وہاں کے باشندوں میں سے ایک سے پوچھا کہ یہ مکان عالی شان کس کا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ یہ حویلی ہے دلبر لکھا بیسوا کی۔

شہزادوں نے کہا ''اللہ اکبر یہ محل بادشاہی اس نے کہاں پایا؟''

وہ شخص پھر کہنے لگا کہ یہ رنڈی اس زمانے میں ہے یکتا، حسن اور ملاحت میں بے ہمتا، شہرۂ

آفاق، اپنے کام میں طاق، رعنائی اور زیبائی میں دلجو، خوبی اور دل ربائی میں بغایت خوب رو، چشمِ خورشید کی مدام اسکی شمع جمال پر مانند پروانے کی شیدا اور چہرہ ماہتاب کا دوام اس کے مکھڑے پر فدا۔ ابیات:

کسی نے راہ میں اس کی اگر قدم مارا تو آپ ہی عقل کی فہرست پر قلم مارا
اسی نے تج دیا ناموس و ننگ کو اپنے کہ جس نے ذرہ بھی خواہش میں اس کی دم مارا

صاحبان مباشرت کے واسطے ایک نقارہ مع چوب اس نے اپنے دروازے پر رکھا ہے۔ جو کوئی جا کر اسے بجاوے تو وہ عیاری (عیار) زمانے کی گھر میں اسے بلائے اور لاکھ روپے لے، تب ایک بار اس سے ملے۔

شہزادے کہ اپنی دولت اور مال پر نہایت مغرور تھے۔ نشان ہمت کا اس کے شوقِ ملاقات کے میدان میں بلند کر کے دروازے پر گئے اور جاتے ہی بے تحاشا نقارہ بجا دیا۔

سنتے ہی اس مکارہ دوراں نے دل میں کہا کہ الحمد للہ۔ بعد مدتِ مدید کسی ایسے نیک بخت نے میرے گھر کا قصد کیا ہے۔ چاہئے کہ میری امید کے حجرے کو روشن کرے، اور ایسے موٹے تازے شکار نے میرے جال میں آنے کا قصد کیا۔ اغلب ہے کہ دام میں پھنس جاوے، پھڑک پھڑک کر مرے۔ فی الحقیقت یہ طائفہ اسی تردّد میں رہتا ہے کہ کوئی عقل کا اندھا گانٹھ کا پورا ملے۔ سو خدا نے ویسے ہی شخص بھیج دیے۔ چھپ چھپ بناؤ سنگار کر، زیور مرصّع، لعل، موتی، ہیرا، زمرد، جا بجا موقعے سے پہن ٹیپ ٹاپ سے بن ٹھن کر بیٹھی۔

اس میں یہ بھی آ پہنچے۔ چند قدم استقبال کر کے ہر ایک کو سونے کی کرسی پر بٹھایا۔

لکھنے والے نے یوں لکھا ہے کہ شہزادوں نے اس آدھی رات کے عرصے میں پچاس لاکھ روپے ہارے۔ اس میں خورشید جہاں گرد زمرّدی تختے پر نمود ہوا اور ماہ کا مہرۂ سیمیں اپنے گھر میں لے گیا۔ اس مکر ہائی نے بھی بساط بازی لپیٹی۔ شہزادے اپنے مکان پر آئے۔

دوسرے روز جب آفتاب سیاحوں کی طرح مغرب کی منزل میں پہنچا اور ماہتاب بادشاہوں کی مانند سپاہ انجم کو لئے تختِ فیروزہ رنگ پر رونق بخش ہوا۔ شہزادے اسی آن بان سے اس کے یہاں آئے اور بہ دستور طلا کی چوکیوں پر بیٹھے۔ حور لقا لونڈیاں خدمت میں حاضر ہوئیں اور بھانت بھانت کا کھانا سونے روپے (چاندی) کے خوانوں میں لا دسترخوان پر چن دیا۔

بعد تناول طعام تختۂ نرد منگوا کر دس لاکھ روپے کی بازی مقرر کر کے کھیلنے لگے۔ غرض اس رات سب مال و متاع، نقد و جنس، ہاتھی، گھوڑے، اونٹ وغیرہ جس قدر کہ رکھتے تھے، ہار گئے۔ تب اس مکارہ نے بازی سے ہاتھ کھینچ کر کہا: ''اے جوانو! تمہارا سرمایہ آخر ہو چکا، اب بساط بازی لپیٹو، اور بادو گوش و بینی اپنے گھر کی راہ لو۔''

شہزادوں نے کہا کہ اب کی بار ہم اپنے طالع کے زر کو امتحان کی ترازوں (ترازو) میں تولیں۔ اگر ہمارے بخت کا پلّہ جھکے تو اپنی ہاری ہوئی جنس سب تجھ سے پھیر لیں۔ نہیں تو ہم چاروں تیرے فرمان دار غلام ہو کر رہیں۔

جب یہ قول و قرار ٹھہرا تب اس اچھال چھکا نے طرفۃ العین میں وہ بھی بازی جیت لی اور سب اسباب نقد و جنس ان کا اپنی سرکار میں داخل کیا اور ان کو قیدیوں کے سلسلے میں کہ ویسے سیکڑوں تھے، بھیج دیا۔ لشکر و سپاہ و رفیق ان کے گل خزاں زدہ کی پنکھڑیوں کی مانند درہم برہم ہو گئے۔

تاج الملوکؔ نے دل میں مشورت باندھی کہ اب کچھ ایسا کیا چاہئے جو ان کی خلاصی کا موجب ہو اور میرا کام بھی نمایاں ہو۔ دل میں سمجھ سمجھا شہر میں آیا اور ایک امیر کے در دولت پر جا کر دربانوں کو کہا۔ مسافر ہوں۔ بے خانماں۔ کسی عمدہ قدر دان کو ڈھونڈھتا ہوں۔ تمھارے صاحب کا خلقِ پسندیدہ از بسکہ مشہور ہے۔ گر اپنی بندگی میں بندے کو نوازیں تو بہ دل و جان بجالاؤں۔

ان میں سے ایک نے امیر کی خدمت میں جا کے شہزادے کی کیفیت عرض کی۔ فرمایا:

''اسے حاضر کر!''

جوں وہ آیا، امیر نے اس کے منہہ کو دیکھ کر کہا کہ یا الٰہی! کیا آفتاب چوتھے آسماں سے انسان کے قالب میں آیا یا کوئی غلمان بہشت بریں سے زمیں پر اترا؟

بیت

پیشانیِ نازنین پہ اس کی چمکے تھا ستارۂ بلندی

غرض کہ امیر نے اس کو اپنی خدمت میں رکھا اور ہر روز مہربانی کی نظر اس کے حال پر زیادہ کرتا۔

رانی کیتکی کی کہانی

انشاء اللہ خاں انشاء

(۱۷۵۲ء - ۱۸۱۷ء)

رانی کیتکی کی کہانی

یہ وہ کہانی ہے جس میں ہندوی کے چھٹ اور کسی بولی کا میل نہ پُٹ

سر جھکا کر ناک رگڑتا ہوں اُس اپنے بنانے والے کے سامنے، جس نے ہم سب کو بنایا اور بات کی بات میں وہ کر دکھایا، جس کا بھید کسی نے نہ پایا:

آتیاں جاتیاں جو سانسیں ہیں
اس کے بن دھیان سب یہ پھانسیں ہیں

یہ کل کا پتلا جو اپنے اُس کھلاڑی کی سُدھ رکھے تو کھٹائی میں کیوں پڑے اور کڑوا کسیلا کیوں ہو؟ اس پھل کی مٹھائی چکھے جو بڑوں سے بڑے اگلوں نے چکھی ہے۔

دیکھنے کو تو آنکھیں دیں اور سننے کو یہ کان دیے
ناک بھی اونچی سب میں کر دی مورتوں کو جی جان دیے

مٹی کے باسن کو اتنی سکت کہاں جو اپنے کمہار کے کرتب کچھ تاڑ سکے۔ سچ ہے، جو بنایا ہوا ہو، سوا اپنے بنانے والے کو کیا سراہے اور کیا کہے! یوں جس کا جی چاہے، پڑا بکے۔

سر سے لگا پاؤں تک جتنے رونگٹے ہیں، جو سب کے سب بول اٹھتیں اور سراہا کریں اور اتنے برسوں اسی دھیان میں رہیں، جتنی ساری ندیوں میں ریت اور پھول پھلیاں کھیت میں ہیں، تو بھی کچھ نہ ہو سکے، کراہا کریں۔

اس سر جھکانے کے ساتھ ہی دن رات جپتا ہوں اُس داتا کے بھیجے ہوئے پیارے کو جس کے لیے یوں کہا ہے: ''جو تو نہ ہوتا میں کچھ نہ ہوتا'' اور اس کا چچیرا بھائی جس کا بیاہ اسی کے گھر ہوا، اُسی کی سُرت مجھے لگی رہتی ہے، میں پھولا اپنے آپ میں نہیں سماتا اور جتنے ان کے لڑکے بالے ہیں، انھیں کی یہاں پر چاہ ہے اور کوئی ہو کچھ میرے جی کو نہیں بھاتا۔ مجھے اس گھرانے کے چھٹ کسی لے بھاگ اُچک چور ٹھگ سے کیا پڑی؟ جیتے مرتے انھیں سبھوں کا آسرا اور ان کے گھرانے کا رکھتا ہوں، تیسوں گھڑی۔۔۔

ڈول ڈال ایک انوکھی بات

ایک دن بیٹھے بیٹھے یہ بات اپنے دھیان میں چڑھی، کوئی کہانی ایسی کہیے جس میں ہندوی کے چھٹ اور کسی بولی کی پُٹ نہ ملے۔ تب جا کے میرا جی پھول کی کلی کے روپ سے کھلے۔ باہر کی بولی اور گنواری کچھ اس کے بیچ نہ ہو۔

اپنے ملنے والوں میں سے ایک کوئی بڑے پڑھے لکھے، پرانے دھرانے ڈاگ، بوڑھے گھاگ یہ کھڑاگ لائے۔ سر ہلا کر، منھ تھتھا کر، ناک بھوں چڑھا کر، آنکھیں پھرا کر لگے کہنے: ''یہ بات ہوتی دکھائی نہیں دیتی۔ ہندوی پن بھی نہ نکلے اور بھاکھا پن بھی نہ ٹھُس جائے، جیسے بھلے لوگ اچھوں سے اچھے آپس میں بولتے چالتے ہیں۔ جوں کا توں وہی سب ڈول رہے اور چھانہ کسی کی نہ دبے یہ نہیں ہونے کا!''

میں نے اُن کی ٹھنڈی سانس کی پھانس کا ٹھوکا کھا کر، جھنجھلا کر کہا: ''میں کچھ ایسا بڑھ بولا

نہیں، جورائی کو پربت کر دکھاؤں اور جھوٹ سچ بول کر انگلیاں نچاؤں اور بے سری، بے ٹھکانے کی الجھی سلجھی تانیں لے جاؤں، جو مجھ سے نہ ہوسکتا، تو بھلا یہ بات منھ سے کیوں نکالتا؟ جس ڈھب سے ہوتا، اس بکھیڑے کو ٹالتا۔"

اب اس کہانی کا کہنے والا یہاں آپ کو جتاتا ہے اور جیسا کچھ لوگ اُسے پکارتے ہیں کہ سناتا ہے۔ دہنا ہاتھ منھ پر پھیر کر آپ کو جتاتا ہوں، جو میرے داتا نے چاہا تو وہ تاؤ بھاؤ اور آؤ جاؤ اور کود پھاند اور لپٹ جھپٹ دکھاؤں، جو دیکھتے ہی آپ کے دھیان کا گھوڑا، جو بجلی سے بھی بہت چنچل، اچپلاہٹ میں ہے، ہرنوں کے روپ میں اپنی چوکڑی بھول جائے۔ چوتکا:

گھوڑے پر اپنے چڑھ کے آتا ہوں میں
کرتب جو ہیں سو سب دکھاتا ہوں میں
اُس چاہنے والے نے جو چاہا تو ابھی
کہتا جو کچھ ہوں کر دکھاتا ہوں میں

اب آپ کان رکھ کے، سنمکھ ہو کے، ٹک ادھر دیکھئے، کس ڈھب سے بڑھ چلتا ہوں اور اپنے ان پھول کی پنکھڑی جیسے ہونٹوں سے کس کس روپ کے پھول اگلتا ہوں۔

فسانۂ عجائب

رجب علی بیگ سرور

(۱۷۸۶ء - ۱۸۶۹ء)

الحمد للّٰہ الذی خلق من الماء بشرا فجعلہ نسبا و صھرا و کان ربک قدیرا O سزاوارِ حمد وثنا خالق ارض وسما جل وعلی صانع بے چون وچرا ہے۔ جس نے رنگ بے ثباتی سے بایں رنگارنگی تختہ چمن دنیا پراز لالہ وگل جز وکل بنایا اور باوجود ترس باغبان وبیم صیاد ولولہ رخ گل بلبل کو دے کر دام محبت میں پھنسایا اور عاشق باوفا ومعشوق پر دُغا کو ایک آب وگل سے خمیر کر کے پردۂ غیب سے بعرصۂ شہود لایا ایک خلقت سے دو طرح کا جلوہ دکھایا اور انسان ضعیف بنیان کو اشرف المخلوقات فرمایا۔ جلوۂ حسن بتاں بخدا شیفتگی کا بہانہ ہے۔ نالۂ بلبل شیدا گوش گل رعنا کا ترانہ ہے۔ اس کی نیرنگیوں کے مشہور فسانے ہیں۔ ہم اس کی قدرت کاملہ کے دیوانے ہیں صفت اس کی محال ہے۔ زبان اس کی تقریر سے لال ہے۔ جس کی شان میں فجر صادق یہ فرمائے دوسرا اس عہدے

سے کب برائے۔ ما عرفناک حق معرفتکO

نعت سرور کائنات محبوب خدا برگزیدۂ انبیا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

بعد حمد خالق جن و بشر حاکم قضا و قدر مبدأ شام طالع سحر نعت سید کائنات خلاصۂ موجودات بہترین عالم برگزیدۂ نوع بنی آدم کی ہے۔ جس کے چراغ ہدایت کی روشنی سے تیرہ بخت گم گشتہ کوچہ ضلالت براہ راست آئے۔ بتوفیق رفیق اور مدارج تحقیق کیا کیا مرتبے بلند پائے اور منحرف کور باطنوں کو فہم ناقص کی کجی اور زعم فاسد نے کیسے کیسے روز سیہ دکھائے۔ اس کے حق میں یہ حکم آیا ہے۔ بچشم غور دیکھو تو کسی اور نے بھی یہ رتبہ پایا ہے۔ لولاک لما خلقت الافلاک۔

سر حلقۂ اولیں خاتم المرسلین مظہر صنعت کریم احمد بے میم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم وآلا الطاہرین واصحابہ المکرمین وسلم کوئی شاعر ان کی شان میں کہتا ہے:

پیش از ہمہ شاہان غیور آمدۂ　　ہر چند کہ آخر بہ ظہور آمدۂ
ای ختم رسل قرب تو معلوم شد　　دیر آمدۂ زراہ دور آمدۂ
(لااعلم)

اس مشت خاک کا کیا فہم و ادراک جو شمہ صفات ذات بابرکات زبان پر لائے جو عجز میں نہ درآئے کام و زبان ناکامی سے فوراً جل جائے اور منقبت امیر المومنین امام المتقین یکہ تاز میدان لافتی خلاصہ مضمون سورۂ ھل اتی یہی کافی ہے اور جسے پیمبرؐ نے کہا لحمک لحمی و دمک علی منی و انامنه اور مدح اہل بیت رسالت کہ ولا ان کی ایمان کی دلیل ہے اور محبت ان کی ہر فرد بشر کو واجب باین حدیث جلیل ہے۔ مثل اهل بیتی کمثل سفینة نوح من رکبها نجی و من تخلف عنها غرق و هویO

مذکور شاہ غیور قباد شوکت نوشیروان معدلت غازی الدین حیدر بادشاہ غازی وارث دودمان سعادت

پس از حمد خدا و نعت سرور انبیاً لازم و ضرور ہے کہ مدح والی ملک بیان کرے قولہ تعالی اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول و اولی الامر منکم اگرچہ صفت شاہ زماں گدا کو بیان کرنا چھوٹا منہ بڑی بات ہے مگر نام نامی توصیف ذات گرامی اس کی وسیلۂ توقیران تحریر کا اور مفتاح باب اس پریشان تقریر کا جان کر شمۂ از شمائل و ذرہ از خورشید خصائل رقم کرتا ہوں۔ شاہ کیوان بارگاہ بلند

مرتبہ عالی جاہ سر حلقہ شاہان والا تبالہ جم شوکت فریدوں فر سلیمان اقتدار کشور گیر ملک ستاں خدیو گیہان ابوالمظفر معزالدین شاہ زمن غازی الدین حیدر بادشاہ غازی خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ وایدہ اللہ بالنصر د الظفر جل جلالہ، اگر معرکہ رزم یا صحبت بزم اس کی انشا کر دن صفحۂ دنیا پر نہ لکھ سکوں دم رزم رستم وسام و نریماں مثل پیر از ل لرزاں اور وقت سخا اور عطائے زر و مال حاتم کے ہاتھ میں کاسۂ سوال بزم طرب میں زہرہ و مشتری سر گرم نغمہ پردازی و عربدہ سازی ہنگام عتاب و خشم مریخ مستعد جلادی و بیدادی یہ ادنیٰ عنایت ہے۔ (بیت)

چناں بموسم سرما دو شالہا بخشید
کہ گرم شد ہمہ بنگالہ سرد شد کشمیر

بسکہ سحاب بخشش اس بحر عطا کا روز و شب مزرعۂ کہ دمہ پر بارش رکھتا ہے شہر میں سالہا کان مشتاق سائل کی صدا کا در دیدہ ندیدہ صورت گدا کا عدل یہ کہ ہاتھی چیونٹی سے ڈرتا ہے۔ شیر بکری کی اطاعت کا دم بھرتا ہے۔ بچشم اس کے عہد دولت میں ہزاروں نے دیکھا۔ بکری شیر کے بچے کو دودھ پلاتی تھی کنار میں شفقت سے سلاتی تھی۔ باز تیز پرواز بچہ کنجشک کا دمساز اور نگہبان بلی کی عادت جبلی یہ کہ کبوتر سے ہراساں دوددل اندوہ ناک روزن ہر خانہ سے مسدود شحنہ داد رخنہ بندی فساد و موجود اللہ تعالیٰ اس امید گاہ عالم و عالمیان کو اپنے حفظ وامان میں سلامت رکھے خواہ اس والا جاہ کے عیش و شادی مدام اور دشمن روسیاہ برنج نامرادی گرفتار آلام رہیں۔ بحق رب ذوالمنن بتصدق پنجتن۔

بیان مولف دربار لکھنؤ و ذکر صنعت مردمان خجستہ رو و تذکرۂ ہر صاحب علم وہ کمال علی قدر حال و نمونۂ مکانات شہر

بیپنبہ دہان ہیچمدان محرر داستان مقلد گذشتگان سراپا قصور رجب علی بیگ تخلص سرور متوطن حال خطہ بے نظیر دل پذیر رشک گلشن جناں مسکن حور و غلمان جائے مردم خیز۔ باشندے یہاں کے ذکی فہیم عقل کی تیز اگر دیدۂ انصاف و نظر غور سے اس شہر کو دیکھے تو جہان کے دید کی حسرت نہ رہے آنکھ بند کرے۔ (شعر)

سنا رضواں بھی جس کا خوشہ چین ہے
وہ بیشک لکھنؤ کی سر زمیں ہے

سبحان الله وبحمده عجب شہر گلزار ہے ہر گلی کوچہ دلچسپ باغ و بہار ہے ہر شخص اپنے طور پر باوضع قطع دار ہے۔ دورویہ بازار کس انداز کا ہے۔ ہر دکان میں سرمایہ ناز و نیاز کا ہے۔ ہر چند ہر محلے میں جہاں کا ساز و سامان مہیا ہے۔ پر اکبری دروازے سے جلو خانے اور پکے پل تک کہ صراط مستقیم ہے کیا جلسہ ہے۔ نان بائی خوش سلیقہ شیر مال کباب نان نہاری جہاں کی نعمت اس آبداری کی جس کی بو باس سے دل طاقت پائے دماغ معطر ہو جائے فرشتہ گزرے تو سونگھے کیسا ہی سری ہو ذرا نہ دیر ہو دیکھے سے بھوک لگ آئے۔ وہ سرخ سرخ پیاز سے نہاری کا بگھار سریلی جھنکار، شیر مال شنگرف کے رنگ کی خستہ بھربھری ایکبار کھائے۔ نان نعمت کا مزہ پائے۔ تمام عمر ہونٹ چاٹتا رہ جائے۔ کباب اس آب و تاب کے کہ مرغ و ماہی کا دل سیخ آہ پر حسرت محرومی سے کباب ادرک کا لچھا میاں خیر اللہ کی دکان کا بال سے باریک کترا اضم نایاب حسینی کے حلوہ سوہن پر عجیب جوبن اس کی شیرینی کی گفتگو میں لب بند، جہاں کو پسند پپڑی دبیز بسی بسائی لذیذ ہونٹ سے کھائے۔ دانت کا اس پر تمام عمر دانت رہے دانت لگانے کی نوبت نہ آئے۔ جوزی حبشی اہل ہند کو مرغوب دودھیا شیر خوارہ نوش کر جائے۔ ہر کنجڑن کی وہ تیکھی چتون آدمی صورت دیکھتا رہے۔ رعب حسن سے بات نہ کر سکے سن کر نیں پریزاد سرو قامت رشک شمشاد دوکان میں انواع و اقسام کے میوے قرینے سے چنے روز مرے محاورے ان کے دیکھے نہ سنے کبھی کوئی پکار اٹھی میاں ٹکے کو ڈھیر لگا دیا ہے۔ کوئی موزوں طبیعت یہ فقرہ سناتی مزہ انگور کا ہے۔ رنگتروں میں کسی طرف یہ صدا آتی ہے۔ گنڈیریاں ہیں پونڈے کی۔ ایک طرف تنبولی سرخروئی سے یہ رمز و کنایہ کرتے بولی ٹھولی میں چبا چبا کر ہر دم یہ دم بھرتے مگھیے کا منھ کالا ہو با گردِ کر ڈالا۔ عبیر ہے نہ گلال ہے۔ کتھے چونے سے ادھی میں مکھڑا لال ہے۔ گلیوں میں گجر دم یہ آواز آتی شیر مال ہے گھی اور دودھ کی، مفلس کا دل اچاٹ ہے۔ ٹکوں کی چاٹ ہے کدھر لینے والے ہیں ٹمش کی قلفیاں اور کھیر کے پیالے ہیں، کیا خوب بھنے بھربھرے ہیں چنے پرمل اور مرمرے ہیں۔ جیٹھ، بیساکھ کی وہ گرمی جس میں چیل انڈا چھوڑتی ہے۔ دو پیسے کو برف کی قلفی جمی دو کھائے بدن تھرائے زیادہ ہو کا کرے لقوہ فالج میں مرے۔ سرچوک ہمیشہ شانے سے شانہ چھلا نسیم و صبا کو سیدھا رستہ نہ ملا شیخ کو لی کی مٹھائی جس نے کھائی جہان کی شیرینی سے دل کھٹا ہوا۔ بنارس کا کھجلا بھولا متھرا کے پیڑے کا ٹھٹھا ہوا برفی کی نفاست بو باس در

دراپن نقرئی ورق کا جوبن کسی اور شہر کا ب دار اگر دیکھ پائے یا ذائقہ لب پر آئے زندگی تلخ ہو ہاتھ کاٹ کاٹ کر کھائے، امرتی مسلسل کا ہر پیچ وتاب دیتا یاقوتی مفرح کا مزہ جب منھ میں رکھا اصل تو یہ ہے۔ عسل مصطفیٰ جنت کی نہر کا حلق سے اترا۔ پراچیوں کی گلی کی کھجور لذت ٹپکتی ذائقے میں چور بہتر از انگور نہایت آب وتاب ہم خرما ہم ثواب، بالائی نورا کی دکان پر جب نظر آئی بے قند وشکر شکر کر نور علی نور کہہ کر چھری سے کاٹ کر کھائی۔ مداریے حقے وہ ایجاد ہوئے کسگر ایسے استاد ہوئے کہ جب تڑا قاان کا سنا پیچوان کا دم بند ہوا، پتھانا کا تمبا کو مشک وعنبر کی خوشبو جس نے ایک گھونٹ کھینچا اسی کا دم بھرنے لگا۔ علی الخصوص مرد تماش بین کے واسطے یہ شہر خراد ہے۔ یہاں ہر فن کا استاد ہے۔ سینکڑوں گھامڑ بد عقل کندۂ ناتراش اطراف وجوانب سے آئے عشرے میں چھل چھلا وضعدار ہوگئے، جب ابوتراب خان کے کڑے میں جامیاں خیراتی سے کسی کی خیرات میں خط بنوایا بارہ برس کے سن کا گالوں سے مزہ آیا چار پہر کھونٹی ٹٹولی پتا نہ پایا۔ کاتب قدرت کا لکھا مٹاتا ہے۔ ایسا خط بناتا ہے۔ سید حسین خاں کے دروازے پر عبداللہ عطر فروش کی دکان جائے نشست ہر وضع دار جوان ہے دو پیسے میں بیلے چنبیلی کا تیل ریل پیل فتنہ بپا کرنے والا ایسا ملا کہ سہاگ کا عطر گرد ہوا، جون پور سے دل سرد ہوا عطر کی روئی رکھی کان میں پھر جا بیٹھا کسی افیونی کی دکان میں سفید سفید چینی کی پیالیاں خوبصورت رنگتیں نرالیاں افیون فیض آبادی لاکے کی وہ رنگین جس نے تریاگ مصر کے نشے کرکرے کئے زیادہ پی جانے والوں کو جان کے لالے ہوئے ایسے متوالے ہوئے جھگڑا بادۂ ارغوانی وزعفرانی کا پیدا تبدیل ذائقۂ کو فرنی کے خوانچے نقرئی ورق جمے پستے کی ہوائی چھڑکی ہوئی مہیا چسکی پی ایک دم کے بعد دم حقے کا کھینچا آنکھوں میں سرور موجود ہوا وہاں سے بڑھا کان میں آواز آئی۔ بیلے کے ہار میں شوقیں البیلے کو پہن لے چلا جا فرنگی محل کے میلے کو، جب یہ سج بنی بگڑا نچوں کے بل چلا یہ پھولا کہ وطن کی چال ڈھال راہ ورسم بھولا اکثر باہر سے آیہ دھج بنا جون پور کے قاضی ہونے کو مفتی میں راضی ہوگئے۔ برسات کا اگر موسم ہے شہر کا یہ عالم ہے، ادھر مینہ برسا پانی جابجا بہہ گیا۔ گلی کوچہ صاف رہ گیا۔ ساون بھادوں میں زردوزی جوتا پہن کر پھرے کیچڑ تو کیا مٹی نہ بھرے فصل بہار کی صنعت پروردگار کی قدرت رضوان جن کا شائق دیکھنے کے لائق، روز عیش باغ میں تماشے کا میلہ ہر وقت چین کا جلسہ موتی جھیل کا پانی چشمۂ زندگانی کی آب وتاب دکھاتا پیاسوں کا دل لہراتا سڑک

کے درختوں کی فضا جدا کھجور موجیں مارتا ہار سنگار کے جنگل میں لوگوں کا جمگھٹا رنگا رنگ کی پوشاک آپس کی جھانک تاک تخت لالہ و نافرمان جن پر قربان، بندہائے خاص کی سبک روی خرام ناز ہر قدم پر کبک دری چال بھول کر جبین نیاز رگڑتی شاخ سروان کے روبرو نہ اکڑتی شائق ہزار در ہزار شمع پر پروانوں کا عاہم غول کے غول باہم آم کے درختوں میں ٹپکا لگا خاص جھولا وہیں پڑا، جھولنے والوں پر دل ٹپکا پڑتا محبت کے پینگ بڑھتے دیکھنے والے درود پڑھتے باغ مین کوئل پپیہے مور کا شور جھولے پر گھٹا رہی وہ بھی گھنگھور ساون بھادوں کے جھولے وہ رنگیں جھولنے والے دشت غربت میں یہ جلسہ جو یاد آجاتا ہے۔ دل پاش پاش ہوجاتا ہے۔ کلیجہ منھ کو آتا ہے، نہ کہ کان پور کی برسات ہیہات ہیہات دخل کیا دروازے سے باہر قدم دھرے اور پھسل نہ پڑے گلی میں پاؤں رکھا۔ کیچڑ کا چھپکا سر پر پہنچا دو اس فصل میں باہم نہ دیکھے مگر چہلے کے پھنسے اور جنہیں سواری کا مقدور نہیں دخل کیا جو وہ جائیں کہیں، ان کے حق میں برسات حوالات گھر جیل خانہ نہ کہیں جانا نہ آنا اگر خواب میں کہیں نکل گئے تو چونک پڑے کہ پھسل گئے اور جو بازاری کاروباری ہیں ان کا یہ نقشہ دیکھا۔ ہاتھ میں جوتیاں پائچا چڑھا کیچڑ میں لت پت یہاں گرے وہاں گرے۔ خدا خدا کر جیتے گھر پھرے اور جو شیخی کے مارے ننگے پاؤں نہ نکلے تو — (شعر)

دیکھی ہے یہ رسم اس نگر میں
جوتا ہے گلی میں آپ گھر میں

پھر بر سر مطلب آیا خاص بازار کہ شہر وسیع و خوش قطع ہے۔ اس کے نقشے سے مانی و بہزاد نے خار کھایا شبیہ کشی تو کیا خاک کہ خاک نہ کھینچا ہاتھ تھرایا۔ کوٹھیاں فرح بخش و دل کشا برج ہر ایک جہان نما سلطان منزل واستری منجن نشاط افزا تو بہ شکن انسان کو دیکھ کر سکتہ ہو جائے کام ان کا وہم و قیاس میں نہ آئے سر راہ کی بارہ دری جواہر سے جڑی پری کی صورت کی، قریب نہر جاری تکلف کی تیاری، پائیں باغ اس کا جس نے دیکھا باغ ارم سمجھا، سوسن صفت ہزار زبانیں بہم پہونچیں تعریف نہ کر سکا۔ گونگے کا سپنا ہوا رومی دروازہ اس رفعت و شان کا ہے گزرگاہ ایک جہان کا ہے اگر اس پر چڑھ جائے بام فلک پست معلوم ہو فرشتوں کا مشورہ کان میں آئے۔ سپہر اولین اس کی زمین ہے۔ شش جہت میں دوسرا نہیں ہے مسجد انتخاب ہے۔ امام باڑہ لاجواب ہے۔ مقبرے عالیشان وہ نادر

مکان کہ فلک بدیدۂ انجم نگراں ہے ان کے نظیر کی جستجو میں مشعل مہہ خورشید روز وشب روشن کئے کو بکو سرگرداں ہے۔ اگر پاؤں پھیلانے کی جگہ ان میں ہاتھ آئے سر دست مرجانے کو جی چاہے گومتی کے انداز سے نہر کی کیفیت نظر آتی ہے۔ طبیعت لہراتی ہے۔ دورویہ آبادی عمارت کہیں رمنے کسی جا باغ بنے صبح وشام وہ بہار نظر آتی ہے کہ شام اودھ اور بنارس کی سحر بھول جاتی ہے۔ شہر نفیس مجمع رئیس ہر فن کا کامل یہاں حاصل ہے۔ خوشنویس حافظ ابراہیم صاحب سا اس قطع کا قطعہ لکھا جو میر علی یا آغا جیتے ہوتے اپنے لکھے کو روتے اشک حسرت سے وصلیاں دھوتے۔ مرزائی صاحب کا یہ حال تھا کوئی پرچہ ان کا ان کی نظر پڑ جاتا لبریز بریذ کہتا یاقوت رقم ہیرا کھاتا۔ مرثیہ خواں جناب میر علی صاحب نے وہ طرز نو مرثیہ خوانی کا ایجاد کیا کہ چرخ کہن نے مسلم الثبوت استاد کیا۔ علم موسیقی میں یہ کمال بہم پہونچایا اس طرح کا دھریت خیال پٹہ گایا اور بتایا کہ کبھی کسی نایک کے وہم وخیال میں نہ آیا تھا ایک رنگین احاطہ کھینچا ہے جو اس میں اایا پھولا پھلا وہ ان کا پیرو ہوا اور جس نے ڈھنگ جدا کیا وہ ٹکسال باہر بدرنگ ہوا۔ اگر تان سین جیتا ہوتا ان کے نام پر کان پکڑتا بھیک مانگ کھاتا مگر نہ گاتا۔ ہزاروں شاگرد جگت استاد ہوا مولوی سب میں پریزاد ہوا امیروں میں حسین علی خاں بلبل ہزار داستاں خوش الحان مرچیہ گو بے نظیر میاں دل گیر، صاف باطن نیک ضمیر خلیق فصیح مرد مسکین مکروہات زمانہ سے کبھی افسردہ نہ دیکھا اللہ کے کرم سے ناظم خوب دبیر مرغوب سکندر طالع بصورت گدا بار احسان اہل دول کا نہ اٹھایا۔ عرصۂ قلیل میں مرچیہ سلام کا دیوان کثیر فرمایا۔ طبیب ہر ایک مسیحائی کرتا ہے۔ قم باذنی کا دم بھرتا ہے جسے دیکھا بقراط سقراط جالینوس زماں ہے۔ اس معنی میں یہ خطہ رشک زمین یونان ہے۔ میرک جان صاحب پیرنے کے فن سے ایسے آشنا ہوئے کہ مردم بحر وبر سرگرم ثنائے۔ شاعر زباندان ایسے کہ عرفی اور خاقانی کی غلطی بتائی فردوسی وانوری کی یاد بھلائی۔ شیخ امام بخش ناسخ نے یہ ہندی کی چندی کی اور روز مرے کو ایسا فصیح اور بلیغ کیا کہ کلام سابقین منسوخ ہوا۔ فصحائے شیراز واصفہان اس سیف زبان کا لوہا مان گئے۔ اپنے قبح پر منفعل ہوئے اس زبان کا حسن جان گئے۔ زمین شعر کو آسمان پر پہنچایا۔ سیکڑوں کو استاد بنایا، خواجہ حیدر علی آتش بیانی شرر افشانی سے دل جلوں کے سینے میں سوز وگداز ہے۔ مرد قانع شاعر ممتاز ہے فرنگی محل کا حال کیا لکھوں کہاں زبان ودست کو یارا جو شمہ لکھتا مولوی فاضل عدیم المثال ہر شخص جمیع علوم کا استاد کتب درسی ابتدا سے

انتہا تک یا د منقول و معقول میں دقیقہ باقی نہ رہا۔ ریاضی کے ریاض سے آسمان کو زمین کر دیا۔ مولوی انوار کا پر تو فیض جہان میں روشن مولوی مبین دوربین سراج انمن مولوی ظہور اللہ سبحان اللہ ایسے فقیہہ محقق کہاں ہوتے ہیں۔ یہی لوگ نادر الزمان ہوتے ہیں۔ ادھر رکن دین بلا کد میر سید محمد مجتہد مستند مرزا کاظم علی متقی اخوند محمد رضا رضائے خدا کا جویا عالم قرآن ہمہ دان کسی علم میں عاری نہیں روئے زمین پر آقا محمد تبریزی سا قاری نہیں مگر وہ جو مثل ہے۔ نیک اندر بد یہ اصل ہے۔ لب معشوق مولویوں سے وہ رنڈیاں پری شمائل زہرہ پیکر مشتری خصائل حسن و نازہ انداز سحر کرامات غمزہ عشوہ اداگات بانکی کہ ہاروت اور ماروت تو معاذ اللہ اگر سب فرشتے عرش سے فرش خاک پر آئیں ان کے چاہ میں لکھنؤ کے کنویں بھر جائیں گھڑی بھر ان سے زانو بزانو بیٹھے تو یہ نصوحا ٹوٹے ان کا دروازہ نہ چھوٹے۔ لولی چرخ ان پر نثار ہے۔ ہر ایک حور کردار ہے، خوش مزاج مردم شناس روزمرہ شستہ دم تقریر رمز و کنایہ اس کوچے کے فیض سے انسان آدمیت بہم پہنچاتا ہے۔ تراش خراش اثر صحبت سے کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے۔ کلانوت قوال بے مثال چھجو خاں غلام رسول سب کو موسیقی میں کمال حصول، شوری کی منہ زوری کی دھوم ہے۔ پے کا موجد ہوا سب کو معلوم ہے۔ بخشو اور سلاری نے طبلہ ایسا بجایا کہ پکھاوج کو شرمایا۔ پتنگ ایسا بنا ایسا لڑا کہ نزدیک و دور مشہور ہے۔ ستر بہتر تار ڈور کا پتنگ خیراتی یا چھنگا کے ہاتھ کا لڑائی کی گھات رستم کی عافیت تنگ کرنے والا منحنی ہاتھ پاؤں پر مولوی عمدو نے ایسا لڑایا۔ عمداً اتنا بڑھایا کر وبیوں سے عبادت چھوٹی دوڑ دوڑ کر ڈور لوی آنکھ بچا کر پیٹا توڑا فرشتے خاں کا پتنگ نہ چھوڑا۔ مردان بیگ مانجھا دینے والا دیکھا نہ سنا۔ غرض کہ جو چیزیں یہاں نئی بنیں اور ایجاد طبیعت سے کاریگروں نے نکالیں۔ سلف سے آج تک نہ ہوئی تھیں۔ اوگی زردوزی ایسی بنی ایسی باریکی چھنی کہ باہر بند و اس کے پٹے جو پائیں بجائے جیغہ سر پیچ سر پر لگائیں۔ جو تا خرد نوک کا ببر علی نے اس نوک جھونک کا بنایا کہ جہان کو پسند آیا۔ آرام پائی جس کے ہاتھ آئی۔ دل نے چین پایا چالیس سال دیکھ بھال کی ایسا شہر یہ لوگ نظر سے نہ گزرے اور تو اور شہدی پیر بخار کا نما سا سید الشہدا کا شیدا برس روز میں پیدا کیا۔ عشرہ محرم میں محتاجوں کو نذر حسین کھلا دیا۔ یہ یک رنگ مزاج میں سمائی تمام عمر جوا کھیلا دوئے کے داؤ پر ادھی نہ لگائی ایک روپیہ ہوا خواہ سو کہہ دیا۔ پو سینکڑوں داؤ منجھے گئے منہ سے نہ پنجے گئے۔ وہاں بھی اک چوک لگا رہتا ہے۔ آدمی کے چھکے چھوٹ جاتے

ہیں۔ جب وہ لوگ نظر آتے ہیں۔ مشائخ فقیروں کے مزار خوب خواب راحت میں آسودہ سالک ومجذوب شاہ مینا، شاہ پیر محمد شاہ خیر اللہ ایک سے ایک سبحان اللہ ظاہر مردہ حقیقت میں جیتے ہیں اشیائے لطیف کھاتے پیتے ہیں۔ مولوی عبدالرحمٰن برگزیدۂ عالم باعمل درویش اکمل خواجہ باسط اور میر نصیر جن کا عدیل نہ نظیر خواجہ حسین وحسن سرکردہ انجمن طبیعت بسکہ مصروف باختصار ہے۔ ایک ایک فقرہ لکھا ہے وگرنہ ان بزرگوار کی صفت میں کتابیں تحریر کرے تو بجا ہے۔۔۔ مگر (شعر)

کار دنیا کسے تمام نہ کرد

ہر چہ گیرید مختصر گیرید

اس پر عمل کیا۔ منصف سے انصاف طلب ہیں۔ ہٹ دھرم سے کیا کہیں جھوٹے کے روبرو سچا روبیٹا ہے بالغرض معترض کہے یہ لوگ کہاں کے تھے۔ تو یہ جواب شافی کافی ہے کہ یہ شہر ایسا تھا۔ جیتے جی یہاں سے نہ نکلے مرگئے پر یہیں رہے اور یوں تو۔۔۔ (مصرع)

؎ کس نگوید کہ دوغ من ترش است

جو گفتگو لکھنؤ میں کو بکو ہے کسی نے کبھی سنی ہو سنائے لکھی دیکھی ہو دکھائے عہد دولت بابر شاہ سے تا سلطنت اکبر ثانی کہ مثل مشہور ہے۔ نہ چولہے میں آگ نہ گھڑے میں پانی دہلی کی آبادی ویران تھی۔ سب بادشاہوں کے عصر کے روزمرے لہجے اردوئے معلیٰ کی فصاحت تصنیف شعرا سے معلوم ہوئی۔ یہ لطافت اور فصاحت وبلاغت کبھی نہ تھی نہ اب تک وہاں ہے۔ قطع نظر اس سے لوگ اس خلقت کے کرہ سے کھوئیں اور جلسہ کریں۔ چنانچہ ایک بندے کے شفیق جگت آشنا مرزا محمد رضا مجمع خوبی از پا تا فرق تخلص برق فی الحقیقت کلام بلاغت نظام ان کا صاعقہ کرمن ہستی حاسد ہے۔ بھائی بند شاعروں کا بازار ان کے روبرو کاسد ہے۔ جوان خوش رو بہادر آشنائے بامزہ نیک خوش ماہ صحبت مشاعرہ بدولت خانہ مرزا معین ہے۔ رئیس امیر صغیر کبیر تشریف لاتے ہیں۔ اس مکان وسیع میں آدمیوں کی کثرت سے جگہ کی قلت ہوتی ہے۔ ہوا کشمکش سے بار پاتی ہے۔ جب پنکھے کی سعی اٹھاتی ہے۔ سخن سنج بے رنج خوش گو نازک فہم باریک بین نیک خو جمع ہوتے ہیں۔ لوگ ان سے وہ لوگوں سے حظ اٹھاتے ہیں۔ تلامذہ مرزائے ممدوح خدمت کو حاضر۔ کورے کورے مدارے دم بدم گوریاں ورق لگی کتھا پسا چونا سنگ مرمر کا متواتر قبل از غزل خوانی افیون کا چرچا جاری ہے۔ کوئی پیتا

ہے۔کوئی کھاتا ہے اگر چاہ کسی کو چائے کی ہوتی دودھ پیتے بچے تک شیر چائے موجود کردی۔ ہمیشہ صبح اس شام کے جلسے کی ہوجاتی ہے۔ طبیعت نہیں گھبراتی ہے۔ گھر جانے والوں کو صدائے مرغ سحر ندائے اللہ اکبر آتی ہے۔ ہر چند سب لوگ یہاں کیب قر ہیں مگر یہ بزرگوار زینت شہر ہیں اور لکھنؤ کے جیسے بازاری ہیں۔ کسی شہر کے ایسے ہفت ہزار ہیں۔ دلال مرفہ حال خوش پوشاک چمکے چمکائے اور ملکوں کے سیٹھ کروڑ پتی گاتر میں لنگوٹی یا دھوتی جب بڑا تکلف کیا گاڑھے کا مرزائی پہن لیا کلمی حق کہنے والے کا مدار دار پر ہوتا ہے۔ منصور نگر اس کا محلہ ہے۔ یہ نکتہ بگوش دل و جان سن الحق مر حاسدوں کے خوف سے یہ مضمون مختصر کیا اگر زیادہ لکھتا قصہ ہوتا کہ کوتاہ بیں لکھنؤ کینام سے چڑ جاتے ہین۔ رشک کھاتے ہیں افتراپردازی کرتے ہیں۔ جل مرتے ہیں۔ اچھے آغاز کا نام بخیر ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ مشقت کسی کی بیکار نہیں کھوتا ہے۔ یہ فسانہ بعد دولت شاہ غازی الدین حیدر شروع ہوا تھا اور تمام بعصر سلطان بن سلطان ابوالنصر نصیرالدین حیدر دام ملکہ کے ہوا اللہ یہ عجب شاہ جم جاہ اریکہ نشین ہوا کہ حاتم کا نام صفحہ سخا سے مثل حرف غلط مٹا دیا، فقیروں کو امیر بنادیا، عیش ونشاط کی طرف طبیعت جو آئی ایک ایک ادنیٰ کنجڑن ہفت ہزاریوں سے اعلیٰ بنائی۔ محمد شاہ کی گورتھرائی شہزادیوں کو کہاریوں پر رشک آیا۔ خواصوں کو صاحب نوبت کیا چنڈول سکھپال میں چڑھایا ہزار بارہ سو جلسے والی حوروش برق کردار کبک رفتار نغز گفتار راز پا تا فرق دریائے جواہر میں غرق دست بستہ روبرو کھڑی رہی۔ جہاں کی نعمت ان کے سامنے پڑی رہی۔ اسیلوں کو کروڑوں روپے دیئے پیش خدمتوں نے بادشاہت کے چین کئے قدسیہ محل پر طبیعت جو آئی۔ معارفعت وشان فلک ہفتم پر پہنچائی۔ کئی کرور روپے اس منظور نظر نے صرف کئے خزانے خالی کر محتاجوں کے گھر بھر دیئے ہر وقت راجہ اندر کا جلسہ رہا نہروں میں عطر بہار مکان اس طرح کے بنوائے کہ فلک گردان نے صدقے ہو کر چکر کھائے اندر اس گلشن ارم کہ ایسا باغ اور اس طرح کی کوٹھی چشم و گوش عالم نے دیکھی۔ نہ سنی دواز دہ امام کی درگاہ ایسی بنائی کہ چرخ گرداں کو خواب میں نظر نہ آئی۔ اندرس میں عطر کا حوض چھلکتا رہا۔ تمام شہر مہکتا رہا۔ مغلانیوں نے گوٹے کناری کی کترنوں سے چاندی سونے کے محل اٹھائے خاصے۔ والیوں نے لونگ الائچی زعفران کے اپنے گھروں میں خاصے ڈھیر لگائے۔ مکا خیاط مال دنیا سے مالا مال ہے استغنا کا دم بھرتا ہے۔ سینا تو کیا ٹانکا کم بھرتا ہے۔ بجز غم حسین شہریار کو اندوہ غم

نہیں کون ہے جو اس زمانے میں شاد و خرم نہیں۔ اربعین تک عزاداری ہوتی ہے۔ خلق خدا ماتم حسین میں روتی ہے، لاکھوں روپیہ اس راہ میں صرف ہوتا ہے۔ چالیس شب نہیں سوتا ہے۔ تخم عمل نیک مزرعہ آخرت میں بوتا ہے۔ روز تولد ہر امام و شب وفات جگر بندان خیرالانام لاکھ لاکھ روپے کا صرف ہے۔ اس کی ہمت کے آگے فیاضان گذشتہ پر حرف ہے حسن صورت شوکت و حشمت جاہ و ثروت حبشی دنیا کی خوبیاں ہیں۔ اللہ نے سب دی ہیں، ہر شب شب برات روز عیدیں کی ہیں، سیر دریا کی دفعتہً جو لہر آئی گنگا سے نہر منگائی۔ اس میں بھی غریا نہال کار ندے مالا مال ہو گئے بس کہ خامۂ مولف اختصار رقم ہے۔ جتنا اس کی صفت میں لکھے بہت کم ہے۔ لہٰذا اس غزل پر اختتام کیا یہ جملہ تمام کیا۔

غـــــزل

تا ابد قائم رہے فرماں روائے لکھنؤ — یہ نصیرالدین حیدر بادشائے لکھنؤ

گو ملے جنت بھی رہنے کو بجائے لکھنؤ — چونک اٹھتا ہوں میں ہردم کہہ کے ہائے لکھنؤ

رشک کھا کھا گو فلک مجھ سے چھڑائے لکھنؤ — تب میں جانوں دل سے جب میرے بھلائے لکھنؤ

یا تو ہم پھرتے تھے ان میں یا ہوا یہ انقلاب — پھرتے ہیں آنکھوں میں ہر دم کوچہ ہائے لکھنؤ

انکے استغنا سے کیا کیا آرزو کرتی ہے رشک — جام جم پر تف نہیں کرتے گدائے لکھنؤ

کیوں گمانِ زاغ بلبل کے ترانے پر نہ ہو — یاد آجائیں جو وہ نغمہ سرائے لکھنؤ

ہر محلے سے بچانا جی ہے عیسیٰ کو محال — چھوڑتے جینا نہیں معجز نمائے لکھنؤ

جن و انس و وحش و طائر کیوں نہ سب محکوم ہوں — ہے سلیماں ان دنوں فرمانروائے لکھنؤ

دشت غربت میں کیا برباد وحشت نے تو کیا — دل سے اڑتی ہے کوئی اپنے ہوائے لکھنؤ

یہ رہے آباد یارب تا بہ دور مشتری — میں کہیں ہوں مانگتا ہوں پر دعائے لکھنؤ

بلبل شیراز کو ہے رشک ناسخ کا سرور
اصفہاں اس نے کئے ہیں کوچہ ہائے لکھنؤ

الٰہی بحرمت سید ابرار احمد مختار و بہ تصدق ائمہ اطہار لکھنؤ کو آباد رکھ والی ملک کو یہاں کے کار رما رعیت پرور مسند حکومت پر دل شاد رکھ، جب تک گنگا جمنا میں پانی ہے یہ خط دل چسپ فرح آفزا

آبادرہےفرد:

الٰہی لکھنؤ بستار ہے دور قیامت تک
سرور دشت پیما کا کبھی وہ شہر مسکن تھا

اور مقلدی میں یہاں کے لوگ صاحب کمال ہیں۔ باریک بیں دقیقہ رس زودفہم نازک خیال ہیں۔ یہ عجب ان صاحبوں کا لیکھا ہے مقلدی میں موجد سے بہتر ہو جاتے انہیں کو دیکھا ہے اس شہر میں کئی مطبع سنگی ہیں نمونہ نیرنگی ہیں لیکن ایک ہمارے عنایت فرما ہیں جناب یرحسن صاحب صاحب حسن و جمال جوان خوش رو صاحب باطن حمیدہ خسال حسن خلق ان کا خلق میں مشہور ہے۔ عجب ونخوت ان کے نزدیک سے دور ہے۔ موسم شباب ہے۔ چہرے پر جوانی کی آب وتاب ہے۔ بیت ابرو کا کل مشک بوصفحہ رخسار گل بے خار، از سرتاپا ہر شے دیوان وجاہت میں انتخاب ہے۔ محمود نگر میں ان کا چھاپہ خانہ جدید ہے۔

عیاذ باللہ پھولا گلشن بے خزاں ہے کہ دیدنہ شنید ہے،۔ عقل دنگ ہے کارخانہ کیا ے تختہ ارژنگ ہے۔ ایک سمت خوشنویس ثانی آغاز میرہفت قلم ایک طرف فاضل صاحب درس وتدریس ہر ایک بےنظیر شیر وشکر کی طرح باہم۔ ایک جاولایتی کل جسے دیکھ کر جی بے کل ہوگیا ہے کیسا ہی جوان قوی ہیکل ہوا اگر چاہے پہاڑ اوٹھالے مگر ایک کانپی میں ہاتھ کانپے کیا دخل ہے۔ جو بے دریافت دس فرمے نکالے اس کی ہر کمانی کو اگر کارمانی کہوں بدگمانی ہے بہزاد کی عقل کو حیرانی ہے۔ پرزے پرزے پر جلا ہے صفا ہے ید سحر کا ڈھلا ہے۔ کہیں پتھر صاف ساف شفاف جن کے سنگ کا فر سنگوں نظر نہ آئے۔ مردم دیدہ اگر اس کی صفا کو نظر بند کریں۔ آنکھ پھسل جائے۔ ہر پتھر ہمسنگ کوہ طور ہے کسی پر جلی لکھا ہے کوئی قلم مو سے مسطور ہے۔ کاریگر ہر ایک سرگرم فرمانروائی ہے۔ کتب کہن از سرنو زندہ ہوتے ہیں۔ ثبوت اعجاز مسیحائی ہے سبک دست چست وچالاک استاد ہیں۔ طبع بلندان کا مطبوع دل پسند اپنے کام میں ذی استعداد ہیں بیلن ترانی کہتا ہوں۔ نئی تسبیہ ہاتھ آئی ہے۔ بیلن کی سیاہی میں صاف کیفیت روشنائی ہے۔ فریم ہر ایک مرقع کی تصویر ہے۔ لکھا مٹتا نہیں گویا خط تقدیر ہے۔ الٰہی جب تک فلک کی کل چلتی ہے اور کارخانہ خرچ زنگاری رہے یہ کارفرما سلامت رہے۔ کارخانہ جاری ہے بندہ کمترین تلامذہ اور خوشہ چین خرمن سخن جناب قبلہ وکعبہ استاد شاگرد نواز

معزز و ممتاز مجمع فضل و کمال نیک سیرت فرخندہ خسال خرد آگاہ دانش آموز یادگار جناب میر سوز عرفی عصر سعدی زماں رشک انوری دخاقانی نوازش حسین خاں صاحب عرف میرزا خانی تخلص نوازش کا ہے۔ حقیقت حال یہ مقام ہے کہ طرز ریختہ اور روز مرہ اردو کا ان پر اختتام ہے۔ شعران کے واسطے وہ شعر کی خاطر موضوع ہیں۔ کہنے کے علاوہ پڑھنے کا یہ رنگ ڈھنگ ہے۔ اگر طفل مکتب کا شعر زبان معجز بیان سے ارشاد کریں۔ فیض دہان تاثیر بیان سے پسند طبع سحبان وائل ہو۔ فی زمانہ تو کیا سابقین جو موجد کلام کوس لمن الملکی بجاتے تھے۔ ان کے دیوانوں میں دس پانچ شعر تناسب لفظی یا صنائع بدائع کے ہوں گے وہ ان پر نازاں تھے اور متاکرین فخر یہ سند گردانتے ہیں۔ لہذا جس شخص کو فہم کامل یا اس فن میں مرتبہ و کمال حاصل ہو اور طبع بھی عالی آپ کا دیوان بچشم انصاف و نظر غور سے دیکھے کوئی غزل نہ ہوگی جو ان کیفیتوں سے خالی ہو ہر مصرع گواہ ہزار صنعت ہر شعر شاہد لاکھ صفت، مطلع سے مقطع تک ہر غزل مرقع کی صورت اکثر اشعار آپ کے تبرکا و تیمنا بطریق یادگار بندہ نے لکھے ہیں جہاں لفظ استاد ہے وہ آپ کا شعر ہے یادر ہے۔

باعث تحریر اجزا پریشاں و سر گزشت مجمع دوستاں مکلّف ہونا محبوب کا بیان داستان مرغوب کا

حسب اتفاق ایک روز مع چند دوست صادق و محبان صفا کیش و موافق باہم بیٹھا تھا۔ مگر نیرنگی زمانہ ناہنجار و، کجروی فلک سفلہ پروردوں نواز جفا شعار سے سب بادل حزیں و زار اور ہجوم اندوہ و یاس سے اور کثرت حرمان واذکار سے کہ ہر دم یہ پاس تھے دل گرفتہ سینہ ریش اور اداس تھے۔ انہوں نے کہا شعبدہ بازی چرخ مکار از آدم تا ایں دم یوں ہی چلی آئی ہے اور تفرقہ پردازی اس کی سوائے رنج و محن زیادہ مشہور ہے۔ یہ اور برائی ہے۔ اب یہی غنیمت جانیے اور لازم ہے کہ اس کا بھی احسان مانیے کہ تم ہم اس دم باہم تو بیٹھے ہیں:

جو ہم تم پاس بیٹھے ہیں سنو یہ دم غنیمت ہے
یہ ہنسنا بولنا رہ جائے تو کیا کم غنیمت ہے
(استاد)

بیان واقعی ہے اگر شدت رنج والم میں دوست صادق یار موافق ہم نشیں ہو تو الم خیال میں

نہیں آتا ہے اور صحبت غیر جنس میں تخت سلطنت میسر آئے تو تختہ تابوت کی طرح کاٹے کھاتا ہے:

پائے در زنجیر پیش دوستان

بہ کہ بابیگانگاں در بوستاں

(سعدی)

لیکن زمانے کی عادت یہی ہے کہ باوجود کثرت غم وشدت اندوہ والم وہ شخص باہم نہیں دیکھ سکتا۔

پھینکے ہے منجنیق چرخ تاک کی سنگ تفرقہ

بیٹھ کر ایک دم کہیں ہوویں جو ہمکلام دو

(مرزا)

جب سلسلہ سخن یہاں تک پہنچا اس زمرے میں ایک آشنائے باصفا پر مزہ بندے کے تھے۔ انہوں نے فرمایا اس وقت کوئی قصہ یا کہانی بہ شیریں زبانی ایسا بیان کر کہ رفع کدورت وجمعیت پریشانی طبیعت ہو اور غنچۂ سربستۂ دل بہ اہتزاز نسیم تکلم کھل جائے فرمانبردار نے بجز اقرار انکار مناسب وقت نہ جانا چند کلمے گوش گزار کیے اگر چہ گریہ کردن راہم دل خوش مے باید مگر اس نظر سے ــــ (مصرع)

ہر چہ از دوست می رسد نیکوست

یہ فسانہ انہیں بہت پسند آیا کہا اگر بدل جمعی تمام تو اس قصہ پراگندہ کو از آغاز تا انجام زبان اردو میں فراہم اور تحریری کرے تو نہایت منظور نظر اہل بصر ہو لیکن تقصیر معاف ہو نعت سے صاف ہو۔ بندے نے کہا طبیعت ابنائے روزگار بیشتر متوجہ عیب جوئی وہنر پوشی ہے ــــ (بقول دل گیر)

قبح کے دیکھنے والے تو بہت ہیں دل گیر

اور یہاں حسن شناساں سخن تھوڑے ہیں

وہ بولے چشم داشت صلہ طلب اجرت کسی سے متصور نہیں فقط ہماری خوشی مدنظر رکھ جیسا رطب دیابس کہے گا ہمیں پسند ہے بشرطکہ جو روزمرہ اور گفتگو ہماری تمہاری ہے یہی ہو۔ ایسا نہ ہو کہ آپ رنگینی عبارت کے واسطے وقت طلبی اور نکتہ چینی کریں ہم فقرے کے معنے فرنگی محل کی گلیوں میں پوچھتے پھریں۔

بندے نے کہا یہ تو مقدمہ تحریر ہے اگر سرسرکار کے کام آ جائے تقریر نہیں مگر جلدی نہ کرنا بوقت فرصت لکھوں گا۔

وہ تو یار شاطر نہ بار خاطر تھے کہا اچھا۔ فقیر کو اسی دن سے ہمیشہ اس کا خیال رہتا تھا۔ عدم فرصت سے نہ کہتا تھا۔ آخر الامر مقتضائے عادت تلاش معاش کے حیلے میں فلک تفرقہ پرداز گردون عریدہ ساز نے صورت مفارقت کی دکھائی مہاجرت استقبال کو آئی:

به وقت لقمه خوردن اے مسرت گفت بسهایم
که روزی می کند از هم جدا یاران همدم را
(مسرت)

ربیع الثانی کے مہینے میں کہ سن ہجری نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بارہ سو چالیس تھے۔ آنے کا اتفاق مجبور کوردہ کانپور میں ہوا بسکہ یہ بستی پوچ ولچر ہے۔ اشراف یہاں عنقا صفت ناپیدا ہیں۔ احیاناً جو ہوں گے تو گوشہ نشین عذات گزیں مگر چھوٹی امت کی بڑی کثرت تھی یہ طور دیکھ کر دل وحشت منزل سخت گھبرایا۔ کلیجہ منھ کو آیا۔ قریب تھا جنوں ہو جائے۔ تیرہ بختی سے روز سیاہ پیش آئے لیکن بشریت عنایت ومعجون شفقت ارسطو فطرت بقراط حکمت حکیم سید اسد علی صاحب شیر پیشۂ علم وکمال سخن فہم ظریف خوش خصال طبع سودا خیز اور مرجنوں انگیز کو آرام وتسکین حاصل ہوئی وہ حال فقیر دل گیر پر الطاف وکرم فرماتے تھے، تدبیریں نیک واحسن وافع رنج وصحن بتاتے تھے۔ ایک روز ان سے بعد اظہار حال مکلف فسانہ دوستانہ یہ بھی کہا کہ ایک کہانی لکھنا چاہتا ہوں۔ سن کر فرمایا بے کار مباش کچھ کیا کر:

میر نہیں پیر تم کاہلی اللہ ری
نام خدا ہو جوان کچھ تو کیا چاہئے
(میر)

اس وقت یہ کلمہ توسن طبع کو تازیانہ ہوا، اگر چہ اس ہیچ میرزا کو یہ بار نہیں کہ دعویٰ اردو زبان پر لائے یا اس افسانے کو بنظر نثاری کسی کو سنائے اگر شاہجہان آباد کہ مسکن اہل زبان کبھی بیت السلطنۃ ہندوستاں تھا۔ وہاں چندے بود وباش کرتا فصیحوں کو تلاش کرتا تو فصاحت کا مقرر دم بھرتا۔ جیسا

میر امن صاحب چار درویش کے قصے میں بکھیڑا کیا ہے کہ ہم لوگوں کے ذہن وحصے میں یہ زبان آئی ہے دلی کے روڑے ہیں۔ محاورے کے ہاتھ منہ توڑے ہیں۔ پتھر پڑیں۔ ایسی سمجھ پر یہی خیال انسان کا خام ہوتا ہے۔ مفت میں نیک بدنام ہوتا ہے۔ بشر کو دعویٰ کب سزاوار ہے۔ کاملوں کو بے ہودہ گوئی سے انکار بلکہ ننگ وعار ہے۔ مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار گوید یہ وہی مثل سننے میں آئی کہ اپنے منہ سے دھنا بائی لیکن تحریر اس کی ایفائے تقریر ہے۔ قصہ یہ دلچسپ بے نظیر ہے امید ناظرین پر تمکین سے یہ ہے کہ بچشم عیب پوشی ونظر اصلاح ملاحظہ فرما کر جہاں سہو غلطی پائیں باصلاح مزین فرمائیں۔ کیسی ہی طبیعت عالی ہو ممکن نہیں جو بشر خطا سے خالی ہو اس کے مطالعے سے خاطر عاطر شاد کریں۔ عاصی کو دعائے خیر سے یاد کریں۔ نیاز مند کو اس تحریر سے نمود نظم ونثر وجودت طبع کا خیال نہ تھا۔ شاعری کا احتمال نہ تھا بلکہ نظر ثانی میں جو لفظ دقت طلب غیر مستعمل عربی فارسی کا مشکل تھا اپنے نزدیک اسے دور کیا اور جو کلمہ سہل ممتنع محاورے کا تھا، وہ رہنے دیا۔ دوست کی خوشی سے کام رکھا۔ فسانۂ عجائب اس کا نام رکھا۔ انہ المبدء والیہ الماب۔ عنایت ایزدی سے تمام ہوئی کتاب۔

غالب کے خطوط

مرزا اسد اللہ خاں غالب

(۱۷۹۶ء - ۱۸۶۹ء)

میر مہدی مجروح کے نام

جانِ غالب!

تمہارا خط پہنچا غزل اصلاح کے بعد پہنچتی ہے۔

ہر اک سے پوچھتا ہوں وہ کہاں ہے

مصرع بدل دینے سے یہ شعر کس رتبے کا ہو گیا۔

اے میر مہدی تجھے شرم نہیں آتی۔

میاں ، یہ اہلِ دہلی کی زباں ہے

ارے اب اہلِ دہلی یا ہندو ہیں یا اہلِ حرفہ ہیں یا خاکی ہیں یا پنجابی ہیں یا گورے ہیں۔ ان

میں سے تو کس کی زبان کی تعریف کرتا ہے؟ لکھنؤ کی آبادی میں کچھ فرق نہیں آیا۔ ریاست تو جاتی رہی، باقی ہر فن کے کامل لوگ موجود ہیں۔

خس کی ٹٹی، پروا ہوا، اب کہاں لطف؟ وہ تو اسی مکان میں تھا۔ اب میر خیراتی کی حویلی میں وہ چھت اور سمت بدلی ہوئی ہے۔ بہ ہر حال مے گزرد۔

مصیبت عظیم یہ ہے کہ قاری کا کنواں بند ہوگیا۔ لال ڈگی کے کنوئیں یک قلم کھاری ہوگئے۔ خیر، کھاری ہی پانی پیتے، گرم پانی نکلتا ہے۔ پرسوں میں سوار ہوکر کنوؤں کا حال معلوم کرنے گیا تھا۔ مسجد جامع ہوتا ہوا، راج گھاٹ دروازے کو چلا۔ مسجد جامع سے راج گھاٹ دروازے تک، بے مبالغہ ایک صحرا لق دوق ہے۔ اینٹوں کے ڈھیر جو پڑے ہیں، وہ اگر اٹھ جائیں تو ہو کا مکان ہو جائے۔ یاد کرو، مرزا گوہر کے باغیچے کے اس جانب کوئی بانس نشیب تھا۔ اب وہ باغیچے کے صحن کے برابر ہوگیا۔ یہاں تک کہ راج گھاٹ کا دروازہ بند ہوگیا۔ فصیل کے کنگورے کھلے رہے ہیں باقی سب اٹ گیا۔ کشمیری دروازے کا حال تم دیکھ گئے ہو۔ اب آہنی سڑک کے واسطے کلکتہ دروازے سے کابلی دروازے تک میدان ہوگیا۔ پنجابی کٹرا، دھوبی واڑہ، رام جی گنج، سعادت خاں کا کٹرہ، جرنیل کی بی بی کی حویلی، رام جی داس ودام والے کے مکان صاحب رام کا باغ، حویلی، ان میں سے کسی کا پتہ نہیں ملتا۔ قصہ مختصر، شہر صحرا ہوگیا تھا۔ اب جو کنویں جاتے رہے اور پانی گوہر نایاب ہوگیا۔ تو یہ صحرا صحرائے کربلا ہو جائے گا۔ اللہ اللہ دلی نہ رہی اور دلی والے ابتک یہاں کی زبان کو اچھا کہے جاتے ہیں۔ واہ رے حسنِ اعتقاد ارے بندۂ خدا، اردو بازار نہ رہا اردو کہاں، دلی کہاں واللہ، اب شہر نہیں ہے، کمپ ہے چھاونی ہے نہ قلعہ، نہ شہر، نہ بازار، نہ نہر۔

الور کا حال کچھ اور ہے۔ مجھے اور انقلاب سے کیا کام؟ الگزنڈر ہدرلی کا کوئی خط نہیں آیا ظاہر ان کی مصاحبت نہیں۔ ورنہ مجھ کو ضرور خط لکھتا رہتا۔ میر سرفراز حسین اور میرن صاحب اور نصیر الدین کو دعا۔

۱۸۶۰ء

میاں داد خاں سیاح کے نام

صاحب!

کل آپ کا خط آیا، میرا دھیان لگا ہوا تھا کہ آیا میاں سیاح کہاں ہیں اور مجھ کو کیوں بھول گئے ہیں؟ پہلا خط تمہارا جس کا حوالہ اس خط میں دیتے ہو، میں نے نہیں پایا۔ ورنہ کیا امکان تھا کہ جواب نہ لکھتا۔

جناب منشی میر امیر علی صاحب سے مجھ سے شاید ملاقات نہیں، لیکن ان کے محامد و مکارم سنتا ہوں۔ جناب مولوی اظہار حسین صاحب سے البتہ اسی شہر میں دو ملاقاتیں ہوئی ہیں، لیکن میں نے ان کو فقیر دوست اور درویش نواز نہ پایا۔ اغنیا کے واسطے اچھے ہیں۔ ہائے مولوی محمد محسن اور مولوی عبدالکریم، اس عہد میں اگر ان بزرگوں میں سے ایک ہوتا تو میں کیوں اپنی قسمت کو روتا۔ وقت گزر جاتا ہے بات رہ جاتی ہے۔

ہاں، خاں صاحب، آپ جو کلکتے پہنچے ہو اور سب صاحبوں سے ملے ہو تو مولوی فضل حق کا حال اچھی طرح دریافت کر کے مجھ کو لکھو کہ اس نے رہائی کیوں نہ پائی اور وہاں جزیرے میں اس کا کیا حال ہے؟ گزارا کس طرح ہوتا ہے؟

جمعہ ۴ ماہ اکتوبر ۱۸۶۱ء　　　　　　غالب

اقبال کے خطوط

علامہ اقبال

(۱۸۷۳ء - ۱۹۳۸ء)

اکبر الٰہ آبادی کے نام

لاہور، ۶ر اکتوبر ۱۱ء

مخدوم ومکرم جناب قبلہ سیّد صاحب، السلام علیکم

کل ظفر علی خاں صاحب سے سنا تھا کہ جناب کو چوٹ آ گئی۔ اسی وقت سے میرا دل بے قرار تھا اور میں عریضہ خدمت عالی میں لکھنے کو تھا کہ جناب کا محبت نامہ ملا۔ دست بدعا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے اس تکلیف کو رفع کرے اور آپ کو دیر تک زندہ رکھے تا کہ ہندوستان کے مسلمان اُس قلب کی گرمی سے متاثر ہوں جو خدا نے آپ کے سینے میں رکھا ہے۔

میں آپ کو اُسی نگاہ سے دیکھتا ہوں جس نگاہ سے کوئی مرید اپنے پیر کو دیکھے اور وہی محبت و عقیدت اپنے دل میں رکھتا ہوں۔ خدا کرے وہ وقت جلد آئے کہ مجھے آپ سے شرف نیاز حاصل ہو اور میں اپنے دل کو چیر کر آپ کے سامنے رکھ دوں۔ لاہور ایک بڑا شہر ہے لیکن میں اس ہجوم میں تنہا ہوں۔ ایک فرد واحد بھی ایسا نہیں جس سے دل کھول کر اپنے جذبات کا اظہار کیا جا سکے:

طعنہ زن ہے ضبط اور لذت بڑی افشا میں ہے ‏ ‏ ہے کوئی مشکل سی مشکل راز داں کے واسطے

لارڈ بیکن کہتے ہیں: ''جتنا بڑا شہر ہو اتنی ہی بڑی تنہائی ہوتی ہے[1]۔'' سو یہی حال میرا لاہور میں ہے۔ اس کے علاوہ گذشتہ ماہ میں بعض معاملات کی وجہ سے سخت پریشانی رہی اور مجھے بعض کام اپنی فطرت اور طبیعت کے خلاف کرنے پڑے اور ان ہی میں طبع سلیم میرے لئے شکنجے کا کام دے گئی۔ کیا خوب کہہ گیا ہے عرفیؔ:

رستم ز مدعی بقبولِ غلط ولے
در تا بم از شکنجۂ طبعِ سلیم خویش[2]

ناتمام نظم کے اشعار آپ نے پسند فرمائے۔ مجھے یہ سن کر مسرت ہوئی ہے کہ آپ میرے اشعار پسند فرماتے ہیں۔ غرہ شوال[3] پر چند اشعار لکھے تھے۔ زمیندار اخبار کے عید نمبر میں شائع ہوئے ان کو ضرور ملاحظہ فرمائیے۔ میں نے چند اشعار آخر میں ایسے لکھے ہیں کہ ترکی واٹلی کی جنگ نے اس کی تصدیق کردی ہے۔ اگر زمیندار اخبار آپ تک نہ پہنچا ہو تو تحریر فرمائیے، بھجوادوں گا۔

خواجہ حسن نظامی واپس تشریف[4] لے آئے۔ مجھے بھی ان سے محبت ہے اور ایسے لوگوں کی تلاش میں رہتا ہوں۔ خدا آپ کو اور مجھ کو بھی زیارتِ روضۂ رسولؐ نصیب کرے۔ مدت سے یہ آرزو دل میں پرورش پا رہی ہے۔ دیکھئے کب جوان ہوتی ہے۔ شیخ عبدالقادر لائل پور میں سرکاری وکیل ہوگئے۔ اب وہ لاہور سے وہاں چلے گئے۔ کچھ دن ہوئے یہاں آئے تھے مگر ان سے نہ مل سکا۔ آرڈر[5] قائم کرنے کا خیال تھا اور اب تک ہے مگر اس راہ میں مشکلات بے حد ہیں اور سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ اس مذاق کے لوگ کہاں ہیں۔ بہر حال میں ہم خیال پیدا کرنے کی کوشش میں مصروف ہوں اور کسی موقع کو ہاتھ سے نہیں دیتا۔ آپ دعا کریں۔

۱۔ **Magna Civitas, Magna Solitudu (A great city is a great solitude) Bacon: From the essay entitled 'Of Friendship' included in his book of 'Essays'.**

۲۔ (ترجمہ) مدعی (دشمن) کی غلط پکڑ سے تو میں نکل آیا مگر اب اپنی طبع سلیم کے شکنجہ میں پیچ و تاب کھا رہا ہوں۔

۳۔ غرہ: قمری مہینے کا پہلا دن

۴۔ خواجہ حسن نظامی حجاز و فلسطین و شام کے سفر پر ۱۹۱۱ء میں گئے تھے اور مدینہ منورہ میں بھی حاضری دی تھی۔

۵۔ آرڈر سے مراد غالباً 'سلسلۂ صوفیہ' ہے۔ اس زمانے میں خواجہ حسن نظامی نے حلقۂ نظام المشائخ قائم رکھا تھا اور اس کی توسیع و تبلیغ میں مصروف تھے۔

خیریت مزاج سے مطلع کیجیے۔ مجھے اس خط کے جواب کا انتظار رہے گا۔ خدا آپ کو صحتِ کامل کرامت فرمائے۔

دعا گو

محمد اقبال، بیرسٹر، لاہور

(اقبال نامہ)

وحشت کلکتوی کے نام

لاہور، ۳۰/ مارچ ۱۰ء

مخدوم و مکرم جنابِ وحشت! 'دیوانِ وحشت' کی ایک کاپی جو آپ نے از راہِ عنایت ارسال فرمائی۔ موصول ہوئی۔

شکریہ قبول کیجیے۔ میں ایک عرصہ سے آپ کے کلام کو شوق سے پڑھتا ہوں اور آپ کا غائبانہ مدّاح ہوں۔ دیوان قریباً سب کا سب پڑھا اور خوب لطف اُٹھایا۔ ماشاء اللہ آپ (کی[1]) طبیعت نہایت تیز ہے اور فی زمانہ بہت کم لوگ ایسا کہہ سکتے ہیں۔ آپ کی مضمون آفرینی اور ترکیبوں کی چستی خاص طور پر قابلِ داد ہیں، فارسی کلام بھی آپ کی طباعی کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ شعر کا بڑا خاصہ یہ ہے کہ ایک مستقل اثر پڑھنے والے کے دل پر چھوڑ جائے اور یہ بات آپ کے کلام میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ والسلام!

نیاز مند

محمد اقبال

(خطوطِ اقبال)

---

[1] اصل متن میں "کی" موجود نہیں ہے۔

آزاد کے خطوط

مولانا ابوالکلام آزاد

(۱۸۸۸ء - ۱۹۵۸ء)

خط نمبر : ٦

قلعۂ احمد نگر

۱۱/اگست ۱۹۴۲ء

صدیقِ مکرم!— قید و بند کی زندگی کا یہ چھٹا تجربہ ہے۔ پہلا تجربہ ۱۹۱٦ء میں پیش آیا تھا، جب مسلسل چار برس تک قید و بند میں رہا۔ پھر ۱۹۲۱ء، ۱۹۳۱ء، ۱۹۳۲ء اور ۱۹۴۰ء میں یکے بعد دیگرے یہی منزل پیش آتی رہی، اور اب پھر اسی منزل سے قافلۂ باد پیائے عمر گذر رہا ہے:

باز می خواہم زسر گیرم رہِ پیمودہ را!

پچھلی پانچ گرفتاریوں کی اگر مجموعی مدت شمار کی جائے، تو سات برس آٹھ مہینے سے زیادہ نہیں ہوگی★۔ عمر کے ترپن برس جو گذر چکے ہیں، ان سے یہ مدت وضع کرتا ہوں، تو ساتویں حصے

★ یہ مکتوب ۱۱/اگست ۱۹۴۲ء کو لکھا تھا۔ اس کے بعد قید کے دو برس گیارہ مہینے اور گذر گئے اور مجموعی مدت سات برس آٹھ مہینے کی جگہ دس برس سات ماہ ہوگئی۔ اس اضافہ کے خلاف کوئی شکوہ کرنا نہیں چاہتا۔ البتہ اس کا افسوس ضرور ہے کہ وہ ساتویں حصہ کی مناسبت کی بات مختل ہوگئی، وہ سبت کی تعطیل کا معاملہ ہاتھ سے نکل گیا۔

کے قریب پڑتی ہے۔ گویا زندگی کے ہر سات دن میں ایک دن قید خانہ کے اندر گذرا۔ تورات کے احکامِ عشرہ میں ایک حکم سبت کے لئے بھی تھا۔ یعنی ہفتہ کا ساتواں دن تعطیل کا مقدس دن سمجھا جائے۔ مسیحیت اور اسلام نے بھی یہ تعطیل قائم رکھی۔ سو ہمارے حصہ میں بھی سَبت کا دن آیا مگر ہماری تعطیلیں اس طرح بسر ہوئیں، گویا خواجہ شیراز کے دستورالعمل پر کار بند رہے:

نہ گویمت کہ ہمہ سال مے پرستی کن

سہ ماہ مے خورو نہ ماہ پارسامی باش

وقت کے حالات پیشِ نظر رکھتے ہوئے اس تناسب پر غور کرتا ہوں تو تعجب ہوتا ہے۔ اس پر نہیں کہ سات برس آٹھ مہینے قید و بند میں کیوں کٹے، اس پر کہ صرف سات برس آٹھ مہینے ہی کیوں کٹے!

نالہ از بہرِ رہائی نہ کند مرغ اسیر

خورد افسوس زمانے کہ گرفتار نہ بود

وقت کے جو حالات ہمیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں، ان میں اس ملک کے باشندوں کے لئے زندگی بسر کرنے کی دو ہی راہیں رہ گئیں ہیں۔ بے حسی کی زندگی بسر کریں، یا احساس حال کی۔ پہلی زندگی ہر حال میں اور ہر جگہ بسر کی جا سکتی ہے، مگر دوسری کے لئے قید خانہ کی کوٹھری کے سوا اور کہیں جگہ نہ نکل سکی۔ ہمارے سامنے بھی دونوں راہیں کھلی تھیں۔ پہلی ہم اختیار نہیں کر سکتے تھے، ناچار دوسری اختیار کرنی پڑی:

رندِ ہزار شیوہ را اطاعتِ حق گراں نہ بود

لیک صنم بہ سجدہ در ناصیہ مشترک نخواست

زندگی میں جتنے جرم کیے اور ان کی سزائیں پائیں، سوچتا ہوں تو ان سے کہیں زیادہ تعداد ان جرموں کی تھی جو نہ کر سکے، اور جن کے کرنے کی حسرت دل میں رہ گئی۔ یہاں کردہ جرموں کی سزائیں تو مل جاتی ہیں، لیکن ناکردہ جرموں کی حسرتوں کا صلہ کس سے مانگیں:

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد

یارب! اگر ان کر دہ گناہوں کی سزا ہے

۱۹۱۶ء میں جب یہ معاملہ پیش آیا، تو مجھے پہلی مرتبہ موقع ملا کہ اپنی طبیعت کے تاثرات کا جائزہ لوں۔ اس وقت عمر کے صرف ۲۷ برس گزر رہے تھے، 'الہلال'، 'البلاغ' کے نام سے جاری تھا۔ ''دارالارشاد'' قائم ہو چکا تھا۔ زندگی کی گہری مشغولیتیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھیں۔ طرح طرح کی سرگرمیوں میں دل اٹکا ہوا اور علاقوں اور رابطوں کی گرانیوں سے بوجھل تھا۔ اچانک ایک دن دامن جھاڑ کر اٹھ کھڑا ہونا پڑا، اور مشغولیت کی ڈوبی ہوئی زندگی کی جگہ قید و بند کی تنہائی اور بے تعلقی اختیار کر لینی پڑی۔ بظاہر اس ناگہانی انقلابِ حال میں طبیعت کے لئے بڑی آزمائش ہونی تھی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ نہیں ہوئی۔ آباد گھر چھوڑا اور ایک ویرانہ میں جا بیٹھ رہا:

نقصاں نہیں جنوں میں ، بلا سے ہو گھر خراب

دو گز زمیں کے بدلے بیاباں گراں نہیں!

لیکن پھر کچھ عرصہ کے بعد جب اس صورتِ حال کا ردِ فعل شروع ہوا، تو معلوم ہوا کہ معاملہ اتنا سہل نہ تھا، جتنا ابتدائے حال کی سرگرمیوں میں محسوس ہوتا تھا اور اس کی آزمائشیں ابھی گذر نہیں چکیں، بلکہ اب پیش آرہی ہیں۔

جب کبھی اسی طرح کا معاملہ یکا یک پیش آجاتا ہے، تو ابتداً میں اس کی سختیاں پوری طرح محسوس نہیں ہوتیں، کیونکہ طبیعت میں مقاومت کا ایک سخت جذبہ پیدا ہو جاتا ہے اور وہ نہیں چاہتا کہ صورتِ حال سے دب جائے، وہ اس کا غالبانہ مقابلہ کرنا چاہتا ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ایک پرجوش نشہ کی سی حالت طاری ہو جاتی ہے۔ نشہ کی تیزی میں کتنی ہی سخت چوٹ لگے، اس کی تکلیف محسوس نہیں ہوگی۔ تکلیف اس وقت محسوس ہوگی، جب نشہ اترنے لگے گا اور جماہیاں آنی شروع ہوں گی۔ اس وقت ایسا معلوم ہوا، جیسے سارا جسم درد سے چور چور ہو رہا ہو۔ چنانچہ اس معاملہ میں بھی پہلا دور نشۂ جذبات کی خود فراموشیوں کا گذرا۔ علائق کا فوری انقطاع کاروبار کی ناگہانی برہمی، مشغولیتوں کا یک قلم تعطل، کوئی بات بھی دامنِ دل کو کھینچ نہ سکی۔ کلکتہ سے بہ اطمینان تمام نکلا اور رانچی میں شہر کے باہر ایک غیر آباد حصہ میں مقیم ہو گیا لیکن پھر جوں جوں دن گذرتے گئے، طبیعت کی بے پروائیاں جواب دینے لگیں، اور صورتِ حال کا ایک ایک کانٹا پہلوے دل میں چبھنے لگا، یہی وقت تھا، جب مجھے اپنی طبیعت کی اس انفعالی حالت کا مقابلہ کرنا پڑا، اور ایک خاص طرح کا سانچا اس

کے لئے ڈھالنا پڑا۔ اس وقت سے لے کر آج تک کہ چھبیس برس گذر چکے، وہی سانچا کام دے رہا ہے اور اب اس قدر پختہ ہو چکا ہے کہ ٹوٹ جا سکتا ہے، مگر لچک نہیں کھا سکتا۔

طالب علمی کے زمانے سے فلسفہ میری دلچسپی کا خاص موضوع رہا ہے۔ عمر کے ساتھ ساتھ یہ دلچسپی برابر بڑھتی گئی۔ لیکن تجربے سے معلوم ہوا کہ عملی زندگی کی تلخیاں گوارا کرنے میں فلسفہ سے کچھ زیادہ مدد نہیں مل سکتی۔ یہ بلاشبہہ طبیعت میں ایک طرح کی رواقی (Storical) بے پروائی پیدا کر دیتا ہے، اور ہم زندگی کے حوادث وآلام کو عام سطح سے کچھ بلند ہو کر دیکھنے لگتے ہیں، لیکن اس سے زندگی کے طبعی انفعالات کی گتھیاں سلجھ نہیں سکتیں۔ یہ ہمیں ایک طرح کی تسکین ضرور دے دیتا ہے، لیکن اس کی تسکین سرتاسر سلبی تسکین ہوتی ہے، ایجابی تسکین سے اس کی جھولی ہمیشہ خالی رہی۔ یہ فقدان' کا افسوس کم کر دے گا۔ لیکن 'حاصل' کی کوئی امید نہیں دلائے گا۔ اگر ہماری راحتیں ہم سے چھین لی گئی ہیں، تو فلسفہ ہمیں کلیلہ ودمنہ (پنج تنتر) کی دانش آموز چڑیا کی طرح نصیحت کرے گا۔ مدتاس علیٰ مافات۔

(جو کچھ کھو چکا، اس پر افسوس نہ کر) لیکن کیا اس کھونے کے ساتھ کچھ پانا بھی ہے: اس بارے میں وہ ہمیں کچھ نہیں بتلاتا۔ کیونکہ بتلا سکتا ہی نہیں، اور اس لئے زندگی کی تلخیاں گوارا کرنے کے لئے صرف اس کا سہارا کافی نہ ہوا۔

سائنس عالم محسوسات کی ثابت شدہ حقیقتوں سے ہمیں آشنا کرتا ہے اور مادی زندگی کی بے رحم جبریت (Physical Determinism) کی خبر دیتا ہے۔ اس لئے عقیدہ کی تسکین اس کے بازار میں بھی نہیں مل سکتی۔ وہ یقین اور امید کے سارے پچھلے چراغ گل کر دے گا۔ مگر کوئی نیا چراغ روشن نہیں کرے گا۔

پھر اگر ہم زندگی کی ناگواریوں میں سہارے کے لئے نظر اٹھائیں تو کس کی طرف اٹھائیں؟

کون ایسا ہے جسے دست ہو دلسازی میں؟
شیشہ ٹوٹے تو کریں لاکھ ہنر سے پیوند

ہمیں مذہب کی طرف دیکھنا پڑتا ہے۔ یہی دیوار ہے جس سے اک دکھتی ہوئی پیٹھ ٹیک لگا سکتی ہے:

دلِ شکستہ دراں کوچہ می کنند درست
چنانکہ خود شناسی کہ از کجا بشکست

بلاشبہ مذہب کی وہ پرانی دنیا جس کی مافوق الفطرت کارفرمائیوں کا یقین ہمارے دل و دماغ پر چھایا رہتا تھا، اب ہمارے لیے باقی نہیں رہی۔ اب مذہب بھی ہمارے سامنے ہمارے دماغوں اور ہمارے دلوں سے زیادہ چھایا رہتا تھا، اب ہمارے لیے باقی نہیں رہی۔ اب مذہب بھی ہمارے سامنے آتا ہے تو عقلیت اور منطق کی ایک سادہ اور بیرنگ چادر اوڑھ کر آتا ہے اور ہمارے دلوں سے زیادہ ہمارے دماغوں کو مخاطب کرنا چاہتا ہے۔ تاہم اب بھی تسکین اور یقین کا سہارا مل سکتا ہے تو اسی سے مل سکتا ہے:

درد دیگرے بنما کہ من بکجا روم، چو برانیم

فلسفہ شک کا دروازہ کھول دے گا اور پھر اسے بند نہیں کر سکے گا۔ سائنس ثبوت دے گا، مگر عقیدہ نہیں دے سکے گا لیکن مزہب ہمیں عقیدہ دے دیتا ہے، اگرچہ ثبوت نہیں دیتا۔ اور یہاں زندگی بسر کرنے کیلئے صرف ثابت شدہ حقیقتوں ہی کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ عقیدہ کی بھی ضرورت ہے۔ ہم صرف انہی باتوں پر قناعت نہیں کرے سکتے جنھیں ثابت کر سکتے ہیں اور اس لئے مان لیتے ہیں، ہمیں کچھ باتیں ایسی بھی چاہئیں جنھیں ثابت نہیں کر سکتے، لیکن مان لینا پڑتا ہے:

By Faith , and faith alone, embrace
Believing. Where we cannot prove

عام حالات میں مذہب انسان کو اس کے خاندانی ورثہ کے ساتھ ملتا ہے اور مجھے بھی ملا۔ لیکن میں موروثی عقائد پر قانع نہ رہ سکا، میری پیاس اس سے زیادہ نکلی جتنی سیرابی وہ دے سکتے تھے۔ مجھے پرانی راہوں سے نکل کر خود اپنی نئی راہیں ڈھونڈھنی پڑیں۔ زندگی کے ابھی پندرہ برس بھی پورے نہیں ہوئے تھے کہ طبیعت نئی خلشوں اور نئی جستجوؤں سے آشنا ہوگئی تھی، اور موروثی عقائد جس شکل وصورت میں سامنے آکھڑے ہوئے تھے، ان پر مطمئن ہونے سے انکار کرنے لگی تھی۔ پہلے اسلام کے اندرونی مذاہب کے اختلافات سامنے آئے، اور ان کے متعارض دعوں اور متصادم فیصلوں نے حیران وسرگشتہ کر دیا۔ پھر جب کچھ قدم آگے بڑھے، تو خود نفس مذہب کی عالمگیر نزاعیں

سامنے آگئیں، اور انھوں نے حیرانگی کو شک تک اور شک کو انکار تک پہنچادیا۔ پھر اس کے بعد مذہب ـــ و ـــ علم کی باہمی آویزشوں کا میدان نمودار ہوا۔ اور اس نے رہا سہا اعتقاد بھی کھودیا۔ زندگی کے وہ بنیادی سوال جو عام حالات میں بہت کم ہمیں یاد آتے ہیں، ایک ایک کرے ابھرے اور دل ودماغ پر چھا گئے۔ حقیقت کیا ہے اور کہاں ہے؟ اور ہے بھی یا نہیں؟ اگر ہے اور ایک ہی ہے، کیونکہ ایک سے زیادہ حقیقتیں ہو نہیں سکتیں، تو پھر راستے مختلف کیوں ہوئے! کیوں صرف مختلف ہی نہیں ہوئے، بلکہ باہم متعارض اور متصادم ہوئے! پھر یہ کیا ہے کہ خلاف ونزاع کی ان تمام لڑتی ہوتی راہوں کے سامنے علم، اپنے بے لچک فیصلوں اور ٹھوس حقیقتوں کا چراغ ہاتھ میں لیے کھڑا ہے، اور اس کی بے رحم روشنی میں قدامت اور روایت کی وہ تمام پر اسرار تاریکیاں، جنھیں نوع انسانی عظمت وتقدیس کی نگاہ سے دیکھنے کی خوگر ہوگئی تھی، ایک ایک کر کے نابود ہورہی ہیں۔

یہ راہ ہمیشہ شک سے شروع ہوتی ہے اور انکار پر ختم ہوتی ہے، اور اگر قدم اسی پر اسی رک جائیں تو پھر مایوسی کے سوا اور کچھ ہاتھ نہیں آتا:

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے

تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں!

مجھے بھی ان منزلوں سے گذرنا پڑا مگر میں رکا نہیں۔ میری پیاس مایوسی پر قانع ہونا نہیں چاہتی تھی، بالآخر حیرانگیوں اور سرگشتگیوں کے بہت سے مرحلے طے کرنے کے بعد جو مقام نمودار ہوا، اس نے ایک دوسرے ہی عالم میں پہنچادیا۔ معلوم ہوا کہ اختلاف ونزاع کی انہیں متعارض راہوں اور اوہام وخیالات کی انہی گہری تاریکیوں کے اندر ایک روشن اور قطعی راہ بھی موجود ہے، جو یقین اور اعتقاد کی منزل مقصود تک چلی گئی ہے، اور اگر سکون وطمانیت کے سرچشمے کا سراغ مل سکتا ہے، تو وہیں مل سکتا ہے۔ میں نے جو اعتقاد حقیقت کی جستجو میں کھودیا تھا، وہ اسی جستجو کے ہاتھوں پھر واپس مل گیا۔ میری بیماری کی جو علت تھی، وہی بالآخر داروے شفا بھی ثابت ہوئی:

تداویت من لیلیٰ بلیلیٰ دن الھویٰ

کما یتداوی شارب الخمر بالخمر

البتہ جو عقیدہ کھویا تھا، وہ تقلیدی تھا؛ جو عقیدہ پایا، وہ تحقیقی تھا:

راہے کہ خضر داشت ز سر چشمہ دور بود
لب تشنگی ز راہِ دگر بردہ ایم ما

جب موروثی عقائد کے جمود اور تقلیدی ایمان کی چشم بندیوں کی پٹیاں ہماری آنکھوں پر بندھی رہتی ہیں، ہم اس راہ کا سراغ نہیں پاسکتے لیکن جونہی یہ پٹیاں کھلنے لگتی ہیں، صاف دکھائی دینے لگتا ہے، کہ راہ نہ تو دور تھی، اور کھوئی ہوئی تھی۔ یہ خود ہماری ہی چشم بندی تھی جس نے عین روشنی میں گم کردیا تھا:

درد شتِ آرزو نہ بود بیم دام ودو
راہے ست ایں کہ ہم ز تو خیز د بلاے تو

اب معلوم ہوا کہ آج تک جسے مذہب سمجھتے آئے تھے، وہ مذہب کہاں تھا! وہ تو خود ہماری ہی وہم پرستیوں اور غلط اندیشوں کی ایک صورت گری تھی:

تا بغایت ماہنر پند اشتیم
عاشقی ہم ننگ و عارے بودہ ست

ایک مذہب تو موروثی مذہب ہے کہ باپ دادا جو کچھ مانتے آئے ہیں، مانتے رہیے، ایک جغرافیائی مذہب ہے کہ زمین کے کسی خاص ٹکڑے میں ایک شاہ راہ، عام بن گئی ہے، سب اسی پر چلتے ہیں، آپ بھی چلتے رہئے، ایک مردم شماری کا مذہب ہے کہ مردم شماری کے کاغذات میں ایک خانہ مذہب کا بھی ہوتا ہے۔ اس میں اسلام درج کرادیجئے۔ ایک رسمی مذہب ہے کہ رسموں اور تقریبوں کا ایک سانچا ڈھل گیا ہے، اسے نہ چھیڑیے اور اسی میں ڈھلتے رہیے۔ لیکن ان تمام مذہبوں کے علاوہ بھی مذہب کی ایک حقیقت باقی رہ جاتی ہے۔ تعریف وامتیاز کے لئے اسے حقیقی مذہب کے نام سے پکارنا پڑتا ہے، اور اسی کی راہ گم ہوجاتی ہے:

ہمیں ورق کہ سیہ گشت ، مدعا ایں جاست

اسی مقام پر پہنچ کر یہ حقیقت بھی بے نقاب ہوئی کہ علم اور مذہب کی جتنی نزاع ہے، وہ فی الحقیقت علم اور مذہب کی نہیں ہے، مدعیانِ علم کی خامکاریوں اور مدعیانِ مذہب کی ظاہر پرستیوں اور قواعد سازیوں کی ہے، حقیقی علم اور حقیقی مذہب اگرچہ چلتے ہیں، الگ الگ راستوں سے، مگر بالآخر

پہنچ جاتے ہیں، ایک ہی منزل پر:

عبــاراتــنــا شتّــی وحُسـنك واحـد

وکـــلّ الـــی ذاك الـجـــمـــال یشیـــر

علم عالم محسوسات سے سروکار رکھتا ہے، مذہب ماورائے محسوسات کی خبر دیتا ہے، دونوں میں دائروں کا تعدد ہوا مگر تعارض نہیں ہوا۔ جو کچھ محسوسات سے ماورا ہے، اسے محسوسات سے معارض سمجھ لیتے ہیں اور یہیں سے ہمارے دیدۂ کج اندیش کی ساری درماندگیاں شروع ہو جاتی ہیں:

بر چہرۂ حقیقت اگر ماند پردۂ

جرمِ نگاہ دیدۂ صورت پرستِ ماست

بہر حال زندگی کی دشواریوں میں مذہب کی تسکین صرف ایک سلبی تسکین ہی نہیں ہوتی، بلکہ ایجابی تسکین ہوتی ہے کیونکہ وہ ہمیں اعمال کے اخلاقی اقدار (Moral Values) کا یقین دلاتا ہے، اور یہی یقین ہے جس کی روشنی کسی دوسری جگہ سے نہیں مل سکتی۔ وہ ہمیں بتلاتا ہے کہ زندگی ایک فریضہ ہے، جسے انجام دینا چاہئے۔ ایک بوجھ ہے، جسے اٹھانا چاہئے:

جلوۂ کاروانِ مانیست بہ نالۂ جرس

عشقِ تو راہ می برد ، شوقِ تو زادی دہد

لیکن کیا یہ بوجھ کانٹوں پر چلے بغیر نہیں اٹھایا جا سکتا؟

نہیں اٹھایا جا سکتا، کیونکہ یہاں خود زندگی کے تقاضے ہوئے جن کا ہمیں جواب دینا ہے اور خود زندگی کے مقاصد ہوئے جن کے پیچھے والہانہ دوڑنا ہے۔ جن باتوں کو ہم زندگی کی راحتوں اور لذتوں سے تعبیر کرتے ہیں، وہ ہمارے راحتیں اور لذتیں ہی کب رہیں گی۔ اگر ان تقاضوں اور مقصدوں سے منہ موڑ لیں، بلاشبہ یہاں زندگی کا بوجھ اٹھا کے کانٹوں کے فرش پر دوڑنا پڑا، لیکن اس لئے دوڑنا پڑا کہ دیبا و مخمل کے فرش پر چل کر ان تقاضوں کا جواب دیا نہیں جا سکتا تھا، کانٹے کبھی دامن سے الجھیں گے، کبھی تلووں میں چبھیں گے، لیکن مقصد کی خلش جو پہلوے دل میں چبھتی رہیں گی، نہ دامنِ تارتار کی خبر لینے دے گی۔ نہ زخمی تلووں کی:

معشوق درمیانہ جاں ، مدعی کجاست

گل در دماغ می دمد آسیب خار چیست

اور پھر زندگی کی جن حالتوں کو ہم راحت والم سے تعبیر کرتے ہیں، ان کی حقیقت بھی اس سے زیادہ کیا ہوئی کہ اضافت کے کرشموں کی ایک صورت گری ہے، یہاں نہ مطلق راحت ہے، نہ مطلق الم، ہمارے تمام احساسات سرتا سر اضافی ہیں:

دویدن ، رفتن ، استادن ، نشستین ، خفتن ومردن

اضافتیں بدلتے جاؤ؛ راحت والم کی نوعتیں بھی بدلتی جائیں گی۔ یہاں ایک ہی ترازو لے کر ہر طبیعت اور ہر حالت کا احساس نہیں تولا جاسکتا۔ ایک دہقان کی راحت والم تولنے کے لئے جس ترازو سے ہم کام لیتے ہیں۔ اس سے فنون لطیفہ کے ایک ماہر کا معیار راحت والم نہیں تول سکیں گے۔ ایک ریاضی دانکو ریاضی کا ایک مسئلہ حل کرنے میں جو لذت ملتی ہے، وہ ایک ہوس پرست کو شبستانِ عشرت کی سیہ مستیوں میں کب مل سکیں گی! کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہم پھولوں کی سیج پر لوٹتے ہیں اور راحت نہیں پاتے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کانٹوں پر دوڑتے ہیں اور اس کی ہر چبھن میں راحت وسرور کی ایک نئی لذت پانے لگتے ہیں:

بہر یک گل ، زحمتِ صد خارمی باید کشید!

راحت والم کا احساس ہمیں باہر سے لاکر کوئی نہیں دے دیا کرتا۔ یہ خود ہمارا ہی احساس ہے جو کبھی زخم لگاتا ہے، کبھی مرہم بن جاتا ہے۔ طلب وسعی کی زندگی بجائے خود زندگی کی سب سے بڑی لذت ہے، بشرطیکہ کسی مطلوب کی راہ میں ہو:

رہرواں راخستگی راہ نیست
عشق ہم راہ ست وہم خود منزل ست

اور یہ جو کچھ کہہ رہا ہوں، فلسفہ نہیں ہے؛ زندگی کے عام واردات ہیں۔ عشق ومحبت کے واردات کا میں حوالہ نہیں دوں گا۔ کیونکہ وہ ہر شخص کے حصے میں نہیں آسکتے۔ لیکن رندی اور ہوسناکی کے کوچوں کی خبر رکھنے والے تو بہت نکلیں گے۔ وہ خود اپنے دل سے پوچھ دیکھیں کہ کسی کی راہ میں رنج والم کی تلخیوں نے کبھی خوشگواریوں کے مزے بھی دیے تھے یا نہیں؟

حریفِ کاوشِ مژگانِ خون ریزش نہ ناصح!
بدست آور رگِ جانے و نشتر را تماشا کن

زندگی بغیر کسی مقصد کے بسر نہیں کی جاسکتی۔ کوئی اٹکاؤ، کوئی لگاؤ، کوئی بندھن ہونا چاہئے، جس کی خاطر زندگی کے دن کاٹے جاسکیں۔ یہ مقصد مختلف طبیعتوں کے سامنے مختلف شکلوں میں آتا ہے:

زاہد بہ نماز و روزہ ضبطے دارد!
سرؔمد بہ مے وپیالہ ربطے دارد

کوئی زندگی کی کار برآریوں ہی کو مقصد زندگی سمجھ کر ان پر قانع ہو جاتا ہے، کوئی ان پر قانع نہیں ہوسکتا جو قانع نہیں ہوسکتے، ان کی حالتیں بھی مختلف ہوئیں۔ اکثروں کی پیاس ایسے مقصدوں سے سیراب ہو جاتی ہے۔ جو انھیں مشغول رکھ سکیں۔ لیکن کچھ طبیعتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جن کے لئے مشغولیت کافی نہیں ہوسکتی، وہ زندگی کا اضطراب بھی چاہتی ہیں۔

نہ داغ تازہ می کارد ، نہ زخم کہنہ می خارد
بدہ یارب ؛ دلے کیں صورتِ بیجاں نمی خواہم

پہلو کے لئے جو دل بستگی اس میں ہوئی کہ مشغول رہیں، دوسروں کے لئے اس میں ہوئی کہ مضطرب رہیں:

دریں چمن کہ ہوا داغِ شبنم آرائی ست
تسلیے بہ ہزار اضطراب می بافند

ایک خنک اور ناآشنائے شورش مقصد سے ان کی پیاس نہیں بجھ سکتی، انھیں ایسا مقصد چاہئے، جو اضطراب کے انگاروں سے دہک رہا ہو، جو ان کے اندر شورش و سرمستی کا ایک تہلکہ مچا دے جس کے دامن ناز کو پکڑنے کے لئے وہ ہمیشہ اپنا گریبان وحشت چاک کرتے رہیں:

دامن اس کا تو بھلا دور ہے اے دستِ جنوں
کیوں ہے بیکار ، گریباں تو مرا دور نہیں

ایک ایسا بلائے جان مقصد جس کے پیچھے انھیں دیوانہ وار دوڑنا پڑے، جو دوڑنے والوں کو ہمیشہ نزدیک بھی دکھائی دے، اور ہمیشہ دور بھی ہوتا رہے، نزدیک اتنا کہ جب چاہیں ہاتھ بڑھا کر پکڑ لیں، دور اتنا کہ اس کی گردِ راہ کا بھی سراغ نہ پا سکیں:

بامن آویزشِ او الفتِ موج ست وکنار

دم بہ دم بامن و ہر لحظہ گریزاں ازمن

پھر نفسیاتی نقطۂ نگاہ سے دیکھیے، تو معاملہ کا ایک اور پہلو بھی ہے، جسے صرف تہ رس نگاہیں ہی دیکھ سکتی ہیں، یکسانی اگرچہ سکون وراحت کی ہو، یکسانی ہوئی اور یکسانی بجائے خود زندگی کی سب سے بڑی بے نمکینی ہے۔ تبدیلی اگرچہ سکون سے اضطراب کی ہو، مگر پھر تبدیلی ہے اور تبدیلی بجائے خود زندگی کی ایک بڑی لذت ہوئی۔ عربی میں کہتے ہیں حمّضوا مجالکسم! اپنی مجلسوں کا ذائقہ بدلتے رہو۔ سو یہاں زندگی کا مزہ بھی انہی کو مل سکتا ہے، جو اس کی شیرینیوں کے ساتھ اس کی تلخیوں کے بھی گھونٹ لیتے رہتے ہیں، اور اس طرح زندگی کا ذائقہ بدلتے رہتے ہیں۔ ورنہ وہ زندگی ہی کیا، جو ایک ہی طرح کی صبحوں اور ایک ہی طرح کی شاموں میں بسر ہوتی رہے۔ خواجہ دردؔ کیا خوب کہہ گئے ہیں:

آجائے ایسے جینے سے اپنا تو جی تنگ

آخر جیے گا کب تلک ، اے خضر! مر کہیں

یہاں پانے کا مزہ انہی کو مل سکتا ہے جو کھونا جانتے ہیں۔ جنھوں نے کچھ کھویا ہی نہیں، انھیں کیا معلوم کہ پانے کے معنی کیا ہوتے ہیں، نظیریؔ کی نظر اسی حقیقت کی طرف گئی تھی:

آنکہ او در کلبۂ احزاں پسر گم کردہ یافت

تو کہ چیزے گم نہ کردی ، از کجا پیدا شود!

اور پھر غور وفکر کا ایک قدم اور بڑھایئے تو خود ہماری زندگی کی حقیقت بھی حرکت واضطراب کے ایک تسلسل کے سوا اور کیا ہے؟ جس حالت کو ہم سکون سے تعبیر کرتے ہیں، اگر چاہیں تو اسی کو موت سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ موج جب تک مضطرب ہے، زندہ ہے، آسودہ ہوئی اور معدوم ہوئی۔ فارسی کے ایک شاعر نے دو مصرعوں کے اندر سارا فلسفۂ حیات ختم کر دیا تھا:

موجیم کہ آسودگی ماعدمِ ماست
ما زندہ از نیم کہ آرام نگیریم!

اور پھر یہ راہ اس طرح بھی طے نہیں کی جاسکتی کہ اس کے لگاؤ کے ساتھ دوسرے لگاؤ بھی لگائے رکھیے۔ راہِ مقصد کی خاک بڑی ہی غیور واقع ہوئی ہے۔ وہ رہرو کی جبینِ نیاز کے سارے سجدے اس طرح کھینچ لیتی ہے کہ پھر کسی دوسری چوکھٹ کے لئے کچھ باقی ہی نہیں رہتا۔ دیکھئے میں نے یہ تعبیر غالبؔ سے مستعار لی:

خاکِ کو یش خود پسند افتاد در جذبِ سجود
سجدہ از بہر حرم نہ گذاشت درے من!

مقصود اس تمام درازنفسی سے یہ تھا کہ آج اپنے اوراقِ فکر پریشاں کا ایک صفحہ آپ کے سامنے کھول دوں:

لختے ز حالِ خویش بہ سیما نوشتہ ایم

اس میکدۂ ہزار شیوہ و رنگ میں ہر گرفتارِ دامِ تخیل نے اپنی خود فراموشیوں کے لئے کوئی نہ کوئی جامِ سرشاری سامنے رکھ لیا ہے اور اسی میں بیخود رہتا ہے:

ساقی بہ ہمہ بادہ زیک خم دہد ، اما
در مجلسِ او مستی ہر یک ز شرابے ست

کوئی اپنا دامن پھولوں سے بھرنا چاہتا ہے، کوئی کانٹوں سے اور دونوں میں سے کوئی بھی پسند نہیں کرے گا کہ تہی دامن رہے۔ جب لوگ کامجوئیوں اور خوش وقتیوں کے پھول چن رہے تھے، تو ہمارے حصے میں تمناؤں اور حسرتوں کے کانٹے آئے۔ انھوں نے پھول چن لئے اور کانٹے چھوڑ دیئے، ہم نے کانٹے چن لیے اور پھول چھوڑ دیے:

ز خارِ زارِ محبت دل ترا چہ خبر
کہ گل بجب نہ گنجد قبائے تنگِ ترا

ابوالکلام

خط نمبر : ۱۹
چڑیا چڑے کی کہانی

قلعۂ احمد نگر

۱۷/ مارچ ۱۹۴۳ء

صدیق مکرم!

زندگی میں بہت سی کہانیاں بنائیں، خود زندگی ایسی گذری جیسے ایک کہانی ہو:

ہے آج جو سرگذشت اپنی
کل اس کی کہانیاں بنیں گی

آیئے، آج آپ کو چڑیا چڑے کی کہانی سناؤں!

دگرہا شنید ستی ، ایں ہم شنو

یہاں کمرے جو ہمیں رہنے کو ملے ہیں پچھلی صدی کی تعمیرات کا نمونہ ہیں۔ چھت لکڑی کے شہتیروں کی ہے اور شہتیروں کے سہارے کے لئے محرابیں ڈال دی ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ جا بجا گھونسلا بنانے کے قدرتی گوشے نکل آئے اور گوریاؤں کی بستیاں آباد ہوگئیں۔ دن بھر ان کا ہنگامہ تگ ودو گرم رہتا ہے۔ کلکتہ میں بالی گنج کا علاقہ چونکہ کھلا اور درختوں سے بھرا ہے، اس لئے وہاں بھی مکانوں کے برآمدوں اور کارنسوں پر چڑیوں کے غول ہمیشہ حملہ کرتے رہتے ہیں، یہاں کی ویرانی دیکھ کر گھر کی ویرانی یاد آگئی:

اُگ رہا ہے در و دیوار سے سبزہ غالبؔ!
ہم بیاباں میں ہیں ، اور گھر میں بہار آئی ہے

گذشتہ سال جب اگست میں یہاں ہم آئے تھے، تو ان چڑیوں کی آشیاں سازیوں نے بہت پریشان کر دیا تھا۔ کمرہ کے مشرقی گوشہ میں منہ دھونے کی ٹیبل لگی ہے۔ ٹھیک اس کے اوپر، نہیں معلوم کب سے ایک پرانا گھونسلا تعمیر پا چکا تھا۔ دن بھر میدان سے تنکے چن چن کر لاتیں اور گھونسلے میں بچھانا چاہتیں۔ وہ ٹیبل پر گر کے اسے کوڑے کرکٹ سے اٹ دیتے۔ ادھر پانی کا جگ بھروا کے رکھا، ادھر تنکوں کی بارش شروع ہوگئی۔ پچھم کی طرف چارپائی دیوار سے لگی تھی، اس کے اوپر نئی

تعمیروں کی سرگرمیاں جاری تھیں۔ ان نئی تعمیروں کا ہنگامہ اور زیادہ عاجز کردینے والا تھا۔ ان چڑیوں کو ذراسی تو چونچ ملی ہے۔ اور مٹھی بھر کا بھی بدن نہیں، لیکن طلب وسعی کا جوش اس بلا کا پایا ہے کہ چند منٹوں کے اندر بالشت بھر کلفات کھود کے صاف کردیں گی۔ حکیم ارشمیدس (Archimedes) کا مقولہ مشہور ہے (Dos moi pau sto kai ten gen kineso) مجھے فضا میں کھڑے ہونے کی جگہ دے دو، میں کرۂ ارضی کو اس کی جگہ سے ہٹا دوں گا۔ اس دعوے کی تصدیق ان چڑیوں کی سرگرمیاں دیکھ کر ہو جاتی ہے۔ پہلے دیوار پر چونچ مار مار کے اتنی جگہ بنالیں گی کہ پنجے ٹیکنے کا سہارا نکل آئے۔ پھر اس پر پنجے جما کر چونچ کا پھاوڑا چلانا شروع کردیں گی اور اس زور سے چلائیں گی کہ سارا جسم سکڑ سکڑ کر کانپنے لگے گا اور پھر تھوڑی دیر کے بعد دیکھیے، تو کئی انچ کلفات اڑ چکی ہوگی۔ مکان چونکہ پرانا ہے، اس لئے نہیں معلوم، کتنی مرتبہ چونے اور ریت کی تہیں دیوار پر چڑھتی رہی ہیں۔ اب مل ملا کر تعمیری مسالہ کا ایک موٹا سا دل بن گیا ہے۔ ٹوٹتا ہے تو سارے کمرے میں گرد کا دھواں پھیل جاتا ہے اور کپڑوں کو دیکھیے، تو غبار کی تہیں جم گئی ہیں۔

اس مصیبت کا علاج بہت سہل تھا، یعنی مکان کی از سرِ نو مرمت کردی جائے اور تمام گھونسلے بند کردیئے جائیں، لیکن مرمت بغیر اس کے ممکن نہ تھی کہ معمار بلائے جائیں، اور یہاں باہر کا کوئی آدمی اندر قدیم رکھ نہیں سکتا۔ یہاں ہمارے آتے ہی پانی کے نل بگڑ گئے تھے۔ ایک معمولی مستری کا کام تھا، لیکن جب تک ایک انگریز فوجی انجینئر کمانڈنگ آفیسر کا پروانہ راہداری لے کر نہیں آیا، ان کی مرمت نہ ہو سکی۔

چند دنوں تک تو میں نے صبر کیا، لیکن پھر برداشت نے صاف جواب دے دیا، اور فیصلہ کرنا پڑا کہ اب لڑائی کے بغیر چارہ نہیں:

من و گرز و میدان و افراسیاب

یہاں میرے سامان میں ایک چھتری بھی آگئی ہے، میں نے اٹھائی اور اعلانِ جنگ کردیا۔ لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد معلوم ہوگیا کہ اس کوتاہ دستی کے ساتھ ان حریفانِ سقف ومحراب کا مقابلہ ممکن نہیں۔ حیران ہو کر کبھی چھتری کی نارسائی دیکھتا، کبھی حریفوں کی بلند آشیانی بے اختیار حافظؔ کا شعر یاد آگیا:

خیالِ قدِ بلندِ تو می کند دل من
تو دستِ کوتۂ من بین و آستینِ دراز

اب کسی دوسرے ہتھیار کی تلاش ہوئی۔ برآمدہ میں جالا صاف کرنے کا بانس پڑا تھا۔ دوڑتا ہوا گیا اور اسے اٹھا لایا۔ اب کچھ نہ پوچھئے کہ میدانِ کارزار میں کس زور کا رن پڑا۔ کمرہ میں چاروں طرف حریف طواف کر رہا تھا اور میں بانس اٹھائے دیوانہ وار اس کے پیچھے دوڑ رہا تھا۔ فردوسی اور نظامی کے رجز بے اختیار زبان سے نکل رہے تھے:

بہ خنجر زمیں رامیستاں کنم
بہ نیزہ ھوا را نیستاں کنم

آخر میدان اپنے ہی ہاتھ رہا اور تھوڑی دیر کے بعد کمرہ ان حریفانِ سقف ومحراب سے بالکل صاف تھا:

بیک تاختن تا کجا تاختم
چہ گردن کشاں راسر انداختم

اب میں نے چھت کے تمام گوشوں پر فتح مندانہ نظر ڈالی اور مطمئن ہو کر لکھنے میں مشغول ہو گیا لیکن ابھی پندرہ منٹ بھی پورے نہیں گذرے ہوں گے کہ کیا سنتا ہوں، حریفوں کی رجز خوانیوں اور ہوا پیمائیوں کی آوازیں پھر اٹھ رہی ہیں۔ سر اٹھا کے جو دیکھا، تو چھت کا ہر گوشہ ان کے قبضہ میں تھا۔ میں فوراً اٹھا اور بانس لا کر پھر معرکۂ کارزار گرم کر دیا:

بر آرم دیار از ھمہ لشکر ش
بہ آتش بسوزم ھمہ کشور ش

اس مرتبہ حریفوں نے بڑی پامردی دکھائی۔ ایک گوشے چھوڑنے پر مجبور ہوتے، تو دوسرے میں ڈٹ جاتے، لیکن بالآخر میدان کو پیٹھ دکھانی ہی پڑی۔ کمرہ سے بھاگ کر برآمدہ میں آئے اور وہاں اپنا لاؤلشکر نئے سرے سے جمانے لگے۔ میں نے وہاں بھی تعاقب کیا اور اس وقت تک ہتھیار ہاتھ سے نہیں رکھا کہ سرحد سے بہت دور تک میدان صاف نہیں ہو گیا تھا۔ اب دشمن کی فوج تتر بتر ہو گئی تھی مگر یہ اندیشہ باقی تھا کہ یہ اندیشہ باقی تھا کہ کہیں پھر اکٹھی ہو کر میدان کا رخ نہ

کرے۔ تجربے سے معلوم ہوا تھا کہ بانس کے نیزہ کی ہیبت دشمنوں پر خوب چھا گئی ہے، جس طرف رخ کرتا تھا، اسے دیکھتے ہی کلمۂ فرار پڑھتے تھے، اس لئے فیصلہ کیا کہ ابھی کچھ عرصہ تک اسے کمرہ میں رہنے دیا جائے۔ اگر کسی اِکّا دُکّا حریف نے رخ کرنے کی جرأت بھی کی، تو یہ سر بہ فلک نیزہ دیکھ کر الٹے پاؤں بھاگنے پر مجبور ہو جائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ سب سے پرانا گھونسلا منہ دھونے کی ٹیبل کے اوپر تھا۔ بانس اس طرح وہاں کھڑا کر دیا گیا کہ اس کا سرا ٹھیک گھونسلے کے دروازے کے پاس پہنچ گیا تھا۔ اب گو مستقبل اندیشوں سے خالی نہ تھا، تاہم طبیعت مطمئن تھی کہ اپنی طرف سے سروسامانِ جنگ میں کوئی کمی نہیں کی گئی، میرؔ کا یہ شعر زبانوں پر چڑھ کر بہت پامال ہو چکا ہے، تاہم موقعہ کا تقاضا ٹالا بھی نہیں جا سکتا:

شکست و فتح نصیبوں سے ہے، ولے اے میرؔ!

مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا!

اب گیارہ بج رہے تھے، میں کھانے کیلئے چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد واپس آیا، تو کمرہ میں قدم رکھتے ہی ٹھٹک کے رہ گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ سارا کمرہ پھر حریف کے قبضہ ہے اور اس اطمینان وفراغت سے اپنے کاموں میں مشغول ہیں، جیسے کوئی حادثہ پیش آیا ہی نہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ جس ہتھیار کی ہیبت پر اس درجہ بھروسہ کیا گیا تھا، وہی حریفوں کی کامجوئیوں کا ایک نیا آلہ ثابت ہوا۔ بانس کا سرا جو گھونسلے سے بالکل لگا ہوا تھا۔ گھونسلے میں جانے کے لئے اب دہلیز کا کام دینے لگا ہے۔ تنکے چن چن کر لاتے ہیں اور اس نو تعمیر دہلیز پر بیٹھ کر بہ اطمینانِ تمام گھونسلے میں بچھاتے جاتے ہیں۔ ساتھ ہی چوں چوں بھی کرتے جاتے ہیں۔ عجب نہیں یہ مصرعہ گنگنا رہے ہوں کہ:

عدو شود سبب خیر گر خدا خواہد

اپنی وہمی فتح مندیوں کا یہ حسرت انگیز انجام دیکھ کر بے اختیار ہمت نے جواب دے دیا۔ صاف نظر آ گیا کہ چند لمحوں کے لئے حریف کو عاجز کر دینا تو آسان ہے مگر ان کے جوشِ استقامت کا مقابلہ کرنا آسان نہیں، اور اب اس میدان میں ہار مان لینے کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں رہا:

بیا کہ، ماسپر انداختیم، اگر جنگ ست!

اب یہ فکر ہوئی کہ ایسی رسم وراہ اختیار کرنی چاہئے کہ ان ناخواندہ مہمانوں کے ساتھ ایک

گھر میں گزارا ہو سکے۔ سب سے پہلے چارپائی کا معاملہ سامنے آیا۔ یہ بالکل نئی تعمیرات کی زد میں تھی، پرانی عمارت کے گرنے اور نئی تعمیروں کے سروسامان سے جس قدر گرد و غبار اور کوڑا کرکٹ نکلتا، سب کا سب اسی پر گرتا، اس لئے اسے اسے دیوار سے اتنا ہٹا دیا گیا کہ براہِ راست زد میں نہ رہے۔ اس تبدیلی سے کمرہ کی شکل ضرور بگڑ گئی لیکن اب اس کا علاج ہی کیا تھا، جب خود اپنا گھر ہی اپنے قبضہ میں نہ رہا، تو پھر شکل و ترتیب اس کی آرائشوں کی کسے فکر ہو سکتی تھی۔ البتہ منہ دھونے کے ٹیبل کا معاملہ اتنا آسان نہ تھا، وہ جس گوشے میں رکھا گیا تھا، صرف وہی جگہ اس کے لئے نکل سکتی تھی، ذرا بھی ادھر ادھر کرنے کی گنجائش نہ تھی، مجبوراً یہ انتظام کرنا پڑا کہ بازار سے بہت سے جھاڑن منگوا کر رکھ لئے اور ٹیبل کی ہر چیز پر ایک ایک جھاڑن ڈال دیا۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد انہیں اٹھا کر جھاڑ دیا تا اور پھر ڈال دیتا۔ ایک جھاڑن اس غرض سے رکھنا پڑا کہ ٹیبل کی سطح کی صفائی برابر ہوتی رہے۔ سب سے زیادہ مشکل مسئلہ فرش کی صفائی کا تھا لیکن اسے بھی کسی نہ کسی طرح حل کیا گیا۔ یہ بات طے کر لی گئی کہ صبح کی معمولی صفائی کے علاوہ بھی کمرے میں بار بار جھاڑو پھر جانا چاہئے۔ ایک نیا جھاڑو منگوا کر الماری کی آڑ میں چھپا دیا۔ کبھی دن میں دو مرتبہ، کبھی تین مرتبہ، کبھی اسے سے بھی زیادہ، اس سے کام لینے کی ضرورت پیش آتی۔ یہاں ہر دو کمرے کے پیچھے ایک قیدی صفائی کے لئے دیا گیا ہے، ظاہر ہے کہ وہ ہر وقت جھاڑو لئے کھڑا نہیں رہ سکتا تھا اور اگر رہ بھی سکتا تو اس پر اتنا بوجھ ڈالنا انصاف کے خلاف تھا، اس لئے یہ طریقہ اختیار کرنا پڑا کہ خود ہی جھاڑو اٹھالیا، اور ہمسایوں کی نظریں بچا کے جلد جلد دو چار ہاتھ مار دیئے۔ دیکھئے ان ناخواندہ مہمانوں کی خاطر تواضع میں کنا سی تک کرنی پڑی:

عشق ازیں بسیار کردست و کند!

ایک دن خیال ہوا کہ جب صلح ہوگئی، تو چاہئے کہ پوری طرح صلح ہو۔ یہ ٹھیک نہیں کہ رہیں ایک ہی گھر میں اور رہیں بیگانوں کی طرح۔ میں نے باورچی خانے سے تھوڑا سا کچا چاول منگوایا۔ اور جس صوفے پر بیٹھا کرتا ہوں، اس کے سامنے کی دری پر چند دانے چھٹک دیئے۔ پھر اس طرح سنبھل کے بیٹھ گیا، جیسے ایک شکاری دام بچھا کے بیٹھ جاتا ہے، دیکھئے عرفی کا شعر صورتِ حال پر کیسا چسپاں ہوا ہے:

فتادم دام بر کنجشک وشادم، یادآں همت
کہ گر سیمرغ می آمد بدام، آزاد میکردم!

کچھ دیر تک تو مہمانوں کی توجہ نہیں ہوئی، اگر ہوئی بھی تو ایک غلط انداز نظر سے معاملہ آگے نہیں بڑھا۔ لیکن پھر صاف نظر آ گیا کہ معشوقانِ ستم پیشہ کے تغافل کی طرح یہ تغافل بھی نظر بازی کا ایک پردہ ہے، ورنہ نیلے رنگ کی دری پر سفید سفید ابھرے ہوئے دانوں کی کشش ایسی نہیں کہ کام نہ کر جائے۔

حور وجنت جلوه برزاهد ده، در راهِ دوست
اندک اندک عشق درکار آورد بیگانه را

پہلے ایک چڑیا آئی اور ادھر ادھر کودنے لگی، بظاہر چہچہانے میں مشغول تھی مگر نظر دانوں پر تھی۔ وحشی یزدی کیا خوب کہہ گیا ہے:

چه لطفها که دریں شیوهٔ نهانی نیست
عنایتے که تو داری بمن، بیانی نیست

پھر دوسری آئی اور پہلی کے ساتھ مل کر دری کا طوف کرنے لگی، پھر تیسری اور چوتھی بھی پہنچ گئی، کبھی دانوں پر نظر پڑتی کبھی دانہ ڈالنے والے پر، کبھی ایسا محسوس ہوتا جیسے آپس میں کچھ مشورہ ہو رہا ہے اور کبھی معلوم ہوتا ہر فرد غور وفکر میں ڈوبا ہوا ہے۔ آپ نے غور کیا ہوگا کہ گوریا جب تفتیش اور تفحص کی نگاہوں سے دیکھتی ہے، تو اس کے چہرے کا کچھ عجیب سنجیدہ انداز ہو جاتا ہے۔ پہلے گردن اٹھا کے سامنے کی طرف دیکھے گی، پھر گردن موڑ کے داہنے بائیں دیکھنے لگے گی۔ پھر کبھی گردن کو مروڑ دے کر اوپر کی طرف نظر اٹھائے گی اور چہرے پر تفحص اور استفہام کا کچھ ایسا انداز چھا جائے گا۔ جیسے ایک آدمی ہر طرف متعجبانہ نگاہ ڈال ڈال کر اپنے آپ سے کہہ رہا ہو کہ آخر یہ معاملہ ہے کیا، اور ہو کیا رہا ہے؟ ایسی ہی متفحص نگاہیں اس وقت بھی ہر چہرہ پر ابھر رہی تھیں:

پایم به پیش از سرِ ایں کونمی رود
یاراں خبر دهید که ایں جلوه گاهِ کیست

پھر کچھ دیر کے بعد آہستہ آہستہ قدم بڑھنے لگے۔ لیکن براہ راست، دانوں کی طرف نہیں۔

آڑے ترچھے ہوکر بڑھتے اور کترا کر نکل جاتے۔ گویا یہ بات دکھائی جارہی تھی کہ خدانخواستہ ہم دانوں کی طرف نہیں بڑھ رہے ہیں۔ دروغِ راست مانند کی یہ نمائش دیکھ کر ظہوری کا شعر یاد آ گیا:

بگو حدیثِ وفا، از تو باور ست، بگو

شوم فدائے دروغے کہ راست مانند ست

آپ جانتے ہیں کہ صید سے کہیں زیادہ صیاد کو اپنی نگرانیاں کرنی پڑتی ہیں، جونہی ان کے قدموں کا رخ دانوں کی طرف پھرا، میں نے دم سادھ لیا، نگاہیں دوسری طرف کرلیں، اور سارا جسم پتھر کی طرح بے حس وحرکت بنالیا، گویا آدمی کی جگہ پتھر کی ایک مورتی دھری ہے کیونکہ جانتا تھا کہ اگر نگاہِ شوق نے مضطرب ہوکر ذرا بھی جلد بازی کی، تو شکار دام کے پاس آتے آتے نکل جائے گا۔ یہ گویا نازِ حسن اور نیازِ عشق کے معاملات کا پہلا مرحلہ تھا:

نہاں ازو بہ رخش داشتم تماشائے

نظر بہ جانب ماکردو شرمسار شدم

خیر، خدا خدا کر کے اس عشوۂ تغافل نما کے ابتدائی مرحلے طے ہوئے اور ایک بت طناز نے صاف صاف دانوں کی طرف رخ کیا۔ مگر یہ رخ بھی کیا قیامت کا رخ تھا، ہزار تغافل اس کے جلو میں چل رہے تھے۔ میں نے بے حس وحرکت بیٹھا دل ہی دل میں کہہ رہا تھا:

بہ ہر کجانا ز سربر آرد، نیاز ہم پائے کم ندارد

تو وخرامے وصد تغافل، من ونگاہے وصد تمنا

ایک قدم آگے بڑھتا تھا، تو دو قدم پیچھے ہٹتے تھے۔ میں جی ہی جی میں کہہ رہا تھا کہ التفات وتغافل کا یہ ملا جلا انداز بھی کیا خوب انداز ہے۔ کاش تھوڑی سی تبدیلی اس میں کی جاسکتی۔ دو قدم آگے بڑھتے، ایک قدم پیچھے ہٹتا۔ غالبؔ کیا خوب کہہ گیا ہے:

وداع ووصل جداگانہ لذتے دارد

ہزار بار برو، صد ہزار بار بیا

التفات وتغافل کی ان عشوہ گریوں کی ابھی جلوہ فروشی ہورہی تھی کہ ناگہاں ایک تنومند چڑے نے، جو اپنی قلندرانہ بے دماغی اور رندانہ جرأتوں کے لحاظ سے پورے حلقہ میں ممتاز تھا،

سلسلۂ کار کی درازی سے اکتا کر بیباکانہ قدم اٹھادیا، اور زبانِ حال سے یہ نعرۂ مستانہ لگاتا ہوا بہ یک دفعہ دانوں پر ٹوٹ پڑا کہ:

زدیم بر صفِ رندان وھرچہ بادا باد

اس ایک قدم اٹھنا تھا کہ معلوم ہوا، جیسے اچانک تمام رکیب ہوئے قدموں کے بندھن کھل پڑے۔ اب نہ کسی قدم میں جھجک تھی، نہ کسی نگاہ میں تذبذب، مجمع کا مجمع بہ یک دفعہ دانوں پر ٹوٹ پڑا اور اگر انگریزی محاورہ کی تعبیر مستعار لی جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ حجاب و تامل کی ساری برف اچانک ٹوٹ گئی یا یوں کہئے کہ پگھل گئی۔ غور کیجئے، تو اس کارگاہِ غم کے ہر گوشہ کی قدم رایناں ہمیشہ اسی ایک قدم کے انتظار میں رہا کرتی ہیں۔ جب تک یہ نہیں اٹھتا، سارے قدم زمین میں گڑے رہتے ہیں، یہ اٹھا اور گویا ساری دنیا اچانک اٹھ گئی:

نامردی و مردی قدمے فاصلہ دارد!

اس بزمِ سود و زیاں میں کامرانی کا جام کبھی کوتاہ دستوں کے لئے نہیں بھرا گیا۔ وہ ہمیشہ انھیں کے حصے میں آیا، جو خود بڑھ کر اٹھا لینے کی جرأت رکھتے تھے۔ شادؔ عظیم آبادی مرحوم نے ایک شعر کیا خوب کہا تھا:

یہ بزمِ مے ہے، یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اٹھالے ہاتھ میں، مینا اسی کا ہے

اس چڑے کا یہ بے باکانہ قدم کچھ ایسا دل پسند واقع ہوا کہ اسی وقت دل نے ٹھان لی، اس مردِ کار سے رسم و راہ بڑھانی چاہیئے۔ میں نے اس کا نام قلندرؔ رکھ دیا کیونکہ بیدماغی اور وارستگی کی سرگرانیوں کے ساتھ ایک خاص طرح کا بانکپن بھی ملا ہوا تھا اور اس کی وضعِ قلندرانہ کو آب و تاب دے رہا تھا:

رہے ایک بانکپن بھی بے دماغی میں تو زیبا ہے
بڑھا دو چینِ ابرو پر ادائے کج کلاہی کو

دو تین دن تک اسی طرح ان کی خاطر تواضع ہوتی رہی۔ دن میں دو تین مرتبہ دانے دری پر ڈال دیتا۔ ایک ایک کر کے آتے اور ایک ایک دانہ چن لیتے، کبھی دانہ ڈالنے میں دیر ہو جاتی تو قلندر

آ کر چوں چوں کرنا شروع کر دیتا کہ وقتِ معہود گزر رہا ہے۔ اس صورت حال نے اب اطمینان دلا دیا تھا کہ پردۂ حجاب اٹھ چکا، وہ وقت دور نہیں کہ رہی سہی جھجک نکل جائے:

اور کھل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں

چند دنوں کے بعد میں نے اس معاملہ کا دوسرا قدم اٹھایا۔ سگرٹ کے خالی ٹین کا ایک ڈھکنا لیا، اس میں چاول کے دانے ڈالے اور ڈھکنا دری کے کنارے رکھ دیا۔ فوراً مہمانوں کی نظر پڑی۔ کوئی ڈھکنے کے پاس آ کر منہ مارنے لگا۔ کوئی ڈھکنے کے کنارے پر چڑھ کر زیادہ جمیعتِ خاطر کے ساتھ چگنے میں مشغول ہو گیا۔ آپس میں رقیبانہ ردّوکد بھی ہوتی رہی۔ جب دیکھا کہ اس طریق ضیافت سے طبیعتیں آشنا ہو گئی ہیں، تو دوسرے دن ڈھکنا دری کے کنارے سے کچھ ہٹا کر رکھا۔ تیسرے دن اور زیادہ ہٹا دیا اور بالکل اپنے سامنے رکھ دیا۔ گویا اس طرح بتدریج بعد سے قرب کی طرف معاملہ بڑھ رہا تھا۔ دیکھیے، بعد قرب کے معاملہ نے عُلَیہ بنت المہدی کا مطلع یاد دلایا:

وَحَبِّب ، فَانّ الحُب دَاعِیة الحُب

وَکَم مِن بَعِید الدَّارِ مُستوجِب القُرب

اتنا قُرب دیکھ کر پہلے تو مہمانوں کو کچھ تامل ہوا۔ دری کے پاس آ گئے مگر قدموں میں جھجک تھی اور نگاہوں میں تذبذب بول رہا تھا لیکن اتنے میں قلندرؔ اپنے قلندرانہ نعرے لگاتا ہوا آ پہنچا اور اس کی رندانہ جرأتیں دیکھ کر سب کی جھجک دور ہو گئی، گویا اس راہ میں سب قلندر رہی کے پیرو ہوئے۔ جہاں اس کا قدم اٹھا، سب کے اٹھ گئے۔ وہ دانوں پر چونچ مارتا، پھر سر اٹھا کے اور سینہ تان کے زبانِ حال سے مترنم ہوتا:

وَمَا الدّھر ، اِلّا مِن رُولۃِ قصائِدی

اِذا قُلتُ شعراً ، اَصبح الدّھر مُنشد

جب معاملہ یہاں تک پہنچ گیا، تو پھر ایک قدم اور اٹھایا گیا اور دانوں کا برتن دری سے اٹھا کے تپائی پر رکھ دیا۔ یہ تپائی میرے بائیں جانب صوفے سے لگی رہتی ہے اور پوری طرح میرے ہاتھ کی زد میں ہے۔ اس تبدیلی سے خوگر ہونے میں کچھ دیر لگی، بار بار آتے اور تپائی کے چکر لگا کے

چلے جاتے۔ بالآخر یہاں بھی قلندر ہی کو پہلا قدم بڑھانا پڑا اور اس کا بڑھنا تھا کہ یہ منزل بھی پچھلی منزلوں کی طرح سب پر کھل گئی۔ اب تپائی کبھی تو ان کی مجلس آرائیوں کا ایوانِ طرب بنتی، کبھی باہمی معرکہ آرائیوں کا اکھاڑا۔ جب اس قدر نزدیک آجانے کے خوگر ہو گئے، تو میں نے خیال کیا، اب معاملہ کچھ اور بڑھایا جا سکتا ہے۔ ایک دن صبح یہ کیا کہ چاول کا برتن صوفے پر ٹھیک اپنی بغل میں رکھ دیا اور پھر لکھنے میں اس طرح مشغول ہو گیا، گویا اس معاملہ سے کوئی سروکار نہیں:

دل وجانم بتا مشغول ونظر بر چپ وراست

تانه دانند رقیبان که تو منظورِ منی!

تھوڑی دیر کے بعد کیا سنتا ہوں کہ زور زور سے چونچ مارنے کی آواز آرہی ہے، کنکھیوں سے دیکھا، تو معلوم ہوا کہ ہمارا پرانا دوست قلندر پہنچ گیا ہے، اور بے تکان چونچ مار رہا ہے۔ ڈھکنا چونکہ بالکل پاس دھرا تھا، اس لئے اس کی دم میرے گھٹنے کو چھو رہی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد دوسرے یارانِ تیز گام بھی پہنچ گئے؛ اور پھر تو یہ حال ہو گیا کہ ہر وقت دو تین دوستوں کا حلقۂ بے تکلف میری بغل میں اچھل کود کرتا رہتا۔ کبھی کوئی صوفے کی پشت پر چڑھ جاتا، کبھی کوئی جست لگا کر کتابوں پر کھڑا ہو جاتا، کبھی نیچے اتر آتا اور چوں چوں کر کے پھر واپس آجاتا۔ بے تکلفی کی اس اچھل کود میں کئی مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ میرے کاندھے کو درخت کی ایک جھکی ہوئی شاخ سمجھ کر اپنی جست وخیز کا نشانہ بنانا چاہا لیکن پھر چونک کر پلٹ گئے یا پنجوں سے اسے چھوا اور اوپر ہی اوپر نکل گئے۔ گویا ابھی معاملہ اس منزل سے آگے نہیں بڑھا تھا جس کا نقشہ وحشی یزدی نے کھینچا ہے:

هنوز عاشقی ودلربائیے نه شده است

هنوز زوری ومرد آزمانیے نه شد است

همیں تواضعِ عام ست حسن رابا عشق

میانِ نازونیاز آشنائیے نه شده است

بہر حال رفتہ رفتہ ان آہوانِ ہوائی کو یقین ہو گیا کہ یہ صورت جو ہمیشہ صوفے پر دکھائی دیتی ہے، آدمی ہونے پر بھی آدمیوں کی طرح خطرناک نہیں ہے۔ دیکھئے، محبت کا افسوں جو انسانوں کو

رام نہیں کرسکتا۔ وحشی پرندوں کو رام کرلیتا ہے:

درس وفا اگر بود زمزمۂ محبتے
جمعہ بمکتب آورد طفل گریزپاے را

بارہا ایسا ہوا کہ میں نے اپنے خیالات میں محو، لکھنے میں مشغول ہوں۔ اتنے میں کوئی دلنشیں بات نوکِ قلم پر آگئی یا عبارت کی مناسبت نے اچانک کوئی پرکیف شعر یاد دلا دیا اور بے اختیار اس کی کیفیت کی خودرفتگی میں میرا سر وشانہ ہلنے لگا یا منھ سے ''ہا'' نکل گیا۔ اور یکا یک زور سے پروں کے اُڑنے کی ایک پھرسی آواز سنائی دی۔ اب جو دیکھتا ہوں تو معلوم ہوا کہ ان یارانِ بے تکلف کا ایک طائفہ میری بغل میں بیٹھا بے تامل اپنی اچھل کود میں مشغول تھا۔ اچانک انھوں نے دیکھا کہ یہ پتھر اب ہلنے لگا ہے، تو گھبرا کر اڑ گئے، عجب نہیں، اپنے جی میں کہتے ہوں، یہاں صوفے پر ایک پتھر پڑا رہتا ہے لیکن کبھی کبھی آدمی بن جاتا ہے!

فیض کے خطوط

فیض احمد فیض

(۱۹۱۱ء - ۱۹۸۴ء)

ایلس کے نام

۲/جنوری، ۱۹۵۲ء

تمہیں اور تمہارے گھرانے کو نیا سال مبارک اور خدا کرے کہ یہ سال تمہارے مصیبتوں کے خاتمے کا دن جلد قریب لائے۔ آج تمہارے دو خط ملے مجھے افسوس ہے کہ میرا گذشتہ خط تاخیر سے بھیجا گیا۔ غالباً اب تک پہنچ گیا ہوگا۔ اور نئے سال تار بھی تمہارے ۲۳/تاریخ کے خط سے سب لوگ بہت محظوظ ہوئے۔ خاص طور سے فلم والے حصے سے شاید میں تمہیں پہلے بھی لکھ چکا ہوں کہ یہاں کے ہنگاموں میں ایک تو یہ فکر دامن گیر ہے کہ رہائی کے بعد ہم جیل خانے کا سا معیار زندگی کیسے قائم رکھ سکیں گے اور دوسرے یہ کہ اس بے وجہ شہرت کے مستحق کیونکر ٹھہریں گے جو ہمیں ملتی جا رہی ہے۔

چھٹیاں ختم ہوگئی ہیں اور عدالتی معمولات شروع ہو چکے ہیں۔ اپنے کو روز عدالت میں گھسیٹنا

بہت نا گوار لگتا ہے۔ یہ سب تضیع اوقات قطعی نا قابلِ معافی ہے۔ خاص طور سے جب زندگی اتنی مختصر ہے اور کرنے کو اتنا کچھ رکھا ہے۔ انگریز ہمارے لئے جو قانونی چھوڑ گئے ہیں اس کے بلاشبہ کچھ اچھے پہلو بھی ہیں بلکہ بہت سے اچھے پہلو ہیں۔ لیکن اس کی تھکا دینے والی اور لامتناہی رسومات پر (جن کا مقصد تو بے گناہوں کی حمایت ہے) وقت اور پیسے کا اس قدر بے دریغ اصراف ہوتا ہے کہ ایک عام انسان کا صبر اور پیسہ دونوں محدود ہوں ان کی تاب نہیں لاسکتا۔

اب تمہیں یہاں کا حال سنائیں۔ عدالت بند ہونے کے سبب پورا دن اور سارا وقت اپنا تھا جب تک جی چاہے بستر پر پڑے رہو۔ جو رئیسوں کی شان ہے۔ (اگرچہ میں نے اس سے زیادہ فائدہ نہیں اٹھایا)۔ دن کا آغاز ناشتے کے بعد بیڈمنٹن کی ایک تیز بازی سے ہوتا۔ اس کے بعد ٹھنڈے پانی سے غسل (سنتی ہو ٹھنڈے پانی سے) اس کے بعد ہم سب اپنے ہمسایوں کے ہاں کافی اور گپ سپ کے لئے جاتے ہیں، ان کی بارک ''خانقاہ'' کہلاتی ہے۔ اس لئے وہاں بریگیڈیر لطیف خان مقیم ہیں جنہیں ہمارے گروہ میں صوفی بزرگ کا مقام حاصل ہے۔ ہماری بارک ''سرائے'' کہلاتی ہے۔ اس لئے کہ یہاں ہر وقت غل غپاڑہ رہتا ہے۔ کافی کے بعد سب دوپہر کے کھانے کے لئے ہماری بارک میں واپس آجاتے۔ کھانے کے بعد شطرنج کی ایک بازی اور اس کے بعد لوگ سونے یا غور وفکر کے لئے اپنے اپنے کمروں میں چلے جاتے۔ اس کے بعد چائے اور کھیل۔ کھیل کے فوراً بعد میرے دیوان خانے میں شبانہ محفل جمتی ہے (آج کل میں محفل کو شیکسپیئر پڑھ کے سناتا ہوں) پھر کھانے کی گھنٹی بجتی اور کھانے کے بعد لوگ ریڈیو سنتے یا گپ کرتے ہیں۔

کرسمس کے دن بیگم جنجوعہ[1] نے ایک بڑا سا کرسمس کیک، کچھ غبارے اور جھنڈیاں بھیج دیں۔ اور میں نے چپکے سے پر تکلف کھانے کا آرڈر دے دیا۔ (جیل خانے میں آرڈر دینا شائد تمہیں عجیب لگتا ہو لیکن یہاں تو ایسا ہی ہے) شام کے لئے مشاعرہ پہلے سے طے تھا ایک کوٹھری خاص طور سے مزّین کی گئی اور جناب محترم جنرل نذیر صاحب کی صدارت میں مشاعرہ منعقد ہوا۔ بالکل سچ مچ کا مشاعرہ معلوم ہوتا تھا۔ کل نئے سال کی تہنیت کا ایک بہت ہی محبت بھرا خط بنّے کی بیگم سے وصول ہوا، جسے پڑھ کر دل بھر آیا۔ اس دنیا میں بہت سی بدی کے باوجود اتنی نیکی اپنے حصے میں آئی ہے کہ اس کا حق ہم کبھی ادا نہیں کرسکتے۔

---

[1] جیل کے ساتھی ایئر کموڈور جنجوعہ کی بیگم

ایلس کے نام

۱۱ مئی ۱۹۵۲ء

گزشتہ اتوار کو تمہیں اس لئے نہیں لکھا کہ تمہارے خط کا انتظار تھا اور وہ منگل کے دن پہنچا۔ جی چاہا کہ تمہیں تار پھر بھیجوں اس لئے کہ ہر وقت خیال اُدھر لگا رہتا ہے۔ ویسے میں جانتا ہو کہ آج کل وہاں موسم اتنا گرم اور ناخوشگوار ہوگا کہ محض جیتے رہنا ہی بڑا کارنامہ معلوم ہوتا ہوگا۔ درجۂ حرارت کے اعتبار سے ہمارا شہر قریب قریب اوّل نمبر پر ہے۔ لیکن یہاں کی راتوں سے اس کی کچھ تلافی ہوجاتی ہے۔ یہاں دن میں بھی زیادہ گرمی اس لئے محسوس نہیں ہوتی کہ ہوا چلتی رہتی ہے۔ لیکن بدقسمتی سے ہوا کے معنی ریت اور گردوغبار کے بھی ہیں۔ مانو یا نہ مانو میں دن میں چار مرتبہ نہاتا ہوں لیکن پھر بھی چند منٹ کے علاوہ صفائی کا احساس نہیں ہوتا۔

یہ سن کر خوشی ہوئی کہ تمہارے پاس چند باوفا لوگ ابھی باقی ہیں۔ اپنے آس پاس تو اتنے بھی نہیں۔ جو ہیں وہ دور فاصلوں پر ہیں اور اپنی دوری قائم رکھتے ہیں۔ البتہ کبھی کبھی قطعی اجنبی لوگوں سے دوستی اور خلوص کا کوئی نہ کوئی پیغام یہاں پہنچ جاتا ہے اور اطمینان ہوتا ہے کہ دنیا نے ہمیں بالکل فراموش نہیں کیا۔

تمہارے عورتوں اور بچوں کے صفحے کے لئے کچھ تجاویز بہت دن ہوئے تمہیں بھیج چکا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ عورتوں کے صفحے میں بلکہ سارے اخبار میں ایک چیز کی کمی ہے اور وہ ہے حقائق اور اعداد وشمار کا عنصر۔ امریکنوں کو اور کچھ بھی کہیں اس ایک کام میں انہیں کمال حاصل ہے اور اس بارے میں ان سے بہت کچھ سیکھنا چاہئے۔ حقائق سے زیادہ وزنی کوئی دلیل نہیں اور حقائق کے بغیر بہت ہی عالمانہ استدلال بھی کھوکھلا معلوم ہوتا ہے۔ تو میری تجویز یہ ہے، عورتوں کی معاشرتی زندگی کے کسی ایک پہلو کو لے لو۔ مثلاً صحت۔ اس مسئلے کے عام پہلو یہ ہیں۔ صوبے کی کل زنانہ آبادی کے اعداد وشمار۔ یہ مردم شماری کی نئی رپورٹ میں سے مل سکتے ہیں، یا گزشتہ رپورٹ کی بناء پر ان کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ پھر یہ دیکھو کہ صوبے میں بیمار عورتوں کے لئے ہسپتالوں میں کل کتنے پلنگ ہیں۔ لیڈی ڈاکٹروں کی تعداد کتنی ہے۔ نرسوں اور زیر تربیت طبی عملے کی تعداد کیا ہے۔ یہ سب اعداد وشمار محکمۂ صحت دستیاب ہوسکتے ہیں۔ پھر ان سہولتوں کو کل آبادی پر تقسیم کرو تو غالباً یہ پتہ

چلے گا کہ بیس ہزار عورتوں کے حصے میں ایک پلنگ آتا ہے اور ایک لیڈی ڈاکٹر۔ غالباً اس سے بھی زیادہ تعداد کی دیکھ بھال کرتی ہے۔ اس کے بعد اس عام مسئلے کا کوئی پہلو لیا جاسکتا ہے۔ مثلاً ایک دو عام بیماریوں کو لے لو جیسے تپ دق یا زچگی اسی طرح کسی خاص علاقے کا انتخاب کرلو جو اوسط علاقہ قرار دیا جاسکے جیسے لاہور یا آس پاس کے کسی ضلعے کے اعداد و شمار حاصل کرلو۔ تپ دق کے مریضوں کے کتنے ڈاکٹر، نرسیں اور پلنگ موجود ہیں۔ اس کا پتہ آسانی سے چل سکتا ہے۔ مریضوں کی ماہانہ یا سالانہ تعداد بھی دریافت کی جاسکتی ہے۔ پھر یہ دیکھو کہ تپ دق کے ایک مریض کے علاج پر اوسط خرچ کتنا آتا ہے اور ان طبقوں کے گھریلو بجٹ میں جو اس مرض سے سب سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں اس خرچ کے لئے کتنی گنجائش نکلتی ہے اسی طرح کارپوریشن کے دفتر سے روزانہ ولادت کے اعداد و شمار مل سکتے ہیں جن سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ کتنے نومولود اور کتنی زچائیں طبی امداد سے محروم رہتی ہیں۔ اسی طریقے سے تعلیم کے مسئلے پر بحث کی جاسکتی ہے۔ ناخواندہ عورتوں کی تعداد کا اندازہ لگایا جاسکتا اور پھر اس تعداد کا مقابلہ ان نمائشی سرگرمیوں سے کیا جاسکتا ہے جن کا اشتہار (اپوا) اسی قسم کی تنظیمیں دیتی رہتی ہیں۔ لیکن شاید بالغ ناخواندگی کا مسئلہ ایسا اہم نہیں زیادہ اہم مسئلہ یہ ہے کہ تعلیمی سہولتوں کی کمی کی وجہ سے ہم ہر نسل کے کتنے حصّے کو جہالت اور ناخواندگی پر مجبور کرتے ہیں۔ شہر میں بچوں کی کل آبادی کا اندازہ کرو اور پھر شہر کی لڑکیوں کے تمام اسکولوں میں جتنی گنجائش ہے اس سے مقابلہ کرو غالباً یہی ثابت ہوگا کہ دس فیصدی سے زیادہ بچوں کے لئے کوئی تعلیمی سہولت موجود نہیں۔ اس کے علاوہ سرکاری مدارس کی حالتِ زار کا بیان بھی کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً بلدیہ لاہور کے پرائمری اسکول میں جہاں جون کی دھوپ میں بچیاں بغیر کسی سائے کے تپتے ہوئے فرش پر بیٹھ کر پڑھتی ہیں۔ استانی کی نشست کے لئے چند اینٹوں کا ڈھیر رکھا ہے اور متفرق اخراجات کے لئے صدر معلّمہ کو آٹھ آنے ماہانہ کی شاہانہ رقم ملتی ہے۔ پھر یونیورسٹی سے یہ دریافت کیا جاسکتا ہے کہ ہر سال کتنی لڑکیاں تعلیم سے فارغ ہوکر نکلتی ہیں۔ بی۔ اے پاس کرنے والی لڑکیوں کو ہی لے لو اور یہ دیکھو کہ ان میں سے کتنی لڑکیاں ملازمت حاصل کرسکتی ہیں۔ اور جو دو چار پیشے لڑکیوں کے لئے کھلے ہیں ان میں ملازمت کی کل گنجائش کتنی ہے۔ غالباً یہی پتہ چلے گا کہ پانچ دس فیصد سے زائد گریجویٹ لڑکیوں کو کسی صورت روزگار میسر نہیں آسکتا۔ کم تعلیم یافتہ لڑکیوں کا تو ذکر

ہی کیا وغیرہ وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک آدمی کا کام نہیں ہے اور ایک دن میں ہو بھی نہیں سکتا لیکن کچھ لوگ مل کر تحقیق کریں تو یہ کچھ ایسی مشکل بات بھی نہیں۔

تمہارے بچوں کی انجمن کے بارے میں ایک تجویز ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ کسی معقول رہنما کی نگرانی میں ان کیلئے مقامی تعلیمی سیر وتفریح کا پروگرام بنایا جا سکے۔ میری مراد یہ ہے کہ عجائب گھر، چڑیا گھر، مغل عمارتیں، فوج اور فضائیہ کے ادارے، میو ہسپتال، انجینیرنگ کالج وغیرہ وغیرہ دکھانے کے لئے اور ہر جگہ کے بارے میں مناسب معلومات بہم پہنچانے کے لئے کوئی پروگرام بنایا جائے۔ غالباً تھوڑی سی بھاگ دوڑ سے کسی سستی سی سواری کا انتظام بھی کیا جا سکتا ہے اور اگر انتظامات کے لئے کہیں سے امداد مل سکے تو یہ بہت ہی اچھا خیال ثابت ہو سکتا ہے۔ مٹھائی اور آئس کریم وغیرہ شامل کر لو تو اسے کاروباری طریقے سے بھی چلایا جا سکتا ہے۔

یہاں کچھ دن ہوئے ہمارے خاندان میں ایک اضافے کی خوشخبری سنائی گئی۔ معلوم ہوا کہ ہماری بلی نے پھر بچے دیئے ہیں۔ اب کے تین ہیں، دو سفید اور ایک چتکبرا۔ بدقسمتی سے مجھے بلیاں پسند نہیں (انسانی ہوں یا حیوانی) لیکن میرے ساتھیوں کو جو اپنی بلیوں پر جان دیتے ہیں۔ ہماری یہ عدم دلچسپی بہت بری لگتی ہے۔

نظم اور کلامِ موزوں کے باب میں

مولانا محمد حسین آزاد

(۱۸۳۰ء - ۱۹۱۰ء)

اے میرے اہلِ وطن! مجھے بڑا افسوس اس بات کا ہے کہ عبارت کا زور مضمون کا جوش و خروش اور لطائف وصنائع کے سامان، تمہارے بزرگ اس قدر دے گئے ہیں کہ تمہاری زبان کسی سے کم نہیں۔ کمی فقط اتنی ہے کہ وہ چند بے موقع احاطوں میں گھر کر محبوس ہو گئے ہیں۔ وہ کیا؟ مضامین عاشقانہ ہیں جس میں کچھ وصل کا لطف، بہت سے حسرت و ارمان، اس سے زیادہ ہجر کا رونا، شراب، ساقی، بہار، خزاں، فلک کی شکایت اور اقبال مندی کی خوشامد ہے۔ یہ مطالب بھی بالکل خیالی ہوتے ہیں اور بعض دفعہ ایسے پیچیدہ اور دور دور کے استعاروں میں ہوتے ہیں کہ عقل کام نہیں کرتی۔ وہ اسے خیال بندی اور نازک خیالی کہتے ہیں اور فخر کی مونچھوں پر تاؤ دیتے ہیں۔ افسوس یہ ہے ان محدود دائروں سے ذرا بھی نکلنا چاہیں تو قدم نہیں اُٹھا سکتے۔ یعنی اگر کوئی واقعی سرگزشت یا علمی مطلب یا اخلاقی مضمون نظم کرنا چاہیں تو اس کے بیان میں بدمزہ ہو جاتے ہیں۔

پس ہمیں اس اس سے زیادہ کیا افسوس ہوگا کہ ہم اپنے مزاروں کو بے اصل اور معدوم باتوں میں ضائع کرتے ہیں اور جواہر کے خزانے کام کی جگہ نہیں لگا سکتے، بے جگہ لٹاتے ہیں۔ کیسی حسرت آتی ہے، جب میں زبان انگریزی میں دیکھتا ہوں کہ ہر قسم کے مطالب و مضامین کو نثر سے زیادہ خوب صورتی کے ساتھ نظم کرتے ہیں اور حق یہ ہے کہ کلام میں جان ڈالتے ہیں اور مضمون کی جان پر احسان کرتے ہیں لیکن ہمیں کیا؟ سن کر ترسیں، اپنے تئیں دیکھ کر شرمائیں۔ کاش! ہم جو ٹوٹی پھوٹی نثر لکھتے ہیں، اتنی ہی قدرت نظم پر بھی ہو جاوے جس کے اعلیٰ درجے کے نمونے انگریزی میں موجود ہیں، پھر بھی ہم دیکھتے ہیں ہمارے بزرگ ردیف و قافیہ کے ساتھ ایسی دل پسند بحریں اور نازک خیالوں کے سامان ہمارے لئے چھوڑ گئے ہیں کہ اگر ہمت کریں تو کسی سے پیچھے نہ رہیں۔

اے میرے اہلِ وطن! ہمدردی کی آنکھیں آنسو بہاتی ہیں، جب مجھے نظر آتا ہے کہ چند روز میں اس رائج الوقت نظم کا کہنے والا بھی کوئی نہ رہے گا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ بہ سبب بے قدری کے اور کہنے والے پیدا نہ ہوں گے۔ کئی پرانی مورتیں باقی ہیں، وہ چراغ سحری ہیں۔ انجام یہ کہ زبان ہماری ایک دن نظم سے بالکل محروم ہوگی اور اردو میں نظم کا چراغ گل ہوگا۔

میرے اہلِ وطن! آؤ آؤ، برائے خدا اپنے ملک کی زبان پر رحم کرو۔ اُٹھو اُٹھو، وطن اور اہلِ وطن کی قدیمی ناموری کو بربادی سے بچاؤ۔ تمہاری شاعری جو چند محدود احاطوں میں بلکہ چند زنجیروں میں مقید ہو رہی ہے، اس کے آزاد کرنے میں کوشش کرو۔ نہیں تو ایک زمانہ تمہاری اولاد ایسا پائے گی کہ ان کی زبان شاعری کے نام سے بے نشان ہوگی اور اس فخر آبائی اور بزرگوں کی کمائی سے محروم ہونا بڑے افسوس کا مقام ہے۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ سر دست یہ کام کچھ مشکل ہے کیونکہ ان محدود احاطوں میں جو کچھ موجود ہے، وہ ڈیڑھ سو برس سے آج تک بڑے بڑے سحر البیان فصیحوں نے شام کو صبح اور صبح کو شام کر کے پیدا کیا ہے۔ دلوں کے خون اور دماغوں کے روغن پسینے کر کے بہائے ہیں۔ جب یہ دل پسند خیالات، شستہ الفاظ، پاکیزہ ترکیبیں، خوش نما تراشیں، مضمون کی گرمیاں، انداز کی شوخیاں پیدا ہوئی ہیں کہ سننے والوں کے کانوں میں رس ڈالتی ہیں۔ اگر کوئی موزوں طبع چاہے کہ عام چیزیں جو آنکھ کے سامنے ہیں، ان میں سے جس کو چاہے لے لے اور ان پر شاعری خرچ کر کے وہی لطف

کلام میں پیدا کرے تو آج نہایت مشکل بات ہے۔ تمام عالم کی تعریفیں اور ہمارے شکریے ان مزاروں پر پھول برساتے ہیں، جن کے سونے والوں نے انہیں چھوٹے چھوٹے احاطوں میں وہ کچھ کیا کہ سالہا سال چاہیں جو ویسے لوگ پیدا ہوں، ویسی کوشش کریں اور ویسے ہی لطیف اور خوش آئند انداز عموماً زبان میں پیدا کریں۔

تو بھی ہمیں مایوس نہ ہونا چاہیے۔ اگر کوشش کریں گے تو ہم بھی کچھ نہ کچھ کر رکھیں گے کیونکہ دِلی دن بھر میں گلزار نہیں ہوگئی تھی، اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ وہ مضامین جو اب تک ان احاطوں کو آباد کر رہے ہیں، وہ خود اس قیامت کا مضمون ہیں، جن میں شیطان ملعون نے اپنے سارے مزے کوٹ کوٹ کر بھر دیئے ہیں۔ اگر کسی شاعر کی زبان میں قدرتی لذت کم ہو تو بھی مضامین مذکورہ اپنی گرمی میں رنجک کی طرح شعر کو لے اُڑتے ہیں۔ البتہ عام مضامین میں ایسی چمک دمک پیدا کرنے کے لئے ایک قدرتی قوت زبان و بیان اور اصلی فصاحت اعلیٰ درجہ کی چاہیئے، تب ہر ایک مضمون کو ویسا ہی گرمائے جس سے سننے والوں کا دل پھڑک کر لوٹ جائے۔ اگرچہ مدت سے مجھے اور اکثر اہلِ وطن کو اس کا خیال ہے مگر اب تقریر میں آنے کا باعث یہ ہے کہ دیکھتا ہوں کہ آج کل ہماری گورنمنٹ اور ان ارا کین کو اس طرف توجہ ہوئی ہے، جن کے دل ہماری تعلیم کا ذمہ اُٹھائے ہوئے ہیں۔ حق پوچھو تو ہماری انشا کے ستارۂ اقبال کی مبارک ساعت ہے۔ اس موقعہ پر ہماری تھوڑی کوشش بھی بہت سا اثر کرے گی۔

میرے اہلِ وطن! تمہاری جماعت دو فرقوں سے مرکب ہے۔ ایک ہندو، ایک مسلمان۔ تم جانتے ہو۔ ہندو کون ہیں؟ ہندو وہ ہیں کہ آج ہم جس بات کی آرزو کرتے ہیں، وہ ان کی زبان کا اصلی جوہر ہے۔ اگر بھاشا ہے تو وہ اصلی حالتوں کے ادا کرنے میں سب پر فائق ہے۔ سنسکرت کی قوتِ نظم خود حد بیان سے باہر ہے کیونکہ مضامین شاعرانہ در کنار، اس نے تاریخ سے لیکر جغرافیہ، طب، منطق، فقہ تک جس علم کو لیا، نظم کی جنتری میں کھینچ لیا۔ دوسرا جزو مسلمان، جن کی اصل عرب، عربی وہ زبان ہے جس میں مرد تو بالائے طاق، گھروں کی عورتیں بلکہ لونڈیاں، جب اپنی جوش تقریر پر آتی تھیں، تو ان کا کلام ایک پُر زور نظم ہو جاتا تھا۔ کیا یہ افسوس کی بات نہیں کہ ایسے بزرگوں کی اولاد اپنے بزرگوں کی میراثوں سے محروم ہو۔ کیا یہ حیف کی جگہ نہیں کہ آج ہماری زبان حرف تاثیر سے

خالی ہو، کیا یہ رنج کی جگہ نہیں کہ اوروں کے سامنے ہماری زبان ضعف بیان کے ساتھ ہزار نقصوں سے مطعون ہو۔ اے خاک ہندوستان! اگر تجھ میں امرؤالقیس اور لبید نہیں تو کالی داس ہی نکال۔

اے ہندوستان کے صحراۓ دشت! فردوسی اور سعدی نہیں تو کوئی والمیک ہی پیدا کردو، جاننے والے جانتے ہیں کہ شاعری کے لئے اول قدرتی جوہر بعد اس کے چند تحصیلی اور علمی لیاقتیں چاہئیں۔ بعد اس کے شوق کامل اور مشق دوامی، میں نثر کے میدان میں بھی سوار نہیں، پیادہ ہوں اور نظم میں خاک اُفتادہ مگر سادہ لوحی دیکھو کہ ہر میدان میں دوڑنے کو آمادہ ہوں۔ یہ فقط اس خیال سے ہے کہ میرے وطن کے لئے شاید کوئی کام کی بات نکل آئے۔ میں نے آج کل چند نظمیں مثنوی کے طور پر مختلف مضامین میں لکھی ہیں، جنہیں نظم کہتے ہوئے شرمندہ ہوں اور ایک مثنوی جورات کی حالت پر لکھی ہے، اس وقت گذارش کرتا ہوں۔

۱۸۵۷ء کا غدر

سر سیّد احمد خاں

(۱۸۱۷ء - ۱۸۹۸ء)

آخر فوجی سپاہیوں کی غیرت نے جوش مارا اور انہوں نے اپنی ذلت کا انتقام لینے کے لئے فیصلہ کرلیا کہ فوری کاروائی عمل میں لائی جائے۔ چنانچہ طے پایا کہ ۱۰ ارمئی کی شام کو اتوار کے دن جب گورے گرجے گئے ہوئے ہوں تو قیدیوں کو چھڑانے کے لئے جنگِ آزادی کا اعلان کر دیا جائے۔ اس منصوبے کے مطابق ۱۰ ارمئی کی شام کو جوں ہی گرجے کا گھنٹہ بجنا شروع ہوا، رسالے نے جیل خانے پر دھاوا بول دیا اور قیدیوں کو آزاد کرالیا۔ یہ جنگِ آزادی کا پہلا اعلان تھا اور سو سال کی غلامی کے بعد اس ملک کی فوج نے بالآخر غیر ملکی اقتدار کے جوئے کو اتارنے کا فیصلہ کرلیا۔ انگریزوں کو جب پتہ چلا تو انہوں نے مقابلے کی تیاری کی، لیکن ہندوستانی سپاہی ادھر ادھر ہو چکے تھے اور انھوں نے دہلی کا رخ اختیار کیا اور میرٹھ میں کچھ شر پسند عناصر نے قتل و غارت گری کا بازار گرم کر دیا۔ انگریز افسروں کے بنگلوں کو آگ لگادی اور جہاں جہاں فوج کی بغاوت کی خبر پھیلی۔ انگریزوں کے مارے ہوئے وہ ستم رسیدہ جن کی جاگیریں، جن کے وظائف ضبط کئے گئے ایک

ایک کر کے میدان میں نکل پڑے اور سب نے اپنا رخ دہلی کی طرف کیا۔ ہندو اور مسلمان فوجیوں میں بڑا اتحاد تھا اور انہوں نے متفقہ طور پر بہادر شاہ ظفر کو اپنا رہنما تسلیم کیا۔ عوام کا ایک بڑا طبقہ بہادر شاہ سے عقیدت رکھتا تھا۔ اس جنگ میں سکھوں اور پارسیوں کے علاوہ قریب قریب ہر قوم کے لوگ شریک تھے اور تقریباً اٹھارہ ماہ دہلی اور ملک کے مختلف حصوں میں بغاوت کے شعلے بلند ہوتے رہے۔ علمائے کرام نے بغاوت کو جہاد کا نعرہ دیا۔ حضرت مولانا فضل حق خیر آبادی جمعہ کے دن جامع مسجد میں جہاد کے فتوے پر علمائے کرام کے دستخط کراتے ہیں۔ سہارنپور میں مولانا محمد قاسم، مولانا امداد اللہ مہاجر کی، مولانا رشید احمد گنگوہی انگریزی فوج کا مقابلہ کرتے ہیں۔ غرض پورے ملک میں جہاں جہاں بغاوت کی آگ بھڑکتی ہے مسلمان پیش پیش نظر آتے ہیں۔ دلی میں ۱۳/ مئی کو جو دربار ہوتا ہے اس میں شریک ہونے والے بھی اکثر و بیشتر مسلمان ہوتے ہیں اور بہادر شاہ کی طرف سے ان کو خطابات اور خلعت دیئے جاتے ہیں۔ جنرل بخت خاں کو تمام افواج کا کمانڈر بنایا جاتا ہے اور جب پہلے پہل انقلاب کا شعلہ میرٹھ میں بھڑکا تو اس میں بھی پچاسی سپاہیوں میں ۴۹ مسلمان اور ۳۶ غیر مسلم تھے اور پھر ان سپاہیوں کے جرم کا فیصلہ کرنے کے لئے جو فوجی عدالت قائم ہوتی ہے اس میں انگریزوں کو اپنے اعتماد کے نو ہندو اور چھ مسلمان ہیں اور ان کا یہ خیال یقین کی حد تک پہنچ گیا کہ از روئے مذہب مسلمانوں پر یہ فرض ہے کہ وہ غیر سے جہاد کریں اسی لئے علماء نے عام مسلمانوں کو انگریزوں کے خلاف جہاد پر آمادہ کیا اور عام مسلمان جہاد کے لئے تیار ہو گئے اور ۱۸۵۷ء کی بغاوت ایک جہاد کی تحریک تھی اور مسلمانوں نے اندرونِ ملک اپنی خفیہ تنظیم کے علاوہ ہمسایہ مسلم ممالک خاص طور پر افغانستان، ایران اور قسطنطنیہ اور مصر تک سے مدد لینے کا منصوبہ بنایا تھا۔ اس خیال کو تقویت اس سے بھی پہنچی کہ تحریکِ انقلاب کی مخالفت میں میں صرف سکھوں نے جماعتی طور پر انگریزوں کا ساتھ دیا اور یہ ساتھ محض سکھوں کی مسلمان دشمنی پر مبنی تھا۔

۱۸۵۷ء کا ہنگامہ کسی تنظیم کے ساتھ نہیں ہوا۔ یہ سب کچھ انگریزوں کی جاگیرداروں کے ساتھ بدعہدی، دیسی سپاہیوں کے ساتھ ذلت آمیز سلوک و امتیاز اور اس ملک میں ایک عام بدحالی کے پیشِ نظر سامنے آیا اور جو علمائے کرام انگریزوں کے خلاف جہاد کا اعلان کر چکے تھے ان کی نظر ملک کی ان داخلی قوتوں کی طرف نہ تھی، جو اندرون ملک انگریزوں کی پشت پناہی کر رہی تھیں

دوسرے مغل حکومت کے زوال اور اس کے مراء سلاطین کی آپس کی سازشوں اور ذاتی اقتدار کی لڑائی نے ملک کو اس قابل نہیں رکھا تھا کہ سیاسی اعتبار سے پھر ملک پر مغل حکمراں اپنا وقار قائم کرلیں۔ دوسرے اگر یہ تسلیم بھی کرلیا جائے کہ ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ اگر کامیاب ہو بھی جاتا تو یہ کوئی یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ انگریزوں کے جانے کے بعد مغل حکومت یا ہندوستانی پھر ہندوستان کے حکمراں ہوسکتے ہیں۔

بہرحال ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ کچھ بھی تھا اس کے لئے ایک علیحدہ بحث کی ضرورت ہے، لیکن یہ بات سب کو تسلیم ہے کہ ہندوستان کے علمائے کرام، دیسی فوج اور رجعت پسند طبقے نے ایک صدی کے بعد غیر ملکیوں کے خلاف کھل کر اعلان جنگ کیا۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوسکے۔ پوری تحریک کے اجتماعی شعور کا اگر ہم جائزہ لیں تو کہیں بھی ہمیں کسی ایک شخص کے ذہن میں بھی تشکیلِ جدید اور آزاد ہندوستان کا نقشہ نہیں ملتا۔ جمہوریت کا تصور دور تک سیاسی شعور میں نظر نہیں آتا۔ شخصی حکومت کا تصور رگ وریشے میں اس طرح پیوست ہو چکا تھا کہ بقول پروفیسر خلیق احمد نظامی ہر مقام پر لوگ ایک بہادر شاہ، ایک نانا صاحب، ایک رانی لکشمی بائی، ایک برجیس قدر کی تلاش کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ انہیں کے سہارے کوئی ایسا نظام تشکیل پاجائے جو ان کے مصائب کا علاج اور ان کے درد کا مداوا بن سکے۔ مغل بادشاہ ہندوستان کا تو سوال ہی کیا لال قلعہ کو بھی قابو میں رکھنے کی صلاحیت نہ رکھتا تھا۔ پھر اس شخصی عقیدت کے نازک رشتوں کو بھی توڑنے کے لئے کتنے ہی عناصر کام کر رہے تھے۔ دہلی میں بخت خاں کو نہ صرف مغل شہزادوں کا تعاون حاصل نہ ہوسکا بلکہ اس کا اثر توڑنے کے لئے یہ پروپگنڈہ کیا گیا کہ شیر شاہ کی طرح اس کا اقتدار بھی مغلیہ خاندان کے لئے مہلک ثابت ہوگا۔ لکھنؤ میں حضرت محل کے ذہن میں یہ بات بٹھائی گئی کہ اگر احمد اللہ کی مدد سے اقتدار قائم ہوا تو سنیوں کا غلبہ ہوجائے گا۔ اسی طرح روہیلوں کے علاقوں میں ہندو زمینداروں کو روہیلہ سرداروں سے برگشتہ کیا گیا۔ لارنس نے سکھوں کو بہادر شاہ سے بدظن کر کے دہلی کے ساتھ سکھوں کے اشتراکِ عمل کے امکانات کو ختم کردیا۔

یہ تھا وہ نقشہ جو ۱۸۵۷ء کی تحریک کے پس پردہ کام کر رہا تھا اور اس تحریک کے وہ رجعت پسند مہرے بساطِ سیاست پر چال چل رہے تھے جن کو انگریزوں نے ان کے اقتدار سے محروم کردیا

اور کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس لئے ہمارے خیال میں ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ سپاہیوں کی بغاوت کے سہارے رجعت پسند قوتوں کا انگریزوں کے خلاف ایک انتقامی جذبہ تھا جس کو بار بار تاریخ میں جنگِ آزادی کا نام دیا گیا ہے اور یہ خیال بھی غلط ہے کہ ۱۸۵۷ء سے قبل انگریزوں کے خلاف نفرت کے جذبات کا اظہار نہیں ہوا تھا۔

۱۷۶۲ء میں ہندوستانیوں کا ذہن غیر ملکی تسلط کے خلاف پورے طور پر تیار ہو چکا تھا۔ یہ سیاسی شعور اور بیداری حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی اور ان کے گھرانے کی پیدا کی ہوئی تھی۔ جب ۱۸۵۷ء کی تحریک ناکام ہوئی تو بھی ولی اللہی تحریک خاموشی سے اپنا کام کرتی رہی۔

آنے والا دن

عبدالرزاق ملیح آبادی

(۱۸۸۸ء - ۱۹۵۹ء)

آنے والا دن ایسا خوفناک دن ہے کہ فرطِ دہشت سے مائیں اپنے بچوں کو بھول جائیں گی۔ شیر خوار بچوں کے بال سفید ہو جائیں گے دل سینوں سے اکھڑ کر حلقوں میں آ جائیں گے۔ نفسی نفسی کا عالم ہوگا اگر کسی پر ہرگز ترس نہ کھایا جائے گا!

آنے والا دن ہولناک دن ہے۔ خدا کی پناہ مانگو اس دن سے گر وہ آئے گا۔ ضرور آئے گا۔ ربِ کعبہ کی قسم ضرور آئے گا۔ اُس دن نہ ٹوٹکے کام آئیں گے، نہ کھوکھلے دعوے، نہ بے گناہی کے عذر، نہ کچھ اور!

آنے والا دن، وہ دن ہے جب دنیا کا نقشہ پلٹ جائے گا، عزت دار، بے عزت ہو جائیں گے، اونچے سر، جھک جائیں گے۔ امیر، غریب بن جائیں گے۔ غریب، امیر ہو جائیں گے!

یہ آنے والا دن کب آئے گا؟ —— ہزار برس بعد؟ بیس سو برس بعد؟ —— نہیں، پچاس برس بعد؟ —— نہیں۔ پھر کب آئے گا؟ —— بس اسے آیا ہی ہوا سمجھو۔ ممکن ہے کل

آ جائے۔ ممکن ہے پانچ برس بعد آ جائے، ممکن ہے پچیس برس بعد آ جائے۔

اس کے آنے میں اس سے زیادہ دیر نہیں ہے۔

تم دھوکے میں پڑے ہو، کہتے ہو "قسمت کا لکھا پورا ہوگا" ـــــــ سچ ہے، مگر قسمت افراد کی ہوتی ہے۔ قوموں کی نہیں ہوتی، افراد کو قسمت کے سامنے مجبور سمجھا جا سکتا ہے، بلکہ حقیقتاً وہ مجبور بھی ہیں، لیکن قوموں کی کوئی قسمت نہیں ہوتی۔ لوحِ محفوظ میں قوموں کے بارے میں یہی لکھا ہے۔ "اِنَّ اللّٰہَ لَایُغَیِّرُ مَابِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُ وامَا بِاَنْفُسِھِمْ ط" یعنی خدا کسی قوم کی کوئی حالت اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک خود وہ قوم اپنی حالت بدل نہ ڈالے۔ یعنی قومیں اپنی قسمت خود بناتی ہیں۔ اپنے عمل سے بناتی ہیں۔

لہٰذا اس وہم کو دل سے دور کردو کہ دنیا میں وہی ہوگا جو روز ازل سے مقرر ہو چکا ہے۔ ہماری قوم کا وہی حشر ہوگا جو نوشتہ تقدیر میں لکھا جا چکا ہے۔

دنیا میں کوئی بات بھی بے سبب نہیں ہوتی، جو کچھ ہونا ہے، کسی نہ کسی سبب کا نتیجہ ہوتا ہے، اور یہ سبب بھی کسی پہلے سبب سے پیدا ہوتا ہے۔

اس وقت ساری دنیا میں بے چینی ہے۔ حاکم اپنی حکومت بچانے کی فکر سے بے چین ہیں امیر اپنی امارت برقرار رکھنے کے لئے بے چین ہیں۔ غریب اپنی غربت دور کرنے کے لئے بے چین ہیں۔ دنیا کے چپہ چپہ پر تصادم ہو رہا ہے۔ ٹکریں لگ رہی ہیں۔ متضاد قوتیں دست بگریباں ہیں۔ زندہ رہنے کے لئے ہر وجود جنگ کر رہا ہے۔ اس صورت حال کا لازمی نتیجہ یہی ہوگا کہ دنیا کی کایا پلٹ ہو جائے گی، اور ہماری آنکھیں وہ سب دیکھ لیں گی جو آنے والے ہولناک دن میں پیش آئے گا۔

مگر ہندوستان کے باشندے غور کریں کہ آنے والے دن کے لئے انھوں نے کیا تیاری کی ہے؟ خاص طور پر مسلمانانِ ہند کو اس وال پر غور کرنا چاہئے۔

یہ کہنا بے سود ہے کہ ہم مسلمان ہیں، دین حق کے ماننے والے ہیں، اس لئے ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ بے شک اسلام زاندہ رہے گا، مگر اسلام کی زندگی سے لازم نہیں آتا کہ ہم بھی زندہ رہیں۔ خصوصاً ایسی حالت میں کہ اسلام سے ہمارا کوئی حقیقی رشتہ باقی نہیں رہا ہے۔ اگر اسلام کا

زبانی دعویٰ کچھ بھی مفید ہوتا تو ہمارے ہاتھ سے ہندوستان کی عظیم الشان سلطنت نکل نہ جاتی۔ ہم بامِ عظمت سے گر کر اس طرح ذلیل وخوار نہ ہو جاتے۔

اس وقت ہماری حالت وہ ہے کہ خدا دشمن کی بھی نہ کرے۔ ہم پر قوم وجماعت کے الفاظ کا اطلاق ہی نہیں ہو سکتا۔ ہم محض ایک بھیڑ ہیں جو نہ اپنا کوئی نظام رکھتی ہے نہ نصب العین۔

آنے والے دن کی ہولناکیوں سے یہ بھیڑ کیوں کر اپنی حفاظت کر سکے گی؟——اس سوال کا جواب ہر آدمی بہ آسانی دے سکتا ہے۔

ہم میں روطرح طرح کی تحریکیں پیدا ہوتی ہیں، مگر کامیاب نہیں ہوتیں، کیونکہ ہماری ضرورتوں کے مطابق نہیں ہوتیں، زمانہ کی روح اور آب وہوا کے خلاف ہوتی ہیں۔ ناممکن ہے کوئی ایسی تحریک کامیاب ہو جو حقیقی ضرورتیں پوری کرنے والی نہیں ہے، اور زمانہ کا مزاج، یعنی عام ذہنیت جس کی مخالف ہے،۔

یہ عجیب واقعہ ہے کہ انسانی جماعتیں صحیح طور پر اپنی ضرورتیں نہیں سمجھتیں، وہ انھیں اسی وقت سمجھتی ہیں جب کوئی سمجھائے۔ مسلمانوں کی بھی یہی حالت ہے۔ انھیں نہیں معلوم ان کی اصلی ضرورتیں کیا ہیں، اسی لئے ہر تحریک کی طرف دوڑ پڑتے ہیں، مگر جلد ہی دیکھ لیتے ہیں کہ ان کے کام کی نہیں۔

مسلمانوں کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ ان کی اقتصادی حالت درست ہو۔ فقرہ وفاقہ نے ان پر قبضہ کر لیا ہے۔ زندگی تلخ کر ڈالی ہے۔ حواس معطل کر دیئے ہیں۔ ترقی کی راہیں بند کر دی ہیں۔

مسلمانوں کی اصلی ضرورت یہی ہے۔ ان کے ۹۹ فیصدی افراد سخت غربت میں مبتلا ہیں، ان کی اکثریت، نان شبینہ کو محتاج ہو رہی ہے۔ ان کو نوکری کی ضرورت ہے اور سب سے پہلے اسی کو پورا کرنا چاہئے۔

لیکن پوری کیسے ہو؟ کچھ لوگوں نے اس کے بعض طریقے تجویز کئے ہیں، مگر ان میں سے کوئی ایک بھی قابل عمل نہیں۔ دولت مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل چکی ہے، ایسے ہاتھوں میں پہنچ چکی ہے، کسی حال میں بھی اسے جانے دینا نہیں چاہتے۔ سوسائٹی کا موجودہ نظام ایسا ہے کہ جس کے

پاس سرمایہ ہے وہی ترقی کرسکتا ہے، جس کے پاس سرمایہ نہیں ہے، وہ کچھ بھی نہیں کرسکتا۔ ایسے آدمی بہت ہی کم ہوتے ہیں جو اپنی دماغی قابلیت سے غربت دور کرکے مالدار بن جاتے ہیں، ورنہ عام طور پر ہماری سوسائٹی کے نظام کا تقاضا یہ ہے کہ جو غریب ہے، ہمیشہ غریب ہی رہے۔ وہ بھی اور اس کی آئندہ نسلیں بھی۔

مسلمانوں کی اقتصادی حالت سدھر ہی نہیں سکتی جب تک سوسائٹی کا موجودہ اقتصادی نظام بدل نہ جائے۔ جڑ کی بات یہی ہے اور اسی کی کوشش ہونی چاہیے۔ اس کے علاوہ کوئی تحریک مسلمانوں کی حالت درست نہیں کرسکتی۔

خوش نصیبی سے سوشیلزم کی تحریک ہندوستان میں پہنچ چکی ہے اور مقبول بھی ہورہی ہے۔ خاص طور پر مسلمانوں کے لئے تحریک، نعمت غیر متوقعہ ہے، کیونکہ یہ سوسائٹی کا اقتصادی نظام بدلنا، اور تمام انسانوں میں اقتصادی مساوات قائم کرنا چاہتی ہے۔

اگر مسلمانوں نے اس تحریک کا ساتھ نہ دیا۔ بدستور غافل رہے۔ بدستور وہام میں مبتلا رہے تو آنے والے ہولناک دن انھیں برباد ہوجانا پڑے گا۔

مردہ پرستوں کی قوم

عبد الرزاق ملیح آبادی

دنیا بھر میں مسلمان ہی کی قوم ایک ایسی قوم ہے جو مردوں کی پرستش کرتی اور زندوں سے بے فکر رہتی ہے۔

میں نے کہا، مردوں کی پرستش کرتی ہے، کیا یہ غلط ہے؟ کیا مسلمان، مردہ پرست نہیں ہیں؟

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے ایک قوم کی حالت اس طرح بیان فرمائی ہے:

نَسُو اللّٰہَ فَاَنسَاھُمْ اَنْفُسَھُمْ "یعنی وہ خدا کو بھول گئی تو خدا نے انھیں خود فراموش بنا دیا۔ ایسا کر دیا کہ اپنی سدھ بدھ سے غافل ہو گئے، اپنے آپ کو بالکل بھول گئے۔"

اس وقت مسلمانوں کی حال بعینہٖ یہی ہے۔ انھوں نے اللہ سے اپنا رشتہ کاٹ دیا ہے اور ماسوا اللہ سے جوڑ لیا ہے۔ اللہ کو بھول گئے ہیں، اس کی سزا انھیں یہ ملی ہے کہ خود فراموش ہو کر رہ گئے ہیں۔

آج حالت یہ ہے کہ مسجدیں ویران ہیں مگر قبریں آباد ہیں، اللہ کے گھروں میں بوسیدہ چٹائیاں پڑی ہیں۔ مگر قبروں پر سفید چادریں بچھی ہیں۔ یتیم اور بیوائیں، فاقوں پر ہیں مگر گیارہویں

کی دیگیں ٹھنک رہی ہیں۔قوم پر جہل وافلاس کی گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں مگر عرسوں پر لاکھوں روپیہ اڑ رہا ہے۔ مدرسوں اور یتیم خانوں کے لیے ہمارے جیب میں ایک پیسہ نہیں مگر شبِ برات آرہی ہے، نیاز کے حلوے پر ہم ہزاروں خرچ کر دیں گے!

کیا یہ خود فراموشی نہیں ہے؟ کیا یہ گھر پھونک تماشہ دیکھنا نہیں ہے۔

اگر یورپ اور امریکا میں جا کر کہا جائے کہ ہندوستان کے مسلمان اپنے زندہ افراد کی تو خبر نہیں لیتے مگر اپنے مردوں کی قبریں بنانے، اور ان پر چڑھاوے چڑھانے میں لاکھوں روپیہ خرچ کر ڈالتے ہیں، تو وہاں کے لوگ ہرگز یقین نہ کریں گے۔ وہ صاف انکار کر دیں گے۔ کہیں گے ناممکن ہے کہ کوئی قوم اپنے زندوں کو چھوڑ دے اور مردوں کا اتنا اہتمام کرے۔

اسلام نے زمین کو زندہ انسانوں کا حق قرار دیا ہے۔ اسلام نے حکم دیا ہے کہ مردوں کی قبریں کچی بنائی جائیں۔ یہ اس لئے کہ کچھ زمانہ بعد مٹ جائیں اور زمین، زندوں کے کام آسکے۔ اسلام نے پختہ قبریں بنانے سے منع کیا ہے، کیونکہ پختہ قبریں، زمین کو گھیرتی اور زندوں کا حق مارتی ہیں۔ مسلمان جب اسلام کی شریعت پر چلتے تھے تو اسی تعلیم پر عمل کرتے تھے۔ صحابہ کرام کی تعداد ایک لاکھ کے لگ بھگ تھی مگر چند ہی صحابیوں کی قبریں موجود ہیں، باقی سب مٹ گئیں، حتیٰ کہ حضرت ابوعبیدہ بن الجراح، جیسے جلیل القدر صحابہ کی قبریں بھی معدوم ہو چکی ہیں!

آج کل مسلمان اسلامی تعلیمات کو پس پشت ڈال چکے ہیں۔ ان کا جرم صرف یہی نہیں ہے کہ پختہ قبریں بنا کر زمین کو زندوں پر تنگ کرتے ہیں بلکہ اس سنگین جرم کے بھی مرتکب ہو رہے ہیں کہ بزرگانِ دین کی قبروں کی پرستش کرتے ہیں۔

میں جانتا ہوں کہ اس پرستش کو تاویلات کے کن پردوں میں چھپا جاتا ہے، کتنی ہی باتیں بنائی جائیں، مگر مزاروں پر جو کچھ ہوتا ہے شریعت کی نظر میں پرستش وعبادت ہی ہے۔ شرک ہے۔ ناجائز ہے۔ حرام ہے۔

مجھے آج کی صحبت میں قبر پرستی کی بحث کرنا نہیں ہے۔ اس قسم کے مباحث خالص دینی رسالوں کے لئے زیادہ موزوں ہیں، لیکن میں مسلمانوں کو خدا کا واسطہ دے کر کہتا ہوں کہ للہ اپنی حالت پر غور کریں۔

سوچو کہ تم سال کے بارہ مہینوں میں نیازوں اور عرسوں پر کتنا خرچ کرتے ہو اور اپنی اولاد کی تعلیم کیلئے کتنی رقم نکالتے ہو؟ میرے خیال میں مسلمان ہر سال تقریباً ایک کروڑ روپیہ نیازوں اور عرسوں پر ضرور خرچ کرتے ہیں۔ یہ کم سے کم اندازہ ہے صرف ایک اجمیر کے عرس ہی میں لاکھوں روپیہ پر پانی پھیر جاتا ہے۔

خدارا غور کرو کہ حضرت خواجہؒ صاحب کو تمہارے اس روپیہ کی کیا ضرورت ہے؟ خواجہؒ صاحب، خدارسیدہ تھے۔ ولی اللہ تھے۔ زندگی میں بھی دینا کی دولتوں اور لذتوں کو ٹھکراتے تھے، پھر اب جب کہ اپنے پروردگار کے پاس پہنچ چکے ہیں، ان کی روح کو تمہارے روپیہ تمہاری شیرینی، تمہارے پلاؤ سے کیا خوشی ہوسکتی ہے۔

آخر تم خواجہؒ صاحب، بڑے پیر صاحب اور دسرے بزرگوں کے نام پر اسراف کیوں کرتے ہوں؟ کیا اس لئے کہ ان کی ارواح کو ثواب پہنچاؤ؟ مگر خود ہی قائل ہو کہ یہ بزرگ، ولی اللہ تھے اور اگر وہ ولی اللہ تھے تو پھر ان کی نجات ہوگئی، تم سے ثواب حاصل کرنے کی انھیں کیا ضرورت باقی ہے؟ اگر ثواب ہی پہنچانا ہے تو ایسی روحوں کو پہنچاؤ جو گناہوں سے آلودہ ہوکر گئی ہیں، جن پر عذاب ہو رہا ہے۔ اگر ثواب ہی پہنچانا ہے تو مٹھائیاں بانٹنے اور پلاؤں پکانے سے بہتر صورت یہ ہے کہ اسی رقم کو مدرسوں اور یتیم خوانوں پر خرچ کرو تا کہ مردوں کو تمہارے عقیدے کے مطابق ثواب بھی پہنچے اور تمہاری قوم کو دنیا میں ترقی حاصل ہو۔

لیکن نہیں تم اپنا روپیہ ثواب پہنچانے کی نیت سے خرچ نہیں کرتے۔ اس اسراف کے دو ہی سبب ہیں۔ ایک سبب جاہلانہ رسم ورواج کی پابندی ہے اور دوسرا سبب یہ ہے کہ تم ان بزرگوں کو حاجت روا سمجھتے ہو۔ تم یقین کرتے ہو کہ اگر ان کے نام پر خرچ کروگے تو وہ خوش ہوکر تمہاری مراد پوری کردیں گے۔ تمہیں اولاد دیں گے۔ مقدمہ جتادیں گے۔ کاروبار میں برکت بخشیں گے۔ یعنی تم انھیں رشوت دیتے ہو۔ اور اس طرح ایک طرف ان بزرگوں کی توہین کرتے ہو۔ دوسری طرف شرک کے مرتکب ہوکر اپنی عاقبت بگاڑتے ہو۔

مین تم سے سچ کہتا ہوں کہ اگر تم قبروں، عرسوں، نیازوں پر اپنی کمائی تلف کرنے سے باز آجاؤ گے تو تمہارا ایک پیسہ بھی میری جیب میں نہیں آئے گا۔ میں تو تمہیں سچائی اور خیر خواہی سے وہ نصیحت کرر ہاہوں جس میں متہارے دین کا بھی بھلا ہے اور دنیا کا بھی بھلا۔

کیا تم نے کبھی یہ بھی سوچا کہ صحابہؓ اہل بیت، تابعین، تبع تابعین، ائمہ اربعہ میں سے بھی کسی نے کبھی کسی کا عرس کیا یا نیاز دلائی تھی جس مولوی سے چاہو پوچھ لو۔ وہ یہی کہے گا کہ کسی نے یہ نہیں کیا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ تم ایسا کرتے ہو۔ حالانکہ اس کے بدعت ہونے میں کسی کو کلام نہیں؟ کیا تم ان بزرگوں سے زیادہ شریعت کو جانتے ہو؟ کیا تمہیں ایصال ثواب کے وہ طریقے معلوم ہو گئے ہیں جو ان ائمہ صحابہ کو بھی معلوم نہ تھے۔

واقعہ یہ ہے کہ تم کھلی ہوئی گمراہی میں پڑ گئے ہو، اپنا دین بھی خراب کرتے ہو اور اپنی دنیا بھی تباہ کرتے ہو۔ خدارا غور کرو کہ تمہاری حالت کتنی ابتر ہو چکی ہے۔ تم میں نہ دولت باقی ہے، نہ تجارت ہے، نہ صنعت و حرفت ہے، نہ تعلیم ہے، دنیا کی قوموں میں تمہاری کوئی عزت نہیں رہی۔ کیا تمہارا فرض نہیں ہے کہ اپنی اصلاح کرو اور اپنا روپیہ اس طرح ضائع کر ڈالنے کی جگہ اسے مفید کاموں میں صرف کرو؟

یقین کرو دنیا دارالعمل ہے، یہاں کھوکھلی آرزوؤں اور احمقانہ دعاؤں سے کام نہیں چلتا۔ جدوجہد کرو گے تو فائدہ اٹھاؤ گے، یہ خدا کا اٹل قانون ہے۔ قبروں کے سامنے جھکنے سے، ان پر چڑھاوے چڑھانے سے، عرسوں میں ہاہو کرنے سے نہ کبھی کسی قوم نے ترقی کی ہے نہ تم کر سکتے ہو بلکہ یہ تباہی کی چیزیں ہیں اور تم ان میں پڑ کر تباہ ہو چکے ہو۔

میں جانتا ہوں کہ تم میں سے بہتر ے یہ مضمون دیکھ کر غصہ سے دانت پیسیں گے اور مجھے گالیاں دیں گے۔ مگر مجھے پرواہ نہیں۔ میں خوش ہوں کہ تمہیں اس زمانے میں بھی سچائی اور صفائی سے نصیحت کر رہا ہوں۔ جب کہ لوگ حق کے اعلان سے ڈرتے اور جاہلوں کی خوشامد میں عقلمندی سمجھتے ہیں، مجھے کسی سے پیسہ لینا نہیں ہے، مجھے اپنی پیشوائی بھی قائم کرنا ہے، میری رائے میں تم غلطی پر ہو، گمراہی میں گر پڑے ہو اور میرا فرض ہے کہ تمہیں ہشیار کر دوں، سیدھی راہ دکھادوں۔

تم روتے ہو کہ مسلمانوں پر خیر و برکت کے دروازے بند ہو گئے مگر یہ نہیں سوچتے کہ خیر و برکت کے دروازے آخر بند کیوں ہو گئے؟ اپنے دین پر چلتے ہو، نہ دنیا کے تجربے سے فائدہ اٹھاتے ہو۔ غیروں نے جس راہ پر چل کر کامیابی و سربلندی حاصل کی ہے، اس پر تم چلنا نہیں چاہتے۔ اسے اپنے دین کے خلاف سمجھتے ہو اور دین کے ساتھ تمہارا یہ برتاؤ ہے کہ اسے بالکل ہی

چھوڑ چکے ہو، دین کے حکم کو ٹھکراتے اور اس کی ہر مخالفت پر چلتے ہو۔ پھر خیر و برکت کے دروازے کیوں کر کھلیں؟

تمہارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے نظریں اونچی بنانے، ان پر روشنی نے ان پر میلے لگانے ان سے التجا کرنے سے نہایت ہی سختی کے ساتھ جو سلوک کیا ہے، خود ہی جانتے ہو۔

تمہارا ایک شاعر مدینہ جاتا ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر شریف کے سامنے کھڑا ہوتا ہے، پھر جانتے ہو کیا کہتا ہے؟ قسم اللہ کی، بھر کے روئیں کھڑے ہو جاتے ہیں کہ جس رسول برحق نے قبروں سے اہتمام سے منع کیا تھا، اسی مقدس رسول کو مخاطب کر کے تمہارا شاعر یوں کہتا ہے:

مدنی صبح کا عجب ہے ظہور   قابلِ دید ہے یہ بارشِ نور
وائے بر حال عاشقِ محروم   پاس ہو کر بھی ہے جو آپ سے دور
طعنے اغیار پر ہے ناز مجھے   کہ میں حسرت ہوں مستفیض قبور

رسول اللہ صلی علیہ وسلم کے حضور میں پوری دلیری سے اعلان کیا جاتا ہے کہ آپ نے ہمیں قبروں سے لو لگانے سے منع فرمایا تھا، دیکھئے ہم ڈنکے کی چوٹ پر کہتے ہیں کہ "ہم مستفیض قبور ہیں" آپ شریعت کو ہم نے پس پشت ڈال دیا ہے کیونکہ قبریں ہمیں فیض پہنچا رہی ہیں، اور ان کا فیض ہمارے لئے آپ کی شریعت کے فیض سے بڑھ چڑھ کر ہے! انا للہ وانا الیہ راجعون ط

اب بھی وقت ہے کہ مسلمان ہوش میں آئیں اور اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنے سے باز رہیں۔ ان کی موجودہ روش یقیناً برباد کن ہے مگر وہ آنکھیں بند کئے بربادی کے غار میں گرتے چلے جا رہے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نشہ سے چور ہیں اور کچھ نہیں سمجھتے کہ کیا کر رہے ہیں۔

سب سے زیادہ حیرت ناک یہ ہے کہ علمائے دین چپ بیٹھے ہیں اور مسلمانوں کو دین و دنیا کی اس بربادی سے منع نہیں کرتے۔ حالانکہ علماً کا فرض ہے کہ مسلمانوں کے عقائد درست رکھیں اور ان راہوں سے انھیں روکیں، جن میں موت چھپی ہوئی ہے۔ اللہ مسلمانوں پر اور ان کے علماً پر رحم فرمائے۔

گر ترجمے سے فائدہ اخفائے حال ہے

محمد حسن عسکری

(۱۹۱۹ء - ۱۹۷۸ء)

ایزرا پاؤنڈ نے کہا ہے کہ جو دور تخلیقی ادب کے لحاظ سے عظیم ہوتا ہے، وہ ترجموں کے لحاظ سے بھی عظیم ہوتا ہے یا تخلیق کا دور ترجمے کے دور کے بعد آتا ہے۔ مثال کے طور پر انگریزی میں ایلیز بتھ کا زمانہ پاؤنڈ کی رائے میں اووڈ کا مترجم گولڈنگ اتنا بڑا شاعر ہے کہ اس کا مقابلہ ملٹن سے کیا جاسکتا ہے، پھر انگریزی میں دو ایک ترجمے ایسے ہوئے ہیں جو بعض اعتبار سے اصل کتاب سے بھی بڑھ گئے ہیں۔ مثلاً سترہویں صدی میں رابلے کا ترجمہ جو سر ٹامس ارکرٹ نے کیا تھا یا ہمارے زمانہ میں پروست کا ترجمہ جو اسکاٹ مونگریف نے کیا ہے اور خود مصنف کی رائے میں اصل سے بہتر ہے۔

ترجموں کے متعلق پاؤنڈ کی رائے کا اطلاق ہمارے ادب پر بھی ہوتا ہے۔ جب ساری دنیا کے ادب کا ذکر ہو تو اردو ادب کے کسی دور یا کسی شاعر کے متعلق "عظیم" کا لفظ استعمال کرتے ہوئے ہچکچاہٹ ہوتی ہے۔ بہر حال ہمارے یہاں جس قسم کی بھی عظمت ہو، اس کا کچھ نہ کچھ تعلق

ترجموں سے ضرور ہے، اردو ادب کے آغاز سے لے کر غالب کے زمانے تک ترجمے چاہے زیادہ نہ ہوئے ہوں لیکن ہمارے شاعر دو قسم کی کوششیں کر رہے تھے۔ ایک طرف تو وہ فارسی کے اسالیب اور تصورات کو اپنی زبان کے سانچے میں ڈھال رہے تھے۔ دوسری طرف خود اپنی زبان کا ایک مزاج اور ایک روح متعین کرنی چاہتے تھے یہ بالکل وہی چیز ہے جو تیرھویں اور چودھویں صدی میں اٹلی اور انگلستان کے شاعروں نے فرانسیسی کے زیر اثر اپنی اپنی زبانوں کے لئے کی۔

پھر جب مغرب کا اثر پڑنا شروع ہوا تو سرشار جیسے ناول نگار نے ''ڈان کوئکوٹ'' کا ترجمہ کیا۔ سروانٹیز کے طفیل اردو میں کم سے کم دو ناول وجود میں آئے۔ ایک تو ''فسانہ آزاد'' دوسرے ''حاجی بغلول'' خیر اتنا تو صاف ظاہر ہے یہ سرشار کی تخلیق اور ان کے ترجمے میں بہت گہرا رشتہ ہے لیکن سوال یہ ہے کہ ''خدائی فوجدار'' ترجمے کے لحاظ سے کیسا ہے؟ پہلی بات تو یہ ہے کہ سرشار نے ترجمہ کیا ہی نہیں بلکہ اصل کہانی کو دیسی لباس پہنایا ہے۔ اس میں انہیں کھینچ تان بھی کرنی پڑی ہے اور ٹھونس ٹھانس بھی۔ اس طرح کتاب کے بعض حصے بالکل مہمل ہو کے رہ گئے ہیں، پھر انہوں نے سروانٹیز کو پوری طرح سمجھنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ غالباً انہیں پوری طرح سمجھنے کی ضرورت بھی نہیں تھی کیونکہ سرشار کے زمانے میں معاشرتی تبدیلیاں شروع تو ہو گئی تھیں لیکن صدیوں کے عرصے میں اس معاشرے نے جو شکل اختیار کر لی تھی، وہ کم سے کم ظاہری طور پر باقی تھی اور میرا خیال ہے کہ ایک مربوط معاشرے میں رہنے والا آدمی کسی دوسرے معاشرے کے ادب کو پوری طرح نہیں سمجھ سکتا۔ اس کے اعصاب ہی اجنبی تجربات کو قبول نہیں کرتے۔ دوسروں کے ادب کو پوری طرح سمجھنے کی فکر یا خواہش تو ہم جیسے لوگوں کو ہوتی ہے جو ایک خلا میں رہتے ہوں۔ مثلاً یورپ نے ہی مشرق کے فلسفوں کو انیسویں صدی میں سمجھنا شروع کیا، جب مغربی سماج کی بنیادیں ہلنے لگی تھیں، اس لئے اگر سرشار نے ایک مغربی شاہکار کو ترجمہ یا اخذ کرتے ہوئے بگاڑ کے رکھ دیا تو اس میں ہنسنے کی کوئی بات نہیں۔ انہوں نے اس کتاب میں اتنا ہی پڑھا، جتنا ان کے معاشرے نے پڑھوایا۔ چلئے ترجمے کے لحاظ سے ایک خرابی تو ''خدائی فوجدار'' میں یہ ہوئی۔ اس سے بھی بڑی خرابی اس میں یہ ہے کہ اس کی عبارت ناہموار ہے۔ چار جملے بے ڈھنگے آدھا صفحہ مزے لے لے کے لکھا ہے تو آدھے صفحے میں گھاس کاٹی ہے۔ اس پر جتنے بھی اعتراض کئے جا سکتے ہیں، وہ مجھے قبول ہیں اور میں

اسے اردو کی بڑی کتابوں میں بھی نہیں شمار کرتا لیکن میں اس کے متعلق وہی بات کہنے کو تیار ہوں جو ایزرا پاؤنڈ نے ہومر کے پوپ والے ترجمے کے بارے میں کہی ہے۔ لوگ شکایت کرتے ہیں کہ پوپ کے ترجمے میں ہومر وہ نہیں رہا جو اصل یونانی میں ہے۔ پاؤنڈ کی رائے ہے کہ پوپ نے ہومر کو چاہے کچھ کا کچھ بنا دیا ہو لیکن کم سے کم "کچھ تو بنایا ہے۔" سرشار نے بھی سروانٹیز کا ترجمہ کرتے ہوئے "کچھ تو بنایا ہے۔" یہ ایسی بات ہے جو سرشار کے بعد آنے والے ایک مترجم کے بارے میں بھی نہیں کہی جا سکتی۔ کم سے کم یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کا نام آپ اردو نثر کی وقیع کتابوں میں سے خارج نہیں کر سکتے۔ اس میں بھی کچھ بھی نہ سہی، اتنا تو ہے اس کا تیں چالیس فی صدی حصہ دلچسپی سے پڑھا جا سکتا ہے۔ اردو میں مغربی ادب کے جو ترجمے ہوئے ہیں، ان کی کیفیت نظر میں رکھیں تو اتنی بات بھی غنیمت معلوم ہوتی ہے۔

نیاز فتح پوری والے دور میں براہ راست ترجموں کی تعداد چاہے کم ہو لیکن جس قسم کی لجلجی رومانیت اور جمال زدگی ان لوگوں نے پیدا کرنی چاہی، وہ بھی اخذ اور ترجمے کرنے والی ذہنیت کا نتیجہ ہے۔ میں نے ان لوگوں کی تحریریں کہیں لڑکپن میں پڑھی تھیں، اس کے بعد پھر ہمت نہیں پڑی۔ "کچھ غم دوراں کچھ غم جاناں" ہی کیا کم ہے جو اوپر سے بکری پالی جائے اس لئے مجھے معلوم نہیں کہ ان لوگوں نے کن مغربی ادیبوں سے اثر لیا اور کن افسانوں کے ترجمے کئے۔ ایک آسکر وائلڈ کا اثر تو مسلم ہے کیونکہ ان کی تحریروں میں جابجا آسکر وائلڈ کے خیالات بری طرح ترجمے کئے ہوئے بکھرے پڑے ہیں۔ دوسرا اثر شاید گیٹے کے "ورتھر" کا ہے۔ بہر حال انہوں نے آسکر وائلڈ کی سی چستی پیدا کرنے کے لئے ایک تجربہ یہ ضرور کیا کہ بغیر فعل کے جملے لکھے جائیں۔ ایسے جملوں سے اردو نثر کو کیا نقصان پہنچا، یہ تو میں پہلے کئی دفعہ کہہ چکا ہوں لیکن کبھی کبھی دم کٹے جملوں کی ضرورت پیش آتی ہے۔ خصوصاً اس لئے کہ اردو میں جملہ فعل پر ختم ہوتا ہے اور "تا تھا" "تے تھے" وغیرہ کی تکرار نثر کے آہنگ کو برباد کر کے رکھ دیتی ہے، پھر ذرا جملہ لمبا ہو جائے تو اس میں چار پانچ دفعہ "کا"، "کی"، "کے"، "کہ" آتا ہے۔ یہ ایک مستقل دردسر ہے۔ میں تو بعض دفعہ جھنجلا کے یہ کہنے لگتا ہوں کہ ایسی زبان میں اچھی نثر لکھی ہی نہیں جا سکتی۔ بہر حال مریل جمال پرستوں نے اس مسئلہ کا ایک حل ضرور پیش کیا تھا جو کبھی کبھی مفید ثابت ہو سکتا ہے اور یہ چیز بھی آسکر وائلڈ کے

خیالات کا ترجمہ کرنے کے سلسلہ میں ہاتھ آئی۔

۳۶ء کے آس پاس جو ترجمے فرانسیسی اور روسی افسانوں کے ہوئے ان سے اردو نثر نے غیر جذباتی بیان اور ایک ہی جملہ میں کسی چیز کے مختلف اجزا کے نام گنوانے کا طریقہ سیکھا۔ آج اردو افسانوں میں عام طور پر جو زبان استعمال ہوتی ہے، وہ انہیں ترجموں کی بدولت وجود میں آئی ہے۔ اس زمانے میں ترجمے تو بیسیوں لوگوں نے کئے لیکن اگر کسی ایک آدمی کو مثال کے طور پر پیش کرنا ہو تو منٹو کا نام لیا جاسکتا ہے۔ آج کل کے افسانوی زبان کے تعین میں منٹو کے ترجموں کو جو دخل ہے، اسے نہیں بھولنا چاہئے لیکن دوسری طرف یہ بھی حقیقت ہے کہ اس دور کے ترجموں نے ان دو باتوں کے علاوہ ہماری نثر کو اور کچھ بھی نہیں سکھایا یا نثر نگاری کے سلسلے میں روسی افسانے ہمیں کیا سکھاتے ہیں، اس سوال کا میں کوئی جواب نہیں دے سکتا کیونکہ میں ایسی کتابیں نہیں پڑھ سکتا جن میں روح کو مادی چیزوں سے الگ کر لیا گیا ہو لیکن اس ذاتی تعصب سے قطع نظر ویسے بھی مجھے شبہ یہ ہے کہ دوستوئفکی کے ناول پڑھنے سے روح میں تلاطم چاہے جتنا ہو لیکن آدمی کی نثر خراب ہو جاتی ہے۔ پھر دوستوئفکی چاہے جتنا بڑا ادیب ہو لیکن عموماً یہی دیکھنے میں آیا ہے کہ جس نے اس سے اثر لیا وہ عمر بھر لڑکا ہی بنا رہا۔ اردو افسانے پر تو خیر اس کا اثر ہی کتنا ہے لیکن ہندی کے دو ایک افسانہ نگار میں نے ایسے دیکھے ہیں، جنہیں دوستوئفکی نے خراب کیا۔ ممکن ہے بیدی کے افسانوں کی خرابیاں بھی اسی اثر کا نتیجہ ہوں۔ بہر حال مجھے نہیں معلوم کہ روسی افسانے نے پڑھ کے آدمی معقول نثر لکھنا سیکھ سکتا ہے یا نہیں لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ ہمارے یہاں موپاساں کے افسانے نے اتنے پڑھے گئے اور ہم نے اس سے موضوع کے انتخاب کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں سیکھا۔

خیر اب اپنے زمانے کی طرف آیئے۔ آج کل ترجموں کی ضرورت شدت سے محسوس کی جارہی ہے اور کچھ برے بھلے ترجمے ہو بھی رہے ہیں لیکن ترجموں کا ہونا یا نہ ہونا ایسی اہم بات نہیں۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ ان سے ہمارے تخلیقی ادب پر کیا اثر پڑسکتا ہے۔ ابھی تک تو ہمارے یہاں ترجمے اس نقطۂ نظر سے کئے اور پڑھے جاتے ہیں کہ اردو پڑھنے والوں کو بھی اصل کتاب کی کہانی معلوم ہو جائے۔ ترجموں سے زیادہ اثر ہم لوگ یہ لیتے ہیں کہ ہمارے ادیب بھی ویسے ہی موضوعات پر لکھنے لگتے ہیں لیکن ترجمے کی بدولت ہمیں ایسا تخلیقی جذبہ نہیں ملتا جیسا سرشار کو مل گیا

تھا، نہ ان کے ذریعے ہماری نثر کے اسالیب میں کوئی اضافہ یا تغیر ہوتا ہے۔ میں نے خود کوئی ایسا ترجمہ نہیں کیا جس پر میں فخر کرسکوں، لیکن ایزرا پاؤنڈ کی تخلیق کرتے ہوئے میں تو اچھا ترجمہ اسی کو سمجھتا ہوں جس میں چاہے اصل کتاب کی روح برقرار نہ رہے لیکن وہ کچھ نہ کچھ بن ضرور جائے۔ خرابی یہ ہے کہ ترجموں کے معاملہ کو ہم نے ابھی تک ادبی مسئلہ سمجھا، اسی لئے تو ہمارا ادب، خصوصاً ہماری نثر روز بروز مضمحل ہوتی جارہی ہے۔

اس مسئلے کی اہمیت ہم نے اب تک اس وجہ سے محسوس نہیں کی کہ ہمیں اپنی زبان کے متعلق خوش فہمیاں بہت زیادہ ہے۔ یہ خود اطمینانی غالباً ایک حد تک اردو ہندی کے جھگڑے کا نتیجہ ہے اور کچھ اردو کے نقادوں کا کرشمہ ہمیں بار بار یہ بتایا جاتا ہے کہ ہماری زبان دنیا کی بڑی زبانوں میں سے ہے اور اردو میں ہر خیال ادا ہوسکتا ہے۔ خیال ویال تو میں جانتا نہیں شاید اردو میں کانٹ کا ہر خیال پوری پوری صحت کے ساتھ منتقل ہوجائے لیکن اگر کوئی صاحب پروست کا ایک جملہ اردو میں ٹھیک ترجمہ کر کے دکھائیں تو میں اردو کو دنیا کی سب سے بڑی زبان مان لوں گا۔ چلئے اسے بھی چھوڑیئے۔ آپ کہیں گے کہ اردو میں ابھی اتنے پیچیدہ اور گنجلک جملوں کو سہارنے کی اہلیت نہیں پیدا ہوئی۔ سیدھے سادے جملوں کا ہی معاملہ لیجئے۔ یوں کرنے کو میں نے ''مادام بواری'' کا ترجمہ کیا ہے لیکن اس ناول میں ایک ٹکڑا ہے جس میں ہیروئن کی چھتری پر برف گرنے کا منظر پیش کیا گیا ہے۔ اگر اردو کے سارے ادیب مل کر ان آٹھ دس سطروں کو اس طرح ترجمہ کردیں کہ اصل کا حسن ویسا کا ویسا ہی رہے تو اس دن سے میں اردو کے علاوہ کسی اور زبان کی کتاب کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔ یہ میں اردو زبان کی برائی نہیں کررہا ہوں۔ خامیاں تو ہر زبان میں ہوتی ہیں لیکن ہم لوگ تو یہ سمجھتے ہیں کہ ہماری زبان میں اب کسی ترمیم یا اضافے کی ضرورت ہی نہیں رہی۔ ادیب کو اپنی زبان سے محبت اور اس پر یقین تو ضرور ہونا چاہئے لیکن تخلیقی کام کرنے والوں کو اس بات سے کوئی مطلب نہیں ہونا چاہئے کہ ہماری زبان کا شمار دنیا کی بڑی زبانوں میں ہوتا ہے، یا نہیں، ہماری زبان اچھی ہو یا بری ہمارے لئے تو یہ پیر تسمہ پا کی طرح ہے ہم اس سے پیچھا نہیں چھڑا سکتے۔ ہمارا سب سے پہلا کام تو یہ ہے کہ ہم اپنی موجودہ زبان کی صلاحیتیں دیکھیں، پھر یہ غور کریں کہ اب اس میں اظہار کے اور کون کون سے طریقے ایجاد کئے جاسکتے ہیں لیکن ہمارے نقاد بڑی آسانی سے کہہ دیتے ہیں

کہ مغربی ادب میں جتنی اچھی باتیں تھیں، وہ سب ہم نے سیکھ لیں اور ہمارا ادب مغربی ادب کے برابر ہو گیا۔ لیکن آپ کسی مغربی کتاب کا ترجمہ کرنے بیٹھیں تو پانچ منٹ میں سب حقیقت کھل جاتی ہے، بشرطیکہ آپ یہ جانتے ہو کہ مصنف لکھتا کس طرح ہے، پھر اوپر سے مشکل یہ ہے کہ اگر آپ ترجمہ کے مسائل سمجھ بھی لیں اور انکا کوئی نہ کوئی حل بھی تلاش کرنا چاہیں تو اردو تنقید راستہ روک لیتی ہے، وہ اس طرح کہ اردو میں ترجموں کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ پبلشر صرف وہی کتاب چھاپتے ہیں جو بک سکے۔ ادھر کتابیں خریدنے والوں کے ذہن کو اردو تنقید نے کمزور کر رکھا ہے۔ اب اگر آپ ترجمے کو تخلیق کرنا چاہیں تو یہ کیسے ممکن ہے؟

اس ضمن میں اگر میں اپنے ترجموں کا ذکر کروں تو آپ یہ نہ سمجھئے گا کہ میں اپنی کتابوں کا اشتہار دے رہا ہوں۔ میں تو صرف یہ بتاؤں گا کہ میرے ترجمے ناکام کیوں رہے، مجھے مسائل کیا پیش آئے اور میں انہیں حل کیوں نہیں کر سکا؟

میرے بعض کرم فرما مجھ سے کہتے ہیں کہ میرا سب سے اچھا ترجمہ ''آخری سلام'' ہے۔ اس رائے سے میری ہمت افزائی تو بہت ہوتی ہے لیکن میں اسے اپنا کوئی کارنامہ نہیں سمجھتا۔ اشروڈ کی یہ کتاب حقیقت نگاری کی روایت سے متعلق ہے لیکن اس کی نثر موپاساں کی نثر نہیں ہے۔ اس کی زیادہ تر دلچسپی واقعات یا کردار نگاری میں ہے۔ اس کی نثر بس کام چلاؤ قسم کی ہے۔ ایسی عبارت کو اردو میں کس طرح منتقل کیا جائے، اس کا طریقہ منٹو نے ۳۶ء کے قریب اپنے ترجموں میں بتا دیا تھا۔ اب اگر آپ کو تھوڑے بہت محاورے آتے ہوں اور ادبی نثر کو گفتگو کے لب ولہجہ سے قریب لا سکیں تو اس کتاب کا اچھا خاصا ترجمہ ہو سکتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اپنے ترجمے میں چاہے میں اشروڈ کی برابری نہ کر سکا ہوں لیکن ترجمہ پڑھنے کے بعد اصل کتاب پڑھنے کی کوئی خاص ضرورت باقی نہیں رہتی۔ جس قسم کی نثر اس کتاب کے ترجمے کے لئے چاہیے اور اس کا ڈھانچہ بنانا بنایا تھا، اردو والے ترجمے میں بس نئی بات دیکھتے ہیں کہ روانی اور سلاست ہو اور پڑھتے ہوئے ایسا لگے، جیسے کتاب اردو میں ہی لکھی گئی ہے۔ تعلّی معاف یہ کام تو میں سوتے ہوئے بھی کر سکتا ہوں لیکن اس سے اردو ادب کو کیا فائدہ پہنچتا ہے؟ اس میں شک نہیں کہ اس سے ترجمے کا کام بہت ہلکا ہو جاتا ہے۔ لیکن ہماری زبان وہیں کی وہیں رہتی ہے، جہاں تھی۔ نثر کی اسی تعریف نے ہمارے ادب کو مار رکھا

ہے۔ خصوصاً ترجمے کو اگر ہمارے نقاد پڑھنے والوں کو یہ راز بتا دیتے کہ پڑھتے وقت دماغ پر زور پڑے تو کوئی ہرج نہیں تو شاید اردو نثر میں ترجمے ہی کے ذریعے کچھ تجربے ہو سکتے لیکن اب تو ایک لفظ کو ادھر سے ادھر کرتے ڈر لگتا ہے کہ ایسی کتاب پڑھے گا کون۔ اگر آپ کی اردو زبان میں بہت سے اسالیب بیان ہوتے، تب تو یہ مطالبہ بجا تھا کہ ترجمہ ایسا لگنا چاہئے جیسے اصل ہو لیکن اس بے بضاعتی کے عالم میں یہ شرط لگانا کہ اردو کے اسالیب میں کسی قسم کی تبدیلی نہ ہونے پائے ایک عجیب سی بات ہے۔ اگر یہ ذہنیت ہمارے ادب پر حاوی رہی تو رابلس یا جوئس کی طرح کے لوگوں کے ترجمے تو قیامت تک نہ ہو سکیں گے۔ اب سے آٹھ سال پہلے مجھے یہ خبط تھا کہ ترجمہ کرتے ہوئے اردو کے اسالیب کا خیال نہ رکھوں لیکن اب اردو کے نقادوں سے ڈر گیا ہوں اور اتنی ہمت نہیں رہی۔ وہ تو میرے پبلشر ہمت والے ہیں کہ میں اردو کو توڑ مروڑ ڈالوں تو بھی میری کتاب چھاپ دیتے ہیں۔

میرے جس ترجمے کو غور سے پڑھا جانا چاہئے تھا، وہ ہے ''مادام بواری'' یعنی ایک ناکامیاب ترجمے کی حیثیت سے اوّل تو اس کتاب کا صحیح ترجمہ آج تک ہوا ہی دنیا کی کون سی زبان میں ہے۔ اردو بیچاری تو پھر بھی بچی ہے۔ یہ کتاب تو اس قابل ہے کہ اردو کے آٹھ دس ادیب مل کر اسے ترجمہ کرتے اور اس پر تین چار سال لگاتے، تب کہیں جا کر کچھ بات بنتی۔ میں یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس کتاب میں نثری اسلوب کے جتنے مسائل سامنے آتے ہیں، میں نے ان سب کو سمجھ لیا۔ اس کام کے لئے بھی سال بھر چاہئے۔ بہر حال جو دو چار باتیں میرے پلّے پڑیں، وہ میں نے اردو میں پیدا کرنی چاہیں۔ مثلاً ایک تو میں نے یہ کوشش کی کہ فلوبیئر نے علامات اوقاف کے ذریعے جو معنی پیدا کئے ہیں، ویسے ہی میں بھی کروں لیکن کاتب صاحب نے سب گڈمڈ کر کے رکھ دیا، پھر فلوبیئر نے بار بار مختلف قسم کے خیالات کو تقابل یا تضاد کے لئے ایک ہی جملہ میں بند کیا ہے۔ میں نے ایسے جملوں کا مطلب لکھنے کے بجائے انہیں ویسے کے ویسے ہی اردو میں منتقل کر دیا۔ اردو والوں نے شکایت کی کہ ترجمے میں روانی اور سلاست نہیں ہے۔ مثلاً ''مادام بواری'' کے پہلے صفحہ پر شارل کی ٹوپی کا بیان لیجئے۔ اگر محض روانی اور سلاست کا معاملہ ہوتا تو میں ''حاجی بغلول'' کے اندر میں اس ٹوپی کا مزے دار سے مزے دار بیان لکھ سکتا تھا لیکن میرے سامنے تو سوال یہ تھا کہ فلوبیئر

کے ایک جملے کا ترجمہ کیا جائے چاہے اردو زباں چیں بول جائے۔ یہی میں نے کیا، لوگوں نے شکایت کی ترجمے کے پہلے صفحے کی عبارت گنجلک ہے۔ مجھے خوشی تو جب ہوتی کہ کوئی صاحب اس جملے کا اور اچھا ترجمہ کر کے مجھے بھیجتے۔ میں کسی رسالے میں شائع کراتا تو اردو نثر کے ایک مسئلے کا کچھ تو حل نظر آیا۔ یہ تو فلوبیئر کی کتاب کے چھوٹے چھوٹے مسئلے ہیں اور بڑے مسئلوں سے الجھنے کی تو مجھ میں ہمت ہی نہ تھی۔ مثلاً جملوں کے آہنگ یا پیراگراف کی تعمیر کا معاملہ تو اتنا سخت تھا کہ میں نے بھاری پتھر سمجھا اور چوم کے چھوڑ دیا۔ بہر حال اردو والوں نے ناول پڑھ لیا اور یہ صرف دو ڈھائی لوگوں کو معلوم ہے کہ اس ترجمے میں میری کامیابی کیا تھی اور ناکامیابی کیا۔

پچھلے سال میں نے استاں دال کے ناول ''سرخ و سیاہ'' کا ترجمہ کیا۔ اس ناول نے مجھے رلا رلا دیا۔ اگر سلاست اور روانی کی باتی ہوتی تو میں لیٹے لیٹے ترجمے کے پچاس صفحے روز لکھوا سکتا تھا لیکن استاں دال تو کمبخت وہ آدمی ہے، جو نثر کے فن کو نظم سے بڑا سمجھتا ہے۔ اب میرے سامنے سوال یہ تھا کہ اردو سے غدّاری کروں یا استاں دال سے، مجھے اعتراف ہے کہ میں نے اپنے پبلشر کے مفاد کا احترام کرتے ہوئے استاں دال سے غدّاری کی کیونکہ پبلشر بچارے کی یہی ہمت کیا کم ہے کہ اتنا لمبا چوڑا ناول چھاپا لیکن ایک لحاظ سے اردو زبان نے بھی میرے ہاتھ باندھ دیئے تھے۔ استاں دال جذبات کا تجزیہ فکر محض کی زبان میں کرتا ہے۔ اردو میں اس کی صلاحیت نہیں۔ اگر میں اس کے لئے کوئی نیا اسلوب بنانے کی کوشش کرتا، تو ڈر یہ تھا کہ اردو کے نقاد پوچھیں گے، یہ ناول ہے یا مقالہ، مرتا کیا نہ کرتا میں نے استاں دال کی روح سے معافی مانگ کے اس کی خشک عبارت کو تھوڑا سا جذباتی رنگ دیا۔ یا یوں کہئے کہ اردو کے نقادوں کو رشوت دی۔ اب ایک اور مشکل پیش آئی۔ پہلی نظر میں تو استاں دال کے جملے بڑے خشک اور بے رنگ معلوم ہوتے ہیں لیکن ذرا غور سے پڑھئے تو ایک کرارا پن اور ایک ایسی چستی ملے گی جو طنز کے قریب پہنچ جاتی ہے۔ یہ ایسی چیز ہے جو انگریزی ترجمے میں نہیں آنے پائی۔ حالانکہ یہ ترجمہ اسکاٹ مونکریف جیسے بڑے مترجم نے کیا ہے۔ قصہ یہ ہے کہ استاں دال کی نثر کے پیچھے ڈیڑھ سال کی وہ فرانسیسی روایت ہے جو (Maximes) لکھنے والوں نے پیدا کی تھی۔ استاں دال کی نثر کے پیچھے سے جگہ جگہ روش فو کو بول اٹھتا ہے۔ اب بتایئے اس خوبی کو اردو میں منتقل کرنے کے لئے میں ایسی روایت کہاں سے لاتا؟ نیاز فتح پوری کی زبان

میں اس کا ترجمہ کرتا یا میر امّن کی زبان میں؟ اردو اب بہت عظیم سہی لیکن کوئی صاحب مجھے چار سطریں استاں دال کی ترجمہ کرکے دکھادیں۔

آج کل میں شودرلو دلاکلو کا ناول ترجمہ کررہا ہوں۔ اس میں ایک نئی مصیبت ہے۔ مصنف کا لب ولہجہ اردو میں کیسے پیدا کروں، یہ میری سمجھ میں نہیں آرہا۔ پھکڑ پن کا نمونہ مجھے سرشار یا سجاد حسین کے یہاں مل سکتا ہے لیکن اٹھارہویں صدی کے فرانسیسی استہزا میں جو رکھ رکھاؤ اور نفاست تھی، وہ کہاں سے لاؤں؟ لیکن اس ناول کے متعلق اتنی بات ضرور کہوں گا استاں دال کا ترجمہ سرشار مجھ سے اچھا نہیں کرسکتے تھے لیکن اس ناول کا ترجمہ کرکے وہ کچھ نہ کچھ ضرور بتا سکتے تھے اور میں یہ بھی نہیں کرسکتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اردو نثر میں جو بات تھی، آج وہ بھی نہیں رہی۔

اپنے ترجموں کا اتنا لمبا چوڑا اشتہار میں نے اس لئے دیا کہ اپنے اس کام کے سلسلے میں مجھے جن ادبی مسائل سے الجھنا پڑا، میں انہیں حل نہیں کرسکا۔ میں نے دو چار بڑی کتابوں کے ترجمے تو کرڈالے ہیں لیکن میں نے اردو کے اسالیب میں رتی بھر بھی اضافہ نہیں کیا۔ اسی کی شکایت مجھے اردو پڑھنے والوں اور اردو کے نقادوں سے ہے۔ اوّل تو میری بساط ہی کیا ہے لیکن میں چاہوں بھی تو اسلوب کا کوئی نیا تجربہ کرنے کی ہمت نہیں پڑتی۔ چنانچہ مجھے اپنے آپ سے بار بار یہ سوال پوچھنا پڑتا ہے کہ جن ترجموں سے تخلیقی ادب پر کوئی اثر نہ پڑے ان کا جواز کیا ہے۔ ترجمے کا تو مقصد ہی یہ ہونا چاہئے کہ خواہ ترجمہ ناکام ہو مگر ادیبوں اور پڑھنے والوں کے سامنے ذرائع اظہار کے نئے مسائل آئیں۔ خواہ کوئی ادبی مسئلہ حل نہ ہو مگر ترجمے کے ذریعے کوئی ادبی مسئلہ پیدا تو ہو لیکن جب تک اردو تنقید زندہ ہے خدا نے چاہا تو ہمارے ذہن میں کوئی ادبی مسئلہ پیدا ہو ہی نہیں سکتا۔

تراجم اور اصطلاح سازی کے مسائل

پروفیسر آل احمد سرور

(۱۹۱۲ء - ۲۰۰۲ء)

زبان کی سہولت کے لئے تین قسمیں کی جاسکتی ہیں۔ ایک کاروباری زبان جس میں اپنا مطلب کسی طرح نکالنا ہوتا ہے جس میں معنی کی ایک ہی سطح پر توجہ ہوتی ہے، جس میں منطقی ترتیب بہتر لفظ یا موزوں ترین لفظ کی قید نہیں ہے۔ یہ زبان اسم، صفت یا فعل کے سیدھے سادھے استعمال سے کام چلاتی ہے۔ دوسری قسم ادبی زبان کی ہے جس میں لفظ کا تخلیقی استعمال شاعری میں اور تعمیری استعمال نثر میں ہوتا ہے۔ ادبی زبان میں ماورائے سخن بھی بات ہوتی ہے۔ زبان تشبیہ، استعارے، علامت اور رمز وایما کی وجہ سے گنجینۂ معنی کا طلسم ہوتی ہے۔ یہاں ''کیا کہا گیا ہے'' سے زیادہ ''کیسے کہا گیا ہے'' پر توجہ ہوتی ہے۔ بقول مڈلٹن میرے یہاں الفاظ پر فتح کا ایک منظر سامنے آتا ہے کیونکہ لفظ ایک پہلو دار ہیرے کی طرح بہت سی شعاعیں دیتا ہے اور ایک سے زیادہ معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ یہاں پیچیدگی، ابہام، اندیشہ ہائے دور دراز کی کافی گنجائش ہے تیسری قسم علمی زبان کی ہے جس سے ہمیں اس وقت بحث ہے۔ علمی زبان میں اظہار منطقی ہوتا ہے، حقیقی مفہوم ادا

کرنے پر توجہ ہوتی ہے۔ کاروباری زبان میں سیدھے سادے خیال اور فوری مطلب کو ادا کرنے کی کوشش ہوتی ہے۔ علمی زبان میں پیچیدہ سے پیچیدہ خیال کو اس طرح ادا کیا جاتا ہے کہ وہ ذہن میں روشنی کردے۔ مہذب زبان کی یہی پہچان ہوتی ہے کہ وہ ادبی اظہار اور علمی اظہار دونوں کیلئے سرمایہ رکھتی ہو۔ کاروباری اظہار تو زبان کی ابتدائی حالت میں بھی کسی نہ کسی طرح ہو ہی جاتا ہے۔

مشرقی زبانوں کی ایک خصوصیت یہ بتائی گئی ہے کہ وہ جذباتی اظہار پر تو پوری طرح قادر ہیں مگر ذہنی اظہار کے لئے انہیں ابھی بہت ترقی کرنا ہے گویا ادبی اظہار کے علاوہ علمی معیار سے بہت ترقی کی گنجائش ہے۔ ایک زمانے میں شاعری علوم کی زبان بھی تھی مگر رفتہ رفتہ اس نے اپنے مخصوص کردار کو پہچان لیا۔ اب مغرب میں کوئی تاریخ نظم نہیں کرتا نہ منظوم جغرافیہ لکھتا ہے۔ نہ نفسیات اور معاشیات کے مسائل نظم کرتا ہے۔ شاعری فرد کے جذبے کی ترجمان بن گئی اور نثر اس کے ذہن کی۔ علمی نثر کی ترقی اسی میلان کا نتیجہ ہے اس ترقی نے شاعری کو بھی فائدہ پہنچایا ہے کیونکہ ادبی اظہار اور علمی اظہار الگ الگ راستوں پر گامزن ہونے کے باوجود چور دروازوں اور پگڈنڈیوں کے ذریعے سے ایک دوسرے سے متاثر ہوتے ہیں۔

ایسا نہیں ہے کہ مشرقی زبانوں میں علمی اظہار کی کوئی روایت نہیں ہے یا علمی زبان بہت کم ملتی ہے، خود اردو کو ہی لے لیجئے اس میں علمی نثر انیسویں صدی کے وسط سے ملنے لگی ہے اور سرسید اور ان کے رفقاء کے ہاتھوں اسے بڑے ترقی ہوئی مگر اس میں شک نہیں کہ علمی زبان پر ادبی زبان و اسالیب کا اثر زیادہ رہا ہے۔ چنانچہ آج علمی نثر کی تعریف کرتے وقت اس کی سلاست، شگفتگی، روانی پر زیادہ زور دیا جاتا ہے اور کبھی کبھی تو یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ اس میں افسانے کی سی دلچسپی ہے۔

اس وجہ سے ضرورت ہے کہ ہم سب سے پہلے علمی نثر کی ضروریات پر کچھ غور کرلیں کیونکہ علمی نثر کو فروغ دینا ہے اس فروغ کا مقصد صرف معلوماتی ادب کا ایک ذخیرہ مہیا کرنا ہی نہیں، خیال اور ذہن کو تقویت دے کر زیادہ سے زیادہ پیچیدہ، مفاہیم اور نازک ترین کیفیتوں کے اظہار پر قدرت حاصل کرنا اور اس زبان کو وسعت اور جامعیت عطا کرنا ہے۔ علمی نثر کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ مشکل ہو یا آسان، عجمی لے رکھتی ہو یا ہندی علمی نثر علم کے مطالب کے اظہار کے لئے ہوتی ہے۔ جہاں علم کے مبادیات عام فہم زبان میں بیان کرنا ہیں وہاں وہ آسان ہوگی تو اس کے

ساتھ موٹی موٹی باتوں پر اکتفا کرے گی، جہاں وہ اس علم کے اسرار ورموز پر روشنی ڈالے گی وہاں اس کا فرض اتنا ہی ہوگا کہ وہ سچ اور صرف سچ بولے اور پوری بات کہے۔ اسی لئے اصطلاحات سے اسے لازمی طور پر کام لینا پڑے گا۔ اس کا مقصد معلومات عطا کرنا ہوگا جذبات سے اپیل نہیں۔ علوم کی بہت سی قسمیں ہیں۔ انہیں سہولت کے لئے تین خانوں میں بانٹا جاسکتا ہے۔ قدرتی علوم جن میں طبعی علوم اور حیاتیاتی علوم آتے ہیں۔ سماجی علوم جن میں سیاسیات اقتصادیات نفسیات، لسانیات جغرافیہ، تعلیم آتے ہیں۔ تاریخ کو پہلے انسانی علوم Humanities میں شامل کیا جاتا ہے۔ انسانی علوم میں فلسفہ، فنون لطیفہ اور ادبیات آتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ قدرتی علوم میں سے طبعیاتی علوم میں نثر کی زبان خالص معلوماتی ہوتی ہے اور اس کا نصب العین ریاضی کی طرح قطعیت حاصل کرنا ہوتا ہے حیاتیاتی علوم میں انواع کے رشتوں کی تفصیل اور ارتقاء کی منزلوں کی تشریح کے سلسلے میں بیانیہ اندازہ کی وہ وضاحت بھی ضروری ہے جس میں ایک خوشگوار پہلو ہوسکتا ہے مگر اسے کسی طرح نمایاں نہ ہونا چاہئے۔ اجتماعی علوم کے سلسلے میں معلومات ہی کا معاملہ نہیں یہاں رشتوں کی پیچیدگی کے علاوہ اسباب وعلل کے سلسلے کو بھی ذہن رکھنا ہوتا ہے قوموں کی تقدیر، اسرار امم، نفسیات، کی بھول بھلیاں، سماج کی سیڑھیاں، کسبِ زر کی داستان، مختلف خطوں کی آب وہوا کا طبائع اور نفسیات پر اثر، غرض سماجی علوم میں چونکہ صرف معلومات کا سال نہیں بلکہ معلومات کی ترتیب بنیادی اور فروعی مسائل کی تشریح اور مختلف نظریات کے تحت ان کی اہمیت سے بحث ہوتی ہے۔ اس لئے سماجی علوم میں نثر کا کام قدرتی علوم سے زیادہ مشکل ہوجاتا ہے۔ پھر یہ بھی کہ قدرتی علوم میں زیادہ تر ایک نظریہ کے مطابق اظہار خیال ہوتا ہے۔ سماجی علوم کے معاملے میں نظریوں کی کثرت ہے۔ قدرتی علوم کے سلسلے میں مکمل معروضیت ممکن ہے سماجی علوم کے سلسلے میں اس کی کوشش ضروری ہے مگر شخصی نظریا میں داخلی انداز کا دخل بھی ہو ہی جاتا ہے جس کی وجہ سے جذبہ کی زبان کو کچھ بار مل جاتا ہے۔ مگر نصب العین یہاں معروضیت ہے۔ انسانی علوم میں فلسفہ علم کی وہ شاخ ہے جہاں مجرد تصورات سے بحث ہے، جلوؤں کی کثرت میں ایک وحدت دیکھنے کی سعی ہے یا دوسرے الفاظ میں ایک نظام فکر بنانے یا ایک ذہنی محور پانے کی جستجو، اس لئے فلسفے کی بنیاد منطق پر ہے اور استدلال اس کا طریقہ کار ہے، برٹرینڈ رسل نے کہا ہے کہ شوپنہار، نطشے اور برگساں کو خالص فلسفی اس لئے نہیں کہا جاسکتا

کہ ان کے یہاں ادبیت بھی درآئی ہے۔یعنی ان کی بظاہر طاقت دراصل ان کی کمزوری ہے۔ کانٹ کے متعلق یہ بات نہیں کہی جاسکتی۔ادبیات کے سلسلے میں ادبی تنقید علوم کے ذیل میں آتی ہے،اس لئے جدید دور میں اسے زیادہ سائنٹفک بنانے پر زور دیا گیا ہے لیکن چونکہ یہ بہرحال ادب کی ایک شاخ ہے،اس لئے اور سائنسی ہوتے ہوئے بھی ادبی اظہار سے اپنا رشتہ توڑ نہیں سکتی، ہاں تاثرات کی دلدل سے اسے ضرور نکلنا ہے۔

اس تمہید کا مقصد یہ ہے کہ ہم علوم کی زبان کی خصوصیات کو ہی ذہن میں رکھیں، معلومات دینے کو سب سے زیادہ اہمیت دیں، پھر منطقی، ترتیب، معروضیت اور ایک غیر جانب دار زبان کو جو جذبے کی گرمی یا شخصیت کے لمس سے بڑی حد تک آزاد ہو،ان اصولوں کی روشنی میں ہمیں تراجم اور تصانیف کے کام کو آگے بڑھانا ہے۔

ترجمے کے کام کو اب تک تصنیف کے مقابلے میں عام طور پر حقیر سمجھا گیا ہے۔ یہ بہت غلط میلان ہے ترجمے کی اہمیت کسی طرح تخلیق سے کم نہیں۔ترجمے میں تخلیق کو از سر نو پانا ہوتا ہے،اس لئے امریکہ میں ترجمہ کے لئے دوبارہ تخلیق (Recreation) کا لفظ بھی استعمال کیا گیا ہے۔ ترجمے کے ذریعہ سے ہم دوسری زبانوں کے افکار واقدار سے آشنا ہوتے ہیں۔ایک فاضل کے الفاظ میں مترجم کا کام صرف لسانیاتی نہیں بشریاتی (Anthropological) بھی ہے۔یعنی اسے صرف اصل زبان (Scurce Language) سے ہی واقفیت نہیں ہونی چاہئے، اسے اس زبان کی تہذیب اور معاشرے سے بھی آشنا ہونا چاہئے۔اس کی دو مثالیں دینا ضروری ہیں تاکہ بات واضح ہو جائے دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کے لئے روم کی تاریخ کے ترجمے میں (Papal Bulls) کا ترجمہ پاپائی سانڈ کیا گیا تھا۔اردو کے ایک ممتاز ادیب نے اپنی کتاب میں شیکسپیئر کے ایک ڈرامے (As you like it) سے ژاک کی ایک تقریر کا حوالہ دیا۔اس میں لفظ Humour کا ترجمہ مزاح کیا گیا تھا حالانکہ یہاں طبی اصطلاح خلط مراد ہے۔

مغرب کی رومانی تحریک میں مشرقی ادب کے تراجم کا بڑا اثر ہے۔جدیدیت کی تحریک میں چین اور جاپان کی شاعری کے تراجم کا بھی دخل ہے۔ ہندوستان کی نشاۃ الثانیہ پر مغربی ادب کے تراجم براہ راست اثر انداز ہوئے ہیں۔ ہماری علمی نثر اور جدید نظم دونوں مغربی تراجم کے سہارے

آگے بڑھے ہیں، اس لئے ترجمے کی اہمیت کسی طرح تخلیق یا تصنیف سے کم نہیں۔ یہ تخلیق کے لئے بھی نئے زمین و آسمان دیتا ہے اور علمی موضوعات پر تصانیف کے لئے بھی ذہنی غذا مہیا کرتا ہے۔ یہاں یہ کہنا بھی ضروری ہے کہ علمی کتابوں کے ترجمے میں آزاد ترجمے یا اصل خیال کو اپنے الفاظ میں بیان کرنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ یہاں وہی بات ہے کہ خوب پیو ورنہ مقدس چشمے کو ہاتھ نہ لگاؤ۔ یہاں صرف لفظی ترجمے اور مطابق اصل ترجمے یعنی (Literal and faithful) پر گفتگو ہو سکتی ہے۔ لفظی ترجمے میں لسانیات کی رو سے ایک متنی اظہار کو دوسرے متبادل متنی اظہار میں منتقل کرنا ہوتا ہے لیکن جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے ترجمہ صرف لسانیاتی عمل نہیں بشریاتی عمل بھی ہے، اس لئے ظاہر ہے کہ مطابق اصل کو ترجیح ہونی چاہئے کیونکہ ہر زبان کی صرفی ونحوی خصوصیات علیحدہ ہوتی ہیں۔ خصوصاً انگریزی ترجمے میں تو لفظی ترجمہ مضحکہ خیز ہوتا ہے، اسی لئے مطابق اصل کے معنی یہ ہوتے کہ اصل زبان کے متن کو ترجمے کی زبان کے ایسے الفاظ میں ڈھالا جائے جو ترجمے کی زبان کی جینئس (Genius) کے مطابق ہوں مگر اصل زبان کے مفہوم کو زیادہ ظاہر کرنے پر قادر ہوں یوں تو ایلیٹ نے یہ بھی کہا ہے: ''کسی زبان کی شاعری کا ترجمہ دوسری زبان میں ناممکن ہے —'' مگر ترجمے ہوئے ہیں اور ان کے اثرات بھی پڑے ہیں۔ ترجمے کو جووٹ نے ایک مفاہمہ کہا ہے۔ یہ مفاہمہ بہر حال کبھی زیادہ کامیاب ہوتا ہے، کبھی کم مگر اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہئے کہ ترجمہ نہیں ہوسکتا یا ترجمہ نہیں کرنا چاہئے۔ جہاں تک ادب العالیہ یا علمی سرمائے کے ترجمے کا سوال ہے، اس سلسلے کی افادیت میں شبہ نہیں کیا جاسکتا۔ ہاں مطابق اصل ترجمے پر زور دیا جاسکتا ہے۔ اس ترجمے کے لئے چند شرائط ہیں۔ مترجم اس موضوع سے واقفیت رکھتا ہو اور اپنی زبان کے سرمایے، پر بھر پور نظر کے علاوہ اصل زبان سے بھی اچھی طرح واقف ہو اگر وہ موضوع سے واقف ہے اور اصل زبان سے بھی بڑی حد تک آشنا ہے مگر اپنی زبان کے سرمایے پر اس کی نظر نہیں ہے تو وہ جابجا ٹھوکریں کھائے گا۔ اس کی زبان اکھڑی اکھڑی ہوگی۔ اور اس کا ترجمہ پڑھنا ایسا ہوگا جیسا ناہموار راستے سے گذرنا۔ اگر وہ اپنی زبان پر عبور رکھتا ہے مگر اصل زبان سے اس کی واقفیت محدود ہے تو ظاہر ہے اور بھی خطرناک صورت پیدا ہو جائے گی۔ پھر علوم کے تراجم میں زبان یا زبانیں جاننے سے بھی مقدم اس علم سے واقفیت ہے، اس لئے بھول کر بھی صرف زبان پر یا زبانوں پر عبور

کی وجہ سے ترجمے کا کام کسی کو نہ دینا چاہئے۔ موضوع سے واقفیت بنیادی شرائط ہیں، اس کے بعد اصل زبان سے اور بھی اپنی جان سے۔ یہی وجہ ہے کہ ڈیٹ رایٹ (امریکہ) کی Mass Translation Project میں یہ طریقہ بتایا گیا ہے۔

Translator quality Control-Technical Editor Language Editor

مترجم معیار کا نگراں، ٹیکنیکل ایڈیٹر زبان کا ایڈیٹر اس لئے میری رائے میں ترقی اردو بورڈ کو خالص علمی کتابوں کے ترجمے میں پہلے تو موضوع کے ماہر کا انتخاب کرنا چاہئے۔ اس کے بعد ترجمے کے معیار کو پرکھنے کے لئے ایک دوسرے ماہر کو کتاب دکھانا چاہئے، جسے تراجم کا بھی تجربہ ہو اس کے بعد ٹیکنیکل ایڈیٹر سے مدد لینا چاہئے جو نہ صرف یہ دیکھے کہ مواد کی ترتیب، اعداد و شمار چارٹ وغیرہ درست ہیں۔ آخر میں زبان کے ماہر کی نظر بھی ضروری ہے تا کہ ترجمہ زبان کی جینئس کے مطابق ہو اور الفاظ کی نشست اور جملوں کی سالت اجنبی نہ معلوم ہو علمی کتابوں کے ترجمے کے لئے اردو میں اچھے نمونے موجود ہیں۔ مرزا ہادی رسوا، عبدالباری خلیفہ عبدالحکیم، عبدالماجد سالکؔ، فلسفۂ جذبات اور مکالمات برکلے والے مولانا عبدالماجد، ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر عابد حسین، سید ہاشمی فرید آبادی عزیز احمد، اختر رائے پوری، امتیاز علی تاجؔ، لطیف الدین احمد، مبارز الدین رفعت، رحم علی الہاشمی نے قابل قدر ترجمے کئے ہیں، پھر بھی انہیں حرف آخر سمجھنا غلط ہوگا۔ ترجمے کا ایک اہم اصول یہ ہے کہ اصل میں کمی بیشی نہ کی جائے۔ یورپ میں ایک بین قوم جماعت ہے جس کا نام Fit ہے یعنی ''انٹرنیشنل فیڈریشن آف ٹرانسلیٹرس'' اس نے مترجموں کا ایک چارٹر مرتب کیا ہے اس کی ایک دفعہ میں کہا گیا ہے کہ: ''مشکل فقروں کو مختصر کرنا یا انہیں خارج کر دینا غیر اخلاقی بات ہے۔'' اس کے چند اور اصول قابل ذکر ہیں۔ ایک تو ''اصل زبان کے بجائے کسی درمیانی زبان کے ذریعے سے ترجمہ ایک ایسا مفاہمہ ہے جو غیر تسلی بخش ہے۔'' دوسرے ''نظم کا نثر میں ترجمہ فن پارہ کہلانے کا مستحق نہیں — '' تیسرے ''اسٹائل اور فارم کے معاملے میں عملی طریقۂ کار کو اپنانا چاہئے۔'' مثلاً اصل زبان میں اگر کوئی ذو معنی لفظ ہے تو اس کا لفظی ترجمہ مناسب نہیں۔ یہاں اسی سے ملتا جلتا ترجمے کی زبان کا لفظ ہونا چاہئے جس میں یہی رعایت ہو۔

ادب میں چند مشہور ترجموں سے مثالیں دے کر یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ ان کو نظر انداز

کرنے سے کیا خرابیاں پیدا ہوئیں۔

ارسطو کی کتاب 'فنِ شاعری' (Poetics) یا 'بوطیقا' مغربی تنقید کا صحیفۂ اول کہی جا سکتی ہے۔ آج تک مغربی تنقید میں اس کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک فقرے پر بحث ہوتی ہے اور اسی سے برابر نئے معانی اور مطالب نکالے جاتے ہیں۔ یہ ان بنیادی کتابوں میں سے ہے جن کا ترجمہ دنیا کی قریب قریب ہر زبان میں موجود ہے اردو میں اس کا ترجمہ عزیز احمد نے ۱۹۴۱ء میں کیا تھا۔ عزیز احمد کا ترجمہ عام طور پر اچھا ترجمہ سمجھا جاتا ہے مگر ارسطو کی ٹریجڈی کا ترجمہ ملاحظہ کرکے آپ خود فیصلہ کیجئے پہلے انگریزی ترجمہ ملاحظہ کیجئے پھر عزیز احمد کا ترجمہ پھر اس پر تنقید اور آخر میں میرا ترجمہ:

> **"Tragedy, then, is an imitation of an action that is serious, complete, and of a certain magnitude; in language embellished with each kind of artistic ornament, the several kinds being found in separate parts of the play; in the form of action, not of narrative, through pity and fear, effectings, the proper purgation of these emotions." (BUTCHER)**

> ''ٹریجڈی نقل ہے کسی ایسے عمل کی جو اہم اور مکمل اور ایک مناسب عظمت (طوالت) رکھتا ہو جو مزین زبان میں لکھی گئی ہو جس سے حظ حاصل ہوتا ہو لیکن مختلف حصوں میں مختلف ذریعوں سے جو دردمندی اور دہشت کے ذریعے اثر کرکے ایسے ہیجانات کی صحت و اصلاح کرے۔''

اردو میں اوقاف کا استعمال کم ہی ہوتا ہے عزیز احمد نے صرف الٹے ''کامے'' اور ''وقفے'' استعمال کیا ہے۔ حالانکہ انگریزی میں ''کاما'' اور ''کولن'' کا استعمال ہے۔ جملہ ایک ہی ہے۔ عزیز احمد نے ایک جملے کا ترجمہ چار جملوں میں کیا ہے اور بعض ضروری الفاظ چھوڑ دیئے ہیں۔ بعض الفاظ کے ترجمے سے بھی میں متفق نہیں ہوں۔ "Serious" کا ترجمہ ''اہم'' کے بجائے ''سنجیدہ'' ہونا چاہئے تھا۔

"Magnitude" کے لئے اردو میں سامنے کا لفظ ''حجم'' موجود ہے۔ اس کے لئے

مناسب عظمت اور پھر "قوسین" میں "طوالت" لکھنا غیر ضروری تھا مزین زبان کی وضاحت اس طرح کی گئی ہے کہ جس سے خط حاصل ہو "In the form of action not of narrative" کا ٹکڑا جو بہت اہم ہے چھوڑ دیا گیا ہے پھر "purgation" یا "Katharsis" کے لئے ایک لفظ کے بجائے دو لفظ "صحت و اصلاح" ہیں، اس لئے میرے نزدیک نہ تو اس مشکل میں مطابق اصل ترجمہ ہے، نہ لفظی ترجمہ بلکہ ادھورا اور ناقص ترجمہ ہے۔ اس سے اصل کی روح مجروح ہوتی ہے۔

میرے نزدیک انگریزی عبارت کا ترجمہ کچھ اس طرح ہونا چاہئے:

"بس ٹریجڈی ایک ایسے عمل کی نقالی ہے جو سنجیدہ مکمل اور مناسب حجم کا ہو، جس کی زبان ہر قسم کی نئی آرائش سے مزین ہو اور (آرائش) کی یہ قسمیں کھیل کے مختلف حصوں میں پائی جاتی ہوں۔ یہ عمل کے روپ میں ہو نہ کہ بیانیہ کے، اور رحم اور خوف کے ذریعہ سے جزبات کا تنقیہ کرے۔"

تنقیہ کے علاوہ ایک اور لفظ بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ "تزکیہ" فرق یہ ہے کہ تنقیہ طب کی اصطلاح ہے اور تزکیہ تصوف کی۔ تنقیہ میں فاسد مادے کے خارج ہونے اور پھر جسم کے نظام کے صحت پانے کا مفہوم موجود ہے۔ تزکیہ میں رفعت اور پاکی کا مفہوم ہے۔ صحت و اصلاح سے وہ مفہوم ادا نہیں ہوتا، جو میرے نزدیک "Katharsis" کا ہے۔

بہر حال یہ تو واضح ہو ہی گیا کہ بنیادی کتابوں کے متن کا ترجمہ قطعی طور پر مطابق اصل ہونا چاہئے۔ اس میں تبدیلی کی گنجائش ہے نہ اضافے کی نہ کسی لفظ یا فقرے کو حذف کرنے کی، اس لئے اردو میں "فنِ شاعری" کے ایک اور ترجمے کی ضرورت ہے اور اس کے لئے عنوان "بوطیقا" جیسے ثقیل عربی لفظ کے بجائے صرف "فنِ شاعری" یا "شعریات" لکھنا کافی ہوگا۔ جمیل جالبی نے ایلیٹ کے کچھ مضامین کا ترجمہ کیا ہے جس کی عام طور پر تعریف کی گئی ہے۔ ایلیٹ کے مضمون Tradition & Individual Talent کے ایک اقتباس اور جالبی کے ترجمے پر غور کیجئے۔ دیکھیں آپ کے پلے کیا پڑتا ہے:

"I am alive to a usual objection to what is clearly part of my programme for the metier of

poetry. The objection is that the doctrine requires a ridiculous amount of erudition (Pedantry). a claim which can be rejected by appeal to the lives of poets in any pantheon. It will even be affirmed that much learning deadens of perverts poetic sensibility."

''میں اس عام اعتراض سے واقف ہوں جو شاعری کے پیشے کے سلسلے میں میرے پروگرام کا ایک حصہ ہے اعتراض یہ ہے کہ نظریے کے لئے مضحکہ خیز حد تک تبحر علمی اور اصول پرستی کی ضرورت پیش ہے جو ایک ایسا دعویٰ ہے جیسے شاعروں کے حالاتِ زندگی پر نظر ڈالنے ہی سے رڈ کیا جا سکتا ہے۔ اس سے بھی پتہ چلے گا کہ زیادہ علمیت شاعرانہ احساس وادراک کو کند کر دیتی ہے یا روک دیتی ہے۔''

پہلے جملے کا ترجمہ بالکل غلط ہے۔ ترجمہ یہ ہونا چاہئے: ''میں اس عام اعتراض سے واقف ہوں جو شاعری کے پیشہ کے سلسلے میں میرے پروگرام کے ایک حصے پر کیا جاتا ہے۔ اب دوسرا جملہ لیجے۔ اعتراض یہ ہے کہ نظریے کے لئے مضحکہ خیز حد تک تبحر علمی (اور اصول پرستی) کی ضرورت پڑتی ہے اور جو ایک ایسا دعویٰ ہے جسے شاعروں کے حالات زندگی پر نظر ڈالنے سے رد کیا جا سکتا ہے۔'' یہاں نظریہ سے پہلے لفظ ''اس'' ضروری ہے، پھر یہ جملہ اچھی اردو کا جملہ نہیں ہے، نیز اس میں "Pantheon" کا ترجمہ سرے سے کیا ہی نہیں گیا۔ میرے نزدیک اس جملے کا ترجمہ یہ ہونا چاہئے: ''اعتراض یہ ہے کہ میرے نظریے کے مطابق مضحکہ خیز حد تک تبحر علمی (بلکہ فضیلت مآبی) درکار ہے۔ یہ ایک ایسا دعویٰ ہے جو کسی مقدس سلسلے کے شعرا کے حالات زندگی کی روشنی میں رد کیا جا سکتا ہے بلکہ (معترض) اس پر بھی زور دیں گے کہ زیادہ علمیت شعری حسیت کو مردہ کر دیتی ہے یا مسخ کر دیتی ہے۔'' ادبی تنقید کا ترجمہ اگرچہ آسان نہیں مگر فلسفے کا ترجمہ بہرحال بہت مشکل ہے۔ اردو میں افلاطون کی ''ریاست'' کا وہ ترجمہ جو ڈاکٹر ذاکر حسین نے کیا ہے، عابد حسین کا کانٹ کا ''تنقید عقل محض'' کا ترجمہ خلیفہ عبدالحکیم مرزا ہادی رسوا اور مولانا عبدالباری کے ترجمے مجموعی طور پر

اچھے ترجمے ہیں۔ اگر چہ ''عقل محض'' کے مقابلے میں میرے نزدیک ''عقل خالص'' شاید بہتر ہوتا۔ ظفر حسین نے ''انواع فلسفہ'' کے نام سے "Types of Philosophy" کا بہت اچھا ترجمہ کیا ہے۔ سماجی علوم میں قابل قدر ترجمے روسو کے ''معاہدۂ عمرانی'' کا ترجمہ ڈاکٹر محمود حسین کا کیا ہوا کینس کا روزگار شرح ''سود وزر'' ابو سالم کا کیا ہوا۔ ولیم جیمس کی مشہور کتاب ''نفسیات وواردات انسانی'' کا ترجمہ خلیفہ عبدالحکیم کا کیا ہوا اچھے ترجمے کہے جا سکتے ہیں، پھر بھی سماجی علوم میں بہت سی بنیادی کتابوں کا ترجمہ ہونا باقی ہے۔ ہمارے دستور کا جو ترجمہ اجمل خاں، محمد مجیب اور ہارون خان شیروانی نے کیا ہے، وہ نہ صرف اردو میں انگریزی کی روح کو برقرار رکھنے میں کامیاب ہے بلکہ اس کی خوبی یہ ہے کہ ترجمہ معلوم نہیں ہوتا۔ تمہید ملاحظہ ہو:

> ''ہم ہند کے لوگوں نے پوری سنجیدگی کے ساتھ فیصلہ کیا ہے کہ ہند کو ایک
> پورے اختیار والی عوامی جمہوریہ بنائیں اور اس کا بندوبست کریں کہ اس
> کے ہر شہری کو انصاف ملے۔ سماجی، معاشی اور سیاسی آزادی ملے، خیال،
> بیان، عقیدے، مذہب اور عبادت کی برابری ملے حیثیت اور موقعوں میں۔
> اور ہم نے طے کیا ہے کہ شہریوں کے درمیان اس طرح بھائی چارہ پھیلائیں
> کہ فرد کا وقار اور قوم کی ایکتا محفوظ رہے۔''

جہاں تک تصنیف وتالیف کا سوال ہے، اس کے مسائل ترجمے کے مسائل سے خاصے مختلف ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ تصنیف کے کئی درجے ہوتے ہیں۔ ایک ابتدائی درجہ عام فہم انداز میں کسی مسئلے کے مبادیات کو بیان کرنے کا ہے۔ مثلاً سیاسیات یا نفسیات پر کوئی ابتدائی کتاب لکھی جائے جو بی۔اے۔ کے طالب علموں کے لئے ہو۔ اس میں نصاب کی ضرورت کو ملحوظ رکھنا ہوگا۔ طلباء کی عمر اور استعداد اور ان کی زبان پر قدرت کو بھی دیکھنا ہوگا۔ موضوع کے مناسب معیار کو دیکھنا ہوگا — تاکہ اس ابتدائی منزل پر کوئی غلط نظریہ ذہنوں میں رائج نہ ہو جائے۔ یہاں اصطلاحات کی تعداد زیادہ نہ ہوگی مگر یہ ضروری ہوگا کہ یہ اصطلاحات مستند ہوں۔ بی۔اے کی منزل کے بعد ایم۔ اے کی منزل کے لئے کتابیں لکھوانے کا سوال ہوتا ہے یہاں کتاب کا معیار خالص علمی ہوگا۔ زبان کے عام فہم ہونے پر اصرار نہ ہوگا کیونکہ یہ کتابیں اس مضمون میں مہارت حاصل کرنے کے لئے

پڑھی جائیں گی۔ اس منزل پر، موضوع پر جدید ترین معلومات ضروری ہوں گی۔ ہر مضمون کے لئے تراجم اور تصانیف میں ایک خاص تناسب ہونا چاہئے۔ تراجم کی اہمیت مسلم مگر تصانیف بی. اے کی منزل پر زیادہ اہم ہیں اس لئے اگر کسی مضمون پر چار کتابوں کا ترجمہ کر دیا گیا ہے تو کم سے کم چار تصانیف بھی ہونی چاہئیں۔ اگر کوئی ماہر فن اپنی نظر اور تجربے کی بناء پر سیاسیات یا اقتصادیات پر کوئی کتاب لکھے تو ہمارے طلباء اس مضمون سے زیادہ آشنا ہوں گے۔ ترجمے کے ذریعے اتنا ابلاغ نہیں ہوتا جتنا تصنیف کے ذریعہ ہوتا ہے۔ سماجی علوم میں ویسے ہی ہندوستانی ماحول اور مشرقی فضا کو دیکھتے ہوئے تصانیف کی زیادہ ضرورت ہے کیونکہ مقامی مثالوں کے ذریعے بات کو زیادہ اچھی طرح ذہن نشیں کرایا جا سکتا ہے۔ ترجمہ بہر حال پٹری پر چلنے کے مترادف ہے اور طالب علم اس پٹری سے اکتا بھی سکتا ہے۔ تصنیف میں زیادہ آزادی ہے اور اس کے ذریعے سے زیادہ سے زیادہ وسیع فضا کی سیر کی جا سکتی ہے۔

اب مجھے اصطلاح سازی کے اصولوں کے متعلق کچھ کہنا ہے۔ اس سلسلے میں ہمیں چاہئے کہ وحید الدین سلیم کی ''وضع اصطلاحات'' کو خاص طور سے نظر میں رکھیں جو لوگ آنکھ بند کر کے انگریزی کی اصطلاحات بجنسہٖ لینا چاہتے ہیں ان کے متعلق وحید الدین سلیم کی رائے یہ ہے:

> ''انگریزی زبان میں علمی الفاظ کی اس قدر کثرت ہے کہ اگر ان سب الفاظ کو ہم بگاڑ کر جاہلوں کی زبان خراد پر چڑھا کر اپنی زبان میں داخل کر لیں تو ہماری زبان کا قدرتی حسن و جمال اور اس کے خط و خال کی قدرتی خوبیاں سب خاک میں مل جائیں گی۔ اجنبی زبان کے الفاظ کی کیسی ہی تراش خراش کیوں نہ کی جائے ان میں اجنبیت کی بو اس قدر باقی رہتی ہے کہ اہل زبان ان سے مانوس نہیں ہوتے،۔ ہماری زبان میں موجودہ اصل الفاظ کی تعداد ہی بمقابلہ مہذب زبانوں کے کم ہے اگر انگریزی زبان کے تمام علمی الفاظ توڑ مروڑ کر اس میں بھر دیئے جائیں تو ان کی تعداد اصل سے بھی زیادہ ہو جائے گی اور ہماری زبان کی لچک اور نزاکت سب ملیامٹ ہو جائے گی اور ہم ایسی زبان بولنے اور لکھنے پر مجبور ہوں گے جس کے الفاظ کا کوئی جزو

گوش آشنا اور مانوس نہ ہوگا۔ برخلاف اس کے اگر ہم انگریزی زبان کے علمی الفاظ کے مقابلے میں ایسے الفاظ وضع کریں جن کے اجزا پہلے سے گوش آشنا اور مانوس ہوں تو اس سے نہ تو زبان کی سلاست اور لوچ میں کوئی فرق آئے گا اور نہ ہم اپنی زبان میں کسی ناگوار مداخلت کے مرتکب ہوں گے۔" (وضع اصطلاحات)

میں اس نظریے سے مجموعی طور پر اتفاق کرتا ہوں، ہاں صرف یہ عرض کرنا ہے کہ اس کے باوجود بعض ایسے الفاظ کے لئے جو بالکل نئے ہیں اور جن کا مفہوم کسی طرح سے پرانے الفاظ سے ادا نہیں ہوسکتا۔ ایک دو جگہ انگریزی سے الفاظ لینے میں کوئی حرج نہیں ان کی تعداد اتنی ہونی چاہئے کہ مجموعی طور پر زبان کی جینئس مجروح نہ ہو۔ یہاں میں نے لفظ مزاج یا بناوٹ استعمال نہیں کیا کیونکہ میرے نزدیک جینئس میں انفرادیت کا جو پہلو ہے، وہ مزاج یا بناوٹ سے ظاہر نہیں ہوتا، پھر لفظ جینئس ہمارے صوتی نظام سے ہم آہنگ ہے، اس لئے ایسے الفاظ لینے میں کوئی حرج نہیں۔ ویسے بھی آئیڈیلزم، مارکسزم، بیلٹ، ایڈی پو کمپلیکس(Oedipu Complex) ایٹم، میزائل ٹریبونل اٹارنی، شیڈیول کو بجنسہٖ لے لینا بہتر ہوگا، ان کا ترجمہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ الفاظ اخباروں میں استعمال ہونے لگے ہیں۔

پھر بھی اصطلاح سازی کے لئے ہر جدید زبان کو کسی کلاسیکل زبان کی مدد کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگرچہ وحید الدین سلیم نے اس پر زور دیا تھا کہ اردو کے آریائی مزاج کا خیال رکھا جائے مگر جامعہ عثمانیہ کی اصطلاحوں میں طباطبائی کے اثر سے عربی سے ضرورت سے زیادہ فائدہ اٹھایا گیا۔ چند سال ہوئے کابل میں ترجمے پر ایک سیمینار ہوا تھا جس میں ایران، افغانستان، تاجکستان، ہندوستان اور پاکستان کے نمائندے شریک ہوئے۔ میں اس سیمینار میں موجود تھا۔ ایران کے نمائندوں نے بتایا کہ ان کے یہاں عربی کی اصطلاحوں کے بجائے اب فارسی کی اصطلاحیں برتنے کا رواج ہے۔ انہوں نے اس کے علاوہ فرانسیسی کے اثر کی وجہ سے بہت سی فرانسیسی اصطلاحوں کو مفرس کرلیا ہے۔ ظاہر ہے کہ تہنید کا یہ عمل ہمارے یہاں بھی جاری ہے اور جاری رہنا چاہئے مگر کچھ الفاظ پہلے فارسی پھر عربی سے پھر انگریزی سے لینے ہی پڑیں گے۔ اردو چونکہ ایک جدید ہندوستانی

زبان ہے اور اس کی بنیاد کھڑی بولی ہے جو شورسینی اپ بھرنش سے نکلی ہے، اس لئے اس کا تعلق اپ بھرنش کے ذریعے سنسکرت سے ہے۔ سنسکرت کا رشتہ فارسی سے مسلّم ہے کیوں کہ دونوں زبانیں اِنڈو آرین خاندان سے تعلق رکھتی ہیں، اس لئے اگر چہ ہم اردو کی جینئس کو دیکھتے ہوئے سنسکرت کی اصطلاحوں سے زیادہ فائدہ نہیں اٹھا سکتے، پھر بھی فارسی کی اصطلاحوں پر زیادہ توجہ کر کے سنسکرت سے قریب رہ سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہم (Sub-Conscious Conscious, Unconscious) کے لئے شعور، تحت الشعور اور لاشعور کی اصطلاحیں استعمال کرتے ہیں۔ ان کی جگہ فارسی کی اصطلاحیں آگہی، زیرِ آگہی اور ناآگہی بے تکلف استعمال کر سکتے ہیں، اس لئے میرے نزدیک اصطلاح سازی کے لئے ہمارا اصول یہ ہوگا کہ موجودہ اصطلاحوں میں سے جو ہمارے آریائی مزاج کے مطابق ہیں، وہ بجنسہٖ رہنے دی جائیں۔ نئی اصطلاحیں فارسی کی مدد سے بنائی جائیں اور جہاں انگریزی کی اصطلاح لینی ناگریز ہو، وہاں انگریزی کی اصطلاح تھوڑے سے تصرف کے ساتھ اختیار کر لی جائے۔ اس سلسلے میں ہمیں ایک اصول کو چھوڑنا پڑے گا جس پر اب تک ہمارے علماٗ اور خواص سختی سے عمل پیرا رہے ہیں۔ یعنی فارسی اور ہندی الفاظ کی ترکیب سے احتراز یا ہندی اور عربی سے مرکب الفاظ بنانے سے پرہیز۔ ہماری زبان میں جب لب سڑک، فوق البھڑک، چھٹی رساں تماہی، جیسے الفاظ موجود ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم حسب ضرورت اسی اصول پر اپنی اصطلاحیں نہ بنائیں۔ دراصل انشاءؔ نے ''دریائے لطافت'' میں اردو زبان کی خودمختاری کا جو اعلان کیا تھا، اس سے پورا فائدہ اٹھانا ضروری ہے۔ انشاؔ نے کہا تھا کہ جو لفظ عربی یا فارسی کا اردو زبان میں مستعمل ہوگیا، وہ اب اردو کا لفظ ہے اور اسے اردو کے قاعدے سے برتنا چاہئے۔ اس اصول پر عمل کرنے سے ہماری بہت سی مشکلات دور ہو سکتی ہیں۔

میں چند مثالوں سے اپنی بات واضح کرنا چاہتا ہوں۔ ہم "Nature" کے لئے ''فطرت'' natural کیلئے فطری "Naturalism" کے لئے فطرت پرستی کی اصطلاحوں سے کام لیتے ہیں لیکن Super Natural کیلئے ''مافوق الفطرت'' کہتے ہیں۔ حالانکہ ''فوق فطری'' کافی ہوگا۔ اسی طرح "International" کیلئے بین الاقوامی کے بجائے ''بین قومی'' لکھنا زیادہ مناسب ہوگا۔ ''نشاۃ الثانیہ'' کے لئے ''نئی بیداری'' مناسب ہوگا۔ ہم نے مذہب میں ''صلواۃ'' کے بجائے ''نماز'' کو

اختیار کرلیا لیکن بہت سی اصطلاحیں عربی کی نہیں چھوڑ سکتے، حالانکہ فارسی کی اصطلاحیں یا ہندی کی وہ اصطلاحیں جو ہمارے صوتی نظام سے متصادم نہ ہوں، ہمارے لئے زیادہ قابل قبول ہونی چاہئے۔

اس سلسلے میں ایک بات اور قابل غور ہے۔ انگریزی میں لفظ ''نیشن'' سے ''نیشنلائز'' اور آئیڈیل سے آئیڈلائز بنا گیا ہے۔ اس نہج پر ہمیں ''قومیانا'' اور ''آدرشیانا'' لکھنا چاہئے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ "Idealization" کے لئے آدرشیانے'' کا عمل اور "Nationalization" کے لئے ''قومیانے'' کا عمل لکھنا پڑے گا۔ قدیم اردو میں ''خرچ'' سے خرچنا'' استعمال ہوتا تھا۔ وحیدالدین سلیم نے اس اصول پر برقانا کی حمایت کی تھی۔ اس طرح بہت سے فعل بنائے جاسکتے ہیں۔ گو اس میں شک نہیں کہ ہر جگہ یہ اصول کام نہیں دے گا۔ انگریزی میں بھی نہیں دیتا۔

اصطلاح سازی بہرحال ضروری ہے۔ نئے خیالات کے لئے نئے الفاظ لینے ہوں گے۔ ہاں حالؔی کے بنائے ہوئے اصول کے مطابق اس معاملے میں احتیاط سے کام لینا ہوگا۔ نئے الفاظ نئے ذہن کی تشکیل کرتے ہیں۔ اردو کو جدید ذہن سے ہم آہنگ کرنے کے لئے جدید اصطلاحیں بنائے بغیر چارہ نہیں مگر کوئی جدید چیز بالکل جدید نہیں ہوتی۔ یہ کسی پرانی اور بھولی بسری روایت کی تجدید، توسیع یا ترمیم ہوتی ہے، اس لئے ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنے سارے خزانے کو کھنگالیں، پیشہ وروں کی اصطلاحات سے مدد لیں اور نئی چیزوں، نئے خیالات، نئے لفظوں کو حسب ضرورت اختیار کرلیں۔ یہ نہیں سوچنا چاہئے کہ یہ کتابیں کون پڑھے گا۔ طالب علم تو نہ اردو جانتے ہیں، نہ ہندی اور نہ انگریزی۔ ایک طرف ہمیں اس پر اصرار کرنا چاہئے کہ جن کی مادری زبان اردو ہے، وہ ثانوی تعلیم اردو کے ذریعے سے حاصل کریں تاکہ ان کی بنیاد مضبوط ہو۔ دوسری طرف ہمیں ان کو افسانہ و افسوں اور جذبات کے محشرستان کے بجائے فکر و نظر کی رفعتوں کی طرف مائل کرنا ہوگا تاکہ وہ جدید ذہن پیدا کرسکیں اور اس جدید ذہن کی مدد سے موجودہ دور کی پرپیچ اور نت نئے روپ بدلنے والی زندگی کے فرائض سے عہدہ برآمد ہوسکیں۔ تراجم اور تصانیف کے کام میں یہی آدرش ہونا چاہئے۔ اس آدرش تک پہنچنے میں دیر لگے گی مگر تاریخ بتاتی ہے کہ اچھے راستے وہی ہوتے ہیں جو سب سے لمبے ہوتے ہیں کیونکہ انہیں میں خلوص، ریاض اور خونِ جگر کی مکمل نقش گری ہوسکتی ہے۔

دریافت اور بازیافت: ترجمے کا معاملہ

شمس الرحمٰن فاروقی

(پیدائش: ۱۹۳۵ء)

ترجمے کے بارے میں سوالات اور مسائل کا گہرا تعلق زبان کی اصل اور نوعیت کے بارے میں سوالات سے ہے۔ اگر کوئی ایس واحد قدیمی زبان نہیں تھی جسے ہم ام الالسنہ کہہ سکیں اور اگر ہر زبان اپنی جگہ بے عدیل و بے نظیر ہے، تب تو ترجمہ ناممکن ہے۔ چوں کہ ایک زبان سے دوسری زبان میں کسی نہ کسی طرح کا ترجمہ ممکن ہے، اس لئے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ کبھی کوئی قدیمی، آفاقی ام الالسنہ تھی جس نے اپنے نشان بعد کی تمام زبانوں میں چھوڑے ہیں اور اسی باعث یہ ممکن ہوسکا کہ انسان اپنے تجربے کو دوسروں تک پہنچا سکتے ہیں اور اپنے خیالات کی ترسیل دوسروں تک کرسکتے ہیں۔ نوم چومسکی (Noam Chomsky) اسی نظریئے کا مؤید معلوم ہوتا ہے۔ شاید اسی لئے کہ اس نظریئے کی رو سے کسی آفاقی تبدلاتی (transformational) گرامر کے وجود کا بھی امکان پیدا ہوتا ہے۔ چومسکی کہتا ہے کہ "انسانی دماغوں میں ایک نظام قواعد مشترک ہے اور یہی نظام قواعد ہمارے لئے یہ بات ممکن بناتا ہے کہ ہم لامتناہی پھیلاؤ کے اندر واقع ہونے والے

فقروں کو اپنے اندر وصول کرنے (process) اور ان کی تعبیر کرنے میں کامیاب ہوسکیں۔"

چومسکی کے بہت سے تصورات کی مخالفت گزشتہ چند برسوں میں ہوئی ہے لیکن اس کے اس سوال کو کوئی اطمینان بخش جواب نہیں مل سکا ہے کہ انسان بولتا کیوں ہے؟ کیا انسان اس لئے بولتا ہے کہ اس کے حلق اور گلے میں خاص طرح کے عضلات اور ہڈیات ہیں جو آواز نکالنے میں معاون ہیں یا انسان کے حلق اور گلے میں خاص طرح کے عصلات اور ہڈیات اس لئے ہیں کہ وہ بول سکتا ہے؟ یہ معاملہ صرف اس بات کا نہیں ہے کہ فوقیت کس کو حاصل ہے؟ بدنیات (Anatomy) کو یا حیاتیات (Biology) کو؟ کیوں کہ اگر انسان اس لئے بولتا ہے کہ اس کا گلہ ایک خاص طرح کا ہے تو پھر زبان ایک محض بدنیاتی معاملہ ہے اور یہ محض انسانوں کی کوئی بلاشرکت غیرے جاگیر نہیں۔ لیکن اگر انسان نے لاکھوں برس میں ایسا گلا ارتقائی طور پر حاصل کیا جس کے ذریعے آوازیں نکل سکیں کیوں کہ انسان بولنا چاہتا تھا، تب تو زبان بدنیاتی نہیں بلکہ داخلی اور حیاتیاتی معاملہ ہے اور اگر ایسا ہے کہ تو کسی ایسی زبان کا وجود تصور کرنا مشکل نہیں جسے کسی گم نام، قدیم زمانے میں تمام انسان بولتے تھے۔ اس نظریئے کی رو سے انسان کے لئے زبان فطری اور داخلی قوت ہے اور اس کی وہی حیثیت ہے جو موسیقی، ڈرائنگ اور منطق کی ہے۔

لیکن مشکل یہ ہے کہ موسیقی، ڈرائنگ اور منطق کو سمجھنے کے ان کا ترجمہ ضروری نہیں لیکن زبان تو علامیوں (codes) کے ذریعے اپنا عمل کرتی ہے اور ان علامیوں codes کے ذریعے اپنا عمل کرتی ہے اور ان علامیوں codes کو کھولنا، decode کرنا ہر سطح پر ضروری ہوتا ہے۔ رومان یاکسبن کہتا ہے کہ علامیہ کھولنے (to decode) کا یہ عمل اس وقت بھی ہوتا ہے، جب علامیے کا مخاطب ایسا شخص ہو جو اس زبان کو نہ صرف جانتا ہو، بلکہ وہ زبان اس کی مادری زبان بھی ہو کیوں کہ علامیے کی فطرت ہی ایسی ہے کہ وہ اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ اسے کھولا جائے (یعنی decode کیا جائے) اگر ایسا ہے تب تو ہم تمام زندگی ترجمہ ہی کرتے رہتے ہیں، حتیٰ کہ اپنی زبان میں گفتگو کرتے وقت بھی ہم ترجمہ ہی کر رہے ہوتے ہیں۔ لہٰذا ترجمہ ایسا عمل ہے جو ضروری بھی ہے اور پسندیدہ بھی۔ جب دو اشخاص کے درمیان علامیے مشترک ہوں تو مشکل نہیں ہوتی بلکہ یوں کہیے کہ ہوتی ہے مگر بہت کم، اتنی نہیں ہوتی کہ بات سمجھ میں نہ آئے۔ اصل مشکل تب پیدا ہوتی ہے، جب

گفتگو کرنے والوں کے درمیان علامیہ مشترک نہیں ہوتا، مثلاً جب ہمارا سابقہ ایسی زبان سے پڑتا ہے جس سے ہم نابلد ہوں۔ ایسی صورت میں اجنبی زبان کے علامیوں کو سیکھنا اور ان اجنبی علامیوں کو اپنے مانوس علامیوں مین منتقل کرنا پڑ جاتا ہے۔

علامیوں کو اس طرح منتقل کرنے میں ان کے معنی کا کتنا حصہ ضائع ہو جاتا ہے۔ مثالی صورتِ حال کی رو سے تو یہ ہونا چاہئے کہ کچھ بھی ضائع نہ ہو، خاص کر اگر تمام زبانوں کی ماں ایک ہی زبان ہے۔ لیکن حقیقی صورتِ حال یہ ہے کہ بہت کچھ ضائع ہو جاتا ہے۔ کیفیت کے اعتبار سے بھی اور کمیت کے اعتبار سے بھی، بلکہ یوں کہئے کہ کیفیت کے اعتبار سے نقصان اتنا زیادہ ہوتا ہے کہ یہ کہنا مشکل ہے کہ نقسان کی نوعیت محض کمیت سے متعلق ہوتی ہے۔ اس معاملے پر آئندہ بحث ہوگی۔ فی الحال تو زبان کی نوعیت کے بارے میں ایک دو باتیں اور ہو جائیں۔

چومسکی کے مخالف نظریات لسان میں ایک نظریہ یوں ہے کہ زبان دراصل تہذیب سے مختص ہے۔ بعض لوگ تو یہاں تک کہہ دیں گے کہ تہذیب ہی زبان سے مختص ہے، یعنی اگر زبان مجموعہ ہے حیات و کائنات کے بارے میں بیانات کا، تو تہذیب ان بیانات کی عملی صورت یا ان کا عملی پہلو ہے۔ اس طرح معلوم ہوا کہ تہذیب کچھ نہیں ہے۔ وہ محض زبان کی اولاد ہے۔ جارج اسٹائنر (George Stainer) کا نظریہ تقریباً یہی ہے کہ جب وہ کہتا ہے bread یعنی ''روٹی'' کے لئے انگریزی لفظ کو Pain (یعنی ''روٹی کے لئے فرانسیسی لفظ) کا ترجمہ نہیں کہہ سکتے فرانسیسی کانوں کا لفظ pain میں احتیاج اور پر جوش مطالبے کی وہ گونج سنائی دیتی ہے جو انگریزی لفظ میں ہے ہی نہیں۔ لہٰذا اس نظریئے کی رو سے یہ ہم نہیں ہیں جو کوئی نظریۂ حیات و زندگی وضع کرتے ہیں اور پھر اسے زبان کے ذریعے ظاہر کرتے ہیں بلکہ یہ زبان ہے جو ہمارے نظریۂ حیات و زندگی کو وضع کرتی ہے، یہاں ہم ارسطو کے اس خیال کے بہت قریب پہنچ جاتے ہیں کہ کسی چیز کو نام دینا اور اس کو بیان کرنا ہی اس شے کا علم حاصل کرنا ہے۔ یعنی جب آپ نے کسی شئے کو نام دے دیا اور اس کو بیان کر دیا تو اس کا علم آپ کو حاصل ہو گیا۔ یہ تصور تمام قدیم فلسفوں اور قبلِ قدیم اعتقادات میں کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے۔ پرانے تصورات کی رو سے لفظ اور شے ایک ہی تھے۔

رچرڈ رورٹی (Richard Rorty) نے نطشے اور نلسن گڈمین کے خیالات سے استفادہ

کرتے ہوئے اپنے حالیہ خیال انگیز مضامین کے سلسلے میں اس بات سے بحث کی ہے کہ خودی (Selfhood) اور لسان دونوں ہی وجوب سے معریٰ ہیں۔ رورٹی کا کہنا ہے کہ حقائق (یا حقیقت) چوں کہ زبان کے ذریعے ظاہر کئے جاتے ہیں اور زبان انسان کی بنائی ہوئی ہے، اس لئے حقائق (یا حقیقت) بھی انسان کے بنائے ہوئے ہیں۔ یہ تصور ترجمے کے لئے پیغام موت کا حکم رکھتا ہے کیوں کہ اگر تمام سچائیاں انسان کی بنائی ہوئی اور وجوب سے عاری ہیں تو ایسی کوئی آفاقی حقیقت نہیں جسے ہم جان سکیں اور جس کا ترجمہ کرسکیں۔ تمام تراجم کو یہ خطرہ لاحق ہے کہ وہ محض ہماری سچائیوں کی تخلیقِ نو ہیں اور ان میں کوئی بھی اصلیت نہیں۔

لیکن اگر ہم رورٹی کے اس تصور کو مسترد بھی کردیں کہ زبان وجواب سے عاری ہے تو بھی ہم ان مسائل کو حل کرنے سے بہت دور رہیں گے جو زبان کے تفاعل کے بارے میں آج کے مقبول نظریات کے ذریعے پیدا ہوتے ہیں۔ سی ایس پیرس (C.S.Peirce) اور فرڈنیاں سوسیور (Ferdinand Sanssure) کی تحریرات اس صدی کے شروع میں منظرِ عام پر آئیں اور آج تو سوسیور کی لسانیات اس زمانے کا برحق نظریہ لسان بن گئی ہے۔ ایڈورڈ سعید نے اپنی کتاب The World The Text And The Cricitc میں کہا ہے کہ لسان کے عدم وجوب کا نظریہ سب سے پہلے اسپینی عرب فلسفی ابن حزم نے پیش کیا۔ ان تمام خیالات کے نتیجے میں یہ مشکل پیدا ہوتی ہے کہ اگر زبان مطلق حقائق کا گہوارہ نہیں ہے، تب ہم دنیا کے بارے میں علم صرف منفی اصطلاحات کے ذریعے حاصل کرسکتے ہیں اور یہ منفی اصطلاحات بھی انسان کی بنائی ہوئی ہیں۔

ترجمے سے ان معاملات کا تعلق ظاہر ہے۔ اگر معنی الفاظ کے اندر اصلی وجود نہیں رکھتے بلکہ محض الل ٹپ ہیں تو کیا ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ کسی فن پارے میں مرادِ شاعر کیا تھی؟ کیا ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ شاعر کے معاصرین نے اس کے کلام سے کیا مراد لی تھی؟ اور اگر ہم شاعر کی مراد کو سمجھنے میں کامیاب بھی ہوجائیں تو کیا یہ ضروری ہے کہ اس کا مفہوم ہمارے لئے بھی معنی خیز ہو؟ اگر نہیں تو کیا جب ہم کسی فن پارے کا ترجمہ اپنی فہم کے اعتبار سے کرتے ہیں تو کیا ہم اس فن پارے پر اپنے معنی مسلط نہیں کررہے ہیں؟ شاید اسی لئے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ترجمہ محض ترجمہ نہیں، بلکہ ترجمہ شدہ فن پارے کی عمدہ تنقید بھی ہوتا ہے اور فرض کیجئے کہ ہم مراد شاعر کو سمجھ گئے اور

مرادِ شاعر ہمارے لئے بامعنی بھی ہے تو اب ہم کیا کریں؟ مثال کے طور پر پرانے یونانیوں کا خیال تھا کہ نظر یا بصارت روشنی کی باریک لکیریں ہیں جو آنکھ سے نکل کر اشیأ پر پڑتی ہیں اور اس طرح اشیأ ہمیں دکھائی دیتی ہیں۔ یونانیوں کے اس نظریئے کی بنا پر فارسی، عربی، ترکی، اردو وغیرہ میں ''تارِ نگاہ'' قسم کے صدہا استعارے وجود میں آئے۔ اس تصور کی وجہ سے شعرأ کے لئے یہ ممکن ہوا کہ وہ بصارت کو کسی طبعی قوت کی طرح کا فرض کر سکیں۔ پھر معشوق کی نگاہ کے لئے خنجر، تلوار، تیر وغیرہ استعارے ممکن ہو سکے۔ مصری سائنس داں ابن الہیثم نے دسویں صدی میں دریافت کیا کہ روشنی آنکھ سے نکل کر اشیا پر نہیں پڑتی بلکہ وہ روشنی جو اشیا پر باہر سے پڑتی ہے، اس کے ذریعے آنکھ کے پردے پر تصویریں بنتی ہیں۔ ابن الہیثم کے تصورات کی وجہ سے اس طرح کے مضامین وجود میں آئے کہ دیکھی ہوئی شے کا نقش (یا عکس) آنکھ پر ہمیشہ کے لئے مرتسم ہو جاتا ہے۔ اب اگر آپ انگریزی میں ترجمہ کر رہے ہیں تو اس طرح کے استعاروں کو کس طرح ادا کریں گے کہ نگاہیں تیر ہیں یا یہ کہ آنکھ کی سطح پر کسی شے کا نقش ہمیشہ کے لئے کالجر ہو گیا ہے؟ آپ جو بھی کریں، لیکن اصل بیابن کی کچھ نہ کچھ سچائی ترجمے میں ضرور ضائع ہو جائے گی۔

کہا گیا ہے کہ چوں کہ تمام زبان ہی الل ٹپ ہے۔ اس لئے تمام زبان استعارہ ہے۔ لہٰذا مترجم کو چاہئے کہ لفظ بہ لفظ ترجمے کے بجائے استعارہ بہ استعارہ ترجمہ کرے۔ لیکن یہ استدلال دوری (cricular) ہے کیوں کہ اگر تمام زبان استعارہ ہے تو الفاظ سے الگ استعارہ کوئی چیز نہیں۔ لیکن چلئے تھوڑی دیر کے لئے اس استدلال کو تسلیم کر لیتے ہیں کہ مترجم کو چاہئے کہ استعارہ بہ استعارہ ترجمہ کرے۔ استعارے کی بنیاد یہ ہے کہ مماثلت کی بنا پر معنی میں توسیع ہو اور مماثلت کا تصور پیدا ہوتا ہے ہمارے تصورِ حیات وزندگی سے اور ہمارا تصورِ حیات وزندگی اگر زبان کا پروردہ نہیں بھی ہے تو زبان سے متاثر ضرور ہوتا ہے۔ سی۔ایس۔ پیرس (C.S.Peirce) نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ''لفظ کتا کسی کو نہیں کاٹتا'' لہٰذا کتے اور خون خواری میں مماثلت اس وجہ سے نہیں ہے کہ لفظ ''کتا'' میں کوئی خاص ''کتاپن'' ہے۔ یہ مماثلت اس وجہ سے ہے کہ ہمارے نظریۂ حیات وزندگی کی رو سے کتے خوں خوار ہوتے ہیں لیکن اگر کوئی تہذیب ایسی ہو جس میں کتے کو معصوم اور مقدس مانا جاتا ہو تو کتے اور خونخ خواری کی مماثلت غائب ہو جاتی ہے۔ فرض کیجئے ایسی کسی تہذیب میں کوئی مترجم

آڈن (Auden) کی ایک نظم کا ترجمہ کر رہا ہے جس میں یہ دو سطریں ہیں:

In the nightmare of the dark

All the dogs of Europe bark

تو ایسی تہذیب والے کے لئے یہ مصرعے مفہوم سے عاری ہوں گے۔ لہٰذا اس کے ترجمے میں ogs کی جگہ کوئی اور جانور رکھنا پڑے گا، مثلاً بھیڑیا، لکڑ بگھا لیکن فرض کیجئے کہ ہمارے مترجم کی تہذیب میں بھیڑیے اور لکڑ بگھے کا وجود نہیں۔ وہ سوچ سمجھ کر ان کا نزدیکی درندہ ''شیر'' اپنے ترجمے میں لکھ دیتا ہے۔ بھیڑیے یا لکڑ بگھے کا لفظ رکھنے کے بعد اسے لفظ bark کے لئے بھی کوئی دوسرا لفظ پڑتا۔ لیکن لفظ شیر کا انتخاب کر کے وہ دہری مشکل میں پڑے گا اسے لفظ bark کی جگہ کوئی اور لفظ تو رکھنا ہی ہوگا، لیکن ''شیر'' کہہ کر وہ مراد شاعر سے بہت دور بھی جا پڑے گا کیونکہ آڈن انگریزی شاعر ہے اور یورپ میں شیر ہوتے ہی نہیں۔ لہٰذا ''یورپ کے شیر'' اتنا ہی بے معنی ہے جتنا ''ہندوستانی زیبرا'' یا ''خطۂ شمالی کا مور'' پھر مصیبت یہ ہے کہ بھونکتے ہوئے کتوں کے پیکر میں بہت سے انسانی، گھریلو انسلاکات بھی ہیں۔ جہاں آپ نے لفظ bark کو ترک کیا، وہ انسلاکات بھی ترک ہو جائیں گے اور ترجمہ ناقص رہ جائے گا۔

لہٰذا ایسا لگتا ہے کہ دونوں طرح مترجم کی شکست ہی بدی ہے۔ اگر لفظ بہ لفظ ترجمہ سہل ہو سکتا ہے تو غیر لفظی یا استعاراتی یا تخلیقی ترجمہ بھی اسی خطرے میں ہے۔

بہت سے مترجم کہتے ہیں کہ اگر ہم ''اصل کی روح'' کو ادا کر دیں تو ہم نے اپنا کام کر لیا، کیوں کہ الفاظ تو بہر حال ناقابلِ ترجمہ ہیں۔ یا اگر ان کا ترجمہ ہو بھی جائے تو وہ اصل کے ساتھ انصاف نہیں کرتے۔ یہاں میں اس بات سے بحث نہ کروں گا کہ کیا مترجم بلکہ کسی بھی شخص میں یہ صلاحیت ہوتی بھی ہے کہ وہ اصل کی روح کے بارے میں صحیح صحیح بیان کر سکے کہ وہ کیا ہے؟ لیکن میں یہ سوال ضرور پوچھوں گا کہ کیا اصل الفاظ کے علاوہ اور بھی کوئی الفاظ ہو سکتے ہیں جو اصل کی روح کو بیان کر سکیں، مثلاً نگاہوں کے تیر، اس فقرے کی روح کو بیان کرنے کے لئے کون سے الفاظ یا کون سی عبارت کافی ہوگی۔ اقبالؔ کا مصرع ہے:

؎ اور نگاہوں کے تیر آج بھی ہیں دل نشیں

یہاں ''دل نشیں'' کے لغوی معنی ہیں دل میں بیٹھا ہوا، دل میں گڑا ہوا، دل میں بیٹھنے یا گڑنے کی صلاحیت رکھنے والا۔ اس کے مجازی معنی ہیں دل کو کھینچنے والا، دل کو متاثر کرنے والا۔ اب ''نگاہوں کے تیر'' کی مناسبت سے ''دل نشیں'' کے لغوی معنی ترجمے میں زیادہ بہتر معلوم ہوں گے اور اس فقرے کا لغوی ترجمہ ''اصل کی روح'' سے نزدیک تر معلوم ہوگا۔ پھر اس قاعدے کا کیا بنا کہ مترجم کو چاہئے کہ وہ لغوی معنی کو نظر انداز کر کے ''اصل کی روح'' کو اپنی گرفت میں لائے؟ اکثر تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لغوی معنی ہی میں اصل کی روح پوشیدہ ہے۔

وکٹر کیئرنن(Victor Kiernan) نے اقبال کے محولہ بالا مصرعے کا ترجمہ یوں کیا ہے:

Those glances whose barbs sticks in the heart

where they fall.

ظاہر ہے کہ اس ترجمے میں ''دل نشین'' کے دونوں معنی لغوی اور استعاراتی مفقود ہیں۔ پھر ترجمے کے آخری تین لفظ where they fall نہ صرف بالکل نامناسب ہیں بلکہ تکرار ناروا کی بھی مثال ہیں۔ مترجم نے یہ فقرہ وزن کو پورا کرنے کیلئے اور شاید انگریزی میں barb of glances کی تقریباً بے معنویت کو نرم کرنے کے لئے مصرعے میں داخل کیا ہے۔ پھر یہ بھی غور کیجئے کہ اردو کا مصرع اپنی جگہ پر مکمل ہے۔ مترجم نے اس کی ہیئت کو بدل کر مصرعے میں تکمیلیت کے احساس کو بھی نقصان پہنچا دیا ہے۔

مزید مسئلہ یہ ہے کہ مترجم کی ذاتی ترجیحات، اصل زبان اور ترجمے والی زبان کے لئے اس کا جبلی اور باطنی احساس اور جس مصنف کا ترجمہ وہ کر رہا ہے، اس کے پورے کلام کے بارے میں مترجم کا تاثر یہ سب باتیں مختلف طرح سے ترجمے پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ اسٹینلی برن شا (Stanley Burnshaw) نے اپنی کتاب (Varieties of Literary Experience) کے دیباچے میں اس کی بڑی مؤثر مثال فراہم کی ہے۔ ٹومس مان (Thomas Mann) کے طویل افسانے ''ٹونیو کروگر (Tonio Krogar) کا محض ایک سادہ سا جملہ وہ ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ اصل جرمن زبان سے اس کو حسب ذیل طریقوں سے انگریزی میں منتقل کیا گیا ہے۔

بی کیو مارگن : And Tonio Kroger Journeiyed northward

کنتھ برک : And Tonio Kroger travelled north

ہیچ ٹی لوپورٹر : And Tonio Kroger travelled north

خود مان کا منظور شدہ ترجمہ : And Tonio Kroger went north

بعض لوگ کہہ سکتے ہیں کہ آخری شکل، جسے خود اصل مصنف کی منظوری حاصل ہے، سب سے زیادہ کمزور ہے تو کیا بطور مترجم ہم یہ برحق رکھتے ہیں کہ مصنف کی ترجیح اور منظوری کو نظر انداز کردیں اور اس طرح ترجمہ کریں جس طرح ہم مناسب سمجھتے ہیں؟

میں نے اوپر کہا ہے کہ زبان میں کوئی چیز درحقیقت کمیت کی حامل نہیں ہوتی بلکہ ہر چیز کیفیت کا حکم رکھتی ہے۔ ترجمے میں اصل کا جو کچھ چھوٹ ہوتا ہے، وہ بھی اتنی ہی کیفیت کا حامل ہوتا ہے جتنا وہ حصہ جو اصل سے ترجمے میں پہنچتا ہے۔ کوئی ضروری نہیں کہ ہم روبرٹ فروسٹ کی طرح یہ کہیں کہ شاعری وہ ہے جو ترجمے میں حذف ہوجاتی ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ ترجمہ دراصل قربانیوں اور مفاہمتوں کا سلسلہ ہوتا ہے۔ جب ہم شاعری کا ترجمہ کرتے ہیں تو وزن و بحر، شعر کی ظاہری ہیئت، قافیہ مختلف طرح کے بصری علامئے روزمرہ اور محاورہ کے وہ حصے جو اصل زبان کے باہر بے معنی ہوجاتے ہیں، الفاظ کی شکل وبافت، ہمیں ان سب کو سب سے پہلے قربان کردینا پڑتا ہے۔ ان میں سے کچھ قربانیاں لائق برداشت تو ہوتی ہیں لیکن چوں کہ مندرجہ بالا تمام کی تمام چیزیں شعر کے معنی کا حصہ ہوتی ہیں، اس لئے ہم جس حد تک انھیں ترک کرنے پر مجبور ہوں گے، اس حد تک ہم اس شعر کے اندر موجود شاعری کو بھی ترک کرنے پر مجبور ہوں گے۔ علیٰ ہذا القیاس، گرامر کا بہت سارا حصہ بھی ترجمے میں ضائع ہوجاتا ہے اور یہ نقصان بھی کیفیت کا حامل ہے، محض کمیت کا نہیں۔ ڈپٹی نذیر احمد نے اپنے اردو ترجمۂ قرآن کے دیباچے میں لکھا ہے کہ (اور یہ بات بہت اہم ہے، اس کو بیان کرنے میں اولیت کا شرف بھی نذیر احمد کا ہے) کہ عربی گرامر کے بہت سے قاعدے اور رسوم اردو میں ناپید ہیں۔ نذیر احمد نے بیان کیا ہے کہ گرامر کے یہ قاعدے اور رسوم متنِ قرآن کے کردار کو قائم کرنے میں بہت اہم ہیں لیکن افسوس کہ اردو کا ترجمہ نگار اس نقصان کو کسی طرح پورا نہیں کرسکتا۔

یا جنس کی معمولی سی مثال لیجئے۔ انگریزی زبان میں جنس gender کا محدود تصور ہے،

فارسی میں بالکل نہیں۔اردو، ہندی، پنجابی، عربی، فرانسیسی میں جنس ہے۔ کسی زبان میں اس کا عمل دخل بہت زیادہ ہے، کسی میں نسبتاً کم۔ اب اگر کسی منظر کو انگریزی یا فارسی میں بیان کیا جائے تو یہ ممکن ہے کہ suspense اسرار یا عدم قطعیت پیدا کرنے کی غرض سے کرداروں کی جنس کو واضح نہ کیا جائے۔ اب اگر ایسے فن پارے کو ایسی زبان میں ترجمہ کیا جائے جس میں جنس کو واضح کئے بغیر چارہ نہ ہو، تو ظاہر ہے کہ بیانیہ کی وہ ترکیب جو اصل مصنف نے استعمال کی ہے، بروئے کار نہ آسکے گی، مثلاً انگریزی کا جملہ ہے Sparky Came ۔ اس سے بالکل پتہ نہیں لگتا کہ Sparky عورت ہے یا مرد لیکن اردو میں ہمیں کہنا ہوگا ''اسپارکی آیا'' یا ''اسپارکی آئی'' اور اس طرح اسپارکی فوراً مرد یا عورت ثابت ہو جاتی ہے۔ لہٰذا وہ suspense یا اسرار قائم نہیں ہو سکتا جو اصل مصنف کا مقصود تھا۔ دوسری طرف یہ بھی ہے کہ جنس کا التزام رکھنے والی زبان کے مصنف کو بہت سے ایسے جدلیاتی رسومیات اور جذبات انگیز طریقے بہم ہوتے ہیں جو اس زبان میں نہیں ہوتے جس میں جنس کا التزام نہیں ہوتا۔ مثلاً اردو میں ہم کہتے ہیں، میرا محبوب آیا/میری محبوبہ آئی۔ انگریزی میں دونوں صورتوں کے لئے ایک ہی عبارت ہوگی۔ My beloved came اور جملے کا انگریزی میں ترجمہ بہر حال ناقص ہوگا۔ پھر یوں بھی ہے کہ اردو میں مذکر لکھ کر مؤنث مراد لیتے ہیں (یعنی معشوق کو اکثر مذکر لکھتے ہیں) اور اس طرح کثیر المعنویت حاصل ہوتی ہے۔ جس زبان میں مذکر مونث نہ ہو اس میں اس طرح کی کثیر المعنویت ممکن نہیں۔

ان سب نقصانات کے باوجود ترجمہ تو بہر حال ہونا ہی چاہئے۔ سچ تو یہ ہے کہ کبھی کبھی ترجمے کو ان سے بھی زیادہ نقصانات اٹھانے پڑتے ہیں اور کبھی کبھی شکست تسلیم کرنی پڑتی ہے۔ بیکٹ Beckate کے ڈرامے Waiting For Godot کا ترجمہ کرتے وقت کرشن چندر نے عجب غیر معمولی کارنامہ انجام دیا کہ پوتسو Pozzo کے بے معنی مکالمات کا ترجمہ انھوں نے لغوی طور پر کرنے کے بجائے اپنے طور پر بے معنی عبارت لکھ دی اور اصل کا تاثر بھی قائم رکھا۔ یعنی انھوں نے لفظ اور فقرے کی جگہ تاثر اور تاثیر کا لحاظ رکھا۔ لیکن ایسا ہر بار ممکن نہیں ہو سکتا۔ مثلاً شیکسپیئر کے ڈرامے King Lear میں بادشاہ لیئر کی مجذوبانہ بڑ یا اسی ڈرامے میں مسخرے کی بے معنی گفتگو کا ترجمہ کرنے کے لئے کرشن چندر والی ترکیب کارگر نہ ہوگی کیوں کہ ان عبارتوں میں رعایتِ لفظی،

ابہام اور تلمیح کی کثرت ہے۔ بادشاہ کی مخبوط الحواسی اور مسخرے کے اعمال میں شیکسپیئر نے بہت ساری باریکیاں پوشیدہ کر رکھی ہیں۔

کامیاب ترجمہ وہ ہے جو اصل کے مطابق ہو (یا بڑی حد تک اصل کے مطابق ہو) اور خلاقانہ شان رکھتا ہو۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں باتوں کا یکجا ہونا تقریباً ناممکن ہے لیکن ترجمے میں کامیابی کا تصور بہت وسیع ہے اور اگرچہ کوئی بھی شخص اس کامیابی کی پوری وسعت کا احاطہ نہیں کرسکتا، اچھے اور خوش نصیب مترجم اس کے بڑے حصے کا احاطہ ضرور کر سکتے ہیں۔ کامیاب ترجمہ اس معنی میں خلاقانہ نہیں ہوتا کہ مترجم اصل کی جگہ اس کے برابر کوئی دوسری نظم یا ناول لکھ دیتا ہے۔ مترجم اصل فن پارے کو اپنی زبان میں دوبارہ خلق کرتا ہے اور اس طرح نہیں کہ پہلے وہ اصل فن پارے کو مار ڈالے اور پھر اسی کو اپنی زبان میں دوبارہ زندہ کرے اور نہ اسے یہ غلط فہمی ہوتی ہے کہ وہ خود اصل فن پارے کا مصنف ہے اور اب اس فن پارے کو وہ ترجمے والی زبان میں لکھ رہا ہے۔ سوفکلیز (Sophocles) کا ترجمہ کرتے وقت ازرا پاؤنڈ نے یونانی دیہاتی لوگوں کو لندن کی کوکنی cockney زبان بولتے ہوئے دکھایا ہے۔ اس سے انگریزیت تو ترجمے میں آ گئی، لیکن یونانیت غائب ہوگئی۔ یہ بات صحیح ہے کہ بقول ٹی-ایس-الیٹ، یہ بڑی غلطی ہوگی کہ ہم ازرا پاؤنڈ کے تراجم کو اس کے طبع زاد کلام سے الگ کر کے دیکھیں۔ لیکن الیٹ کے اس جملے کا اطلاق ازرا پاؤنڈ کے ان ترجموں پر زیادہ ہوتا ہے جو اس نے غیر زبانوں کی شاعری اور خاص کر چینی اور لاطینی شاعری سے کیے ہیں۔ ولیم ایروسمتھ (William Arrowsmith) نے یونانی طربیہ نگار ارسٹوفینیز (Aristophanes) کے جو تراجم کیے ہیں، ان میں یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے۔ ایروسمتھ کے تراجم میں یونانی عوام اور دیہاتی لوگ ایسی زبان تو بولتے ہیں جو طربیہ مضمون اور لہجے کے لئے مناسب ہے لیکن وہ ''عوامی'' یا ''دیہاتی'' زبان نہیں بولتے۔ اس طرح ایروسمتھ اصل ڈرامے اور ہمارے درمیان ضروری فاصلہ قائم کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ خلاقانہ ترجمہ وہ ہے جو اصل فن پارے کی شخصیت کو منہدم نہیں کرتا اور ترجمے والی زبان میں پہلے سے موجود ادب سے مختلف معلوم ہوتا ہے لیکن مختلف معلوم ہوتے ہوئے بھی وہ ترجمے والی زبان بولنے والوں کے لئے قابل قبول اور قابلِ فہم ہوتا ہے۔

لٰہذا یہ کہنا غلط ہے کہ ترجمہ کیے ہوئے فن پارے کو ترجمہ نہیں معلوم ہونا چاہئے۔ محمد حسن عسکری، جنہوں نے خود فرانسیسی اور انگریزی سے بہت عمدہ تراجم کئے ہیں، کہا کرتے تھے کہ ترجمے میں ''ترجمہ پن'' کا ہونا کوئی عیب نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ترجمے کے ذریعے ترجمے والی زبان کے نئے امکانات منکشف ہوتے ہیں۔ ترجمہ دراصل مترجم کو دوطرفہ جنگ میں مبتلا کرتا ہے۔ یہ جنگ اس زبان سے بھی ہوتی ہے جس سے ترجمہ کیا جارہا ہے اور اس زبان سے بھی جس میں ترجمہ ہورہا ہے۔ جورج اسٹائیز Georg Steiner کہتا ہے کہ ترجمہ ایک زندہ چنگاری ہے، یہ ماضی اور حال اور تہذیبوں کے درمیان توانائی کا بہاؤ ہے۔ وہ مزید کہتا ہے کہ اپنے وجود کی جگہ دوسرا وجود اختیار کرنے کا قریب ترین امکان اسی میں ہے کہ ہم ''جہاں تک ہم سے ہوسکے، خود کو کسی دوسری زبان میں غرق کردیں۔'' لیکن چوں کہ ترجمہ ہمیں خود اپنی زبان کے بھی حدود اور امکانات سے روشناس کراتا ہے، اس طرح وہ بذاتِ خود تخلیق بن جاتا ہے۔

کہا گیا ہے کہ ناول کے ترجمے میں وہ مسائل نہیں پیدا ہوتے جو شاعری کے ترجمے میں ہوتے ہیں۔ اسٹینلی برن شا کا کہنا ہے کہ ناول کا بڑا حصہ اور یقیناً اس کا اہم ترین حصہ ترجمے میں باقی رہتا ہے۔ برن شا کہتا ہے کہ ''شاعری یقیناً وہ واحد عنصر نہیں ہے جو کسی بدیسی ناول کے انگریزی ترجمے کے مجموعی گہرے تاثر کو پیدا کرتی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ ناول میں بہت سے ایسے اجزاُ ہوتے ہیں جو اصل سے الگ کئے جاسکتے ہیں اور وہ ترجمے میں بخوبی آسکتے ہیں۔ یہ بات صحیح ہے کہ فکشن کا ترجمہ شاعری کے ترجمے کے مقابلے میں آسان لگتا ہے۔ لیکن شاعری کی نوعیت ہی ایسی ہے کہ مترجم کو اس سے زیادہ کامیابی کی امید نہیں ہوسکتی جتنی اس فوٹو گرافر کو ہوسکتی ہے، جو کسی رنگین تصویر کی یک رنگی فوٹو تیار کرتا ہے۔ فکشن میں بھی بہت سی وہی تشکیلات ہوتی ہیں جو شاعری اور ڈرامے میں ہوتی ہیں لیکن کسی اچھے اسٹیج ڈرامے کا خراب ترجمہ بھی اسٹیج پر کامیاب ہوسکتا ہے۔ کیوں کہ ڈرامے کی بہت سی خصوصیات موسیقی کی طرح، ترجمے کی محتاج نہیں ہوتیں۔ مگر فکشن میں لسانی تشکیلات زیادہ ہوتی ہیں، خالص ڈراما کم (اگرچہ ہنری جیمس کی تمنا یہی تھی کہ وہ ایسے ناول لکھے جس میں ڈراما کا وصف ہو) روسی اور فرانسیسی ناولوں کے جو تراجم اردو میں ہوئے ہیں (چاہے براہِ راست، چاہے براہِ انگریزی) ان میں سے اکثر میں یہی خرابی ہے کہ مترجم اصل زبان کو اپنے

وجود کا حصہ بنانے اور ''اندر سے کام کرنے'' سے قاصر رہا ہے۔ ان تراجم میں اصل زبان تحرک انگیزی کے بجائے نمونے کا کام دیتی ہوئی نظر آتی ہے۔ یہاں اصل زبان، ترجمے والی زبان کی تشکیل کے بجائے، اس سے ٹکرانے کا کام کرتی ہے اور اس طرح دونوں کا زیاں ہوجاتا ہے۔ خلاقانہ ترجمے میں اصل زبان، ترجمے والی زبان کو زندگی بخشنے کا کام کرتی ہے۔

اگر ترجمہ تخلیق کا درجہ رکھتا ہے تو ہمیں transcreation اور 'آزاد ترجمہ' جیسی اصطلاحوں پر وقت ضائع کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ سب اصطلاحیں یا تو خراب ترجموں کا پردہ ہیں یا پھر ایسے تراجم کی حمایت کرتی ہیں جو اصل سے بہتر ہونے کی کوشش کرتے ہیں یا اس کی توہین کرتے ہیں۔ کوئی بھی ترجمہ اصل کے حسن و خوبی کا مقابلہ نہیں کرسکتا لیکن یہ بھی سچ ہے کہ کوئی فن پارہ کسی دوسرے فن پارے کی ہو بہو نقل نہیں ہوسکتا۔ ترجمہ بذاتِ خود فن پارہ ہے لیکن اسے ترجمہ کہلانے کا حق اسی وقت ہے، جب وہ اصل کی کیفیت اور احساس کو ممکن ترین حد تک دوبارہ خلق کرسکے۔

اگر ترجمے کا وہی مرتبہ ہے، جو تخلیق کا ہے تو کیا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ صرف تخلیقی فن کار ہی اچھے مترجم ہوسکتے ہیں؟ بودلیئر کا دعویٰ تھا کہ: ''نقادوں میں سب سے اچھا نقاد شاعر ہوتا ہے۔'' یہ بات بودلیئر کی حد تک تو صحیح ہے کیوں کہ آج بہت سے لوگ بودلیئر کو سب سے بڑا فرانسیسی نقاد مانتے ہیں لیکن خود بودلیئر نے ایڈگر ایلن پو Edger Allan Poe کے جو ترجمے کیے ہیں وہ پوری طرح سچے نہیں ہیں۔ اس معنی میں کہ بودلیئر نے ترجمے کو اصل سے بڑھا دیا ہے۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ شاعر اور غیر شاعر، دونوں فرقوں میں اچھے مترجم بھی ہوئے ہیں اور برے بھی۔ پروست کے ترجمے کیلئے اسکاٹ مانکریف (Scott Mancriefe) سے بہتر کوئی نہیں لیکن خود اسکاٹ مانکریف (Scott Moncriefe) ناول نگار نہ تھا۔ ہومر کی الیڈ Alliad کا جو ترجمہ پوپ (Pope) نے کیا تھا وہ بہت زندہ اور متحرک ہے۔ چیپ مین chapman کے ترجمۂ الیڈ نے کیٹس کو بہت متاثر کیا۔ لیکن نہ چیپ مین اچھا مترجم تھا نہ پوپ میکس ہے ورڈ (Max Hayward) نہ شاعر تھا نہ افسانہ نگار لیکن اس نے روسی نظم و افسانہ کے بہترین تراجم ہمارے زمانے میں پیش کئے۔ اردو میں بہت سے عمدہ شاعر، مترجم اور افسانہ نگار مترجم ہوئے ہیں اور مولوی عنایت اللہ جیسا شخص بھی ہے کہ ان سے بہتر اور کثیر الترجمہ شخص کوئی ہمارے یہاں نہ ہوا لیکن مولوی صاحب نہ شاعر تھے، نہ ڈراما نگار۔

لہٰذا اس سلسلے میں کوئی حتمی قاعدہ نہیں ہوسکتا۔ بنیادی بات یہ ہے کہ مترجم دونوں زبانوں (یعنی اصل زبان اور ترجمے والی زبان) کے آہنگ کو جتنی خوبی سے سن سکے گا، اتنا ہی عمدہ ترجمہ وہ کر سکے گا۔ خلاق مترجم کی صفت یہ ہے کہ جس زبان سے وہ ترجمہ کر رہا ہے، اس کے ادب اور ادبی روایت سے وہ پوری طرح واقف ہوتا ہے۔ جس فن پارے کا ترجمہ کیا جا رہا ہے، صرف اس فن پارے سے گہری واقفیت کافی نہیں۔ اتنی ہی اہم بات یہ ہے کہ مترجم کو ترجمے والی زبان میں محسوس کرنے اور سوچنے پر قدرت ہونی چاہئے۔ ہم ہندوستانی جب اردو/فارسی سے انگریزی میں ترجمہ کرتے ہیں تو ہمیں مشکل یہ پڑتی ہے کہ ہم جدید روز مرہ معیاری انگریزی اور قدیم یا کتابی انگریزی میں فرق نہیں کر سکتے۔ یوسف حسین کا ترجمۂ غالبؔ اور خشونت سنگھ کا ترجمۂ اقبال اس کم زوری کی نمایاں مثالیں ہیں، لیکن ایسی مثالیں بہت سی اور بھی ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ شاید ہی کسی ہندوستانی پاکستانی ترجمے کی نشان دہی ہو سکے جو اردو سے جدید، معیاری اور بامحاورہ انگریزی میں کیا گیا ہو۔ اے۔ کے۔ رامانجن (A.K.Ramanujan) نے قدیم تامل سے جو تراجم انگریزی میں کیے ہیں ان کو دیکھنے سے پتا چلتا ہے کہ جدید انگریزی کس طرح ایک قطعی مختلف زبان اور قطعی اجنبی ادبی روایت کے فن پاروں کو آج کے پڑھنے والوں تک پہنچانے میں کامیاب ہوسکتی ہے۔ مغربی ترجمے میں فرینسس پرچٹ (Frances Pritchett) نے انتظار حسین، غالب اور داستانِ امیر حمزہ کو انگریزی میں منتقل کرنے میں خاصی کامیابی حاصل کی ہے۔

کیا مترجم کے لئے ضروری ہے کہ وہ اصل زبان اور ترجمے والی زبان ان دونوں پر پوری طرح اور یکساں قدرت رکھتا ہو؟ مستثنیات کو دیکھئے تو رابرٹ لول (Robert Lowell) اور آڈن ہیں جو روسی نہیں جانتے تھے لیکن انھوں نے روسی کے ماہرین یا اس کو مادری زبان کی حیثیت سے بولنے والوں کی مدد سے روسی سے انگریزی میں بعض عمدہ ترجمے کیے ہیں۔ لیکن ترجمے کی کوئی طویل کارگزاری اس طرح نہیں چل سکتی۔ مثالی صورت تو یہ ہے کہ ہم صرف مادری زبان ہی میں خود کو پوری طرح غرق کر سکتے ہیں اور اس طرح غرق ہوئے بغیر زبان میں خلاقانہ فکر کو حاصل کرنا ممکن نہیں۔ چوں کہ بہت ہی کم لوگ ایسے ہیں جو صحیح معنوں میں ذولسانی (bilingual) ہوں، اس لئے بہترین عملی صورتِ حال یہ ہوگی کہ مترجمین دو دو کی ٹیم کی شکل میں کام کریں۔ ایک مترجم کی مادری

زبان اصل زبان ہو اور وہ ترجمے والی زبان سے بھی خوب واقف ہو اور دوسرے مترجم کی مادری زبان ترجمے والی زبان ہو لیکن وہ اصل زبان سے بھی بخوبی واقف ہو۔ اس طرح دونوں ایک دوسرے کی تکمیل اور پشت پناہی کریں گے۔ یہ اصول خاص کر مشرقی سے مغربی زبانوں میں ترجمے کے لئے کارآمد ہے کیوں کہ ان دونوں کے درمیان تہذیبی تفاوت بہت بڑا ہے۔

ترجمے کو جاری رہنا چاہئے تا کہ ترجمے والی زبان اور اس زبان کے ادب اور اس کے بولنے والوں کو تونگری حاصل ہو۔

جنت الحمقاء

مولانا محمد حسین آزاد

(۱۸۳۰ء - ۱۹۱۰ء)

تمہید

مضمون مفصلۂ ذیل ایک مرقعِ خاص کی تصویر کا خاکہ ہے جس کی صورتِ اصلی یہ ہے کہ ہم اور ابنائے جنس ہمارے، کچھ اپنی غلط فہمی سے اور کچھ کوتاہ اندیشی سے اعمالِ قبیحہ یا حرکاتِ ناپسندیدہ میں مبتلا ہیں اور باوجود یہ کہ اس کے حال و مال کی قباحتوں سے آگاہ ہیں بلکہ اور ہم صورتوں کو ان کے خمیازے بھرتے دیکھتے ہیں، پھر بھی کنارہ کش نہیں ہوتے۔ تعجب یہ ہے کہ جب اپنی جگہ بیٹھتے ہیں، تو اس ارتکاب کو داخلِ حسن سمجھ کر اس میں افراط اور زیادتی کرنی سرمایۂ فخر سمجھتے ہیں، ایک شراب خوار آدمی یاروں میں بیٹھ کر فخریہ بیان کرتا ہے کہ میں کئی کئی بوتلیں برابر اڑا جاتا ہوں اور حواس میں بالکل فرق نہیں آتا۔ دوسرا اس سے بڑھ کر اچھلتا ہے کہ میں پانی تک نہیں ملاتا، مگر آواز میں اصلاً تغیر نہیں ہوتا۔ اسی طرح ایک عیاش تماش بین اپنی روسیاہیوں کو کہتا ہے اور نہیں شرماتا؟ دوسرا اس میں اپنی شدتیں اور افراطیں بیان کرتا ہے اور خوشی سے رنگِ رخ چمکاتا ہے۔ ایک دغاباز

منشی یا دیوان غبن کر کے آقا کے گھر کو برباد اور اپنا گھر آباد کرتا ہے اور جو جو دغل فصل حساب میں کیئے، انھیں مسائلِ افلاطون کی طرح فخریہ سمجھتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جیسا کرتے ہیں، ویسا بھرتے ہیں۔ مگر خدا جانے وہ کیا شئے ہے، جس نے ایسا پردۂ غفلت آنکھوں پر ڈال رکھا ہے کہ نہ وہ برائیاں معلوم ہوتی ہیں، نہ ان سے باز آتے ہیں۔ یہی کوتاہ اندیشی کبھی ایک غلط فہمی کے لباس میں ظہور پاتی ہے یعنی اکثر اشخاص خاص خاص امور میں اپنے کمال پر مفتخر اور نازاں ہوتے ہیں۔ ہر چند امورِ مذکور بجاے خود قابل فخر و ناز کے ہیں۔ مگر بشرطیکہ ان میں کمال نصیب ہو۔ فی الحقیقت اسے غلط فہمی کہنا چاہیئے جو کہ نتیجہ حماقت اور ایک قسم کی کوتاہ اندیشی کا ہے۔ چنانچہ یہ لوگ بھی ابتدا میں ناواقفیت عوام کے سبب سے رونقِ بازار پاتے ہیں، مگر چند درجے طے کر کے گر پڑتے یں اور سخت ندامت اٹھاتے ہیں۔ افسوس کہ کوئی زمانہ اس قسم کے گناہوں سے خالی نہیں، بلکہ روز بروز حال ابتر نظر آرہا ہے۔ اس لئے یہ مضمون ابناے جنس کی عبرت کے لئے ایک استعارہ اور کنایہ کے رنگ میں لکھا جاتا ہے۔ ہر چند یہ رنگ صورتِ مضمون کے منہ پر ایک باریک نقاب ہے، لیکن اگر اہلِ نظر چند ساعت کے لئے نظرِ غور کو تکلیف دیں گے، تو یہ استعارے اور کنایے صراحت اور وضاحت کے پہلو میں رکھے ہوئے پائیں گے:

دل تیرا آپ پردہ ہے دیدار کے لئے
ورنہ کوئی نقاب نہیں یار کے لئے

دنیا میں اکثر قباحتیں اور حماقتیں ایسی ہیں کہ ہم سب ان میں آلودہ ہیں، مگر معلوم نہیں ہوتیں۔ درحقیقت وہ ہماری رسائیِ فہم سے بہت اونچے طاق پر رکھی ہیں اور کچھ ایسے ڈھب سے سجائی ہوئی ہیں کہ ہر بدی عین خوبی نظر آتی ہے۔ لطف یہ ہے کہ وہ آلودگی ہمیں کچھ بری بھی نہیں معلوم ہوتی۔ بلکہ بجاے اس کے رفع کرنے یا چھپانے کے خود دکھاتے ہیں اور آرزوئیں کرتے ہیں کہ اپنی قباحتوں میں ترقیاں کریں اور انھیں میں ہماری قدر دانیاں ہوں۔ چنانچہ سینکڑوں واہیات، ہزاروں لغو خیالات، نئے مسخراپن ظرافتوں کے چمن ہیں کہ وہی ہماری تفریحِ طبع اور خوش دلی کا سرمایہ ہو رہے ہیں۔ اور یہ رنگینیاں ہمیں ایسے ایسے رنگوں میں رنگین کر کے ابناے جنس کے سامنے جلوہ دیتی ہیں کہ ہم بھی انھیں میں خلعتِ افتخار لیتے ہیں۔ اس فخرِ بے ہودہ اور خیالِ بے بنیاد

کی خوشی میں خدا جانے کیا لطف دیکھا ہے کہ سیانے دنیا داروں نے اس کی دل فریبیوں کا اشارہ کرنے کے لئے ایک لطیف اصطلاح چھانٹی ہے یعنی (جنت الحمقاء)

لفظِ آخر میں شاید لوگوں کو کچھ غلطی کا خیال ہو اور جو کچھ میں نے کہا، انھیں اس کی نسبت کچھ اور وضع دکھائی دیتی ہو۔ لیکن مجھے اب اس کا امتحان کرنا بے جا ہے کیونکہ میں جو اس وقت آنکھیں مل رہا ہوں، تو یہی خواب دیکھ رہا تھا۔

ابھی سوتے سوتے ایسا معلوم ہوا گویا کسی نے مجھے ایک پہاڑ پر پھینک دیا ہے۔ مگر عجیب پہاڑ ہے کہ سبزہ سے لہلہاتا، پھولوں سے چہچہاتا، جابجا پانی لہراتا ہے۔ چڑھائی اس کی ہمتِ بلند کا نمونہ ہے۔ مگر باوجود اس کے اعتدال پر ہے کہ دم نہیں چڑھنے دیتی۔ بلکہ ساعت بہ ساعت سینہ کو قوت حاصل ہوتی ہے۔ میں ادھر ادھر پھرنے لگا۔ اتنے میں ایک پہاڑ کی چوٹی پر پہنچا تو میدانِ فراخ پایا، اور دور سے نظر آیا کہ ایک جگہ آبِ رواں میں پاؤں لٹکائے کوئی شہزادی بیٹھی ہے کہ زیور اور لباس سے طاؤسِ مرصع کا عالم ہے۔ مگر آنکھ سے بھینگی ہے، اور اس میں بھینگی آنکھ پر ایک رنگین عینک بھی لگائے ہے کہ اسی سبب سے اسے کوئی شے حالتِ اصلی پر نظر نہیں آتی۔ چنانچہ معلوم ہوا کہ ملکہ غلط فہمی یہی ہے اور کل اہل عالم کی غلط فہمی گویا اسی کی نگاہ پر منحصر ہے۔

برابر اس کے ایک اور عجوبۂ روزگار نظر آئی کہ اس کے بے انتہا سر ہیں اور دھڑ ایک جس بات کی پسند یا ناپسند پر سر ہلاتی ہے، تمام جہان کے سر اسی طرح ہل جاتے ہیں یہ جب معلوم ہوا کہ پسند عام اس کا نام ہے، ان میں سے ایک غلط نمائی کرتی ہے، اور دوسری دل ربائی کر کے جس شئے پر چاہتی ہے سب کو شیفتہ و فریفتہ کر لیتی ہے۔ یہ دونوں رات دن جادوگری میں مصروف ہیں اور تسخیرِ خلائق کے عمل میں شہرہ آفاق ہو گئی ہیں۔

لوگوں کا یہ حال دیکھا کہ چاروں طرف سے انبوہ در انبوہ امڈے چلے آتے ہیں اور اگرچہ آمد کے رستے بھی دور ہیں۔ مگر ہر رستہ انہی دونوں کی طرف جاتا ہے۔ آنے والوں میں بعض آدمی جو خود آرائی کے رنگ سے رخ چمکائے ہوئے اور زیبائی کے روغن سے سر چکنائے ہوئے تھے، انھیں کچھ ہدایت یا اشارت کی حاجت نہ تھی، خود بخود غلط فہمی کی طرف چلے جاتے تھے، اور وہ عالم فریب ایک ایک شخص کو اس کی طبیعت کے موافق اسی طرح لبھاتی تھی کہ لٹو ہو جاتا تھا۔ بعد ازاں

کچھ ایسی کل مروڑتی تھی کہ خود پسندِ عام کے پھندے میں جا کر گلا رکھ دیتا تھا۔

غرض کہ اسی طرح پھرتے پھرتے ہم ایک میدانِ جانفزا میں جا نکلے۔ وہاں دیکھیں تو پسندِ عام چہل قدمی کر رہی ہے اور بہت سے لوگ جو ہم سے بھی پہلے وہاں پہنچے ہوئے تھے، انھیں پھسلا رہی ہے۔ آواز اس کی ایسی رسیلی تھی کہ دل مست ہوئے جاتے تھے۔ جب بات کرتی تھی، تو منہ سے پھول جھڑتے تھے۔ بولتی تھی، تو سانس کے ساتھ خوشبو کی لپٹیں آتی تھیں۔ لطف یہ تھا، جس شخص سے بات کرتی تھی، جدا زبان اور جدا طرزِ بیان تھا اور جو سنتا تھا، یہی خیال کر رہا تھا کہ وہ جوہر بے مثل جو خاص میری ذاتِ باکمال میں قابلِ قدر ہے، اسی کی بابت یہ گفتگو ہو رہی ہے۔ بس گویا اس جنتِ بے زوال کا فرمان ملا، جس کے انعام کا استحقاقِ کلی مجھ میں موجود ہے۔

غرض اسی حال میں ہم سب کھچے کھچے اس کے پیچھے چلے جاتے تھے اور مسافتِ راہ میں یا تو اپنی خوبیوں کی خود آپس میں تعریف کرتے جاتے تھے، یا اپنی خیالی خوبیوں پر آپ ہی اتراتے تھے، یا جنھیں اپنی وضع کا نہ پاتے، ان کی ہجو کرتے جاتے تھے۔ کچھ اپنے اپنے مدارجِ کمال پر آپس میں لڑتے جھگڑتے چلے جاتے تھے۔

غرض اسی عالم میں چلتے چلتے ایک باغ نظر آیا جو کہ اسم بامسمیٰ اندھیرا یا باغ تھا۔ اس کے دروازے پر دیکھیں تو غلط فہمی بیٹھی ہے۔ مگر جس مکان میں وہ بیٹھی تھی، اسے عمداً ایسی حکمتِ عملی سے بنایا تھا کہ صورت اس کی دھندلی سی نظر آتی تھی۔ اس نے کچھ سفید سا لباس پہنا ہوا تھا کہ جس سے دیکھنے والوں کو ملکہ صداقت کا دھوکا ہوتا تھا اور چونکہ شہزادی صداقت پری ایک مشعل بھی ساتھ رکھا کرتی ہے جس سے اپنے عاشقوں کو حسنِ خدا آفرین کی خوبیوں کا جلوہ دکھاتی تھی، اس نے اس کے جواب میں داہنے ہاتھ پر شیشۂ جادو اور بائیں ہاتھ پر سحرِ سامری کی چھڑی رکھی تھی، انہی ٹونے ٹوٹکوں سے دلوں کو لبھاتی تھی اور دھوکے دغا سے سب کو پرچاتی تھی۔ چنانچہ کبھی کبھی بڑی تمکنت سے ہاتھ بڑھا کر اس چھڑی کو اٹھاتی اور منہ ہی منہ میں کچھ پڑھتی تھی۔

اس کے علاوہ نرگس جادو بہت ناز و انداز کے پھول اور نمود و نمایش کی کلیاں گود میں بھرے کھڑی تھی، انھیں اہلِ اشتیاق کے سامنے بکھیرتی جاتی تھی۔

دفعتہً عصا کا اشارہ آسمان کی طرف ہوا اور ساتھ ہی اس کے سب کی نگاہیں اوپر اٹھ گئیں۔

ایک نیلا قطعہ آسمان کا ایسا صاف و مصفا دکھائی دیا جیسے صبح بہار میں فلکِ فیروزی کا رنگ نکھرا ہوا ہو۔ اسی فضا سے دلکشا میں ملکۂ خام خیالی کا محل نظر آیا کہ آسمان سے باتیں کرتا تھا۔ مگر نہ معلوم ہوتا تھا کہ کون سی بنیاد ہے جس پر یہ قائم ہے۔ فقط پیچ در پیچ بادلوں کا ایک زنجیرہ تھا کہ جادو کے زور سے ادھر کھڑا تھا، اس کی چڑھائی کا راستہ جو ہمارے زیرِ قدم تھا، قوس وقزح کی طرح خوش رنگ وخوشنما تھا۔ نسیمِ جاں بخش جو ادھر ادھر سبزہ پر لوٹتی تھی، ہر جھونکے میں عقل وحواس پر جادو کی پڑیاں مارتی تھی، تمام دیواریں طلسمات کے رنگ سے دم میں سنہری تھیں، اور دم میں روپہلی۔ سب سے نیچے کے درجے کے ستون اگرچہ باغِ ارم والی تراش پر اتارے تھے، مگر برف کے تراشے تھے۔ چھت کا گنبد نہایت عالی شان تھا۔ لیکن برج کی جگہ ایک شیشہ کا بلبلہ دھرا تھا اور اس کے کلس پر طائرِ خیال کا ہما پر پھیلائے تھرتھرا رہا تھا۔

مسافروں نے وہاں پہنچ کر نہ کوئی دربان پایا، نہ کسی کا انتظار کیا۔ جو آیا اپنے جوہرِ قابلیت کو پروانۂ اجازت سمجھے ہوئے بے دھڑک اندر داخل ہو گیا۔ دربار کے کمرے میں پہنچے، تو دیکھتے ہیں کہ بہت سی نمودِ بے بود صورتیں ہیں کہ ہم ہی میں ملی جلی اہتمام کرتی پھرتی ہیں اور اس انبوہ بے تمیزی میں اپنے اپنے خیالات کے بموجب ایک ایک کے درجے قائم کر کے صفیں ترتیب دیتی پھرتی ہیں۔ مدارجِ عزت بھی وہاں روشن ہوتے ہیں، مگر ساعت بہ ساعت دھوپ کی طرح ڈھلتے جاتے ہیں، اور لوگ تھے کہ بتاشے کی طرح بیٹھے جاتے تھے۔ استحقاق پوچھو، تو دادا پردادا کے وقت کا ایک پھٹا پرانا سا چغہ تھا، اس کے سوا کچھ نہیں۔

ایک طرف لاف گزاف تھی جس نے خود اپنی ذاتِ خوش صفات کا ایک قصیدہ بنا رکھا تھا۔ آپ ہی اس اعمال نامے کو پڑھتی تھی اور خوش ہوتی تھی۔ اسے اپنے سوا دوسرا ذکر نہ کرتا۔ اکڑ بکڑ تھی کہ پنجوں کے بل چلتی تھی اور اینٹھتی پھرتی تھی۔ خود پرستی ایک طرف آئینہ کے سامنے کھڑی تھی۔ آپ ہی اپنے تئیں دیکھتی تھی اور پھولی نہ سماتی تھی۔ کمرے کے صدر میں تختِ شاہانہ اور آگے ایک شامیانہ اس شان وشوکت سے سجا ہوا تھا کہ جس قدر سجاوٹ کے گمان میں گنجائش اور حوصلہ آرائش میں وسعت تھی، سب اس میں خرچ ہو گئی۔ تخت پر ہالۂ ماہ کا چتر، اس کے نیچے ملکۂ خام خیالی مہتاب آتش بازی کے دو پر لگائے پری بنی بیٹھی تھی، جو اس کے خیال پرست تھے، وہ اسے پری حسن آفریں

کہتے تھے اور زہرۂ ثانی اعتقاد کرتے تھے، ایک نوجوان تخت کے پہلو میں کھڑا تھا اور ہر ایک کو سامنے لاکر سجدے کرواتا تھا۔ معلوم ہوا کہ وہ اس کا رشید بیٹا ہے، اور شہزادہ خود پرست اس کا نام ہے۔ اس کی خود پسندی اور خود بینی کا یہ عالم تھا کہ اپنی نظر اپنے ہی بیچ میں غرق ہوئی جاتی تھی۔ ادھر ادھر کی شئے اسے اصلاً نظر نہ آتی تھی۔ اس پر بھی لوگوں کا یہ حال تھا کہ ملکہ سے زیادہ اس کی طرف جھکتے تھے۔

ایک گلاب پاش اس کے ہاتھ میں تھا، بقدر حیثیت ہر شخص کے سر پر چھڑک دیتا تھا کہ خود پسندی اور بلند نظری کے خمار سے دماغ ان کے آسمان پر پہنچ جاتے تھے۔ تماشہ یہ تھا کہ شہزادہ جو جو ہتھیار فتوحات کے لئے کام میں لاتا تھا، وہ انھیں لوگوں سے لیے تھے جن کو شکار کرتا تھا۔ چنانچہ جس بہادر کو اپنے تیر کا نشانہ کرتا تھا، اسی کے سر کی کلغی نوچ کر اپنے تیر کی پر گیری لگاتا تھا۔ جس نیزے سے اہلِ علم پروار کرتا تھا، وہ انھیں کے لکھنے کا قلم تھا۔ جس تلوار سے دولت مندوں کو دوپارہ کرتا تھا، اس کے قبضہ پر انھیں کے خزانوں سے لے کر سونا چڑھاتا تھا۔ ناظمانِ ملک کے لئے دامِ تزویر بناتا تھا کہ پھندے اس کے انھیں کی بندشِ تدبیر سے اڑائے ہوئے تھے۔ صاحب جمالوں کے رخساروں سے گرمیِ حسن لیتا تھا اور عاشقوں کے ساتھ اسی میں انھیں بھی گرماتا تھا۔ یہاں تک کہ حسن کے پھول خود بخود کملا کر رہ جاتے تھے۔ فصیحوں کی زبانوں سے بجلی کی تڑپ نکالتا تھا کہ اپنی آگ میں آپ ہی جل کر خاک ہو جاتے تھے۔

تخت کے نیچے تین چڑیلیں پریوں کا بھیس بھرے حاضر تھیں۔ اول تو خوشامد تھی کہ بڑی خوش ادائی سے رنگ آمیزی کا خول سنبھالے کھڑی تھی۔ دوسری ظاہرداری آئینہ سامنے رکھے، اپنے فن کی مشق کر رہی تھی۔ بعد اس کے خوش رواجی تھی، جسے اب تک ہم بھیڑ چال کہتے تھے، مگر اسے دربار سے رعنائی اور خوشنمائی کا خطاب ملا تھا۔ اس کا یہ عالم تھا کہ ہر نگاہ میں گرگٹ کی طرح نیا رنگ بدلتی تھی، اور ہزاروں شکاروں کو ایک جال میں گھسیٹتی تھی۔

غرض کہ شہزادہ خود پرست، شمشیر کے زور اور تدبیر کی لاگ سے برابر فتوحات حاصل کئے جاتا ہے۔ مصروف کئے اور یہ تینوں دولت خواہ اس کے استحکام اور محافظت میں برابر مصروف تھے۔ ہر کام کا مہتمم اپنا حق صدقِ دل سے ادا کر رہا تھا۔ چنانچہ خوشامد جس شے پر ضرورت دیکھتی تھی، نئے سے نیا رنگ چڑھا دیتی تھی کہ ہر دل کی آنکھ کو خوش آتا تھا۔ ظاہرداری ایسے ایسے ڈھنگ سے نمائش

دیتی تھی کہ کیسی ہی بدنما شے ہوخوشنما ہو جاتی تھی :۔ خوش رواجی کا یہ عالم تھا کہ موٹے موٹے عیب ہوتے، انھیں ڈھانک دیتی، بلکہ ان پر ایسی خوبیاں چپکاتی کہ جنہیں اس سے کچھ لگاؤ بھی نہ ہوتا۔

میں ان حالات کو نگاہِ غور سے دیکھ رہا تھا، جو ایک آواز دردناک کان میں آئی۔ گویا کوئی کہتا ہے ''ہائے آدم زاد، ہائے تیری غفلت! خود رائی سے ہدایت پاتا ہے۔ خود پسند کی اشتعالک سے چمک اُٹھتا ہے۔ خام خیالی کے قدموں پر چل کر تعلیم پاتا ہے، یہاں تک کہ مفلسی اور خواری کی زنجیروں میں گرفتار ہو جاتا ہے۔'' یہ کلمے ابھی زبان بہ زبان پھیلنے نہ پائے تھے، جو دفعتہً ایسی ہلچل پڑی کہ تمام انبوہ تہہ و بالا ہو گیا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد ایک طرف سے رستہ کھلتا معلوم ہوا۔ دیکھوں، تو ایک بڈھا، نورانی صورت، معقول وضع ہے، جس کے چہرے پر سنجیدگی اور متانت برستی تھی۔ اسے گرفتار کیے لاتے ہیں اور جو کلام عبرت انگیز نصیحتاً اس نے زبان سے نکالا تھا، اس کی سزا دینے کے لئے جاتے ہیں کیونکہ وہ ان کے آئینِ حکومت میں سراسر باعثِ خرابی تھا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ اس نے جو کچھ کہا تھا، فقط اپنے بری الذمہ ہونے کو کہا تھا۔ اس کا نام ناصح دانش تھا۔

مگر لوگ ایسے بپھرے ہوئے تھے کہ اس بچارے کی بات سننی بھی گوارا نہ تھی۔ بلکہ اسے ایسی خواری اور زاری میں دیکھ کر خام خیالی تو مسکراتی تھی۔ خود پسندی تیوری چڑھاتی تھی، خوشامد اسے ذرا راست باز سمجھتی تھی، اس نے اتنا لحاظ کیا کہ برقع اوڑھ کر برابر سے نکل گئی۔ ظاہر داری نے اپنا پنکھا اٹھا کر اس کی اوٹ میں منہ چڑا دیا۔ کسی نے اس بچارے کا نام حاسد رکھا، کسی نے عیب جو کا خطاب دیا۔ رواج نے دھوم مچا دی کہ بداطوار سلطنت کے برخلاف بغاوت پھیلانی چاہتا ہے۔ غرض اس پیر دیرینہ سال نے ہر طرف سے ذلت ہی ذلت اٹھائی اور اس جرم میں کہ ایسے ایسے لائق و فائق معززوں کے حق میں گستاخی کی، چاروں طرف سے دھکے کھائے۔ بلکہ تحقیق خبر لگی کہ اگرچہ اس وقت نکالا گیا ہے، مگر حکم ہے کہ آئندہ اگر کہیں صورت دکھائی تو اس کے حق میں بہت برا ہوگا۔

بڈھے بے چارے نے جو کچھ کہا، اس میں سے بہت کچھ تو میں آنکھوں سے دیکھ چکا تھا۔ باقی باتوں کے لئے سوچ رہا تھا کہ دیکھیے، کس رنگ سے پوری ہوں۔ اتنے میں باہر کی طرف سے ایک غل اٹھا اور ظلم و ستم اور بے انصافیاں چڑیوں کے برن میں اسی طرح اڑنے لگیں، گویا آندھی آئی۔ انھوں نے اس کثرت سے ہجوم کیا کہ دروازہ تیرہ و تار ہو گیا۔ بیوقوفی اور بے اعتباری نمودار

ہوئیں۔ تکلیف، شرم، رسوائی، حقارت، مفلسی سب آگے پیچھے حاضر ہوئیں۔ ان کے آتے ہی ادھر تو خام خیالی جو سونے کی چڑیا بنی بیٹھی تھی، ادھر شہزادہ خود پرست، ان کے ساتھ ساری پریاں دم کے دم میں ہوا ہوگئیں۔ ادھر تمام معتقد اور ہوا خواہ ان کے بھاگ بھاگ کر کونے گوشے اور سوراخوں میں گھس گئے۔ مگر ایک شخص میرے پاس کھڑا تھا۔ اسے کہیں سے دور بین ہاتھ آگئی۔ چنانچہ اس نے دیکھا اور دفعتہً بولا کہ وہ گرفتاری کا حکم ہوا، وہ سو آدمیوں کا غول جیل خانے کو چلا، دو ہزار آدمی تہہ خانہ میں قید ہونے کو چلے، وہ سب اندھیری کوٹھریوں میں بند ہوگئے۔ مراد اس قید سے زندگی کے عذاب، دنیا کے دھندے، مکر و فریب کے جھگڑے تھے۔ جن مکانوں میں وہ لوگ ڈالے گئے، ان کی خرابی دیکھنی چاہو، تو دلہائے پریشاں کی بدحالی کو دیکھ لو، وہ لوگ اگرچہ یہاں ہائے وائے بہت سی کرتے تھے، مگر نکلنے کے رستے کی طرف کبھی خیال نہ کرتے تھے۔ چنانچہ اس شخص نے ناک چڑھا کر کہا کہ یہ کم بخت اپنی حماقت اور شامتِ اعمال سے آپ یہاں پڑے ہیں۔ نہیں تو نہ یہ مکان ان کی شان کے قابل ہیں، نہ یہ اخراجات ان کے سامان کے لئے کافی ہیں۔ خیر ہم نے ایسے تماشے بہت دیکھے ہیں۔ اب یہ ہلچل ہو چکے گی، تو پھر وہی بہار کا سماں ہوگا۔

جب میں نے یہ سنا، تو اس کارخانہ کی ناپائداری نے میرا دل بے زار کر دیا۔ میرے رفیق نے جو خبر دی تھی، میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ مگر جب دیکھا کہ یہ بغیر گرفتار ہوئے یہاں سے نہ سرکے گا تو میں چپکے سے دروازہ کی طرف کھسکا، اور چند اور شخصیتوں میں جا ملا کہ جو صداقت اور واقعیت کو مانتے تو نہ تھے، مگر ان شامتِ اعمال کے گرفتاروں کو دیکھ کر ڈر گئے تھے۔ جب ہم دروازے کی دہلیز پر پہنچے تو دل پر صدمۂ عظیم گزرا۔ یعنی وہاں آکر غلط نمائی کا پردہ آنکھوں سے اٹھ گیا۔ تب معلوم ہوا کہ اس محل کی بنیاد بالکل نہیں، معلق ہوا میں کھڑا ہوا ہے۔ اول تو ہم نے سوائے اس کے چارہ نہ دیکھا کہ موت کا کنواں ہے، آنکھیں بند کرو اور کود پڑو۔ مگر اس پہلی ہوسِ بے حاصل پر دل کو ہزار لعنت ملامت کی، جس نے اس عذاب میں گرفتار کیا۔

اب مقامِ تعجب یہ ہے کہ جس قدر یہ سب اپنے اپنے دل میں غور کرتے جاتے تھے، اتنا ہی وہ محل ہمیں نیچے اتارتا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ جو حالت ہم اپنے مناسب حال دیکھتے تھے، اس انداز پر آکر ٹھہر گیا۔ رفتہ رفتہ تھوڑی دیر میں جہاں ہم کھڑے تھے، وہ مقام زمین سے لگ گیا۔ ہم سب

نے نکل کر اپنا اپنا راستہ لیا اور محل آنکھوں سے غائب ہوگیا۔ اب یہ نہیں کہہ سکتے کہ جو لوگ اس میں رہے، ان پر کیا گذری، اور انھیں ہمارے اتر جانے کی خبر بھی ہوئی یا نہیں۔ میں تو جانتا ہوں کہ نہیں ہوئی، خیر جو ہوا سو ہوا۔ اس سوچ میں دفعتہً میری آنکھ کھل گئی۔ خواب تو خواب و خیال ہوگیا مگر نصیحت ہوئی کہ اب خام خیالی کے اشاروں پر کبھی نہ چلوں گا۔ اس راہِ خطرناک میں پھر قدم نہ دھروں گا۔

مردہ بدست زندہ

مرزا فرحت اللہ بیگ

(۱۸۸۴ء - ۱۹۴۷ء)

زمانہ نے خلوص دلوں سے مٹا دیا ہے۔ سچی محبت کی جگہ ظاہر داری نے لے لی ہے نہ اب جینے میں کوئی سچے دل سے کسی کا ساتھ دیتا ہے اور نہ مرنے کے بعد قبر تک دلی درد کے ساتھ جاتا ہے۔ غرض دنیاداری ہی دنیاداری رہ گئی ہے۔ پہلے کوئی ہمسایہ بھی مرتا تھا تو ایسا رنج ہوتا تھا، گویا اپنا عزیز مر گیا ہے۔ اب کوئی اپنا بھی مر جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ غیر مر گیا۔ جنازہ کے ساتھ جانا اب رسما رہ گیا ہے۔ صرف اس لئے چلے جاتے ہیں کہ لوگ یہ نہ کہیں کہ واہ جیتے جی دوستی و محبت کا یہ دم بھرا جاتا تھا۔ مرنے کے بعد پھر کر بھی نہ دیکھا کہ کون مر گیا۔ اب رہی دل کی حالت تو اس کا بس خدا ہی مالک ہے۔ آیئے، میرے ساتھ آیئے، آج کل کی میتوں کا رنگ بھی دکھادوں۔

یہ لیجئے سامنے ہی کے مکان میں کسی صاحب کا انتقال ہو گیا ہے۔ کوئی بڑے شخص ہیں۔ سیکڑوں آدمی جمع ہیں۔ موٹریں بھی ہیں، گاڑیاں بھی ہیں، غریب بھی ہیں، امیر بھی ہیں۔ بیچارے غریب تو اندر جا بیٹھے ہیں۔ کچھ پڑھ بھی رہے ہیں۔ جتنے امیر ہیں وہ یا تو اپنی اپنی سواری میں بیٹھے

ہیں یا دروازہ پر کھڑے سگریٹ پی رہے ہیں، جو غریب آتا ہے، وہ سلام کرتا ہوا اندر چلا جاتا ہے۔ جو امیر آتا ہے، وہ ان باہر والوں ہی میں مل کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ پہلا سوال یہی ہوتا ہے: ''کیا مر گئے؟'' بھئی ہمارے تو بڑے دوست تھے۔'' اتنا کہ اور اپنی جیب سے سگریٹ کا بکس یا پانوں کی ڈبیا نکالی۔ لیجئے، تعزیت ختم ہوئی اور رنج دلی کا اظہار ہو چکا۔ اب دنیا بھر کے قصے چھڑے۔ ایک دوسرے سے نہ ملنے کی شکایت ہوئی۔ دفتر کی کاروائیاں دریافت کی گئیں۔ ملک کی خبروں پر رائے زنی ہوئی۔ غرض اس بات چیت کا یہاں تک سلسلہ کھینچا کہ مکان سے جنازہ نکل آیا۔

یہ دیکھتے ہی دروازہ کی بھیڑ چھٹ گئی۔ کچھ ادھر ہو گئے کچھ ادھر۔ آگے آگے جنازہ ہے، اس کے پیچھے پیچھے یہ سب لوگ ہیں۔ ابھی چند ہی قدم چلے ہوں گے کہ ان ساتھ والوں میں تقسیم ہونی شروع ہوئی۔ اور چپ چاپ اس طرح ہوئی کہ کسی کو معلوم بھی نہ ہوا کہ کب ہوئی اور کیوں کر ہوئی، جن کو پیچھے رہنا تھا، انھوں نے چال آہستہ کر دی، جنہیں ساتھ جانا تھا، وہ ذرا تیز چلے۔ غرض ہوتے ہوتے یہ ساتھ والے تین حصوں میں بٹ گئے۔ آگے تو وہ رہے جو مرنے والے کے عزیز تھے یا جن کو جنازہ اٹھانے کی اجرت پر بلایا گیا تھا۔ اس کے پیچھے وہ لوگ رہے جن کے پاس سواریاں نہ تھیں یا شرما شرمی پیدل ہی جانا مناسب سمجھتے تھے۔ اخیر وہ طبقہ ہوا جو آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتا ہٹتا اپنی سواریوں تک پہنچ گیا اور ان میں سوار ہو گیا۔ اگر پیدل چلنے والوں میں کوئی عہدہ دار ہیں تو غرض مندوں سے ان کو یہاں بھی چھٹکارا نہیں۔ ایک آیا جھک کر سلام کیا۔ گھر بھر کی مزاج پرسی کی۔ مرنے والے کے کچھ واقعات بیان کئے۔ اگر ڈاکٹر کا علاج تھا تو ڈاکٹر کی برائیاں، اگر حکیم کے علاج سے مرا ہے تو طبابت کی خرابیاں ظاہر کیں اور اسی سلسلے میں اپنے واقعات بھی بیان کر گئے۔ اس پیچھا چھٹا کہ دوسرے صاحب آ گئے اور انھوں نے بھی وہی دنیا بھر کے قصے شروع کئے۔ غرض اسی طرح جوڑی بدلتے بدلتے مسجد تک پہنچ ہی گیے۔ یہاں ہمراہیوں کی پھر تقسیم ہوتی ہے۔ ایک تو وہ ہیں جو ہمیشہ نماز پڑھتے ہیں اور اب بھی پڑھیں گے اور دوسرے وہ ہیں جو نہا دھو، کپڑے بدل، خاص اسی جنازہ کے لئے آئے ہیں۔ تیسرے وہ جو اپنی وضعداری پر قائم ہیں، یعنی نماز نہ کبھی پڑھی ہے اور نہ اب پڑھیں گے۔ دور سے مسجد کو دیکھا اور پیچھے ہٹنا شروع کیا۔ جنازہ مسجد تک پہنچا بھی نہ تھا کہ ان کو کسی دیوار، کسی موٹر یا کسی گاڑی کی آڑ مل گئی۔ یہ وہیں کھڑے ہو گئے اور سگریٹ پی کر پان کھا کر

انھوں نے وقت گذار دیا۔ ہاں اس بات کا انتظام رکھا کہ نماز ختم ہونے کی اطلاع فوراً مل جائے۔ ادھر نماز ختم ہوئی ادھر یہ لوگ مسجد کے دروازے کی طرف بڑھے۔ ادھر جنازہ نکلا، ادھر یہ پہنچے۔ بس یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی نماز پڑھ کر مسجد ہی سے نکل رہے ہیں۔

یہ تو ساتھ والوں کا حال ہوا۔ اب راستے والوں کی سنئے۔ اگر میت کے ساتھ صرف دو چار آدمی ہیں تو کوئی پوچھتا بھی نہیں کہ کون جیا کون مرا۔ اگر جنازہ کے ساتھ بڑے بڑے لوگ ہوئے تو دکان والے ہیں کہ ننگے پاؤں بھاگے چلے آرہے ہیں۔ آئے مرنے والے کا نام پوچھا، مرض دریافت کے ذمہ تفویض کردیا ہے اور یہ صرف اس لئے نام پوچھنے آئے تھے کہ رجسٹر میں مرنے والے کا نام خارج کردیں۔

موٹرنشینوں کی کچھ نہ پوچھو۔ یہ تو سمجھتے ہیں کہ سڑکیں انھیں کے لئے بنی ہیں۔ کسی جنازہ کا سڑک پر سے گذرنا ان کو زہر معلوم ہوتا ہے اور کیوں نہ ہو موٹر کی رفتار دھیمی کرنی پڑتی ہے اور ظاہر ہے کہ رفتار کم ہونے سے پٹرول کا نقصان ہے۔ کسی کو کیا حق ہے کہ مر کر ان کے پٹرول کا نقصان کرے۔ شوفر ہے کہ ہارون یا ہارن بجا رہا ہے۔ لوگ ہیں کہ ادھر سے ادھر بھاگ رہے ہیں، جنازہ ہے کہ ٹیڑھا ترچھا ہو رہا ہے۔ مگر موٹر والے صاحب کی موٹر جس رفتار سے آرہی ہے، اسی رفتار سے نکلے گی اور ضرور نکلے گی۔ یہ لوگ تو وہ ہیں کہ قیامت آئے گی تو اس کو بھی ہارن بجا بجا کر سامنے سے ہٹانے کی فکر کریں گے۔ خیر کسی نہ کسی طرح یہ تمام مصیبتیں اٹھا کر جنازہ قبرستان پہنچ ہی گیا۔

قبرستان کی حالت پر جتنا افسوس کیا جائے کم ہے۔ جائے عبرت کو جائے وحشت بنا دیا ہے، قبرستان کیا ہے، خاصہ ایک جنگل ہے۔ ایک طرف ٹوٹی پھوٹی ایک جھونپڑی پڑی ہے۔ اس میں ایک سقے صاحب، ان کی بیوی دس بارہ بچے، پانچ چھ بکریاں، ایک لنگڑا ٹٹو، سو دو سو مرغیاں، پانچ چھ بلیاں اور خدا معلوم کیا کیا بلیات بھرے پڑے ہیں۔ جس حصے میں قبریں ہیں، وہاں کی گھاس بڑھ کر کمر ہوگئی ہے۔ دیواروں کو توڑ کر لوگوں نے راستے بنالئے ہیں۔ نیم، پیپل اور خدا معلوم کس کس قسم کے درخت قبروں کے تعویذ اور چبوترے توڑ کر نکل آئے ہیں۔ کوئی قبر دھنس کر کنواں بن گئی ہے۔ کسی کا تعویذ ہی غائب ہے۔ کسی چبوترے کی اینٹیں نکل کر جھونپڑی میں خرچ ہوگئی ہیں۔ غرض کس مپرسی نے اس حصہ کی عجیب حالت کردی ہے۔ دوسرا حصہ جس میں قبریں نہیں ہیں وہ کسی قدر صاف ہے اور کیوں نہ ہو، پہلے حصے کا مردوں سے تعلق ہے اور دوسرے کا زندوں

سے۔ مردے تو اپنی قبر کی مرمت کرنے یا کرانے سے رہے۔ ان کے جو عزیز ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ اس فضول چیز پر کون خرچ کرے۔ جن کی زمین ہے، وہ تو روپئے کھڑے کر چکے۔ اب ان کو اس سے کیا تعلق۔ دوسرے حصے کا صاف رکھا جانا اصول تجارت پرمبنی ہے۔ جب گاہکوں کو گھیرنے کے لئے دکاندار اپنی ایک ایک چیز جھاڑ کر رکھتا ہے تو یہ قبرستان والے اپنی پچاس روپئے گز والی زمین کو کیوں کر نہ صاف رکھیں۔ خریدتے وقت اچھا مال دیکھ لو، پھر تم جانو اور تمہارے مردے جانیں۔

میاں سقہ رہتے تو قبرستان میں ہیں مگر ہمیشہ پھولوں کی سیج پر سوتے ہیں۔ ادھر لوگ قبر پر پھول چڑھا کر گئے اور ادھر ان کے بچے سب کے سب سمیٹ لائے۔ رات بھر یہ پھول بستر پر رہے، صبح باسی پھول لیجا کر قبر پر چڑھا دیئے۔ خیر کیا ہرج ہے؟ زندوں کا کام بھی نکل گیا، مردے بھی خوش ہوئے۔ اس گھر میں سل بٹا کبھی خریدنے کی نوبت نہ آئی۔ قبر کے اچھے اچھے پتھر پر مسالہ پیس لیا۔ اگر کچھ دنوں کوئی دیکھنے بھالنے نہ آیا تو پتھرا کھاڑ جھونپڑی کے پاس لا رکھا۔ بکریاں قبروں پر قلانچیں مارتی پھر رہی ہیں، مرغیاں کچی قبروں کو کرید رہی ہیں، بچے یا تو چبوترے پر لوٹ رہے یا تعویذوں کو گھوڑا بنائے بیٹھے ہیں، بچیاں قبروں پر بیٹھی اینٹیں اور ٹھیکرے پیس رہی ہیں۔ کسی بچارے کی قبر پر چادر پڑی ہے اس پر سقنی نے گیہوں سکھانے کو ڈال دیئے ہیں۔ ٹٹوانی کو ایک اگلی اور پچھلی ٹانگ باندھ کر چھوڑ دیا ہے۔ وہ قبروں میں گھانس چرتی پھرتی ہے۔ اس کے ادھر ادھر پھدکنے سے کسی قبر کی اینٹ گری، کسی کا چونا گرا، کسی کا پتھر گرا، اگر ایسے ہی چار پانچ گھوڑے چھوڑ دیئے جائیں تو تھوڑے دنوں میں وہی منظر بن جائے جو زلزلہ کے بعد کانگڑے کا ہو گیا تھا۔

جنازہ قبرستان میں کیا گیا، فوج میں ترم بج گیا۔ سقے کا سارا خاندان اپنا اپنا کام چھوڑ کر جھونپڑی میں گھسا اور اناج لینے کو برتن لے لائن باندھ کر آ بیٹھا۔ کسی کے ہاتھ میں پینیدے کا تام چینی کا کٹورہ ہے تو کسی کے پاس ٹوٹی رکابی۔ کسی کے پاس مٹی کا پیالہ ہے تو کسی کے ہاتھ میں ٹوٹا ہوا چھاج۔ سچ ہے، خدا رازق ہے۔ قبرستان والوں کو بھی گھر بیٹھے رزق پہنچاتا ہے۔

یہ تو قبرستان والوں کی حالت ہوئی، اب ساتھ والوں کی کیفیت سنئے۔ جنازہ لا کر لب گور رکھ دیا گیا۔ ایک آتا ہے قبر کو جھانک جاتا ہے۔ دوسرا آتا ہے جھانک جاتا ہے۔ ہر شخص کو زمین سخت ہونے کی شکایت ہے۔ کوئی مزدور کو سست کہتا ہے، کوئی پٹاؤ کا نقص بتاتا ہے اور کوئی قبرستان والے کو برا کہتا ہے جب اس ریویو سے فراغت پائی تو دو دو تین تین آدمی ایک ایک قبر پر جا بیٹھے۔ چبوترہ کو

تخت بنایا اور تعویذ کو گاؤ تکیہ اور لگے سگریٹ اور بیڑی کا دم لگانے۔ کسی نے سقہ سے چلم بھرنے کی فرمائش کی۔ اس نے حقہ تازہ کر سلفہ بھر حاضر کیا۔ حقے مزے لے لے کر پیے جا رہے ہیں۔ ایک دوسرے کی تواضع کی جا رہی ہے۔ سلفہ پر سبو بھروایا جاتا ہے اور یہ وقت کسی نہ کسی طرح کاٹا جاتا ہے۔ یہ توفیق نہیں ہوتی کچھ خدا کی یاد کریں یا ان خفتگان خاک کی حالت کو دیکھ کر عبرت ہی حاصل کریں۔ بعض لوگ ہیں کہ گھانس سے بچتے بچاتے قبروں پر کودتے پھاندتے چلے جا رہے ہیں۔ یہ کون ہیں؟ یہ وہ صاحب ہیں جن کے مرے ہوئے عزیزوں کے آج دن پھرے ہیں۔ یوں تو خدا نخواستہ فاتحہ کو کیوں آنے لگے۔ آج شرما شرمی قبرستان میں آ گئے ہیں۔ مفت کرم داشتن کی صورت سے، چلو فاتحہ بھی پڑھ لیتے ہیں۔ اس کے بعد جب کوئی دوسرا عزیز یا دوست مرے گا تو پھر دیکھا جائے گا۔

ایک صاحب ہیں قبروں کے مکتبے ہی پڑھتے پھر رہے ہیں۔ کچھ نوٹ بھی کرتے جاتے ہیں۔ کوئی اچھا کتبہ مل گیا تو دوستوں کو بھی آواز دے کر بلا لیا اور بجائے فاتحہ کے داد سخن گوئی دی گئی۔ کچھ اپنا کلام سنایا گیا، کچھ ان کا سنا۔ غرض کوئی نہ کوئی مشغلہ وقت گذارنے کو نکال ہی دیا۔ جو لوگ چبوتروں پر متمکن ہیں، ان کی کچھ نہ پوچھو۔ ہر چبوترہ ایک پارلیمنٹ ہے اور ہر قبر ایک کانگریس کا اجلاس۔ دنیا بھر کی خبروں پر تنقیح و تنقید ہو رہی ہے۔ دفتروں کی کاروائیوں پر بحث ہو رہی ہے۔ افواہوں کے ذرائع اور ان کی تصدیق اور تردید کی جا رہی ہے۔ سفارشیں ہو رہی ہیں، وعدے لئے جا رہے ہیں، غرض سب کچھ ہو رہا ہے۔ نہیں ہو رہا ہے تو وہ جو ہونا چاہئے اور جس غرض سے ساتھ آئے ہیں، خیر خدا خدا کر کے خبر آئی کہ قبر تیار ہے۔ کچھ تو قبر کے گرد جا کھڑے ہوئے۔ کچھ وہیں بیٹھے رہ گئے۔ ایک صاحب نے قبر میں اتر کر گلاب اور عود چھڑکا۔ ایک نے میت کے اوپر کی چادر سمیٹی۔ چادر میں بل دیئے۔ دو صاحبوں نے مٹھے کے سرے پکڑ کر میت کو اٹھایا۔ آٹھ دس نے غل مچایا: ''سنبھال کے سنبھال کے۔ میت بھاری ہے، کمر کے نیچے چادر دو۔ ارے میاں اپنی طرف گھسیٹو۔ ہاں آہستہ سے آہستہ۔'' اب میت قبر کے منہ تک آ گئی۔ فقیروں یا یوں کہو کہ مفت خوروں کو اناج تقسیم ہونے لگا اور قبر کے گرد جو لوگ کھڑے تھے، انھوں نے بے تحاشا غل مچانا شروع کیا۔ کوئی کہتا ہے ''ذرا کمر کی چادر کھینچو۔ ارے بھئی اتنا بھی دم نہیں ہے۔ دیکھنا کہیں قبر کا پاکھا نہ گرے۔

ہاں ہاں، ذرا اور جھکا کر۔ لا الہ میت بھاری ہے ذرا سنبھال کے، آہستہ آہستہ بس بھئی بس۔ کوئی چیخ رہا ہے'' مٹھے کے بندھن کھول دو۔ ارے میاں لو یہ ڈھیلا لو۔ سر کے نیچے رکھ کر منہ قبلہ کی طرف تو کردو۔ واہ بھئی واہ، اتنا بھی نہیں آتا ابھی منہ پورا نہیں پھرا۔ بس بھئی بس۔''

یہ مختلف فقرے ایک زبان سے نہیں نکلتے کہ کچھ سمجھ میں بھی آئے۔ ہر شخص ہے کہ غل مچا رہا ہے۔ جو بچارے قبر میں اترے ہیں، وہ پریشان ہیں کہ کیا کریں کیا نہ کریں۔

بہر حال اس غل غپارے کے ساتھ دوست احباب اس مرنے والے کو پہلی منزل تک پہنچا ہی دیتے ہیں۔ اب پٹاؤ کی نوبت آتی ہے۔ اس میں بھی وہی گڑ بڑ شروع ہوتی ہے۔ کوئی کہتا ہے ''یہ کڑی نہیں وہ کڑی لو۔'' کوئی کہتا ہے ''...... '' مفت سو روپے مار لئے اور کڑیاں دیں تو ایسی۔'' غرض کوئی کچھ کہتا اور کوئی کچھ اور اسی گڑ بڑ میں پٹاؤ بھی ہو جاتا ہے۔ اور مٹی دینے کی نوبت آتی ہے۔ مٹی تو ہر ایک دیتا ہے اور منہ سے بھی ہر ایک بڑبڑاتا ہے۔ لیکن یہ خدا ہی کو معلوم ہے کہ جو پڑھنا چاہئے وہ پڑھتا بھی ہے یا نہیں۔ البتہ لفظ منھا بہت اونچی آواز میں کہا جاتا ہے اور باقی سب الفاظ منہ ہی منہ میں ختم کر دیئے جاتے ہیں۔ جب اس کام سے فراغت پائی اور قبر تیار ہوگئی تو فاتحہ کی نوبت آئی۔ ساتھ آنے والوں میں کوئی بھی ایسا نہ ہوگا۔ جو اس میں شریک نہ ہو۔ ہونٹ سب کے ہلتے ہیں مگر شاید سو میں بیس بھی نہ ہوں گے جو یہ جانتے ہوں کہ فاتحہ میں کیا کیا سورتیں پڑھتے ہیں۔ فاتحہ پڑھتے ہی سب کو گھر جانے کی سوجھی۔ یہ بھی پھر کر نہ دیکھا کہ مرنے والے کے اعزہ کون ہیں اور ان کی حالت کیا ہے۔ ہاں ان بچاروں کو گھیرتے ہیں تو جنازہ لانے والے مزدور۔ گھر سے چکا کر لائے تھے مگر یہاں آکر وہ بھی پاؤں پھیلاتے ہیں۔ کبھی تو کہتے ہیں کہ ''فاصلہ بہت تھا'' کبھی کہتے ہیں'' آپ کی وجہ سے دوسری میت کو چھوڑ آئے ہیں۔ وہاں آپ کے یہاں سے دو گنا مل رہا تھا۔'' بہر حال ان مصیبت زدوں کو دق کر کے مزدور کچھ زیادہ ہی لے مرتے ہیں۔

دیکھ لیا آپ نے، اس زمانہ کی میت کا رنگ۔ جو میں نے عرض کیا تھا وہ صحیح نکلا یا نہیں؟ اب سوائے اس کے کیا کہوں کہ خدا سے دعا کی جائے کہ اے اللہ! اپنے ان بندوں کو نیک ہدایت دے، ان کے دل میں درد پیدا کر۔ یہ سمجھیں کہ احکام کیا ہیں اور ہم کیا کر رہے ہیں ـــــ؟

میبل اور میں

پطرس بخاری

(۱۸۹۸ء - ۱۹۵۸ء)

میبل لڑکیوں کے کالج میں تھی لیکن ہم دونوں کیمرج یونیورسٹی میں ایک ہی مضمون پڑھتے تھے، اس لئے اکثر لکچروں میں ملاقات ہوجاتی تھی۔ اس کے علاوہ ہم دوست بھی تھے۔ کئی دلچسپیوں میں ایک دوسرے کے شریک ہوتے تھے۔ تصویروں اور موسیقی کا شوق سے بھی تھا۔ میں بھی ہمہ دانی کا دعویدار اکثر گیلریوں یا کانسرٹوں میں اکٹھے جایا کرتے تھے۔ دونوں انگریزی ادب کے طالب علم تھے۔ کتابوں کے متعلق باہم بحث مباحثے رہتے۔ ہم میں سے اگر ایک کوئی نئی کتاب یا نیا مصنف دریافت کرتا، تو دوسرے کو ضرور اس سے آگاہ کر دیتا اور پھر دونوں مل کر اس پر اچھے برے کا حکم صادر کرتے۔

لیکن اس تمام یک جہتی اور ہم آہنگی میں ایک خلش ضرور تھی۔ ہم دونوں نے بیسویں صدی میں پرورش پائی تھی، عورت اور مرد کی مساوات کے قائل تو ضرور تھے، تاہم اپنے خیالات میں اور بعض اوقات اپنے رویے میں ہم کبھی نہ کبھی اس کی تکذیب ضرور کر دیتے تھے بعض حالات کے

ماتحت مبیل ایسی رعایت کو اپنا حق سمجھتی، جو صرف صنفِ ضعیف ہی کے ایک فرد کو ملنی چاہیئے اور بعض اوقات میں مشحکم اور رہنمائی کا رویہ اختیار کر لیتا، جس کا مطلب یہ تھا کہ گویا ایک مرد ہونے کی حیثیت سے میرا یہی فرض ہے۔ خصوصاً یہ احساس میرے لئے بہت زیادہ تکلیف دہ تھا کہ مبیل کا مطالعہ مجھ سے بہت وسیع ہے۔ اس سے میرے مردانہ وقار کو صدمہ پہنچتا تھا۔ کبھی کبھی میرے جسم کے اندر میرے ایشائی آباؤ اجداد کا خون جوش مارتا اور میرا دل جدید تہذیب سے باغی ہو کر مجھ سے کہتا کہ مرد اشرف المخلوقات ہے۔ اس طرف مبیل عورت مرد کی مساوات کا اظہار مبالغہ کے ساتھ کرتی تھی۔ یہاں تک کہ بعض اوقات ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ عورتوں کی کائنات کی رہبر اور مردوں کو حشرات الارض سمجھتی ہے۔

لیکن اس بات کو میں کیوں نظر انداز کرتا کہ مبیل ایک دن دس بارہ کتابیں خریدتی اور ہفتہ بھر کے بعد انھیں میرے کمرے میں پھینک دیتی اور یہ کہہ جاتی کہ میں انھیں پڑھ چکی ہوں، تم بھی پڑھ چکو گے تو ان کے متعلق باتیں کریں گے۔

اوّل تو میرے لئے ہفتے میں دس بارہ کتابیں ختم کرنا محال تھا لیکن فرض کیجئے مردوں کی لاج رکھنے کے لئے راتوں کی نیند حرام کر کے ان سب کا پڑھ ڈالنا ممکن بھی ہوتا تو بھی ان میں دو یا تین کتابیں فلسفے یا تنقید کی ضرور ایسی ہوتیں کہ ان کے سمجھنے کے لئے مجھے کافی عرصہ درکار ہوتا۔ چنانچہ ہفتے بھر کے جانفشانی کے بعد مجھے ایک عورت کے سامنے اس بات کا اعتراف کرنا پڑتا کہ میں اس دوڑ میں پیچھے رہ گیا ہوں۔ جب تک وہ میرے کمرے میں بیٹھی رہی انداز میں کچھ کھسیانا سا ہو کر اس کی باتیں سنتا رہتا۔ وہ نہایت عالمانہ انداز میں بھویں اوپر کو چڑھا چڑھا کر باتیں کرتی۔ جب میں اس کیلئے دروازہ کھولتا یا اس کے سگریٹ کے لئے دیا سلائی جلاتا یا سب سے زیادہ آرام دہ کرسی اس کے لئے خالی کر دیتا تو وہ میری خدمات کو حقِ نسوانیت نہیں بلکہ حق استادی سمجھ کر قبول کرتی۔

مبیل کے چلے جانے کے بعد ندامت بتدریج غصے میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ جان یا مال کا ایثار سہل ہے لیکن آن کی خاطر نیک سے نیک انسان بھی ایک نہ ایک دفعہ تو ضرور ناجائز ذرائع کے استعمال پر اُتر آتا ہے۔ اسے میری اخلاقی پستی سمجھئے لیکن یہی حالت میری بھی ہوگئی۔ اگلی دفعہ جب مبیل سے ملاقات ہوئی تو جو کتابیں میں نے نہیں پڑھی تھیں۔ ان پر بھی میں نے رائے زنی شروع

کردی لیکن جو کچھ کہتا تھا سنبھل سنبھل کر کہتا تھا۔ تفصیلات کے متعلق کوئی بات منھ سے نہ نکالتا تھا۔ سرسری طور پر تنقید کرتا تھا اور بڑی ہوشیاری اور دانائی کے ساتھ اپنی رائے کو جدت کا رنگ دیتا تھا۔

کسی ناول کے متعلق مبیل نے پوچھا تو جواب میں نہایت لاابالانہ کہا:

''ہاں اچھی ہے لیکن کچھ ایسی اچھی نہیں۔ مصنف سے دور جدید کا نقطۂ نظر نبھ نہ سکا لیکن پھر بھی نکتے نرالے ہیں، بری نہیں، بری نہیں۔''

کنکھیوں سے مبیل کی طرف دیکھتا گیا لیکن اسے میری ریاکاری بالکل معلوم نہ ہونے پائی۔ ڈرامے کے متعلق کہا کرتا تھا:

''ہاں پڑھا تو ہے، لیکن ابھی یہ فیصلہ نہیں کر سکا کہ جو کچھ پڑھنے والے کو محسوس ہوتا ہے۔ وہ اسٹیج پر جا کر بھی باقی رہے گا یا نہیں؟ تمہارا کیا خیال ہے؟''

اور اس طرح سے اپنی آن بھی قائم رہتی اور گفتگو کا بار بھی مبیل کے کندھوں پر ڈال دیتا۔

تنقید کی کتابوں کے بارے میں فرماتا:

''اس نقاد پر اٹھارویں صدی کے نقادوں کا کچھ کچھ اثر معلوم ہوتا ہے لیکن یونہی نامعلوم سا کہیں کہیں۔ بالکل ہلکا سا اور شاعری کے متعلق رویہ دلچسپ ہے، بہت دلچسپ۔''

رفتہ رفتہ مجھے اس فن میں کمال ہو گیا۔ جس روانی اور نفاست کے ساتھ میں ناخواندہ کتابوں پر گفتگو کر سکتا تھا، اس پر میں خود حیران رہ جاتا تھا۔ اس سے جذبات کو ایک آسودگی نصیب ہوئی۔

اب میں مبیل سے نہ دبتا تھا۔ اسے بھی میرے علم و فضل کا معترف ہونا پڑا۔ وہ اگر ہفتہ میں دس کتابیں پڑھتی تھی تو میں صرف دو دن کے بعد ان سب کتابوں پر رائے زنی کر سکتا تھا۔ اب اس کے سامنے ندامت کا کوئی موقع نہ تھا۔ میری مردانہ روح میں اس احساس فتح مندی سے بالیدگی سی آ گئی تھی۔ اب میں اس کے لئے کرسی خالی کرتا یا دیا سلائی جلاتا تو عظمت و برتری کے احساس کے ساتھ جیسے ایک تجربہ کار تنومند نوجوان ایک نادان کمزور بچی کی حفاظت کر رہا ہو۔

صراط مستقیم پر چلنے والے انسان میرے اس فریب کو نہ سراہیں تو نہ سراہیں لیکن کم از کم مردوں کے طبقے سے اس کی داد ضرور چاہتا ہوں۔ خواتین میری اس حرکت کے لئے مجھ پر دہری لعنتیں بھیجیں گی کہ ایک تو میں نے مکاری سے کام لیا اور دوسرے ایک عورت کو دھوکہ دیا۔ ان کی تسلی

کے لئے میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آپ یقین مانئے کئی دفعہ تنہائی میں میں نے اپنے آپ کو برا بھلا کہا۔ بعض اوقات اپنے آپ سے نفرت ہونے لگتی۔ ساتھ ہی اس بات کا بھلانا بھی مشکل ہو گیا کہ میں بغیر پڑھے ہی کے علمیت جتاتا رہتا ہوں۔ مبیل تو یہ سب کتابیں پڑھ چکنے کے بعد گفتگو کرتی ہے، تو بہر حال اس کو مجھ پر تفوق تو ضرور حاصل ہے۔ میں اپنی کم علمی ظاہر نہیں ہونے دیتا لیکن حقیقت تو یہی ہے کہ وہ کتابیں نہیں پڑھتا۔ میری جہالت اس کے نزدیک نہ سہی۔ میرے اپنے نزدیک تو مسلم ہے۔ اس خیال سے اطمینان قلب مفقود ہو جاتا اور اپنا آپ ایک عورت کے مقابلے میں پھر فقیر نظر آنے لگتا ہے۔ پہلے تو مبیل کو صرف ذی علم سمجھتا تھا، اب وہ اپنے مقابلے میں پاکیزگی اور راست بازی کی دیوی بھی معلوم ہونے لگی۔

علالت کے دوران میں میرا دل زیادہ نرم ہو جاتا ہے۔ بخار کی حالت میں کوئی بازاری سا ناول پڑھتے وقت بعض اوقات میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔ صحت یاب ہو کر مجھے اپنی اس کمزوری پر ہنسی آتی ہے لیکن اس وقت اپنی کمزوری کا احساس نہیں ہوتا۔ میری بدقسمتی کہ انہی دنوں مجھے خفیف سا انفلوئنزا ہوا۔ مہلک نہ تھا۔ بہت تکلیف دہ بھی نہ تھا۔ تاہم گذشتہ زندگی کے تمام چھوٹے چھوٹے واقعات گناہ کبیرہ بن کر نظر آنے لگے۔ مبیل کا خیال آیا تو ضمیر نے سخت ملامت کی اور میں بہت دیر تک بستر پر پیچ و تاب کھاتا رہا۔ شام کے وقت مبیل کچھ پھول لے کر آئی، خیریت پوچھی۔ دوا پلائی، ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ میرے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ میں نے (میری آواز بھرائی ہوئی تھی) ''مبیل! مجھے خدا کے لئے معاف کر دو۔'' اس کے بعد میں نے اپنے گناہ کا اعتراف کیا اور اپنے آپ کو سزا دینے کے لئے میں نے اپنی مکاری کی ہر ایک تفصیل بیان کر دی۔ ہر اس کتاب کا نام لیا جس پر میں نے بغیر پڑھے لمبی لمبی فاضلانہ تقریریں کی تھیں۔ میں نے کہا: ''مبیل! پچھلے ہفتے جو تین کتابیں تم مجھے دے گئیں تھی، ان کے متعلق میں تم سے کتنی بحث کرتا رہا ہوں لیکن میں نے ان کا ایک لفظ بھی نہیں پڑھا۔ میں نے کوئی نہ کوئی بات ایسی ضرور کہی ہوگی، جس سے میرا پول تم پر کھل گیا ہوگا۔''

کہنے لگی: ''نہیں تو۔''

میں نے کہا: ''مثلاً ناول تو میں نے پڑھا ہی نہ تھا۔ کیریکٹروں کے متعلق میں جو کچھ بک رہا

تھا، وہ سب من گھڑت تھا۔"

کہنے لگی: "کچھ ایسا غلط بھی نہ تھا۔"

میں نے کہا: "پلاٹ کے متعلق میں نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ ذرا ڈھیلا ہے۔ یہ بھی ٹھیک تھا؟"

اس کے بعد گذشتہ فریب کاری پر وہ اور میں دونوں ہنستے رہے۔ میبل رخصت ہونے لگی تو بولی: "تو وہ کتابیں میں لیتی جاؤں؟"

میں نے کہا: "ایک تائب انسان کو اپنی اصلاح کا موقع تو دو۔ میں نے ان کتابوں کو اب تک نہیں پڑھا لیکن اب میں انھیں پڑھنے کا ارادہ رکھتا ہوں، انھیں یہیں رہنے دو۔ تم تو انھیں پڑھ چکی ہو؟"

کہنے لگی: "ہاں، میں تو پڑھ چکی ہوں۔ اچھا یہیں چھوڑے جاتی ہوں۔"

اس کے چلے جانے کے بعد میں نے ان کتابوں کو پہلی مرتبہ کھولا۔ تینوں میں سے ایک کے بھی اوراق نہ کٹے تھے۔ میبل نے ابھی تک نہ پڑھے تھے۔ مجھے مرد اور عورت، دونوں کے برابر ہونے میں کوئی شک باقی نہ رہا۔

سیل زمانہ

سجاد حیدر یلدرم

(۱۸۸۰ء - ۱۹۴۳ء)

بہے جا، بہائے جا۔ نہ تجھ میں سلامتی، نہ تیرے کنارے سلامت مٹے ہووں کے نشان مٹائے جا تیراکوں کو ڈبا،غواصوں کو نہ اُبھار، یہی تیرا کام ہے۔

تجھ میں جو خوشنما ہرے بھرے جزیرے نظر آتے ہیں، جو پھولوں اور پھلوں سے مالا مال ہیں، جن میں خوبصورت پرند چہچہارہے ہیں۔ کیا یہی لذائذ حیات ہیں؟ وہ حسین سحر کار عورتیں، جو ہاتھ میں ستار لئے دل ربا گانے گا رہی ہیں اور جادو بھری نظریں ڈال ڈال کر مجھے اپنی طرف بلا رہی ہیں، کیا یہی جوانی کی اُمنگیں ہیں؟ آہ! مجھے اس جزیرے کو دیکھنے دے، ان دیویوں سے، ان پریوں سے تو ملنے دے، ان کے گانے سے اپنے دل کو راحت تو پہنچانے دے مگر تو کس کی سنتا ہے تو نے کسی اور تنکے کی سنی ہے جو میری سنے گا، اچھالے، تجھے بھی قسم ہے، بہائے لئے جا، بھگا لئے جا، ذرا نہ ٹھہر۔

مگر یہ تو بتا دے، تو مجھے کہاں سے لا رہا ہے، کب سے لا رہا ہے، کیوں لا رہا ہے، کب تک

بہائے گا............یہ کیا، کیا اور تیزی سے بہنا بھنور میں پڑنا، طوفان کا اُٹھنا موجوں کا مجھے تھپیڑے مارنا، میرے سوالوں کا جواب ہے؟ تجھے میرے سوالوں سے غصہ آ گیا؟ میں نے بے ادبی کی؟ اچھا، اچھا جواب نہ دے، بہے جا، بہائے جا۔

میری روح متجسس، مدید نظروں سے ادھر ادھر دیکھتی ہے، نینوا، بابل، قدیم ہند، قدیم مصر کے ٹکڑے تجھ میں نظر آتے ہیں۔ واعظ کہتا ہے: "باطل، باطل، سب باطل ہے۔"

سکندر ہنیبال، نوشیرواں، دارا، تیری موجوں سے کبھی کبھی ان آوازوں سے ملتی جلتی آوازیں آتی ہیں۔ کیا شہرت رفتگاہ بہی ہے؟ فلاسفر کہا ہے: "دھوکا، دھوکا، سب دھوکا ہے، شہرت دھوکا ہے، نام و نمود دھوکا ہے، خود زندگی دھوکا ہے۔"

لیکن نہیں میں نہ ملل سابقہ کو باطل، نہ شہرت رفتگاں کو دھوکا سمجھتا ہوں۔ ان کی شہرت ہمت بڑھاتی ہے۔ لیکن یہ خیال کر کے کہ کیا ہوں میں اور کیا ہے میری ہست و بود، دل بیٹھ جاتا ہے۔

اس لئے بہتر یہی ہے کہ لاتعداد خس و خاشاک کی طرح جو مجھ سے پہلے آئے اور بعد میں آئیں گے بہے جاؤں۔

بس اب سیل زمانہ، بہے جا، بہائے جا لئے جا، اور اس بحر ناپیدا کنار میں اس عمان عظیم الشان میں، اس اوقیانوس ابد میں اب یا جب تیرا دل چاہے گرا دے۔

برسات

نیاز فتح پوری

(۱۸۸۷ء - ۱۹۶۶ء)

ساون کی وہ سیاہ رات، رات کی وہ امنڈ پڑنے والی تاریکی، وہ پہاڑوں اور جنگلوں کو ہلا دینے والی گرج اور پھر اس کے تاریک پردہ سے فطرت کا وہ زہرہ گداز تبسم، برق، یہ معلوم ہوتا ہے کہ اب اس رات کی صبح کبھی نہ ہوگی، یہ بارش کائنات کی ہر چیز کو بہالے جائے گی۔ یہ گرج آسمان و زمین کو پاش پاش کردے گی اور یہ برق تمام عالم کو پھونک کر رکھ دے گی۔ اے انسانی آبودیو! مجھے یقین نہیں کہ تم آرام وسکون کے ساتھ اس وقت زندگی بسر کررہے ہوگے، مجھے معلوم ہے کہ تمہارے بدن کانپ رہے ہوں گے۔ تمہارے دل لرز رہے ہوں گے۔ تمہاری جانیں گھل گھل کر تحلیل ہورہی ہوں گی اور تمہارے سینے اس منظر فطرت کے حسین رخ سے بے خبر دہل رہے ہوں گے لیکن، میرے غار میں آؤ اور سنگین فرش پر بیٹھ کر اس حسن کا نظارہ کرو جس کو تمہارے محلوں کی اونچی دیواریں، تمہارے کمروں کے بھاری بھاری پردے اور تمہارے دلوں کی بند آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں۔ یہ نگاہوں کے سامنے غیر محدود وسعت کا یہ رقیق میدان یہ غیر متناہی بسیط والی سیال زمین، مجھ سے

پوچھو کہ جب بجلی دفعتاً آسمانوں کی شق کرتی ہوئی تمام عالم کو منور کر دیتی ہے تو اس روشنی میں دشت سبزہ کا ہوا کے ساتھ لہریں سی لینا یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تمام صحرا، سارا میدان ہچکولے کھاتا ہوا چلا جارہا ہے لیکن بجلی کے گم ہو جانے کے بعد اس تاریکی میں بھی میری نگاہ کا بڑا جزو اُس درخشاں منظر کے ساتھ ساتھ ہے۔ وہ ہوا کی سرد سنسناہٹ، وہ آبشار کی پُرشور روانی، وہ کبھی کبھی درندوں کی ہولناک آواز اور غار کے اندر ان تمام باتوں سے لطف اُٹھانے والی تنہا میری جان۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ اگر میں نہ ہوں تو یہ سارا انتظام بدل جائے، ہوا ساکن ہو جائے، آبشار کا پانی جم جائے، بجلی مچلنا اور بادل پانی برسانا چھوڑ دے۔ میں کیسا خوش ہوں کہ اس منظر سے لطف اُٹھانے والا سوائے میرے اور کوئی نہیں ہے کہ اپنی نگاہ سے اس کو جھوٹا کر دے۔ میں بیوی اور فطرت کے یہ مناظر۔ مری نگاہ ہے اور ان مناظر کی یہ دوشیزگی۔ اگر میرے غار میں پانی بھر رہا ہے تو بھرنے دو کہ قدرت میرے مسکن کا فرش دھو رہی ہے اور میرے پاس کوئی سامان نہیں ہے کہ اس کی تباہی کا درد مجھے بے تاب کر دے۔ اگر سرد ہوا سے میرا جسم کانپ رہا ہے تو کانپنے دو کہ صبح گرم آفتاب کا نکلنا صرف اسی پر منحصر ہے۔ اگر میرے بدن کو گرمی پہنچانا مقصود نہ ہو تو وہ نکلے کیوں۔

اے محفوظ محلوں میں آرام کرنے والو! اپنی زندگی پر تاسف کرو کہ تمہارا حصہ اس میں نہیں ہے، سو جانے کے بعد ایک ساون کی مست رات بھی اُسی طرح عالم بے خبری میں بسر ہو جاتی ہے جس طرح گرما کی خشک گھڑیاں۔ پھر تمہیں کیا معلوم کہ زمانہ کا کون سا لمحہ تم سے بیداری چاہتا ہے، جسے تم نے غفلت و خواب کی کروٹوں میں بسر کر دیا۔ جس وقت صبح کو بارش بند ہو جاتی ہے تو تم اپنے سامان و اسباب کے جائزہ اور اس کی بربادی کے ماتم میں مصروف رہتے ہو اور میں ایک شفاف چشمہ کے کنارے اطمینان سے اس پھیلے ہوئے سکون کو دیکھتا رہتا ہوں جو اس وقت موجوں کے اضطراب کے ساتھ بھی بہتا نظر آتا ہے۔ آہ، مجھ سے پوچھو کہ جس وقت صبح اپنے کاسۂ طلائی میں شرابِ زر چھلکاتی ہوئی نکلتی ہے تو اس وقت میری تنہائیاں، پہاڑ کی ویرانیاں، صحرا کی وسیع خلوت زائیاں، اس سے کیسی شرابور ہو جاتی ہیں۔ تمہارے آئینے صرف تمہاری بگڑی ہوئی صورتوں کو پیش کر سکتے ہیں۔ آؤ، میرے ساتھ اس چشمہ میں فطرت کے اُس حسن کا مطالعہ کرو جس کو کبھی زوال نہیں۔ اس دلکشی میں غرق ہو جاؤ جس کو کبھی انحطاط نہیں۔ تمہارے اسباب تعیشِ گراں ہیں اور

ناپائیدار۔ میرے سامانِ تفریح ہفت ہیں اور لازوال۔ اس سے تم تھک جاتے ہو کہ وہ بہت محدود ہیں اور تنگ۔ اس سے میں اپنے اندر ایک سچا جوش، ایک حقیقی مسرت پاتا ہوں کہ یہ وسیع ہیں اور غیر محدود۔

(۲)

افقِ بعید کے وہ ساحر بادل جن کے حیات بخش کناروں سے آفتاب کی کرنیں چھو کر آبشار رنگ میں تبدیل ہو جاتی ہیں، اس وقت جبکہ شفق کی کی ارغوانی شراب ساری وادی کو کناروں تک لبریز کرتی ہوئی بہ نکلتی ہے، ہاں مجھ سے پوچھو کہ پہاڑ کی چوٹی پر ایک سنسان اور ویران جھونپڑے میں وہ بادل مجھے کیا نظر آتے ہیں۔ میں اپنی آنکھوں میں طوفان رنگ کی روشن لہروں کو لئے بیٹھا ہوں اور ایسا محسوس کرتا ہوں کہ میری آنکھوں سے اس وقت موسیقی نکل نکل کر تمام وادی میں گونج رہی ہے۔ پہاڑ اور اس کے درختوں کا سکوت، وادی اور اس کی گہرائی کی خاموشی، پانی اور اس کی موجوں کا سکون۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ دنیا اس موسیقی میں ڈوب کر سوگئی ہے۔

میری وہ ایک چیز جو غار کی تنگ آغوش اور تاریکی کے ایک محدود قفس میں اپنی وسعت کو سمیٹے ہوئے پڑی سو رہی تھی، اس وقت بیدار ہو کر انگڑائی لیتی ہے اور آفتاب کے چہرہ سے نقاب زر اُٹھا کر اس کا منہ چوم لیتی ہے اور اس کی کرنوں کے ساتھ ساتھ آغوشِ سحاب میں کھل کھلا کر گر پڑتی ہے اور پھر روشنی کی ہلکی ہلکی موجوں کے ساتھ میری آنکھوں میں اُتر آتی ہے اور خون میں رقص کرنے لگتی ہے۔ اب میں سمجھنے لگتا ہوں کہ یہ روح ہے، یہ حیات ہے۔ اس کا نام زندگی اور زندگانی ہے۔ میں اس وقت غار میں غار کے چاروں طرف، پہاڑ میں، پہاڑ کے ہر ہر جامد پتھر میں اور درخت میں درخت ہر ہر پتی میں، زمین میں، آسمان میں، ساری کائنات میں اور خود اپنے اندر ایک جنبشِ بیداری محسوس کرتا ہوں اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر چیز کے اندر اس وقت شباب موجزن ہے اور اگر کوئی ایک چیز دوسرے سے مل گئی تو پھر کبھی جدا نہ ہوگی۔

کسے خبر ہے لیکن مجھے معلوم ہے کہ اس وقت میری پلکوں کی ہر جنبش ایک آغوش ہے جو کامیابی سے معمور اور معموری سے مطمئن نظر آتی ہے۔

آزاد اور سچی موسیقی کی لذتیں، پاک و غیر آلودہ مسرت کا جوش، نزاکت و لطافت کی فراوانی، مکلف محفلوں، آراستہ مجلسوں اور ان افسردہ و مضمحل آغوشوں میں نہیں ہے جن کو صرف

تمہاری دولت نے مہیا کیا ہے۔ ادھر آؤ۔ اس شفق کے سمندر میں شاخِ بلوط کی موج کو دیکھو اور رشک کرو اس شاما پر جس کی ننھی سی منقار سے نکل کر سچی موسیقی کی روشنی تمام دنیا میں پھیل جانا چاہتی ہے۔ بخورِ نغمہ سے کائنات معطر ہے۔

وہ صنوبر کی چوٹی پر فاختہ کا جوڑا۔ یہ معصوم و پاک محبت کا اظہار۔ یہ طمانیتِ قلب۔ یہ جمع خاطر۔ معلوم ہوتا ہے کہ فطرت اس کے سکونِ مسرت کو لے کر ہر ہر ذرہ پر چھڑک رہی ہے۔ یہ جنگلی پھولوں کی شرابِ لالہ رنگ سے بھرے ہوئے کٹورے! تیتری سے پوچھو جو ابھی ابھی ایک جرعہ پی کر اپنے رقص سے فضا کو مست بنائے ہوئے ہے۔ یہ نازک پتیوں کی شاداب و مسکر شیرینی! بھنبھیریوں کو دیکھو اور ان کی مخمور تھرتھری سے ارتعاشِ نگاہ کو! کیا تمہاری شرابِ رنگین نے کبھی یہ موج پیدا کی ہے؟

میں تو یہی سمجھتا ہوں۔ اچھا اگر غلط ہے تو مجھے بتاؤ۔ اپنے تمدن کی دلچسپیوں میں میرے لئے کشش پیدا کرو۔ اپنے مادی اسبابِ طرب میں میرے دل کے لئے کوئی جاذبیت ثابت کرو۔ میری روح کو اپنی مسرتوں کی طرف کھینچ لو۔ مجھے اپنی لذتوں کی طرف بلالو، اگر بلا سکتے ہو۔ تم کو اگر میری ویران زندگی پر افسوس ہے، اگر میری تنہائیوں یا بے سروسامانیوں پہ تم اپنا دل دُکھاتے ہو، تو اپنی متمدن حیات، اپنی عشرت سامانیوں، اپنی محفل طرازیوں سے اس تعفن و اضمحلال کو پہلے دور کردو، جس سے ہر صبح تمہاری روح مغلوب نظر آتی ہے۔ تم اپنے اندر ایک تھکن محسوس کرتے ہو اور چاہنے لگتے ہو کہ کچھ زمانے کیلئے اپنے اسبابِ طرب سے جدا ہو کر کہیں اور زندگی گذار دی جائے۔

میں تو اپنی صبح و شام سے کبھی بیزار نہیں ہوتا۔ میرے رات دن تو مجھ میں کبھی حزن و ملال پیدا نہیں کرتے۔ تمہاری مادیت ایک فریب ہے، خدا کے لئے میری روحانیت کو اس میں مبتلا نہ کرو۔ فطرت کی طرف سے مجھ میں خواہشِ انحراف پیدا نہ کرو۔ میری زندگی مجھ سے چھیننے کی کوشش نہ کرو کہ میرے نزدیک ـــــ

حیات نام ہے صرف ان تاثرات کا جو مناظرِ فطرت کی اچھوتی فضا میں پیدا ہوں اور اسی میں تحلیل ہو جایا کریں۔

ایک قافلۂ صحرا کو دیکھ کر

نیاز فتح پوری

اے اس آسمان کے نیچے، فرشِ زمین پر صحیح معنی میں زندگی بسر کر دینے والو وحشیو۔ اے بادلوں کی طرح اپنی خانہ بدوش آوارگیوں میں گم رہنے والے صحرائیو۔ کیا مجھے بھی تم اپنے اس نشۂ وارفتگی میں کبھی شریک کر سکتے ہو؟ جس سے تم نے صحرا کے ذروں کو مخمور اور پہاڑ کی وادیوں کو معمور کر رکھا ہے۔ کچھ تو بتاؤ کہ میں کیوں کر تمہاری اس لبریزِ سکون پراگندگی کی جمعیت کو اپنے دل میں بھر لوں۔ میں کس طرح تمہاری اس مرتحل معاشرت کے اندر چھپا ہوا جنگلوں کا سکوت، راتوں کا سکون چھین کر اپنی حیات کو دے دوں۔ تمدن کی ساری ہنگامہ خیزیاں، تہذیب و ترقی کی تمام جلوہ آرائیاں، دولت و حکومت کی جملہ نخوت سامانیاں اور سب کچھ وہ جو شاید تمہیں اپنی ایک بوسیدہ سی تنی ہوئی چادر کے اندر میرے پاس قابلِ رشک نظر آتا ہے۔ ہاں یہ سب لے لو۔ ابھی لے لو اور ہمیشہ کے لئے لیکن خدا کے لئے مجھے اپنی زندگی کی ایک گھڑی، اپنی حیات کا کوئی لحہ دے دو کہ کچھ دیر تو اس سکون و اطمینان کو اپنے سینہ سے لگا سکوں جو بازارِ عالم میں اک جنسِ نایاب ہے اور شاید کونین کے عوض بھی خریدی نہیں جا سکتی۔

تمہیں کیا بتاؤں کہ میں کس قدر بیتاب ہوں، کیسا تڑپ رہا ہوں کیوں کہ تم اس کرب و اضطراب سے واقف ہی نہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اگر کہیں تم اس پر راضی ہو جاؤ اور میں ایک چاندنی رات، ایک صبح و شام بھی تمہارے ساتھ اک کھلے ہوئے میدان میں اس اطمینان کے ساتھ بسر کرسکوں، تو شاید میں مر جاؤں گا اور اس مسرت کو برداشت نہ کرسکوں گا۔

وہ جنگل ہو یا بستی، ویرانہ ہو یا آبادی، تمہارا اُسی طرح کسی صاف جگہ میں چارگز زمین پر چادر تان کر اپنے سارے خاندان اور نہایت محدود اسبابِ زندگی کو لے کر ساری عمر کاٹ دیتا، وہ تمہارا مل جائے تو کھا کر زمین پر چین سے سو جانا اور نہ ملے تو صبر کر کے خاموش رہ جانا۔ آؤ، تم انسان ہو لیکن پھر جی چاہتا ہے کہ تمہیں معصوم کہہ دوں اور تمہاری اس معصومیت کی داستانیں گا گا کر کائنات پر اک نیند طاری کر دوں اور خود بھی کہیں کسی پتھر پر سر رکھ کر ہمیشہ کے لئے غافل ہو جاؤں۔

ہاں۔ کہہ دو۔ اجازت دے دو کہ میں بھی تم میں آ کر مل رہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ دنیا پر کبھی تو ایک نگاہِ مستغنی ڈال کر دیکھوں کہ کیسا معلوم ہوتا ہے۔ میں عہد کرتا ہوں کہ کبھی تم سے وہ طلب نہیں کروں گا جو تمہارے پاس نہیں ہے۔ کبھی میں اپنی راحت و عشرت نظر آنے والی کلفت و صعوبت کے بیان سے تمہارے امن کو آزار نہ پہنچاؤں گا۔ میں تمہارے ساتھ وہی خشک روٹی کھاؤں گا جو تم مجھے دے دو گے یا پھر بھوکا رہوں گا، اگر کبھی یہ بھی میسر نہ آئے۔ میں تمہارے ہمراہ سارا دن برہنہ پا چل کر کاٹ دوں گا، اس امید پر کہ شام کو تمہارے قیام کی سادگیوں میں حصہ لے سکوں اور میں تمہارے قافلہ کی اکیلی ہرنی، یعنی اس سانولی لڑکی کے ساتھ محبت کرنا سیکھوں گا جس کی پھڑکتی ہوئی سیاہ آنکھوں کی وحشت سے ملا ہوا اس کی شوخ و پُر صحت جوانی کا متوالا پن مجھے ایک ہی رات میں، اگر وہ چاہے تو ہمیشہ کے لئے جھکا سکتا ہے اور جس کے سامنے صبح کو میں اپنی روح کی آسودگی نذر یعنی اک خمیازہ خمار پیش کر کے نہایت مسرت سے اس دنیا کو چھوڑ سکتا ہوں، میں نے عالیشان قصر کے اندر راحت و ناز میں نشو و نما پانے والے حسن کی آرزو کر کے دیکھ لیا، میں نے زرکا درخشاں ملبوس کے اندر جگمگانے والے جمال کے سامنے اپنا سر نیالیش جھکا کے دیکھ لیا، میں نے گھونگھٹ کے اندر برق آسا چہروں اور مچھلی کی طرح بیتاب آنکھوں کے سامنے اپنی ہستی کو تباہ و داغدار بنانے کے لئے پیش کر کے دیکھ لیا لیکن اب چاہتا ہوں کہ صناعاتِ انسانی سے جدا، الوانِ

تہذیب سے علیحدہ، اختراعاتِ عقل سے الگ، اسبابِ نمود و نمائش سے منفک، فطرت کے اصلی رنگ میں حسن کا تماشہ کروں اور دیکھوں کہ اس کا معاملہ دل کے ساتھ کیا ہوتا ہے۔ صرف حسن کا استغنا تو میرے لئے راحت و شکیبائی ہے۔ جمال کی بے نیازیاں محض جمال ہونے کے لحاظ سے تو میرے لئے سرمایۂ لذت و سکون میں لیکن دولت و امارت کا غرور، علم و تہذیب کی نخوت پسندی جو ایک غیر محسوس طریقہ سے دنیا کے اس کفر آباد تمدن میں ہر چیز کے ساتھ ملی ہوئی نظر آتی ہے، مجھے پسند نہیں کیونکہ اس نے حسن کی فطری رعنائیوں صحیح دلفریبیوں کو سخت آزار پہنچا رکھا ہے۔

محلوں کی سنگین دیواروں میں عشق کی نالہ سامانیاں رخنہ پیدا نہیں کر سکتیں۔ میں باہر سر ٹکرایا کرتا ہوں اور سونے والیاں اندر چین سے غافل و مدہوش سویا کرتی ہیں۔ نگاہ خیرہ کرنے والے زر کا دامنِ ملبوس تک، خاک ہو جانے والے دل کے ذرّرات نہیں پہنچ سکتے۔ ناز سے دامن اُٹھا کر اٹھکھیلیاں کرتی ہوئی گذر جانے والیاں گذر جاتی ہیں اور میرا غبارِ پامالی بلند ہو ہو کر رہ جاتا ہے کہ کہیں لباس کے ساتھ ان کا دل بھی میلا نہ ہو جائے۔ وہ مخملی بستروں پر اپنے مخمل سے زیادہ نرم پہلو بدل بدل کر بیٹھنے والیاں، ہم بوریا نشینوں کے جذباتِ محبت کو کیا سمجھ سکتی ہیں۔ وہ بجلی کی روشنی میں اپنے سیمیں قہقہوں سے تلاطم بپا کرنے والی نا آشنائے غمِ نخوت و پندار کی دیویاں، ہم رات رات بھر اک گوشۂ تار میں رونے والوں کا حال کیوں پوچھنے لگیں۔ اس لئے بعض وقت میں ایسا محسوس کرنے لگتا ہوں کہ شاید میں حسن کے لئے بیتاب نہیں ہوں بلکہ اس کے میسر الحصول ہونے کے لئے بیقرار ہوں۔ حسن مجھے مسحور نہیں کرتا بلکہ اس کے اعراض ڈھونڈتا ہوں کہ کوئی فرشِ خاک پر میرے برابر بیٹھ کر برقی روشنی میں نہیں بلکہ صرف جنگل کی نکھری ہوئی چاندنی میں میرے اس اقرارِ محبت کو سن لے جو کبھی لبوں تک نہیں آسکا اور پھر اس کا اختیار ہے، چاہے رد کرے یا قبول۔

تو اے فرزندانِ صحرا، تم مجھے بھی اپنے ساتھ مل کر رہنے کی اجازت دو گے، کیا مجھے اس لڑکی سے جو اپنی شیام رنگ جوانی لئے ہوئے بڑی بڑی وحشی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہی ہے، دو باتیں کرنے کی فرصت دو گے ــــ؟ آہ، تمہیں کیونکر بتاؤں کہ اس کو دیکھ کر اس وقت میرا کیا حال ہو رہا ہے اور مجھ پر کیا گذر رہی ہے۔ اچھا اگر تم کچھ نہیں کہتے تو میری قسمت کا فیصلہ اُسی کے ہاتھ میں دے دو جو اتنی دیر سے کھڑی مجھے تڑپا رہی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ میری حالت کو بہتر سمجھتی ہوگی اور

کبھی مجھے مایوس و ناکام واپس نہ کرے گی لیکن اگر تم اس پر بھی راضی نہیں تو اس سے کہہ دو کہ میری طرف نہ دیکھے۔ یہ اپنی جادو کرنے والی آنکھیں میری طرف سے ہٹا لے۔ یہ مقناطیسی نگاہیں نیچی کر لے ورنہ اب ضبط و تحمل میرے بس کی بات نہیں۔ میرے پاؤں تھرتھرا رہے ہیں۔ میرا بدن کانپ رہا ہے۔ ہاں دیکھو، سمجھاؤ، ورنہ وہ مجھے اپنی طرف کھینچ لے گی اور میں کھنچ جاؤں گا اور پھر اس وقت تمہارا مجھے اس سے جدا کرنا روح کا بدن سے جدا کرنا ہو گا اور پھر اس وقت تمہیں معلوم ہو گا کہ حسن کچھ نہیں ہے مگر محبت سے مل جانے کی تمنا۔

سری نگر کی ایک شام

ل-احمد اکبرآبادی

(۱۸۸۵ء - ۱۹۸۰ء)

وادیٔ مسرور، نظیر جنت، کشمیر کی ناکافی و حرص انگیز سیر کے بعد میں اور جمالی لاہور ٹھہرے۔ شام کے وقت ہوٹل سے نکلے، ولیریو کے یہاں چائے پی اور پھر ''چڑیا خانے'' میں پہنچ کر اِدھر اُدھر پھرنے لگے۔ گل گشت چمن نے نشاط باغ کی نشاط انگیزیاں یاد دلا دیں — پھر آپ سمجھ لیجئے کہ نظارۂ گلستاں اور یادِ گلزار کے تاثر کی نوعیت کیا ہو سکتی اور وہ جن موضوعات کلام کی محرک ہو سکتی ہے۔ ہمارا موضوعِ گفتگو بس وہی تھا لیکن جب گفتگو کے پہلو نکلے تو جمالی، ہماری سیر کشمیر کا جائزہ لینے لگا۔

اس نے ہماری جماعت کی نقل و حرکت، مصروفیات و تفریحات کے طور و طریق پر تنقید شروع کر دی۔ ''اس کے خیال میں ہم لوگوں کا ایک ساتھ ہونا تو اس کے خلاف مزاج نہ تھا لیکن اس میں ندرت بھی کیا تھی — یہ لطفِ صحبت تو کشمیر گئے بغیر بھی حاصل تھا!''

''اصل بات یہ ہے کہ تم لوگوں کے ساتھ سیر کشمیر کا کچھ لطف نہیں تھا۔'' اس نے کہا۔ ''میں

جتنی دیر تم سے الگ رہا، وہی وقت یادگار گزرا۔ تم لوگوں نے اصلی کشمیر دیکھا ہی نہیں۔ اگر تمہاری الپتر و گلمرگ کی سیر مجھ بیمار کو سری نگر میں پڑا نہ رہنے دیتی تو میں بھی تم سب کی طرح کو دن ہی گھر کو پلٹتا!''

لیکن ہم نے کشمیر کے تمام قابل دید مقامات کی سیر کی۔ تمام حسین مناظر دیکھ ڈالے، جتنی فرصت تھی، اس کا ایک ایک منٹ کارآمد طور پر صرف کیا؟'' میں نے اپنے بھدّے طریق پر جواب دینا چاہا۔

''جی، کشمیر کی سیر صرف اسی کا نام نہیں ہے؟ کشمیر کی سیر کے معنی ہیں کہ انسان کے کپڑے تک بک جائیں؛ اس کے برخلاف آپ لوگ جو نپا تلا خرچ گھر سے لے کر چلے تھے اس میں سے بھی بچا کر واپس ہوئے۔'' اس نے جلے کٹے لہجے میں کہا۔

''تو کیا روپیہ بکھیرتے بھرنے کا نام سیر ہے؟ ہم نے کس موقع پر جزرسی سے کام لیا؟ ہر چیز میں کفایت مہیا تھی!'' میں نے اس کے مفہوم سے تجاہل برتا اور اس کے جواب میں کہا۔

جی ہاں، آپ نے کشمیر کے میوے بکریوں کی طرح چرے، آپ نے حسن منظر پر سبحان اللہ بھی پکار پکار کر کہا اور اسے فردوس بریں بھی باور کیا۔ لیکن شاید آپ کو معلوم نہیں کہ یہاں کے پھول پھل، رنگ و نکہت کے علاوہ بھی کسی مستور پیغام کے حامل ہیں۔ آپ نے حسن رہ گزر پر ''فتبارک اللہ'' بھی چپکے چپکے کہہ لیا مگر آپ واقف نہیں کہ یہ جواز ہی اشیاء کی دل کشی کو زائل کر دیتا ہے! کشمیر کی سیر، اس کا راز دار ہوئے بغیر نہیں ہو سکتی۔ آپ کو کیا معلوم ہے۔ دوگانہ ہیں۔ وہ جن مناظر کو برملا پیش کرتا ہے ان کی اصل اس کے سیہ چشموں کی خلوتوں میں مستور ہوتی ہے ــــ یہی کشمیر کا راز ہے۔

''تم نے بس کشمیر کی صورت دیکھی، اس کی جان و روح کا نظارہ تمہارا مقدر نہیں تھا۔ میں خوش بخت تھا کہ تم سے علیحدگی کا ایک ہفتہ مل گیا!

میرے اصرار پر جمالی نے اپنے ہفتۂ واردات کا خاکہ اس طرح کھینچا۔ محبت کے موضوع پر غور و فکر کرتے وقت عافیت تو اسی میں ہے کہ تیشۂ فرہاد کی خاراشگافیوں کو یاد رکھا جائے اور شیکسپیئر کے ترکیب دیئے ہوئے چار لفظوں کو بھلا نہ دیا جائے، جنہیں اس نے ایک ڈرامے کا سرنامہ و عنوان قرار دیا یعنی ''عشق کی محنت برباد'' لیکن ایک بھلے آدمی کو یہ حق پھر بھی حاصل رہتا ہے کہ وہ اس

سہولت کے خیال کو مسترد کر دے، اور اپنا سر پھوڑنے اور غم وغصہ کھانے کے لئے سعی و جستجو کرے! ہوسکتا ہے کہ ایک بھلے آدمی کو یہ حق حاصل نہ ہو۔ مجھے اس پر اصرار بھی نہیں ہے!

بہرحال، تم اندازہ نہ کرسکو گے، وہ کیسی تکمیل وعدہ تھی جو میرے اس ایک حسین ومنور تجربے کی خصوصیت تھی! تمہیں یاد ہوگا کہ میری طبیعت ناساز ہونے اور تم لوگوں کے گلمرگ جانے سے ایک دن پہلے، تیسرے پہر کے وقت میں اپنی غیر وارداتی ہاؤس بوٹ اور تم غیر وارداتی ساتھیوں کو سوتا چھوڑ کر نکل گیا تھا — ؟ میں تم سب کو چھوڑ کر ٹہلتا ہوا چنار باغ جا پہنچا۔ اور نہر کے کنارے درختوں کے سائے میں سبزے کے اوپر، تنہا بیٹھا ہوا تھا۔ سورج ہولے ہولے ڈوب رہا اور آس پاس کو ایک رمزناک تاثر میں ڈبو رہا تھا۔ میرے سامنے، نہر کے دوسرے کنارے پر ایک پرانا شکارا پڑا تھا جس کی زخم خوردہ لکڑی اور تختوں کی دراڑیں بہت بری معلوم ہو رہی تھیں۔ میں نے خیال کیا کہ یہ شکارا کس قدر ناکارہ ہے!

اس خیال کے ساتھ میری آنکھیں خود بخود بند ہوگئیں اور میں ایک خواب دیکھنے لگا۔ میں دیکھتا ہوں کہ کسی کے ریشمی لباس کی فرفر ہوا میں ملتی محسوس ہو رہی ہے اور کوئی نرم، نازک اور خرد سوز ہستی موجود مگر نگاہوں سے مخفی ہے۔ میں محسوس کرتا معلوم ہوتا ہوں کہ شامہ فریب اور سحر روح و جان خوشبو میرے حواس پر چھا گئی ہے! کیا یہ بالکل واہمہ ہوسکتا تھا؟ نہیں میں آنکھیں کھول دیتا ہوں اور جانتے ہو، میں نے آنکھیں کھول کر کیا دیکھا؟ ایک نازنین، نہیں ایک پری کو دیکھا۔ سب پریاں نازنین ہوتی ہیں مگر سب نازنین پریاں نہیں ہوتیں! اب میں نے دیکھا کہ وہ شکارا خالی نہیں تھا — اس کے سارے عیب دور ہوگئے تھے!

بندش کی رنگائی کا پیمک لگا دوپٹہ، دو مالہ مارنے سے اس کے شانوں پر اس طرح اکٹھا ہوگیا تھا کہ وہ مجھے اس کے قزحی رنگ کے پر معلوم ہوا۔ میں نے نگاہیں اٹھائیں مگر ایسی دلیری کے ساتھ جس میں شرم کا رکھ رکھاؤ بھی تھا اور ان آنکھوں میں دیکھنے لگا، جن کی رقیق کرنیں میری آنکھوں کو چوندھیا رہی تھیں۔ آہ وہ ان آنکھوں کے سیاہ فتنے! اس کے وقت میں بے بات سرور میں تھا!

ایک شکارا جس میں مخملی تکئے لگے تھے اور ایک حریر اندام و پریاں پوش ان تکیوں میں بیٹھی

تھی۔عین اس شکارے سے بھڑا کر کھڑا کر دیا گیا تھا جو مجھے اتنا برا معلوم ہوا تھا۔اب رہا یہ سوال کہ وہ شکارا وہاں کیوں کھڑا کیا گیا، میں اس کی توجیہہ نہیں کرسکتا، میں صرف قیاس سے کام لے سکتا ہوں،تم بھی عقل کے گھوڑے دوڑاؤ۔سنو،ایک وجہ تو یہ ہوسکتی ہے کہ وہ لوگ ڈل میں جانا چاہتے ہوں اور چونکہ نہر کی سطح نیچی ہونے کے باعث ڈل کے دروازے میں داخل نہ ہوسکتے تھے، پانی کی سطح برابر ہوجانے کا انتظار کررہے ہوں۔دوسری بات یہ ہوسکتی ہے کہ کسی دوسرے شکارے میں اپنے ساتھیوں کے آجانے کا انتظار کررہے ہوں۔تیسرا سبب خود چنار باغ کے منظر سے لطف اٹھانا بھی ہوسکتا ہے اور چوتھی شکل میں بہت سی صورتیں داخل کی جاسکتی ہیں،ان میں ایک صورت میری بھی ہوسکتی ہے۔اس پر تمہیں یا کسی کو اعتراض بھی کیوں ہو؟اور اعتراض نہیں ہوسکتا تو پھر رشک بھی کیوں ہو؟

داغ کا یہ شعر مجھے ذرا دیر سے ملا تھا کہ:

جرأت وشوق اب کہاں وقت ہی جب نکل گیا
اب تو ہیں یہ ندامتیں ، صبر کیا تھا ہائے کیوں

داغ کے تجربے کے بعد میں نے اس کی طرح وقت کی نوحہ خوانی نہیں کرنا چاہی، پھر بھلا ایسے موقعے پر میں کیونکر طرح دے سکتا تھا۔یقین کرو کہ میرے ''ذوق حصول'' نے میری ''جرأت رندانہ'' کو زندہ و بیدار کردیا تھا۔چنانچہ موقع مناسب یا غیر مناسب کا ذرا خیال نہ کرتے ہوئے میں نے بلاتمہید گفتگو شروع کردی۔اگر کوئی مجھے بدتہذیب کہنا چاہئے،اوباش سمجھے،تو ضرور اپنا دل خوش کرلے لیکن ختم داستان پر خفت اٹھانا پڑے گی۔

سنو،جب میری اس کی نگاہیں چار ہوئیں،اور سچ پوچھو تو چار نہیں ہوئیں—دو کی دو ہی رہیں۔کیونکہ اس نے نگاہیں ملائی نہیں بلکہ لڑائیں—تو پہلی ادا جو اس نے صرف کی وہ یہ تھی کہ اس نے اپنے صنوبری قامت کی نمائش کی۔تم جانتے ہو کہ کشمیر کی عورتوں میں قدرسا ایک نادر چیز ہے۔ مگر مجھے آج تک حیرت ہے کہ اس کو میری اس کمزوری کا علم کیونکر ہوگیا کہ میرے یہاں طوبےٰ قامتی کو پہلا درجہ حاصل ہے؟اس کے کھڑے ہونے کا انداز تر کا نہ جوں کا توں میرے دل میں اتر گیا۔شلوار کی اس رعنائی وزیبائی کا میں کبھی تصور بھی نہ کرسکا تھا جو زونو کے جسم پر نظر آئی۔

یہ صحیح ہے کہ میں خشکی پر تھا اور وہ پانی پر مگر ہمارے درمیان فاصلہ بہت ہی کم تھا— اگر سن لئے جانے کا اندیشہ نہ ہوتو سب گفتگوئیں ہوسکتی تھیں۔ مختصر یہ کہ اس نے میری طرف سے نظر ہٹا کر اپنے خادم کی طرف دیکھا اور وہ کچھ مسکرا کر میری جانب متوجہ ہوا اور کہنے لگا۔

''جناب بابو صاحب اکیلے ہیں؟ آیئے سیر کر آیئے!''

اب تم ہی کہو کہ ایک گالی اور ایک غلط بیانی! اگر میری جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو کیا ہوتا؟ اور مجھ پر تو یہ مزید قیامت گزر گئی کہ اس سے مجھے جو تکدر ہوا، اس نے میرے تمام خوش آئند خیالات کو درہم برہم کر دیا۔ خیر جس طرح بھی ہوسکا، میں نے اپنے آپ کو بہلایا۔ اس بابو صاحب کی گالی کو بھی پی گیا اور اس جھوٹ کو بھی کہ میں 'اکیلا' تھا کیونکہ میرے ساتھ تو تم کراماً کاتبین کے دو ''سیٹ'' تھے اور اُنھیں جیسے یبوست مآب بھی! غرض میں نے اسے جواب دیا کیونکہ بہرحال میں چپ نہ رہ سکتا تھا۔

''میں نہ تو ''بابو صاحب، ہوں اور ''اکیلا''، آگے بڑھ کر، وہ جو ہاؤس بوٹ کھڑی ہے، وہاں چار نفر پڑے خراٹے لے رہے ہیں جن کو اگر یہ معلوم ہو جائے کہ میں نے اپنے آپ کو 'اکیلا' کہا یا اس الزام کو سنا بھی ہے تو ابھی تمہیں اور مجھے دونوں کو ''دست بدستِ دگرے'' کرنے کو طیار ہو جائیں گے۔ ہاں تم نے جو سیر کی دعوت دی ہے، سو یہ ممکن ہے کیونکہ یہاں پڑا ہوا بھی میں سیر ہی کر رہا تھا۔ اب خاک نہ سہی آبی سیر ہو جائے گی'' میں نے اپنے نزدیک انشاء کو بھی چین بلوادی تھی مگر معلوم یہ ہوا کہ پریاں اردو نہیں سمجھتیں۔

وہ حیرت سے اپنے نوکر کا منہ دیکھنے لگی۔ اور اس نے کشمیری میں اسے جو کچھ سمجھایا ہو مگر مجھے یہ دیکھ کر صدمہ ہوا کہ میری بذلہ سنجی اور ذہین ظرافت اکارت ہی گئی۔ وہ کم بخت خود ہی کچھ نہ سمجھا ہوگا۔ ترجمانی کیا خاک کر سکتا تھا! ایک ہی منٹ کے اندر میری کوفت کا یہ دوسرا موقعہ تھا۔

میں نے اٹھنے کے لئے حرکت تو کی مگر مجھے یہ خیال ستا رہا تھا کہ اگر وہ اردو نہیں سمجھتی تو میرا اُٹھنا بیکار ہے۔ ظاہر ہے کہ اس خیال کا پیدا ہونا میرے ذہن و تعقل کا تقاضا تھا، لیکن کوئی مجھے بتائے کہ ایسے وقت میں کہیں عقل کی سنی جاتی ہے؟ چنانچہ اس احساس کے باوجود میں اٹھ کھڑا ہوا اور وہ شکارا بھی حرکت میں آ کر کنارے لگ گیا اب تم ہی کہو کہ کیا میں اس میں سوار نہ ہو جاتا؟ میں نے شکارے پر پہنچ کر تسلیم عرض کی، وہ منہ پھیر کر بیٹھ گئی۔ کہیئے سبحان اللہ کوئی کہے یا نہ کہے، مگر باور کرو

میں نے اس جملے کی کئی بار تکرار کی اور بلند آواز سے۔ خیر اس کے آدمی نے اس کی بغل میں تکیئے وغیرہ درست کردیئے اور میں بیٹھ گیا اس جملے کی کئی بار تکرار کی اور بلند آواز

''آپ کے مزاج اچھے ہیں۔'' میں نے بیٹھتے بیٹھتے کہا۔

''رمضان جو.........'' اس نے جو کچھ کہا کشمیری میں کہا۔

''جناب آپ پنجابی بولتے ہیں؟'' رمضان جو نے مجھ سے دریافت کیا میں سیدھی سادی پنجابی سمجھ ضرور لیتا ہوں لیکن بولنے کی کوشش کبھی نہ کی تھی۔ مگر یہ دیکھ کر کہ ایک موقع ہاتھ آتا ہے، میں اقرار کرلیا لیکن معلوم یہ ہوا کہ میں جتنی پنجابی بول سکتا تھا، وہ اتنی ہی ہندوستانی سمجھ سکتی تھی۔ تاہم میرے لئے اپنی زبان کو بدل دینا اور ایسے الفاظ میں گفتگو کرنا، جن کو وہ سمجھ سکتی دشوار تھا، اس لئے میں نے پنجابی ہی کو ترجیح دی۔

میں شاید بتا چکا ہوں کہ اس کا نام زونو تھا۔ لیکن ضرورتاً لفظ ''جان'' کا بھی اضافہ کردیا گیا تھا۔ ایک ہفتہ قبل وہ اپنے وطن پرستان سے سری نگر کا پہلا سیزن کرنے آئی تھی۔ مقدرات کو دیکھئے کہ کیا کیا ستم ظریفیاں کی جاتی ہیں۔ وہ نقل مکان انھیں دونوں میں کرے جب میں اپنے مختصر پانچ ہفتے کشمیر کے طلسم مناظر میں بسر کرنا چاہوں اور میں اپنے دوگانہ کراماً کاتبین کو چکما بھی اس روز دوں جس روز وہ پرستان کی پری مجھے اڑا لے جانے کے ارادے سے نکلی ہو۔

اب تم بے چین ہوگے کہ میں تمہیں اس حیرتناک اور پرستانی ہستی کے متعلق کچھ تفصیلات سناؤں —— وہ تفصیلات جن کو میں کبھی بھلا نہیں سکتا۔ بہت خوب لیکن یہ میں تمہاری خاطر سے نہیں بلکہ اس لئے بیان کرتا ہوں کہ اس کے ذکر میں، اس کی یاد میں خود میرے لئے عیش ولذت پنہاں ہے —— اور ''ذکر عیش بہ از عیش'' تم نے سنا ہی ہوگا!''

میں نے اس کی آنکھوں کا ذکر تو کیا مگر شاید ان کی کیفیت آفرینی کا بیان نہیں کیا۔ اس کی ''سیر چشمانِ کشمیری'' جب مجھے دیکھتی تھیں تو میری روح کو ان کے اندر بے شمار روشنیاں منعکس ہوتی دکھائی دیتی تھیں، جن کے مقابلہ میں سورج اتنا خیرہ کن نہیں ہوسکتا اور ستارے اس قدر پر رمز نہیں ہوسکتے! اس کی پلکیں جب جھکتیں اور میری موجودگی میں بار بار جھپکتی تھیں، تو پپوٹے ان کا بار نہیں سنبھال سکتے اور وہ رخساروں پر آگرتی تھیں، اس کا بدن کشمیر کی خوبانیوں سے زیادہ گداز تھا اور

نمودِ سحر کی نازک گلابی رنگت کے مقابلے میں اس کا رنگ زیادہ دلکش رنگینی رکھتا تھا۔ اس کے عناب سے ہونٹ شبنم معطر کی طرح تازہ تھے۔ اس کے سیاہ بالوں کی ریشمیں رونق جذب سحر کی تصویر تھی۔ اس کی پیشانی زیادہ فراخ نہ تھی مگر لوحِ بلور کی طرح شفاف تھی۔ اس کے رخسار سیوتی کے پھولوں اور کشمیر کے سیبوں سے بنائے گئے تھے۔

مختصر یہ کہ اگر میں اس کی خوبیِ جمال کو بالتفصیل بیان کروں تو سننے والوں کو نیند آ جائے گی یا پھر وہ سری نگر پہنچ کر دم لیں گے۔ بہر حال زونو دنیا اور زندگی کے متعلق کیا کیا باتیں جانتی تھی، مجھے معلوم نہ ہو سکا لیکن میں اتنا اندازہ ضرور کر سکا کہ محبت کے موضوع پر اس کے خیالات میں گہرائی تھی اور شاید وہبی طور پر اسے اس جذبے کی اہمیت کا احساس بھی تھا۔ تین چار روز کی ملاقاتوں کے بعد خود میرے ایک سوال کے جواب میں اس نے مجھے بتایا اور اپنے سیدھے سادھے لفظوں میں بتایا کہ اس کو مجھ سے محبت ہو گئی ہے اور اب وہ اس محبت کو میری خاطر سے بھی تباہ نہ کرے گی! وہ جو کچھ بھی تھی، تقدیر سے تھی لیکن وہ محبت کی تجارت نہیں کر سکتی تھی اور محبت کو جسم سے کوئی علاقہ نہیں ہے، اس جواب کو سن کر میری مایوسی کی کوئی انتہا نہ ہونا چاہئے تھی لیکن یقین کروں کہ اس وقت میں ایسا محسوس کر رہا تھا کہ گویا اس کے مونہہ میں زبان نہیں بلکہ میرا دل ہے! مجھے اس وقت ایک خفیف سا احساس ناکامی تو ہوا لیکن تھوڑی دیر بعد میں اور زیادہ خوش اور مسرور تھا کیونکہ مجھے زونو کی محبت کا اندازہ ہو رہا تھا۔ موضوع محبت کے علاوہ اسے جس چیز کا علم تھا وہ سری نگر کا جغرافیہ تھا۔ کشمیر کی اس بے صدا موسیقی کی سنگت میں جب سوائے آسمانی قندیلوں کے سارے چراغ ٹھنڈے ہو جاتے ہیں اور اس کے ارغوانی سایوں میں جب سکون و خموشی کا دریا بہتا ہوتا ہے، ہم دونوں شکارے میں بیٹھے ہوئے نہروں، ندی اور ڈل کی سطح پر بہتے ہوتے تو وہ اگر کوئی کشمیری گیت گنگناتی نہ ہوتی۔ مجھے ہر ہر مکان و مقام کے متعلق کچھ نہ کچھ بتاتی جاتی تھی۔ اس کی صحبت کا اثر میرے اوپر ایک تو یہ ہوا کہ میں شکارے کی سواری کا حد درجہ شوقین ہو گیا اور میں حیران تھا کہ پھر میں اپنے پاؤں سے چلنا کیسے سیکھ گیا اور دوسرا اثر یہ ہوا کہ میں نے غالبؔ کے شعر سے سبق لینے کا خیال ہی ترک کر دیا۔

شاید میں نے یہ نہیں بتایا کہ دوسرے روز سے میں نے اپنے ایک پنجابی ملاقاتی سے پنجابی زبان سیکھنا شروع کر دیا تھا لیکن زونو خود بہتر معلّم ثابت ہوئی اور یہ بھی کہ مجھے تار دے کر گھر سے

روپیہ منگانا پڑا کیوں کہ ہمارے مشترکہ خزانے میں نہ تو اس قدر روپیہ تھا اور نہ مجھے اپنے خزانچی صاحب سے کچھ ملنے کی توقع ہوسکتی تھی!

ایک اور بات بھی باقی رہ گئی اور وہ یہ کہ پہلی ملاقات میں ہمارا شکارا جب ڈل کے سناٹے میں داخل ہوا اور پانچویں کا چاند ڈوبنے لگا تو میں نے ماحول کے پیدا کردہ اضطرار سے بے قابو ہوکر اس کا بوسہ لے لیا۔ اس کا جواب زونو کی طرف سے بھی ایک مدید بوسے کی شکل میں ملا لیکن مجھے بعد میں علم ہوا کہ میں اگر ایسا نہ کرتا تو زونو مجھے کبھی معاف نہ کرتی اور صرف وہی نہیں بلکہ میں بھی اپنے آپ کو معاف نہ کرتا کیونکہ اس بوسے نے تو میرے اندر شوق کا وہ شعلہ بھڑکا دیا جسے ڈل کا تمام پانی بھی نہ بجھا سکتا تھا، اس کے بعد ہر روز جب میں اس کے پاس جاتا تو محسوس کرتا کہ اس کی ہنسی زیادہ شیریں، اس کا تبسم زیادہ دلنشیں ہوگیا ہے۔

کہانی کا باقی حصہ تقریباً ہر فسانے میں پڑھا جاسکتا ہے مجھ سے پہلے اسے کسی کے ساتھ محبت نہ ہوئی تھی۔ اپنی عمر رفتہ کو وہ ضائع شدہ سمجھتی تھی مگر باقی عمر کے صحیح مصرف کے خیال سے خوش تھی۔ ہم دونوں پاس ہوں یا دور اس کی محبت میں فرق نہیں آسکتا۔ ہم دونوں انتہائی سرور میں تھے! آخر زونو کو مجھ سے واقعی محبت تھی۔

میں تمہارے ہونٹوں پر اب یہ سوال لرزتا دیکھ رہا ہوں کہ زونو ہے کہاں؟

غلط فہمی میں نہ پڑو، میں نے اسے براہ راست گھر نہیں پہنچا دیا ہے۔ میری اس کی ملاقات ایک ہفتہ پرانی تھی کہ کوئی راجہ صاحب وارد ہوگئے اور ایک طے شدہ بات کی طرح ان کو زونو سے محبت بھی ہوگئی اور ایک امر واقعہ کی طرح انھوں نے اس کو محل میں بھی ڈال لیا۔

اب میں زونو کے قول یا اصول کی تصدیق کرسکتا ہوں کیونکہ اس کے دل میں اگر راجہ صاحب کا ذرا سا خیال بھی ہوتا۔ اس نے راجہ صاحب کو کچھ بھی اہمیت دی ہوتی، تو وہ ان کی بڑی رانی نینا بھی قبول نہ کرتی۔ بہر حال میں اب دوبارہ سری نگر جاؤں گا۔ یہ زونو کا حکم ہے۔

مزدور فلسفی

ل - احمد اکبر آبادی

بینک کی نوکری پھر سال تمام کا چٹھا، کھوکھلے ہندسوں کا جوڑ باقی دلچسپ مشغلہ تو ہو نہ سکتا تھا۔ سیتل گھوش بینک میں اکاؤنٹنٹ تھا۔ کروڑوں روپے، روپے کی صورت دیکھے بنا لے دے چکا اور پائی پائی کی بدہ بیٹھ گئی تو اس نے اطمینان کی سانس لی۔ بینک سے نکلا تو گھر جانے سے پہلے دماغ کو تازہ کرنے کے خیال سے اپالو بندر کی طرف ہواخوری کو نکل گیا جو بینک سے دور بھی نہیں تھا۔

سمندر کے کنارے پہنچ کر ہوا لگی تو دماغ کی تکان فرحت سے بدل گئی اور گھوش سمندر کی چنٹ پڑی نیلی چادر پر سنہری کرنوں اور بادلوں میں جو آنکھ مچولی ہو کر دھوپ چھانوں پھیلا رہی تھی اس کے تماشے میں دیر تک کھویا رہا۔ ہلکی ہلکی موجوں پر گھڑی میں رونق پھیل جاتی اور گھڑی میں سایہ، ایک جگہ روشنی دوسری جگہ پرچھائیں، اتنا دلکش نظارہ تھا کہ ایک دفعہ تو بے حس آدمی بھی باحس بن جاتا ہے! پشتے کی منڈیر دیر تک بیٹھے رہنے کے بعد گھوش اٹھا اور سینکڑوں تفریح کرنے والوں کے ہجوم میں ساحل پر ٹہلنا چاہتا تھا کہ ایک چوبیس پچیس برس کی عمر کا سانولی صورت لڑکا اس کی طرف بڑھا اور کہا:

''بوٹ پالش سیٹھ!''

''نہیں!''

''وہ ''بوٹ پالش'' گھوش کا انکار سن کر بے پروانہ مسکراتا ہوا بڑھ گیا، لیکن وہ مسکراہٹ گھوش کے دل میں جا ڈوبی۔ گھوش کو کچھ ایسا محسوس ہوا کہ لمبوترے اور شانت چہرے پر مسکراہٹ کا کھیل کسی طوفان کی رمز ہے، سکھڑ سانولے نقشے پر یہ مسکراہٹ گہرے احساس کی غمازی کر رہی ہے! یہ محسوس کر کے گھوش پلٹا اور وہاں پہنچا جہاں وہ ''بوٹ پالش'' ایک خریدار کے جوتے کو صاف کرنے لگا تھا۔

اس دفعہ گھوش نے اسے جائزہ لینے والی نظر سے دیکھا۔ اس کے کپڑے تو کثیف تھے لیکن چہرے مہرے پر تہذیب کی مہر لگی محسوس ہوتی تھی۔ سر کے بال سیاہ اور گھنے تھے، ناک کسی قدر بھاری اور نتھنے چوڑے تھے، گھنے ابروؤں کے نیچے سیاہ پتلیاں زخم خوردہ نگاہوں کا مسکن معلوم ہوتی تھیں، ایسی نگاہیں جو انسان سے امید رکھنا چھوڑ چکی ہوں، ایک ایسے آدمی کی نگاہیں جو زندگی کا راز سمجھ چکا ہو، جسے کوئی مغالطہ نہ رہ گیا ہو، زندگی سے نبرد آزما ہو!

اس ''بوٹ پالش'' کا سنجیدہ انداز گھوش کے لئے مقناطیس ثابت ہوا، اور اس نے چپکے سے اپنے جوتے اس کے سامنے اتار دیئے۔ اور وہ گردن جھکائے گھوش کے جوتے بھی پالش کرنے لگا۔ جوتے پہننے میں گھوش نے اس کا وطن معلوم کرنا چاہا تو اس نے جواب دیا۔

''کیا ملے گا آپ کو میرا وطن پوچھ کر؟ میں دکھ نگر کا باشندہ ہوں!''

''تم کون ہو؟''

''ایک بوٹ پالش—'' وہ پالش کی ڈبیا اور برش وغیرہ اپنے تھیلے میں ڈالنے لگا تو گھوش نے پوچھا:

''تمہارے تھیلے میں یہ کون سی کتاب ہے؟''

''یونہی سی ایک کتاب ہے!''

''ذرا دکھاؤ تو!''

اس نے بڑی بیدلی سے ایک پرانی پھٹی ٹوٹی کتاب تھیلے میں سے نکال کر گھوش کے ہاتھ

میں دیدی جورو سو کی مشہور تصنیف تھی۔ گھوش کہنے لگا:

''جبھی تو میں حیران ہو رہا تھا کہ تم اصلی بوٹ پالش نہیں ہو!''

''تو کچھ نقلی بھی نہیں ہوں۔ کسی سے بری پالش نہیں کرتا!''

''تم انگریزی پڑھے ہو؟ کہاں تک تعلیم ہے تمہاری؟''

''آج کل انگریزی پڑھا ہونا تعجب کی بات تو نہیں ہے جب کہ روزی کمانے کا ذریعہ ہی انگریزی تعلیم کو بنا لیا گیا ہے۔ اس بوٹ پالش کے ذہین جواب مختصر مگر جامع تھے! گھوش کی دل چسپی بڑھ گئی تو کہا:

''کوئی حرج نہ سمجھو تو چلو چائے پی لیں!''

وہ مسکرا کر آمادہ ہو گیا، پاس ہی ریستوران تھا، وہاں پہنچ کر گھوش نے چائے منگوائی اور چائے پیتے میں اس کا نام پوچھا تو اس نے کہا:

''رائے، جے، این رائے!''

میں سمجھ رہا تھا کہ تم بنگالی ہو، ہر چند تم نے ڈھنگ ایسا بنایا ہے کہ شناخت مشکل ہے۔ میں بھی بنگالی ہوں!''

کوئی آدمی کہاں پیدا ہوا، کس کے گھر میں پیدا ہوا، محض اتفاق کی بات ہے۔''

''رائے بابو تعلیم کہاں تک ہے؟''

''بابو وابو تو میں ہوں نہیں، خالی ایک بوٹ پالش ہوں اور میری تعلیم مصیبت کے اسکول اور تظلم کی یونیورسٹی میں ہوئی ہے!''

''خیر مگر پیشے کا انتخاب تعلیم کی مناسبت سے کرتے ——''

''ہات پانوں کی محنت کا نام پیشہ ہے مگر خرابی یہ ہے کہ ہمارے دیش میں جو تعلیم دیجاتی ہے وہ یہی بات نہیں سکھاتی! میرے خیال میں تو اس تعصب کو ختم کرنے کے لئے آدمی کو وہی پیشہ اختیار کرنا چاہئے جسے ذلیل سمجھنا اسے سکھایا گیا ہے! جن لوگوں کو معاش کی طرف سے بے پرواہی ہے، میں تو کہوں گا کہ ان کو بھی محنت کرنے کا شرف حاصل کرنا چاہئے! آدمی جتنا گرا ہوا پیشہ اختیار کرے گا اتنا ہی اونچا انسان بن جائے گا!''

''ٹھیک ہے، لیکن آدمی معزز پیشہ ہی کیوں نہ اختیار کرے؟''

''معزز پیشے کی تلاش میں بہت دھکے کھا چکا ہوں۔ یہ ذلیل پیشہ بھیک مانگنے کی ذلت سے تو بچا لیتا ہے!''

اندھیرا ہو چلا تھا اور ریستوران میں خریداروں کی تعداد بڑھنے لگی تو رائے کو وہاں بیٹھے رہنا کچھ اچھا معلوم نہ ہوا اور بے آرامی سی محسوس کر کے کھڑا ہو گیا۔ گھوش کو پہلے اس کی شخصیت نے اور پھر اس کے فلسفہ زندگی نے الجھا سا لیا تھا۔ گھوش نے خواہش کی کہ وہ رائے کے ساتھ اس کی جائے قیام تک جائے۔ رائے اس پر مسکرا دیا اور کہنے لگا۔

''آپ کا بہت شکریہ، مگر میری ذات میں دل چسپی لینے سے آپ کا وقت ہی ضائع ہوگا!''

گھوش نے ایک جاتی ہوئی ٹیکسی رکوائی مگر رائے ٹیکسی میں سوار ہوتے ہچکچایا گھوش نے اس کا بازو تھام کر اندر کیا اور جب دونوں بیٹھ لئے تو رائے نے دادر جانے کو کہا۔ راستہ خموشی میں کٹا کیونکہ گھوش اس سے بہت سی باتیں ایک دم سے پوچھ لینا چاہتا تھا۔ اس لئے ابتدا کرنے میں الجھ رہا تھا اور رائے اسے زیادہ سے زیادہ ایک متجسس آدمی سمجھ کر بات کرنے کی ضرورت نہ سمجھتا تھا۔

ٹیکسی دادر پہنچی تو رائے نے ہند ماتا سنیما کے قریب رکوائی اور اتر کر جب گھوش نے کرایہ ادا کر دیا تو وہ اسے ایک گلی میں لے گیا اور پھر ایک پرانی چال کی تیسری منزل پر پہنچ کر رائے نے ایک کمرے کا تالا کھولا۔ کمرے میں ایک اسٹریچر اور لکڑی کی پیٹی نے ساری جگہ گھیر لی تھی۔ یہ پیٹی میز کا بھی کام دیتی تھی، کھڑکی میں چند پھٹی پرانی کتابیں رکھی تھیں اور دیواروں پر چند تصویریں ٹنگی تھیں ایک تصویر میں رائے تنہا اور دوسری میں بیوی کے ساتھ تھا۔ تیسری تصویر مہا تما بودھ کی دھیان یا استغراق کی حالت کی تھی، اور چوتھی تصویر حضرت عیسیٰ کے سولی چڑھنے کی تھی جن کے سامنے ایک ننگے بدن عورت جھکی ہوئی تھی اور بہت سے راہب اور ننیں کھڑے دیکھ رہے تھے۔

کوٹھری میں داخل ہو کر گھوش کو سکون اور تنہائی کا احساس ہوا اور وہ سوچنے لگا کہ یہ نوجوان ''بوٹ پالش'' شاید لڑکپن سے نکل کر سیدھا کھولت کی منزل میں جا پہنچا ہے، قبل از وقت ہی ہر چیز کو دیکھا، پرکھا اور کھوٹا پایا ہے۔ رائے نے اصرار کر کے گھوش کو اسٹریچر پر بٹھایا اور خود اس پیٹی پر بیٹھ گیا۔

''آپ کو میرے متعلق تجسس ہے! اس کی تسکین کے لئے بتاتا ہوں کہ مرشد آباد میں پیدا

ہوا، میٹرک پاس کرتے ہی باپ نے شادی کردی اور تھوڑی سی زمین تھی، اسے گروکر کے بیٹے کے بیاہ کا ارمان نکالا۔ دو برس نہیں ہوئے تھے کہ خود رخصت ہوگئے۔ آمدنی کے ذریعے موقوف ہونا ہی تھے۔ میں کلکتے میں ٹیوشن کرتا اور کالج میں پڑھتا تھا۔ بیوی کو میکے میں رہنا پڑا۔ وہاں کوئی الفتامل گیا اور اسے لے کر چمپت ہوگیا۔ سوچتا ہوں یہ بھی ہونا ہی تھا مفلس اور بے سہارا آدمی کا کون دوست بننا پسند کرے گا کالج کے دو چار ساتھی تھے انھوں نے بھی کنارہ کرلیا۔ جوں توں بے اے کا امتحان دے سکا۔ نوکری کے لئے ہر دروازہ جھانکا۔ ٹیوشن بھی ختم ہوگئی تو نیا تجربہ کرنے کے خیال سے بمبئی آ گیا۔ جو کچھ گزر گیا اس کا مجھ پر نہ اثر ہے نہ کوئی ملال! یہ ہے میری تاریخ زندگی!'' رائے نے کچھ ایسے انداز اور لہجے میں کہا جیسے اپنا نہیں، کسی اور آدمی کا ذکر کر رہا تھا۔

گھوش نے اس کے ان چند فقروں میں اس کی زندگی کا طریقہ اور فلسفہ سمجھا تو سوال کیا ''ا وراس حال میں خوش بھی ہو؟''

''انسان کی خوشی تو ایک علمی بحث ہے۔ فلسفیوں اور گیانیوں کے کرنے کی بات! خوشی کی تعریف میں مجھے کسی کا یہ قول بہت بھایا کہ خوش آئسس دیوی کی نقاب کی سی ایک چیز ہے جسے (اٹھانے کے لئے) فانی انسان ہاتھ بھی نہیں لگا سکتا!''

گھوش نے اپنی جگہ جو رائے قائم کی وہ کچھ اس قسم کی تھی کہ مزدور فلسفی اپنے اس حال پر مطمئن تو نہیں لیکن زندگی کی حرکت کا معتقد ہے، زندگی کی حیرت آفرینیوں پر مطمئن ہے! ہمہ وقت ہے جانے اور رنگ بدلنے والی زندگی اس کے دل میں بھی ولولے ابھارتی ہے۔ وہ خود الگ رہ کر راستہ و بازار میں خلقت کے ہجوم کا تنوع، ساحل پر موجوں کی بے تابی، جو سما میں بادلوں کے دل اور پرندوں کی پرواز، فرش زمین پر ریلوں اور موٹروں کی دوڑ، ان سب چیزوں کو انسانی زندگی کے ساتھ وابستہ دیکھتا اور جو کچھ دیکھتا ہے اس سے لطف اٹھانا سیکھ گیا ہے! اور ہر چند وہ زندگی کے محرک کے اندر کی موسیقی سے گوش آشنا ہو چکا لیکن آہ و اکراہ کی حرکت کا بھی راز دار بن سکا ہے! گھوش نے یہ فیصلہ بھی کرلیا کہ رائے کا ایک ذلیل پیشہ اختیار کرنے کا سب کچھ بھی ہوا ہو مگر اب وہ اپنی موجودہ حالت ہی کو پسند کرتا ہے! اور اس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ اس زندگی میں پامال انسانیت سے بھائی چارہ ملتا ہے۔ یہ خیال کرنے کے بعد گھوش نے اس سے ایک اور سوال کیا۔

''خدا پر عقیدہ رکھتے ہو؟''

''نہیں یہی سبب ہے کہ بمبئی میں ہوں ورنہ کسی گانوں میں کھیت مزدور ہوتا اور بھگوان کو یاد کرتا رہتا، ناستک کو شہری زندگی ہی پسند ہو سکتی ہے، جہاں خوش باشی، لطف ولذت، حسن وشباب سب کچھ موجود ہوتا اور پڑھنے کو کتابیں بھی مل جاتی ہیں اور اسے انھیں چیزوں سے دلچسپی ہوتی ہے کیونکہ وہ زدگی سے محبت کرتا ہے! جو لوگ زندگی کی کشاکش سے تھک یا ہار جاتے ہیں وہ خدا کے نام میں پناہ پاتے ہیں۔ یعنی زندگی کے معرکے سے فرار کا نام خدا ہے!'' رائےؔ نے پرسکون لہجے میں دھیرے دھیرے کہا۔

''لیکن ہر آدمی کی زندگی ایک فلسفے کے مطابق گزرتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہر آدمی اپنے عقیدے کے سہارے جیتا ہے!''

ٹھیک ہے، مگر کون سا عقیدہ حقیقت ہے؟'' یہ کہہ کر اس نے کھڑکی کے ریل پر سے ایک کتاب اٹھالی جو والٹ دھٹمین کی نثر کا مجموعہ تھا اور ان کے دیباچے کی یہ سطریں پڑھ کر سنائیں۔

''میں سورج سے، زمین سے حیوانوں سے (سب سے) محبت کرتا ہوں۔ اپنی آمدنی اور محنت دوسروں کے لئے وقف سمجھتا ہوں۔ ظالموں سے نفرت کرتا، احمقوں، سنکیوں سے ہمدردی کرتا اور سب سے رواداری برتتا ہوں...... کسی انسان کے سامنے نہ جھکو! نوجوانوں اور جہلا سے میل ملاپ رکھو! اسکول میں جو کچھ سیکھا اور لٹریچر نے جو کچھ سکھایا، اسے پھر سے جانچو اور اس کے اس حصے کو خارج کردو جو تمہاری روح کی توہین کرتا نظر آئے!''

گھوشؔ نے ان فقروں کو بڑے غور سے سنا اور سمجھا کہ رائے کا مذہب انسانیت ہی ہو سکتا ہے۔ رات ہونے لگی تھی۔ گھوش اس سے رخصت لے کر روانہ ہوا اور وہ نیچے گلی تک اسے چھوڑنے آیا اور بولا: ''آپ کو اندازہ تو ہوا ہوگا کہ میں عیش ومسرت کی دنیا کے لئے ایک پہیلی اور دکھ درد کی پامال دنیا کی زبان ہوں! اس لئے کسی کا میرے لئے دل دکھانا بیکار ہوگا اب تو آپ کی جستجو کی تسکین ہوگئی؟''

''گھوش اس ''بوٹ پالش'' کو اس خیال پر مستحکم چھوڑ کر رخصت ہو آیا اور وہ زندگی کو سمجھ چکا۔ اور اسی کے مطابق جی بھی رہا ہے۔ جن کے ساتھ زندگی نے فریب کیا اور بے رحمی برتی ہے۔

یہ ''بوٹ پالش'' ان کے لئے دل دکھاتا ہے وہ زندگی کی لذتوں اور محرومیوں کا تجربہ کر چکا ہے۔ اس لئے زندگی کے کسی پہلو پر حرف رکھنے کو حماقت سمجھتا ہے! لیکن گھوش کا اپنا خیال یہ تھا کہ اس ''بوٹ پالش'' کی زندگی یا اس کا طریقہ زندگی دوسروں کے لئے نمونہ نہیں بن سکتا، سب ہی اگر اس کے خیال کے ہو جائیں تو دنیا کا حال کیا ہوگا؟ بہرحال، یہ شخص یا اس کے عقائد پرانے خیال کی دنیا کے لئے ایک چیلنج ضرور ہیں، ایک صدمہ یا دھچکا ہے، گھوش اپنی اس جستجو پر بھی خوش تھا کہ وہ اس ''بوٹ پالش'' کی روح کو سمجھنے کے قابل ہو سکا۔

شاید گھوش کا یہی خیال اسے ایک روز پھر اس کوٹھری میں لے پہنچا کھٹ کھٹایا تو رائے نے دروازہ کھولا۔ سلام اور مزاج پرسی ہوئی۔ اندر قدم رکھا تو وہاں ایک دبلا پتلا آدمی کھڑا تھا۔ بدہیئت، لانبا قد، خاکی کوٹ اور میلا پاجامہ اور سر پر ایک میلی سی بے پھندنے کی ترکی ٹوپی جس پر بے گنتی آڑی ترچھی لکیروں میں ایک خاص قسم کی کشش محسوس ہوتی تھی۔ آنکھیں معمولی تھیں مگر انمیں سے نکلنے والی نگاہیں ایسی دکھائی دیتی کہ جس پر پڑیں گی گہری اتر جائیں گی۔ اور اگر اس کی موچھیں چھدری ہوتیں تو بدصورتی نامکمل رہتی۔

رائے نے گھوش سے اس کو متعارف کراتے ہوئے کہا۔

''یہ میرے دوست فقیر محمدؐ ہیں۔ ملک ملک گھومے اور چھے زبانیں بول لیتے ہیں۔ آج کل وکٹوریہ یا (منن) چلاتے ہیں۔

گھوش اسٹریچر پر بیٹھ گیا تو فقیر محمدؐ بولا۔

''پر تم نے سیٹھ کی پہچان تو کرائی نہیں!''

گھوش نے خود ہی اپنا نام نشان بتادیا اور ''بوٹ پالش'' سے ملاقات کا قصہ بھی سنایا۔ رائے، گھوش سے اجازت لے کر نیچے پانی کے نل پر نہانے چلا گیا۔ گھوش کو خیال ہوا کہ ''بوٹ پالش'' کے اس ''وکٹوریہ چلانے والے'' دوست کا فلسفہ زندگی بھی دلچسپ ہوگا۔ جیب میں سے سگریٹ کیس نکال کر اس کی طرف بڑھایا تو اس نے ''مہربانی'' کہہ کر انکار کر دیا۔ گھوش نے پوچھا:

''پیتے ہی نہیں؟''

''نہیں سیٹھ!''

''مسٹر فقیر محمد!'' آپ نے اتنی دنیا گھومی اور چھ زبانیں بھی بول لیتے ہیں تو کوئی بہتر پیشہ اختیار کرتے!''

''سیٹھ، مسلمانوں کے پیغمبر صاحب نے، جنہیں دنیا کم سے کم بڑا آدمی تو ضرور مانتی ہے، پیشہ وروں کو اللہ کا دوست یا پیار کہا ہے! یہ دنیا چاہے تو مجھے پاگل سمجھ لے۔ فرق کیا پڑے گا؟

''مگر آدمی کے علم، تجربے اور تہذیبی معیار کا بھی تو کچھ تقاضا ہوتا ہے؟''

''تعلیم کا سیٹھ یہ مقصد کہ اسے پیسہ کمانے کا ذریعہ بنایا جائے، میری جان میں تو علم کی ذلت کرنا ہے تعلیم کا مقصود تو انسان کو بہتر انسان بنانا ہے اور پرانے سماج میں یہ ہی سمجھا بھی جاتا تھا کہ تعلیم پا کر آدمی اپنی حیوانیت کو سر نہ اٹھانے دے اور خلق اللہ کی بھلائی کو مقدم رکھے۔''

گھوش نے گاندھی جی کا ذکر چھیڑ کر اس کی رائے پوچھی کہ:

''آپ کے دھیان میں گاندھی جی کی تحریک صحیح ہے یا غلط؟''

''گاندھی جی کو بڑا اور اونچا انسان ماننے سے انکار کرنے والے بہت ہوں گے، لیکن ہوس پروری اور ریا کاری کے اس دور میں حق کا پیغام دینے والا آ سکتا ہے۔ یہ بات گاندھی جی کے دم سے ثابت ہے، جس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔''

''پھر آپ کھدر کا استعمال کیوں نہیں کرتے؟''

''سب کھدر پہننے لگے سیٹھ تو اتنا آئے گا کہاں سے اور ان ملوں کارخانوں کا کیا حشر ہوگا؟ بند کر دینا پڑیں گے اور کروڑوں روپے کی مشینیں ردی لوہا بن کر سڑا کریں گی۔ مشین کے زمانے میں چرخہ چلانا گاندھی جی کیلئے تو ٹھیک ہے، پر میرے آپ کے لئے ٹھیک نہ ہوگا۔ میرا خیال تو یہ ہے۔''

''لیکن تم انھیں حق کے پیغام پر سمجھتے ہو تو ان کی بات پر تمہیں عقیدہ ہونا چاہئے۔''

''ہاں سیٹھ! مگر آدمی ہی سمجھ کے، اور تھوڑی بہت سنک ہر آدمی میں ہوتی ہے۔ آپ فارسی تو جانتے نہ ہوں گے۔ شیخ سعدیؔ کہہ گئے ہیں کہ ''ہر کسی بخیال خویش خبطے دارد، یعنی ہر ایک میں کچھ سنک ہوتی ہے۔ اسے گاندھی جی کی سنک سمجھنا چاہئے کہ وہ دنیا کو یا، ہندوستان کو زمانے سے پیچھے لے جانا چاہتے ہیں مگر میں ان کی اس سنک وک بے معنی نہیں سمجھتا۔ کھدر پہن کر آدمی سے گھمنڈ تو دور ہو جاتا ہے اور وہ اپنے کو دوسروں سے، تم نہیں بلکہ عوام کا خادم سمجھنے لگتا ہے۔ اس کے علاوہ

گاندھی جی جو کچھ کہتے بتاتے ہیں، سچ اور اہنسا کا جو سبق دیتے ہیں، اس پر سب کو چلنا چاہئے۔"

"ایک بات اور بتاؤ مسٹر فقیر محمد کہ تم خدا کا وجود مانتے ہو یا نہیں؟

"سیٹھ! میں ان لوگوں میں سے تو نہیں ہوں جو یہ مانتے ہیں کہ خدا عرش پر بیٹھا ہے، لوح محفوظ اس کے سامنے اور قلم ہاتھ میں ہے اور چوبیس گھنٹے تقدیریں بنانا بگاڑتا رہتا ہے۔"

"مگر خدا کو مان کر یہ لازم ہو جاتا ہے کہ اسے قادر مطلق ہی مانا جائے۔"

"تو سیٹھ! خدا ایسا بھی نہیں ہوسکتا کہ میں نے دعا مانگی تو کسی سے مجھے دلا دیا اور کسی اور نے مانگی تو مجھ سے اسے دلا دیا۔ اس لئے کہ دنیا زیادہ تو روپے کے لئے ہی دعا مانگتی ہے اور عرش پر ٹکسال کا ذکر کسی کتاب نے نہیں کیا ہے، اس لئے وہ اگر دے سکتا ہے تو اسی طرح کہ ایک سے دوسرے کو دلا دے۔ اب آپ ہی سمجھو سیٹھ قادر مطلق کے معنے کیا ہوئے؟ اور خدا اگر چھپی کر ہی دینا چاہتا ہے تو یہ کام خدا کا نہیں ہوسکتا۔ میرے نزدیک تو جو میں نہیں ہوں وہ خدا ہے۔"

"یہ اور پوچھنا چاہتا ہوں مسٹر فقیر محمد کہ کبھی آپ کو کسی عورت سے بھی محبت ہوئی؟"

"نہیں، سیٹھ میں یہ مانتا ہوں کہ عورت کی محبت زندگی کو چٹ پٹا تو بنا دیتی ہے، زندگی میں ایک طرح کا سرور شامل کر دیتی ہے، مگر آدمی سے صحیح فیصلہ کرنے کی قوت بھی چھین لیتی ہے، اس لئے میں عورت سے بہت گھبراتا ہوں۔"

"ماں کی محبت سے بھی؟ وہ بھی تو عورت ہے؟"

"یہ سیٹھ آپ نے ذرا بینڈا سوال کر دیا۔ میں اس مرد اور عورت کو اپنا حقیقی باپ اور ماں نہیں مانتا جس کی طجانے کی جستجو میری ہستی کا موجب بنی بلکہ میرے ماں باپ تو وہ "اتفاق" ہے جس نے ان دونوں کو ایک جگہ کر دیا۔

"مسٹر فقیر محمد! آپ کے خیالات، واقعی نرالے ہیں اور شاید اس زمانے کے ہیں، جب انسان اور حیوان میں معمولی سا ہی فرق تھا۔"

"یہ تو ٹھیک ہے سیٹھ کہ پچھلی دو صدیوں میں سائنس کی ترقی نے انسانی سماج کے مادّی معتقدات کا پیمانہ بدل دیا ہے، مگر اس تہذیب و ترقی نے بھی انسان کے سیاسی عقیدوں کو نئے سانچوں میں ڈھالنے کا کام نہیں کیا۔ سیاسی عقیدوں کی بنیادیں وہی پرانی ہیں اور حقیقت تو سیٹھ یہی

ڈراؤنی چیز۔ اس لئے انسان کو حیوان ہی سمجھا جائے تو برائی بھی کیا ہے؟"

"یعنی تمہارے خیال میں تہذیب ترقی لغو و مہمل چیز ہے؟"

"میرے خیال میں سیٹھ جب فطری کلچر بوڑھا ہونے لگتا ہے تو "نئی تہذیب" نام پاتا ہے۔ ہر چند کہ اس حقیقی کلچر کو پھر سے نوجوان بنا دینا بھی انسان ہی کا کام ہے۔"

"اس سے مسٹر فقیر محمد یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ آپ کیلئے دنیا میں کوئی چیز مقدس و محترم نہیں ہے؟"

"سیٹھ! عزت اور احترام تو میرے دل میں بس اس "بوٹ پالش" کا ہے۔"

گھوش کو آئے دیر ہوگئی تھی، جانے کا خیال کر رہا تھا کہ رائے غسل کر کے آ گیا اور جب وہ ان سے رخصت ہونے لگا تو رائے پھر اسی عجیب و غریب انداز سے مسکرایا۔ گھوش سارے راستے سوچتا گیا کہ یہ "وکٹوریہ ہانکنے والا" ایک ایسا بت شکن ہے جس کی نظر میں کوئی مجسمہ محفوظ نہ رہنا چاہئے۔ وہ ہر روایت کے بت کو ریزہ ریزہ کر دینا چاہے گا۔ زندگی نے اس کے منہ میں نہایت تلخ مزا چھوڑا ہے، اسی لئے اس کے دل میں انسانی ہمدردی کی پھٹک باقی نہیں رہی جو زندگی کو خوشگوار بنا دینے والی شے ہے۔ فقیر محمد ہاتھ پانوں کی محنت کو خدا سمجھتا اور اس پر گھمنڈ رکھتا ہے۔"

یہ دو فلسفی مزدور اکثر گھوش کے خیالوں میں آتے رہتے ہیں اور وہ ان دو متضاد فطرت کے آدمیوں پر غور کرتا رہتا ہے۔ ایک دوسرے کی ضد ہے لیکن دونوں کے خیالات میں یک رنگی ہے۔ رائے گہرا ہے، جسے زندگی کی راحت و مسرت نہیں ملی مگر وہ خوش باشی کا عاشق ہے۔ ایک ہی وقت میں محتاط بھی ہے اور جری بھی۔ اور یہ فقیر محمد محض خیال پرست معلوم ہوتا ہے مگر اس کی زندگی کی ایک ایک گھڑی بے داغ گذری ہے۔ وہ ایک ہی وقت میں آوارہ بھی ہے اور جری بھی "بوٹ پالش" زندگی کے معرکے میں مبتلا رہتا ہے۔ "وکٹوریہ والا" موقع باز ہے۔ اس کو کوئی اخلاقی یا جسمانی خطرہ ڈرا نہیں سکتا اور اس کے لئے آوارہ رہنا زندگی کا جوہر اور عطر ہے۔ اس کے لئے زندگی در حقیقت شدید قسم کی حزنیہ ہے اور وہ واقعتاً مغموم ہے اور اس کے لئے زندگی ایک بڑا مذاق ہے اور یہ اس سے مذاق کر رہا ہے۔"

انتخاب از سفر نامۂ مصر وشام وروم

علامہ شبلی نعمانی

(۱۸۵۷ء - ۱۹۱۴ء)

۲۳ر مئی صبح کے وقت قسطنطنیہ پہنچے۔ جہاز نے لنگر کیا۔ یہ ایسا وقت تھا کہ مجھ کو منزل مقصود پر پہنچنے کی نہایت خوشی ہونی چاہئے تھی لیکن قلیوں اور ملاحوں کے ہنگامے اور شوروغل میں میرے حواس جاتے رہے۔ ملاحوں نے تمام جہاز گھیر لیا۔ ان کے شوروغل اور کشاکش سے ایک عجیب ہنگامہ برپا تھا۔ میں نے پہلے سے کچھ طے نہیں کیا تھا اور نہ کرسکتا تھا کہ جہاز سے اتر کر کہاں جاؤں۔ ہوٹل میرے مناسب حال نہ تھا (اس کی وجہ آگے چل کر معلوم ہوگی) اور سراؤں پر ناواقفیت کی وجہ سے اطمینان نہیں ہوسکتا تھا۔ سخت مصیبت یہ ہوئی کہ شامی احباب جن سے ہر قسم کی امداد کی توقع ہوسکتی تھی، ان کو کالج میں پہنچنے کی جلدی تھی۔ اس لئے وہ میرا انتظار نہ کر سکے۔ مجھ کو اکیلا پا کر ملاحوں اور قلیوں نے اور بھی دق کرنا شروع کیا۔ میرا اضطراب اس خیال سے اور بڑھتا جاتا تھا کہ جہاز پر زبان کی اجنبیت کی وجہ سے یہ دقت ہے تو شہر میں کیا حال ہوگا؟ اس لیت ولعل میں زیادہ دیر ہوتی جاتی تھی۔ اکثر مسافر جہاز سے اتر گئے اور اترتے جاتے تھے۔ آخر خانساماں کو اسباب سپرد کیا اور ا

س سے کہا کہ میں شہر کی سیر کر کے واپس آتا ہوں مقصد یہ تھا کہ پہلے شہر میں جا کر قیام کا کچھ انتظام کر آؤں، تب اسباب جہاز سے اُتاروں۔شام کے چند عربوں نے ایک کشتی کرایہ پر کی تھی۔ میں بھی ان کے ساتھ ہولیا۔ کنارہ پر تذکرہ کی پرس و جو تھی۔ میں نے انگریزی چٹھیاں دکھائیں لیکن وہ پاسپورٹ مانگتے تھے۔غرض بیزار وقت رہائی ہوئی۔ اب حیران تھا کہ کہاں جاؤں؟ ایک شامی عرب سے، جن کا نام عبدالفتاح تھا، کشتی میں تعارف ہوگیا تھا۔ میں نے ان سے اپنی پریشانی بیان کی اور کہا کہ آپ مجھ کو کوئی معقول طریقہ بتائیں۔ انہوں نے کہا کہ میری حالت بھی تمہارے قریب قریب ہے، اس لئے بہتر یہ ہے کہ ہم دونوں ساتھ رہیں۔ یہ طریقہ اگر چہ احتیاط کے خلاف تھا لیکن ناواقفیت اور اجنبیت زبان کی وجہ سے مجبوراً اختیار کرنا پڑا اور سچ پوچھئے تو یہی اتفاقی معیت میری تمام کامیابیوں کا دیباچہ تھی۔

یہاں مسافروں کے ٹھہرنے کے چند طریقے ہیں۔ سب سے زیادہ اطمینان اور آرام ہوٹلوں میں ہے لیکن اولاً تو ان کا کرایہ ایک پونڈ یعنی ۷/روپے روزانہ سے کم نہیں، دوسرے اکثر بلکہ قریباً تمام عمدہ ہوٹل یورپین آبادی میں ہیں جو استنبول سے دور ہے اور جامع مسجدیں کتب خانے، مدرسے مکاتب، جس قدر ہیں، سب استنبول میں ہیں۔

ہوٹل کے بعد خانات یعنی سرائیں ہیں لیکن یہ سرائیں ہندوستان سے کچھ نسبت نہیں رکھتیں۔ یہاں بڑی بڑی سراؤں میں جس قدر کمرے ہوتے ہیں۔عموماً وسیع اور پرفضا ہوتے ہیں۔ اوران میں ہر وقت نواڑ کا پلنگ۔ توشک، چادر، لحاف اور ضروری چیزیں مہیا رہتی ہیں۔ ایک ایک کمرے میں کئی کئی پلنگ ہوتے ہیں۔ اور فی پلنگ آٹھ دس آنہ کرایہ ہوتا ہے۔

تیسرا طریقہ کرایہ کے مکانات ہیں۔ یہ مکانات اکثر دومنزلے سہ منزلے ہوتے ہیں ہر درجے میں متعدد کمرے اور ہر کمرے میں میز کرسی، کوچ، لمپ، فرش۔ پلنگ توشک، لحاف تکیہ مہیا رہتا ہے کرایہ فی کمرہ دس روپے ماہوار سے بیس تیس تک ہوتا ہے ان مکانوں کے مالک یا اجارہ دار عموماً عیسائی ہیں وہ خود بھی انہیں مکانوں میں رہتے ہیں اور ان کی وجہ سے مسافروں کو بہت کچھ آرام ملتا ہے۔ اگر چہ جیسا میں نے ابھی بیان کیا کرایہ کا مکان لینا زیادہ آرام کا طریقہ تھا لیکن میں اور میرے شامی دوست دونوں اس طریقہ سے ناواقف تھے، اس لئے ایک خوان یعنی سرائے میں

جا کر ٹھہرے۔ اس انتظام کی طرف سے اطمینان ہوا تو جہاز پر جا کر اپنا اسباب اُٹھوا لایا۔ چھ سات دن تک ہم اس خان میں رہے۔ پھر باب عالی کے پاس ایک عمدہ مکان کرایہ پر لے لیا۔

خوش قسمتی سے شیخ عبدالفتاح، جن کے ساتھ میں نے زبردستی دوستی پیدا کی تھی، بڑی معزز خاندان کے آدمی نکلے۔ دمشق میں حجرت خالد نقشبندی ایک بزرگ گزرے ہیں، جن کے ساتھ یہاں کے لوگوں کو اس قدر عقیدت ہے کہ ان کا نام نہیں لیتے بلکہ حضرت کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ بزرگ ہمارے خاک ہندوستان کے تربیب یافتہ یعنی حضرت مرزا جان جانان دہلوی کے مرید تھے۔ شیخ عبدالفتاح انہی کے بھتیجے ہیں اور اس تعلق سے لوگ ان کی قدر و منزلت کرتے ہیں چونکہ قسطنطنیہ میں شامیوں کا ایک بڑا گروہ ہے، دو ہی چار روز میں شیخ عبدالفتاح کی اکثر لوگوں سے شناسائی ہوگئی اور ان کے ذریعہ سے مجھ کو بھی ان لوگوں سے تعارف ہوتا گیا۔

ایک دن شیخ علی ظبیان جن کے والد ایک مشہور صوفی ہیں۔ شیخ عبدالفتاح سے ملنے آئے ہیں۔ اس وقت موجود تھا اور اتفاق سے رسالہ اسکات المعتدی جو میری قدیم تصنیف ہے اور عربی زبان میں ہے۔ سامنے رکھا ہوا تھا، انہوں نے اٹھا کر دیکھا اور انہوں نے اس کے مصنف کی نسبت کہا تھا شکر اللہ مساعیہ شیخ علی ظبیان کو جب معلوم ہوا کہ وہ رسالہ میری ہی تصنیف ہے تو اٹھ کر بڑی گرمجوشی سے ملے اور نہایت لطف و مہربانی سے پیش آئے۔ مجھ کو اسہات سے کہ میری ناچیز تصنیف یہاں تک پہنچی اور لوگوں نے اس کو نگاہ قبول سے دیکھا نہایت مسرت ہوئی اور سفر کی کسمپرسی میں اتنا ذریعہ تعارف بہت غنیمت معلوم ہوا۔ شیخ علی ظبیان نوجوان آدمی ہیں، فقہ کی تحصیل شیخ عبدالرحمٰن سے کی ہے جو مصنف روالمختار (مشہور بہ شامی) کے نواسے اور شاگرد تھے۔ اگرچہ ان کو اکثر علوم متداولہ میں دخل ہے لیکن ادب میں زیادہ مہارت ہے۔ ایک غیر منقوطہ قصیدہ سلطان کی مدح میں پیش کیا تھا جس پر ان کو صلہ و انعام بھی عطا ہوا۔ مدت سے درویش پاشا کے مہمان ہیں اور پاشائے موصوف ان کے ساتھ عزیزانہ برتاؤ رکھتے ہیں۔ مجھ سے ان کا تعلق روز بروز بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ باوجود بعد مسافت قریباً ہر روز میرے مکان پر تشریف لاتے اور کبھی کبھی تمام دن میرے پاس رہتے۔ شیخ عبدالفتاح چند روز کے بعد دمشق کو واپس چلے گئے۔ اس وقت تنہائی میں شاید مجھ کو تکلیف پہنچتی لیکن شیخ علی ظبیان کی غمگساریوں نے تمام تردوات دل سے دور کر دیئے۔

مکان جو ہم نے کرایہ پر لیا تھا۔ اگر چہ نہایت خوش فضا اور موزوں تھا لیکن چونکہ مکان کا مالک (عارضی) نہایت بدمعاملہ اور آوارہ مزاج تھا۔ چند روز کے بعد میں نے دوسرا مکان کرایہ پر لیا اور آخر تک وہیں رہا۔ یہاں مکان کی خوبی کے ساتھ بڑا آرام یہ تھا کہ مالک مکان ایک نیک مزاج عورت تھی۔ اگر چہ اس کا مذہب عیسائی تھا اور قوم کی اٹالین تھی، تاہم بقدر ضرورت عربی بول لیتی تھی اور مسلمانوں سے ایک خاص انس رکھتی تھی۔

کھانے پینے کے انتظام کی ہم کو کچھ ضرورت نہ تھی۔ ہوٹل اور دکانیں کثرت سے ہیں اور نہایت مرتبہ اور پرتکلف ہیں۔ بازار میں کھانا یہاں مطلق عیب نہیں۔ میں نے اکثر معزز عہدہ داروں کو ہوٹلوں میں کھاتے دیکھا۔ یہ ہوٹل عموماً عیسائیوں کے ہیں۔ مسلمانوں کی دکانیں بجز اس کے کہ میز کرسی وہاں بھی ہوتی ہیں۔ باقی اور باتوں میں ہندوستان کی دوکانوں سے مشابہ ہیں۔

قسطنطنیہ کی اجمالی تاریخ اور مختصر حالات

قبل اس کے کہ میں یہاں کے تفصیلی حالات جدا جدا عنوان سے بیان کروں، ضرور ہے کہ نہایت مختصر طور پر اس کی قدیم تاریخ اور اس کے ساتھ اس کی عام موجودہ حالت اجمال کے ساتھ بیان کروں اس شہر کی ابتدائی تاریخ (یعنی جب وہ بزنطاین کے نام سے پکارا جاتا تھا) نہایت قدیم ہے لیکن جس زمانے سے اس کا نام قسطنطنیہ ہے اس کو بھی کچھ کم عرصہ نہیں گزرا۔ ۳۲۶ء میں قسطنطنیہ اعظم نے اس کی بنیاد ڈالی اور اس وقت سے محمد فاتح کے زمانے تک وہ قیصران روم کا پایہ تخت رہا۔ انگریزی اور حال کے اسلامی جغرافیوں میں اس کے حالات نہایت تفصیل سے ملتے ہیں۔ قدیم اسلامی جغرافیوں میں بھی اس کا ذکر ہے لیکن ابن بطوطہ کے سوا مجھ کو کوئی اسلامی مصنف معلوم نہیں جس نے اس زمانے کے واقعات چشم دید لکھے ہوں۔ ابن بطوطہ نے ۷۲۵ھ میں اس شہر کو دیکھا۔ اس وقت یہاں عیسائی حکومت تھی۔ وہ لکھتا ہے کہ: ''یہ نہایت عظیم الشان شہر ہے اور ایک نہر کے حائل ہونے کی وجہ سے دو حصوں میں منقسم ہو گیا ہے۔ یہ حصہ جو نہر کے مشرقی کنارے پر ہے استنبول کہلاتا ہے اور قیصر روم اور ارکان دولت و امراُ اسی حصہ میں رہتے ہیں۔ دوسرا حصہ غلطہ کے نام سے موسوم ہے اس میں عموماً یورپ کے بڑے بڑے تاجر رہتے ہیں، جن کو قیصر بزور اپنی اطاعت میں رکھتا ہے۔'' ابن بطوطہ نے ان سوداگروں کی وسعت تجارت کی تعریف اور [illegible]

غچلے پن کی ہجو کی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ: ''جب میں اس شہر میں داخل ہوا تو چھوٹی چھوٹی کشتیوں کے علاوہ قریباً سو بڑے بڑے جہاز موجود تھے لیکن تمام بازار نہایت نجس اور کثیف ہے اور گرجے تک اس سے مستثنیٰ نہیں۔''

مسلمانوں نے قرن اول ہی میں اس کو تسخیر کی نگاہ سے دیکھا تھا۔ چنانچہ سب سے اول جس نے اس کی شہر پناہ کے آہنی دروازے پر تلوار ماری، وہ عبداللہ بن المطلب، خلیفہ ولید بن عبدالملک کا سپہ سالار تھا۔ اس کے بعد اور خلفاً وسلاطین نے بھی اس پر حملے کئے لیکن قیصران روم کا خاتمہ محمدؒ فاتح کے ہاتھ سے ہونے والا تھا، جس نے ۱۸۵۷ء میں اس عظیم الشان دارالسلطنت پر صلیب کے بجائے علم اسلام بلند کیا۔ اس حیرت انگیز معرکہ کی یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ چونکہ عیسائیوں نے بندرگاہ کا راستہ دریا کی طرف سے روک رکھا تھا۔ ترکوں نے باسفورس اور گولڈن ہارن کے درمیان جو سنگلاخ زمین ہے، اس پر پانچ میل تک لکڑی کے تختے بچھا دیئے اور جہازوں کو جن میں پہیئے لگائے تھے، اس پر چلا کر تمام فوجین گولڈن ہارن میں اتار دیں۔ اس وقت اس نامور فاتح کی عمر کل ۲۳ ربرس کی تھی۔ اس فتح کا مادۂ تاریخ 'بلدۃ طیبۃ' ہے۔

موجودہ حالت یہ ہے کہ آبنائے باسفورس کی شاخ جو دور تک چلی گئی ہے۔ یہ شہر اس کے دونوں کناروں پر آباد ہے اور اس وجہ سے اس کے دو حصے بن گئے ہیں۔ ایک حصہ استنبول کہلاتا ہے اور تمام بڑی بڑی مسجدیں۔ کتب خانے، سلاطین کے مقبرے اسی حصہ میں ہیں۔ مسلمانوں کی آبادی بھی کثرت سے یہیں ہے۔ دوسرا حصہ پیرہ سے شروع ہوتا ہے اور اس کے انتہائی جانب پر بشکطاش وغیرہ واقع ہیں، جہاں سطان کا ایوان شاہی اور قصر عدالت ہے۔ پیرہ کے دوسری طرف غلطہ ہے اور چونکہ تمام بڑے بڑے یورپین سوداگر اور سفرائے سلطنت یہیں سکونت رکھتے ہیں، اس کو یورپین آبادی کہنا زیادہ مناسب ہے۔

کہتے ہیں کہ دنیا کا کوئی شہر قسطنطنیہ کی برابر خوش منظر نہیں ہے اور حقیقت یہ ہے کہ منظروں کے لحاظ سے اس سے زیادہ خوشنما ہونا خیال میں بھی نہیں آتا۔ اسی لحاظ سے اس کی بندرگاہ کو انگریزی میں گولڈن ہارن یعنی شارخ زریں کہتے ہیں۔ کہیں کہیں عین دریا کے کنارے پر عمارتوں کا سلسلہ دور تک چلا گیا ہے۔ عمارتوں کے آگے جو زمین ہے، وہ نہایت ہموار اور صاف ہے۔ اس کی سطح

سمندر کی سطح کے بالکل برابر ہے اور وہاں عجیب خوشنما منظر پیدا ہو گیا ہے۔

شہر کی وسعت اور تمدن کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ خاص استنبول میں ۵۰۰ر جامع مسجدیں، ۱۷۱ر حمام، ۳۲۴ر سرائیں، ۱۶۴ر مدارس قدیم، ۵۰۰ر مدارس، جدید ۱۲ر کالج، ۴۵ر کتب خانے، ۳۰۵ر خانقاہیں، ۴۸ر چھاپے خانے ہیں۔ کاروبار اور کثرت آمد و رفت کی یہ کیفیت ہے کہ متعدد ٹریموے گاڑیاں، بارہ دخانی جہاز۔ زمین کے اندر کی ریل۔ معمولی ریلیں (جو ہر آدھ گھنٹے کے بعد چھوٹتی ہیں) ہر وقت چلتی رہتی ہیں اور باوجود اس کے سڑکوں پر پیادہ پا چلنے والوں کا اس قدر ہجوم رہتا ہے کہ ہر وقت میلہ سا معلوم ہوتا ہے۔ غلطہ اور استنبول کے درمیان جو پل ہے، اس پر سے گزرنے کا محصول فی شخص ایک پیسہ ہے۔ اسکی روزانہ آمدنی پانچ چھ ہزار روپے سے کم نہیں ہے۔

قہوہ خانے نہایت کثرت سے ہیں۔ میرے تخمینہ میں چار پانچ ہزار سے کم نہ ہوں گے۔ بعض بعض نہایت عظیم الشان ہیں، جن کی عمارتیں شاہی محل معلوم ہوتی ہیں۔ قہوہ خانوں میں ہمیشہ ہر قسم کے شربت اور چائے وقہوہ وغیرہ مہیا رہتا ہے۔ اکثر قہوہ خانے دریا کے ساحل پر اور بعض عین دریا میں ہیں جن کے لئے لکڑی کا پل بنا ہوا ہے۔ قہوہ خانوں میں روزانہ اخبارات بھی موجود رہتے ہیں۔ لوگ قہوہ پیتے جاتے ہیں۔ اور اخبارات دیکھتے جاتے ہیں۔ قسطنطنیہ بلکہ ان تمام مالک میں قہوہ خانے ضروریات زندگی میں محسوب ہیں۔ میرے عرب احباب جب مجھ سے سنتے تھے کہ ہندوستان میں اس کا رواج نہیں تو تعجب سے کہتے تھے بایش یتسلّون یعنی وہاں لوگ جی کیونکر بہلاتے ہیں، ان ملکوں میں دوستوں کے ملنے جلنے اور گرمی صحبت کے موقعے یہی قہوہ خانے ہیں۔

افسوس ہے کہ ہندوستانیوں کو ان باتوں کا ذوق نہیں۔ وہ جانتے ہی نہیں کہ اس قسم کی عام صحبتیں زندگی کی دلچسپی کے لئے کس قدر ضروری ہے اور طبیعت کی شگفتگی پر ان کا کیا اثر پڑتا ہے۔ دوستانہ مجلسیں ہمارے ہاں بھی ہیں، جس کا طریقہ یہ ہے یہ کسی دوست کے مکان پر دو چار احباب کبھی کبھی مل بیٹھتے ہیں لیکن اس طریقے میں دو بڑے نقص ہیں۔ اولاً تو تفریح کے جلسے پر فضا مقامات میں ہونے چاہئیں کہ تازہ اور لطیف ہوا کی وجہ سے صحت بدنی کا فائدہ پہنچے۔ دوسرے سخت خرابی یہ ہے کہ چونکہ یہ جلسے پرایوٹ جلسے ہوتے ہیں، اس لئے ان میں غیبت شکایت اور اس قسم کی لغویات کے سوا اور کوئی تذکرہ نہیں ہوتا۔ بخلاف قہوہ خانوں کے، جہاں مجمع عام کی وجہ سے اس قسم

کی باتوں کا موقع نہیں مل سکتا۔ قسطنطنیہ اور مصر میں، میں ہمیشہ شام کے وقت دوستوں کے ساتھ قہوہ خانوں میں بیٹھا کرتا تھا لیکن میں نے کبھی اس قسم کے تذکرے نہیں سنے۔ تفریح اور بذلہ سنجی کے سوا وہاں کوئی ذکر نہیں ہوتا تھا اور نہ ہوسکتا تھا۔

قسطنطنیہ کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اگر کسی کو یورپین اور ایشیائی تمدن کی تصویر ایک موقع میں دیکھنی ہو تو یہاں دیکھ سکتا ہے کتب فروشوں کی دکانوں کی سیر کرو تو ایک طرف ایک نہایت وسیع دکان ہے۔ سنگ رخام کا فرش ہے۔ شیشہ کی نہایت خوبصورت الماریاں ہیں کتابیں جس قدر ہیں مجلد۔ اور جلدیں بھی معمولی نہیں بلکہ عموماً مطلا و مذہب۔ مالک دوکان میز کرسی لگائے بیٹھا ہے۔ دو تین کمسن خوش لباس لڑکے ادھر ادھر کام میں لگے ہیں۔ تم نے دوکان میں قدم رکھا ایک لڑکے نے کرسی لا کر سامنے رکھ دی اور کتابوں کی فہرست حوالہ کی۔ قیمت فہرست میں مذکور ہے اور اس میں کمی بیشی کا احتمال نہیں۔

دوسری طرف سڑک کے کنارے چبوتروں پر کتابوں کا بے قاعدہ ڈھیر لگا ہے۔ زمین کا فرش اور وہ بھی اس قدر مختصر کہ تین چار آدمی سے زیادہ کی گنجائش نہیں۔ قیمت چکانے میں گھنٹوں کا عرصہ درکار ہے۔

اسی طرح ہر پیشہ وصنعت کی دکانیں۔ دونوں نمونہ کی موجود ہیں۔ عام صفائی اور زیب اور زینت کا بھی یہی حال ہے۔ غلطہ کو دیکھو تو یورپ کا ٹکڑا معلوم ہوتا ہے۔ دکانیں بلند اور آراستہ، سڑکیں وسیع اور ہموار، کیچڑ ار نجاست کا کہیں نام نہیں۔ بخلاف اس کے استنبول میں جہاں زیادہ تر مسلمانوں کی آبادی ہے۔ اکثر سڑکیں ناصاف اور بعض بعض جگہ اس قدر ناہموار کہ چلنا مشکل۔

اس شہر میں آکر ایک سیاح کے دل میں غالباً جو خیال سب سے پہلے آتا ہوگا، وہ یہ ہوگا کہ اس عظیم الشان دارالسلطنت کے دو حصوں میں اس قدر اختلاف حالت کیوں ہے۔ چنانچہ میرے دل میں سب سے پہلے یہی خیال آیا میں نے اس کے متعلق بہت کچھ بحث وتفتیش کی۔ باشندوں کے اختلافِ حالت کا سبب تو میں نے آسانی سے معلوم کرلیا یعنی مسلمانوں کا افلاس اور دوسری قوموں کا تمول لیکن سڑکوں اور گزرگاہوں کی ناہموار وغلاظت کا بظاہر یہ سبب قرار نہیں پاسکتا تھا، اس لئے میں نے ایک معزز ترکی افسر، یعنی حسین حسیب آفندی پولیس کمشنر سے دریافت کیا۔ انہوں نے

کہا کہ ہماری میونسپلٹی کے ٹیکس بہت کم ہیں۔ بہت سی چیزیں محصول سے معاف ہیں لیکن غلطہ میں یورپین سوداگر خود اپنی خواہش سے بڑے بڑے ٹیکس ادا کرتے ہیں، اس لئے میونسپلٹی ان رقموں کو فیاضی سے صرف کر سکتی ہے مجھے خیال ہوا کہ یہ وہی غلطہ ہے جس کی نسبت ابن بطوطہ نے نجاست اور میلے پن کی سخت شکایت کی ہے یا اب ان کو صفائی اور پاکیزگی کا اہتمام ہے کہ اس کے لئے بڑے بڑے ٹیکس ادا کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ صفائی اور خوش سلیقگی آج کل یورپ کا خمیر بن گیا ہے۔

یہاں کی عمارتیں ہندوستان کی عمارتوں سے بالکل جدا وضع کی ہیں۔ مکانات عموماً سہ منزلہ چو منزلہ ہیں۔ صحن مطلق نہیں ہوتا۔ عمارتیں تمام لکڑی کی ہیں۔ بڑے بڑے امرا اور بادشاؤں کے محل بھی لکڑی ہی کے ہیں اور یہی سبب ہے کہ یہاں اکثر آگ لگتی ہے۔ کوئی مہینہ بلکہ ہفتہ خالی نہیں جاتا کہ دو چار گھر آگ سے جل کر تباہ نہ ہوں اور کبھی کبھی تو محلے کے محلے جل کر خاک سیاہ ہو جاتے ہیں۔ آگ بجھانے کے لئے سلطنت کی طرف سے نہایت اہتمام ہے۔ کئی سو آدمی خاص اس کام پر مقرر ہیں۔ ایک نہایت بلند منارہ بنا ہوا ہے جس پر چند ملازم ہر وقت موجود رہتے ہیں کہ جس وقت کہیں آگ لگتی دیکھیں فوراً خبر کریں۔ اس قسم کے اور بھی چھوٹے چھوٹے منارے جا بجا بنے ہوئے ہیں جس وقت کہیں آگ لگتی ہے۔ فوراً توپیں سر ہوتی ہیں اور شہر کے ہر حصے سے آگ بجھانے والے ملازم تمام آلات کے ساتھ موقع پر پہنچ جاتے ہیں۔ ان کو حکم ہے کہ بے تحاشا دوڑتے جائیں۔ یہاں تک کہ اگر کوئی راہ چلتا ان کی جھپٹ میں آ کر پس جائے تو کچھ الزام نہیں۔ میں نے لوگوں سے دریافت کیا کہ پتھر کی عمارتیں کیوں نہیں بنتیں۔ معلوم ہوا کہ سردی کے موسم میں سخت تکلیف ہوتی ہے اور تندرستی کو نقصان پہنچتا ہے۔

آب و ہوا یہاں کی نہایت عمدہ ہے۔ جاڑوں میں سخت سردی پڑتی ہے اور کبھی کبھی برف بھی گرتی ہے۔ گرمیوں کا موسم جس کا مجھ کو خود تجربہ ہوا، اس قدر خوشگوار ہے کہ بیان نہیں ہو سکتا۔ تعجب ہے کہ ہمارے یہاں کے امرا شملہ اور نینی تال کے بجائے قسطنطنیہ کا سفر کیوں نہیں کرتے۔ پانی پہاڑ پر سے آتا ہے اور نہایت ہاضم اور خوشگوار ہے۔

ہر قسم کے میوے کثرت سے ہیں اور خصوصاً انگور خربوزہ بے مثل ہوتا ہے۔ لکھنؤ کے خربوزے

لطافت میں تو شاید بڑھ کر ہوں لیکن شیرینی میں یہاں کے خرپزوں کی برابری نہیں کر سکتے۔ امرود جس کو اہل عرب انجاس کہتے ہیں، عجیب مخروطی شکل کے ہوتی ہیں۔ رنگ میں تو نہیں لیکن صورت میں گافروں سے مشابہ مگر نہایت شیریں اور لذیذ۔ سیب کابل کے سیب سے بڑے اور زیادہ شیریں۔ ایک میوہ یہاں ہوتا ہے جس کو شمش کہتے ہیں، وہ ہمارے یہاں کی جامن سے کچھ مشابہ ہے۔ ہر قسم کے میوے نہایت ارزاں ہیں۔ انگور ۲ر سیر تک آتے ہیں۔ سیب عمدہ سے عمدہ پیسے کے دو۔ وعلیٰ ھذا۔

لباس اور وضع بالکل یوروپین ہے۔ ظاہری ہیئت سے کسی شخص کا مسلمان یا عیسائی ہونا معلوم نہیں ہوسکتا۔ لال ٹوپی جو ترکوں کا امتیازی لباس ہوسکتا تھا۔ عیسائی اور یہودی سب ہی استعمال کرتے ہیں اور اس وجہ سے دونوں قوموں میں امتیاز کا کوئی ذریعہ نہیں۔ یہ طریقہ ایک اعتبار سے تو اچھا ہے کیونکہ دنیا کی مختلف قوموں میں اختلاف کے آثار جس قدر مٹتے جائیں، تمدن کے لئے مفید ہے لیکن سوشیل ضرورتوں میں اس سے سخت ہرج ہوتا ہے۔ مجھ کو اس کی وجہ سے اکثر دشواریاں پیش آئیں اور ہمیشہ خیال آتا تھا کہ حضرت عمر نے اگر عیسائیوں کو قومی لباس کی پابندی کا حکم دیا تو بہت بجا کیا۔ تعجب یہ ہے کہ یہاں مذہبی گروہ یعنی علماً اور مدرسین بھی یورپ کے اثر سے نہیں بچ سکے۔ ان کے پائجاموں میں پتلون کی طرح بٹن ہوتے ہیں۔ صرف یہ فرق ہے کہ اوپر گھیر ہوتا ہے اور خوبصورتی کے ساتھ چنٹیں ہوتی ہیں۔ کرتہ یا اچکن کی بجائے صرف وائسکوٹ ہوتا ہے وائسکوٹ کے اوپر عبا پہنتے ہیں۔ اور یہی امتیازی علامت ہے جو ان کو اور گروہ کے آدمیوں سے الگ کرتی ہے۔ اس میں بھی یورپ کا یہ اثر ہے کہ عبا کے تکمے نہیں لگاتے اور سامنے سے وائسکوٹ کھلا رہتا ہے۔ ترکی ٹوپی عموماً یہ لوگ بھی استعمال کرتے ہیں لیکن اس پر سپید کپڑے کی ایک وجی لپٹی ہوتی ہے جس کو عربی میں لفہ کہتے ہیں اور وہ اہل علم کی خاص علامت خیال کیجاتی ہے۔ عورتوں کے لباس کی تفصیل میں عورتوں کی تہذیب و معاشرت کے ذکر میں لکھوں گا۔

یہاں کی عمدہ اور یادگاریں عمارتیں، جامع مسجدیں اور شاہی ایوانات ہیں جامع مسجدوں کا ذکر کسی قدر تفصیل کے ساتھ جداگانہ عنوان سے آگے آئے گا۔ شاہی ایوانات کو یہاں سرائے کہتے ہیں۔ ان کی تعداد بیس یا اکیس ہے اور سب دور دور فاصلے پر واقع ہیں۔ یہ عمارتیں مختلف سلاطین

کے عہد کی ہیں اور نہایت عظمت وشان کی عمارتیں ہیں۔ایک ایوان عین لب دریا ہے جو سرتاپا سنگ رخام کا ہے اور نہایت وسیع بلند، خوشنما ہے۔حال میں شہنشاہ جرمن، سلطان کا مہمان ہوا تھا۔تو اسی ایوان میں ٹھہرا تھا۔

یہ بات نہایت تعجب کی ہے کہ تمام شہر میں کوئی ٹاؤن ہال نہیں۔ پبلک گارڈن یعنی باغ عامہ ہے۔ایسا مختصر ہے کہ اس عظم الشان دارالسلطنت کے لئے کسی طرح موزوں نہیں۔

عدالتیں (بجز دوتین) سب یکجا واقع ہیں اور مجموعی عمارت کو باب عالی کہتے ہیں۔وزیرِاعلیٰ کا محکمہ بھی یہیں ہے۔ یہ عمارتیں چنداں شاندار نہیں ہیں۔ہائیکورٹ جس کو یہاں محکمہ التمیز کہتے ہیں، باب عالی سے فاصلے پر ہے۔ میں اس کے اندر تو نہیں گیا لیکن باہر سے بڑی شاندار عمارت معلوم ہوتی ہے۔پولیس کمشنر کی عدالت غلطہ میں ہے۔ میں نے اس کی اچھی طرح سیر کی۔عمارت چنداں قابل ذکر نہیں ہے لیکن نہایت مرتبہ اور آراستہ ہے۔ اجلاس کے کمرہ میں بیش قیمت ترکی قالین بچھا ہوا ہے۔کرسیاں بھی نہایت خوبصورت اور موزوں معارف یعنی سررشتہ تعلیم کا محکمہ بھی میں نے دیکھا معمولی عمارت ہے لیکن صفائی اور خوش سلیقگی کی وجہ سے خوشنما معلوم ہوتی ہے۔

ترکی تعلیم کالج اور اسکول

اس دور دراز سفر سے کتب خانوں کی سیر کے علاوہ اگر میرا کچھ اور مقصد ہو سکتا تھا تو یہاں کی طرز تعلیمی اور ترقی تعلیم کا اندازہ کرنا تھا۔چنانچہ میں نے اس پر بہ نسبت اور تمام باتوں کے زیادہ توجہ کی اور جہاں تک ہوسکا کوشش اور محنت کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔لیکن ناظرین کو یہ امید نہ کرنی چاہئے کہ میں اپنے مقصد میں پورا کامیاب بھی ہوا اور یہ کہ میری تعلیمی رپورٹ کوئی مکمل رپورٹ ہوگی۔تحقیقات کے لئے میں جو کوششیں کر سکتا تھا، وہ یہ تھیں کہ چند بار سررشتہ تعلیم کے دفتر میں گیا افسران تعلیم سے تحقیق طلب باتیں دریافت کیں۔ بڑے بڑے کالج اور اسکول خود جا کر دیکھے۔ ٹیچروں، پروفیسروں سے ملا۔کالجوں کی سالانہ رپورٹیں حاصل کیں لیکن یہاں ان تمام کوششوں پر بھی پوری کامیابی حاصل نہیں ہوسکتی۔ترکوں میں یہ عجیب دستور ہے کہ وہ ہر ایک بات کو پالیٹکس کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اس وجہ سے کسی معاملہ کا منظر عام میں آنا پسند نہیں کرتے۔سررشتۂ تعلیم کی رپورٹ جو سالنامہ کے ساتھ شائع ہوا ہوتی ہے، نہایت مختصر اور محض مجمل ہوتی ہے۔ یہاں [illegible] کی

مصارف تعلیم اور پروفیسروں اور ٹیچروں کی تنخواہوں کا ذکر تک نہیں ہوتا۔ بعض بعض کالجوں مثلاً مکتب حربیہ ومکتب سلطانی کی جداگانہ رپورٹیں شائع ہوتی ہیں لیکن ان میں نتائج امتحان اور نصاب تعلیم کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔

اول اول مجھ کو خیال ہوا کہ چونکہ میری رسائی کے وسیلے کم تھے، اس لئے یہ حالات کم معلوم ہو سکے لیکن جب میں نے خیرالدین پاشا وزیر تونس کی کتاب پڑھی تو تسکین ہوگئی۔ اس نے جہاں ترکی کا ذکر کیا ہے اور اس کی تمدنی و تعلیمی ترقیوں کا حال لکھا ہے، نہایت اجمال سے کام لیا ہے اور یہ معذرت کی ہے۔ میں نے ترکی کے جو حالات لکھے: ''وہ انگریزی کتابوں کے ذریعے سے لکھے ہیں اور اس وجہ سے مفصل نہ لکھ سکا لیکن مسلمانوں کی تحریرات میں اس قدر بھی نہیں مل سکتا۔'' اس تمہید اور معذرت کے بعد میں اصل مطلب شروع کرتا ہوں۔

قسطنطنیہ بلکہ تمام ممالک اسلامیہ میں تعلیم کے دو طریقے ہیں قدیم و جدید۔ قدیم تعلیم ترکی کی حکومت کے ساتھ ساتھ شروع ہوئی۔ چنانچہ آرخان التوفی ۷۶ھ نے جو اس سلسلہ کا دوسرا بادشاہ تھا۔ ازنیق میں ایک مدرسہ قائم کیا اور یہ پہلا مدرسہ تھا جو ممالک عثمانیہ میں قائم ہوا۔ آرخاں کے بعد اور سلاطین نے حوصلہ شاہانہ سے تعلیم پر توجہ کی اور سیکڑوں دارالعلوم اور مدرسے قائم کئے۔ چنانچہ ہمارے رسالے مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم میں اس کی پوری تفصیل موجود ہے۔ نئی تعلیم کی تاریخ اس وقت سے شروع ہوتی ہے جب کی حکومت ایشیائی قالب چھوڑ کر یوروپین قالب میں آئی۔ اس انقلاب کا بانی سلطان محمود تھا جس نے اول اول یوروپین وضع اختیار کی اور فوج کو یورپ کے طرز پر آراستہ کیا۔ اسی مجدد نے ۱۲۵۰ھ میں مکتب حربیہ کی بنیاد ڈالی جو تعلیم جدید کا پہلا کالج تھا۔ یہ کالج اب بھی موجود ہے اور تمام مدارس کا مرکز ہے۔ سلطان محمود کے بعد سلطان عبدالمجید نے ۱۲۶۱ھ میں جدید تعلیم کو زیادہ وسعت دی اور مکاتب رشدیہ قائم کئے۔ اس عہد سے اب تک یہ تعلیم نہایت وسعت کے ساتھ جاری ہے اور روز افزوں ترقی کر رہی ہے۔ تعلیم جدید کے چار درجے قرار دیئے گئے ہیں۔

ابتدائیہ :- اس کی مدت تعلیم زیادہ سے زیادہ پانچ برس ہے لیکن ذہین اور ہوشیار طالب علم دو تین برس بلکہ برس دو برس میں ہی اس کو ختم کر کے اوپر ترقی کر سکتا ہے۔ اس میں قرآن

مجید ترکی زبان عربی کا املا خط۔ حساب تقسیم تک سکھایا جاتا ہے۔

رشدیہ :- مدت تعلیم تین برس اس میں ترکی املا، مفروات زبان ترکی، نحو ترکی، عقائد اسلام بزبان ترکی، حساب چاروں حصے، فرنچ زبان، عربی، جغرافیہ، اقلیدس، کاغذات، تجارت کے اصول نقشہ کشی کی تعلیم ہوتی ہے۔ یہ درجہ تقریباً ہمارے یہاں کے مڈل کی برابر یا اس سے کچھ بڑھ کر ہے۔

رشدیہ کے بعد اعدادیہ ہے جس کو انٹرنس کہا جا سکتا ہے۔ اس کلاس کے طالبعلموں کی مجموعی تعداد ۱۸۹۲ء میں ۲۱۵ ھ تھی۔ اس میں تمام اضلاع اور خود پایہ تخت کے مدارس شامل ہیں۔

اعدایہ کے بعد خاص خاص کالج ہیں، مثلاً مکتب ملکیہ، مکتب الحقوق وغیرہ، جن کا مفصل بیان آگے آئے گا۔ ہر قسم کے عام و خاص مدرسے جو قسطنطنیہ میں ہیں، ان کی تعداد پانچ سو ہیں، جن میں تیرہ بڑے بڑے کالج ہیں۔

یہ امر عموماً تسلیم کیا جاتا ہے کہ سلطان حال کے عہد میں تعلیم نے نہایت ترقی کی ہے اور روز بروز کرتی جاتی ہے۔ سلطان کی تخت نشینی کے وقت مدارس رشدیہ کی تعداد ۹۶ تھی لیکن اب ۴۰۵ ہے۔ ہر قسم کے نئے مدارس جو سلطان کی شانزدہ سالہ حکومت میں قائم ہوئے، ان کی تعداد دو ہزار ہے۔ اس کے ساتھ اسکولوں اور کالجوں میں طالبعلموں کی تعداد اس کثرت سے بڑھتی جاتی ہے کہ ترقی تعلیم کی سال ماقبل کی رپورٹ سالانہ مابعد سے کچھ نسبت نہیں رکھتی۔ پروفیسر ویمبری نے اب سے چند برس پہلے ترکوں کی عام ترقی پر جو لکچر دیا، اس میں مکتب الحقوق (قانونی کالج) کے طالبعلموں کی تعداد تین سو بیان کی ہے لیکن میں جب قسطنطنیہ میں تھا تو اس کالج میں بارہ سو طالب علموں کی تعداد موجود تھے۔ میں نے زمانہ قیام، مصر میں قاہرہ کے مشہور اخبار المویدتیں پڑھا تھا کہ سلطان حال نے جب عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لی تو مصارف تعلیم تین لاکھ پونڈ سالانہ تھے۔ لیکن اب آٹھ لاکھ پونڈ سالانہ ہیں۔ یہ رقم ہمارے ہاں کے ایک کروڑ بیس لاکھ کے مساوی ہے۔ حقیقت میں سلطان کو تعلیم کے ساتھ عجیب دلچسپی ہے۔ مکتب ملکیہ اور مکتب الحقوق جو قسطنطنیہ کے نامور کالج ہیں، خاص سلطان کے قائم کردہ ہیں۔ حضرت ممدوح کو ان کالجوں کی طرف یہ التفات ہے کہ چند بار بنفس نفیس ان کے معائنہ کو تشریف لا چکے ہیں۔

جس زمانہ میں میں قسطنطنیہ میں تھا، حضرت ممدوح نے تمام بڑے بڑے کالجوں کے طالب علموں کی شاہانہ دعوت کی قسطنطنیہ میں کاغذ خانہ ایک مشہور سیر گاہ ہے۔ جہاں ہفتہ میں ایک بار تماشائیوں کا مجمع ہوتا ہے۔ یہ مقام دعوت کے لئے تجویز کیا گیا اور حکم ہوا کہ ہر کالج کے لڑکے باری باری وہاں بلائے جائیں۔ سب سے پہلے مکتب حربیہ، پھر مکتب ملکی (سول سروس کالج) اور دوسرے کالجوں کے طلبا مدعو ہوئے۔ طالب علم کالج سے چلتے تھے تو سلطان کے حکم کے موافق شاہی بینڈ ان کے آگے آگے بجتا جاتا تھا۔ چونکہ مصالح ملکی کی وجہ سے سلطان خود ان جلسوں میں شریک نہیں ہوسکتے تھے۔ ہمیشہ ان کی طرف سے ایک وزیر شریک دعوت ہوتا تھا اور طالب العلموں کو سلطان کا سلام پہنچاتا تھا۔ اس وقت تمام طالب العلم بڑے جوش اور اخلاص سے بادشاہم چوق یشا کا نعرہ بلند کرتے تھے— (یعنی ہمارا بادشاہ بہت زندہ رہے)

تعلیم کے صیغہ میں ایک نہایت مفید ایجاد جو حال میں سلطان کی خاص تجویز سے ہوئی، وہ مکتب العشائر کا قائم ہونا ہے۔ اگرچہ اس وقت تمام ممالک عثمانیہ میں تعلیم کو ترقی ہے لیکن اب تک عرب کے قبائل اس فیض سے قریباً بالکل محروم تھے جس کی وجہ خود ان کی بے پروائی اور بدویت تھی اس ضرورت سے سلطان نے خاص قبائل عرب کی تعلیم کے لئے ایک کالج اور اس کے ساتھ ایک وسیع اور مرتب بورڈنگ قائم کرنے کا حکم دیا۔ میرے زمانۂ قیام ہی میں حکام اور عمال کے نام فرامین صادر ہوئے تھے کہ حجاز، یمن، دیار بکر، بصرہ، بغداد طرابلس الغرب، حلب، موصل شام میں عرب کے جو معزز قبائل ہیں، ان کے لڑکے انتخاب کر کے بھیجے جائیں۔ سلطان نے ان کے ہر قسم کے مصارف حکومت کی طرف سے دینے منظور کئے۔ ۱۲ربیع الاول ۱۳۱۰ھ کو یہ کالج بڑی شوکت وشان کے ساتھ کھولا گیا اور فتاحی رسمیں ادا کی گئیں۔ عربوں کی تہذیب وتربیت کے لئے ایسی عمدہ کوشش کی نظیر تمام اسلامی تاریخ میں نہیں مل سکتی۔

اس سے بھی زیادہ شاہانہ فیاضی کا ثبوت دارالشفقۃ سے ملتا ہے جو خاص یتیموں کے لئے قائم ہوا ہے۔ اس مدرسے میں ایک ہزار یتیم تعلیم پاتے ہیں اور سب کے سب بورڈر ہیں۔ اس گروہ کثیر کی خوراک، لباس اور تمام دوسرے ضروری مصارف کا بار سررشتۂ تعلیم پر نہیں بلکہ سلطان المعظم کی ذات خاص پر ہے۔

خودنوشتِ نسّاخ

عبدالغفور خاں نسّاخ

(۱۸۳۴ء - ۱۸۸۹ء)

حسب نسب وولادت

خاکسار عبدالغفور نسّاخ متخلص بہ نسّاخ، ڈپٹی کلکٹر ڈھاکہ برادر خرد نواب عبداللطیف خان بہادر، سی-آئی-ای، وزیر ریاست بھوپال، ابن جناب منشی قاضی فقیر محمد مرحوم، مؤلف "نسخۂ جامع التواریخ" وکیل عدالت دیوانی صدر کلکتہ، ابن قاضی محمد رضا ابن قاضی محمد شفیع ابن قاضی عبدالشکور ابن قاضی محمد اشرف ابن قاضی عبدالوہاب ابن قاضی عبدالرسول ابن شاہ عین الدین محمد ابن شاہ بدیع الدین احمد ابن شاہ احمد ابن محمد قاسم ابن ابوعبداللہ حسین ابن شمس الدین محمد ابن ابو اسماعیل نجم الدین ابن علی ابن عبدالعزیز ابن محمود ابن محمد ابن عبداللہ ابن ابوعبداللہ محمد ملقب بشرف المعالی عمدۃ الدین معروف بہ ابن القیر انی ابن نصر ابن صغیر ابن واغر ابن محمد ابن خالد ابن نصر ابن واغر ابن عبدالرحمان ابن حضرت مہاجر ابن حضرت سیف اللہ خالد ابن ولید مخزومی رضی اللہ عنہ، حسب خواہش احباب اپنی زندگی کے مختصر حالات وسوانح اس رسالہ میں درج کرتا ہے کہ میرے

مورث اعلیٰ حضرت سیف اللہ خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کا حال اظہر من الشمس ہے۔ اگر کوئی چاہے کہ ان کے حالات کو دریافت کرے تو مغازی الرسول صلعم وفتوح الشام وفتوح المصر واقدی رحمتہ اللہ علیہ میں دیکھے۔ ان کا انتقال سنہ ۲۱ ہجری میں مدینۂ منورہ میں ہوا۔ ان کے فرزندار جمند حضرت مہاجر رضی اللہ عنہ جنگ صفین میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ساتھ تھے اور ان کے بڑے بھائی حضرت عبدالرحمان رضی اللہ عنہ معاویہ کے ساتھ تھے اور میرے بزرگوں میں جناب ابوعبید اللہ بن قیرانی بہت بڑے عالم وادیب تھے اور ملک شام میں مکہ میں پیدا ہوئے اور سنہ ۵۴۸ ہجری میں دمشق میں فوت ہوئے۔ ان کی اولاد میں بعض بعض بزرگ بغداد میں جا بسے۔ ان میں سے جناب شاہ عین الدین محمد قدس سرہٗ سنہ ۱۰۳۲ ہجری میں جب شاہ عباس صفوی بادشاہ ایران کربلا میں زیارت کو جاتے وقت بغداد کو محاصرہ کر کے فتح کیا بغداد سے دہلی چلے آئے۔ اس وقت جہاں گیر بادشاہ ہندوستان کے بادشاہ تھے۔ ان کا انتقال دہلی میں سنہ ۱۰۴۱ ہجری میں ہوا اور ان کے والد ارشد جناب قاضی عبدالرسول کو شہنشاہ ہندشاہجہاں بادشاہ نے سند قضائی سرکار فتح آباد چکلہ بھوسنہ وغیرہ ضلع فرید پور درمیان ممالک بارہ بھوئیاں بنگالہ کی عطا کی اور فرید پور میں آ کر موضع لشکر دیہ کے قطب دانش مند کی صاحبزادی سے جو نواسی تھیں مجلس عالی بایزید زمیندار پرگنہ فتح آباد کی عقد کیا اور وہیں بسنے کا ارادہ کر کے بارہ کھادہ زمین لاخراج موضع سکھپالدیا میں حاصل کیا اور وہیں بسے۔ ان کے صاحب زادے قاضی عبدالوہاب مرحوم نے سیّد بہرام بغدادی رئیس راجہ بنی کی دختر نیک اختر سے شادی کی اور شہنشاہ دہلی اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ سے اور بارہ کھادہ زمین لاخراج موضع راجہ پور میں حاصل کر کے اس کا نام بارہ کھادہ رکھا اور وہیں بس گئے۔ چنانچہ وہ جگہ اب تک اسی نام سے بارہ کھادیہ مشہور ہے۔ ان کی اولاد عہدۂ قضا پر مقرر تھی اور جائیداد حاصل کر کے بعزت آبرو اپنی اوقات بسر کرتے تھے۔ والد مرحوم کے چچیا سسر منشی بقاء اللہ مرحوم جب نظامت وعدالت صدر دیوانی کلکتہ میں مقرر ہوئے اس وقت وکیل مقرر ہوئے اور والد مرحوم بعد شادی کے منشی صاحب مرحوم کے کام میں تائید کرتے تھے یعنی ان کے اسسٹنٹ تھے۔ جب منشی صاحب کا انتقال ہوا تو ان کے کام پر حکام صدر دیوانی عدالت نے والد مرحوم کو وکیل مقرر کیا اور وہ ۲۸ / برس تک بحسن وخوبی اپنے کام کو انجام دے کے سنہ ۱۲۵۹ ہجری میں انتقال کیا۔ وہ بڑے مؤرخ تھے اور ان کی تصنیف

میں 'جامع التواریخ' اور 'منتخب النجوم' مشہور ہیں۔

منشی بقاء اللہ مرحوم کا ایک دو منزلہ مکان مدرسہ عالیہ کلکتہ کا دروازہ جہاں ہے، اسی مقام پر تھا۔ جب مدرسہ کی بنا ہوئی تو وہ مکان ان سے خرید لیا گیا اور والد مرحوم کلکتہ کے محلہ کلنگا میں پیرو خاں ساماں کی گلی میں اپنے خریدے ہوئے مکان میں رہتے تھے۔ وہ مکان شکست ہو گیا۔ اب رعایا بستی ہے۔ اسی مکان میں سنہ ۱۲۴۹ ہجری کے عید الفطر کے روز منگل کو قبل نماز عید متولد ہوا اور پرورش پائی بعد ساڑھے چار برس کے پڑھنے لگا۔ مولوی رمیض الدین چاٹگامی میرے پڑھانے کو مقرر ہوئے۔ ان دنوں ہم لوگوں کے مکان میں چالیس پچاس ساٹھ طالب علم رہتے تھے۔

والدین کا انتقال

میں سات برس کی عمر میں مدرسۂ عالیہ، کلکتہ میں داخل ہوا۔ اس وقت ہم لوگ چار بھائی تھے۔ میں اور نواب عبداللطیف خان بہادر سی. آئی. ای ایک والدہ کی طرف سے اور مولوی عبدالحمید مرحوم اور مولوی عبدالباری مرحوم اور ایک والدہ کی طرف سے۔ مولوی عبدالحمید مرحوم بڑے تھے، نواب عبداللطیف خان بہادر ان سے چھوٹے، مولوی عبدالباری ان سے چھوٹے میں سب سے چھوٹا تھا۔ آخر عمر میں والد مرحوم نے خواب میں دیکھا کہ ایک بزرگ ان سے کہتے ہیں کہ اب چلو۔ اس میں والد مرحوم نے کہا میری اولاد سب چھوٹی ہے۔ ابھی جا نہیں سکتا۔ اس خواب کو انہوں نے میرے عم بزرگوار قاضی محمد صابر قدس سرہٗ سے کہ وہ صاحب کمال تھے، بیان کیا۔ انہوں نے تعبیر دی کہ کچھ اندیشہ وخوف کا موقع نہیں ہے۔ دوسرے سال والد مرحوم نے پھر انھیں بزرگ کو خواب میں دیکھا اور انہوں نے کہا کہ چلنے کی تیاری کرو کہ تمہارا منجھلا لڑکا قابل ہو چکا ہے۔ اس پر والد مرحوم راضی ہوئے۔ بعد ازاں اس خواب کو بھی عم بزرگوار موصوف سے بیان کیا۔ انہوں نے تعبیر دی کہ اب چلنے کی تیاری کیجیے۔ اس میں والد نے وطن یعنی راجہ پور ضلع فرید پور کا قصد کیا اور چاروں اولاد کو ساتھ لے جانے کی نیت کی۔ اس پر میری والدہ شریفہ نے جو کلکتہ میں تشریف رکھتی تھیں، والد سے کہا کہ مجھ کو کلکتہ میں چھوڑ جائیں کہ میں بہت چھوٹا تھا اور عمر میری درمیان نو اور دس برس کے تھی لیکن والد مرحوم نے کہا کہ اس دفعہ میں اپنے کسی لڑکے کو چھوڑ کر نہ جاؤں گا۔ آخر ہم لوگ سب کلکتہ سے راجہ پور کو گئے۔ ایک دن شب کو بوم بولنے لگا۔ اس کی آواز سن کے نواب عبداللطیف خان بہادر

نے (کہ وہ اور میں ایک بچھونے پر سوتا تھا) مجھ کو کہا کہ خدا جانے کلکتہ میں کیا ہوا۔ اس کے تین چار روز کے بعد کلکتہ سے خبر آئی کہ والدہ ماجدہ کا انتقال ہو گیا۔ اس خبر کے سنتے ہی مجھ کو تپ آ گئی اور بعد اس کے والد مرحوم بیمار ہوئے اور والدہ کے انتقال کے ستائیس روز بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ میں نے اس واقعہ کی یہ تاریخ کہی ہے:

والدینم کہ ز دنیا رفتند   جگرم چاک شد و خاک بسرم
چشمم لبریز سر اشک طوفان   کہ ازان نوح بکشتی مضطرم
بر لبم شور قیامت پیرا   کہ ازان عرش بلرزہ یکسر
در چنین حال بگفتم تاریخ   ''خلد ساکن پدرم'' با مادر

۱۲۵۹ھ

تیرنا سیکھنا

ایک روز راجہ پور میں مکان میں جو تالاب تھا، اس میں کشتیاں تھیں۔ ان میں سے ایک پر میں اور میرا بھانجا مولوی عضد الدین محمد دو پہر کو سوار ہو کر سیر کرتا تھا اور اس وقت تالاب میں یا اس کے نزدیک کوئی آدمی نہ تھا۔ ایسے حال میں میرے بھانجے نے جس کی عمر مجھ سے کچھ کم تھی، مجھ کو کشتی پر سے ڈھکیل کے تالاب میں ڈال دیا۔ میں ڈوبنے لگا کہ مجھ کو تیرنا آتا نہ تھا اور میرا بھانجا کشتی پر سے کود کے تالاب میں اور تیر کے بھاگ گیا۔ میں سمجھا کہ میں ڈوبا۔ ہاتھ پاؤں مارتا تھا۔ اس میں ایک بانس میرے ہاتھ لگا۔ اس کو پکڑ کے دم لیا تو دیکھا کہ میرا بھانجا کنارے پر کھڑا ہے۔ جب اس نے دیکھا کہ میں نے بانس پکڑ لیا ہے تو وہ بھاگ گیا۔ میں بانس کے سہارے کنارے پر آیا اور اسی روز سے میں نے تیرنا سیکھا۔ کنارے پر آ کے اس کو تلاش کیا، پایا نہیں۔ بعد ازاں یہ بات سب کو معلوم ہوئی تو اس نے کہا کہ اس نے مجھے تالاب میں اس لئے گرایا تھا کہ مجھ کو تیرنا آ جائے۔

ابتدائی تعلیم

بعد ازاں ہم لوگ کلکتہ میں آئے اور پڑھنے لگے۔ نواب عبد اللطیف خان بہادر، سی. آئی. ای امیران سندھ کی سرکار میں مترجمی کے عہدہ پر مقرر ہوئے۔ میں پڑھتا رہا۔ میں سات برس کی عمر سے کچھ کچھ شعر موزوں کرتا تھا۔ ان دنوں جو شعر کہتے تھے وہ یاد نہیں اور یاد بھی رہنے سے قابل لکھنے

کے نہیں تھے۔ مجھ کو سلہٹ کے پرگنہ کی طرف کے مولوی از ہر مرحوم پڑھاتے تھے اور خواہ مخواہ بغیر قصور کے مارتے تھے۔ ایک دن بے قصور انہوں نے مجھ کو مارا تو میں عم بزرگوار قاضی محمد صابر مرحوم جس مکان میں تھے، وہاں روتا ہوا چلا گیا اور وہاں ایک شمشیر ایرانی لٹکتی تھی، اس کو پکڑ کے رونے لگا اور آہستہ آہستہ سب کی نظر بچا کے اس کو کھولا۔ میرے استاد مجھ کو بلاتے تھے، میں جاتا نہ تھا۔ آخر وہ بید لے کے مجھ کو مارنے کو آئے۔ میں نے جلد شمشیر کو میان سے نکال کر ان پر حملہ کیا۔ وہ بھاگے یہاں تک کہ مکان کے دروازے سے سڑک پر نکل گئے اور میں شمشیر عریاں بکف دھاوا کرتا ہوا ان کے پیچھے پیچھے دو تین سو قدم تک گیا۔ بعد ازاں پھر آیا۔ استاد صرف ایک لنگی پہنے ہوئے تھے اور ننگے پاؤں اور ننگے سر تھے۔ ان کے ہاتھ میں ایک بید تھا۔ اس روز کے بعد سے میں نے انھیں دیکھا نہیں۔ ان کا اسباب وغیرہ سب رہ گیا۔ بعد ازاں سلہٹ کے مولوی رضوان علی مرحوم میرے پڑھانے کے لئے مقرر ہوئے۔ یہ آدمی بہت اچھے تھے۔ معلوم نہیں ایک دن شام کے بعد ان کو خواہ مخواہ مجھ پر غصہ آیا۔ انہوں نے مجھ کو مارا۔ میں چھوٹا تھا مگر بہت قوی تھا۔ وہ بہت کمزور، ضعیف اور ناتواں تھے۔ مجھ کو بھی غصہ آیا، میں نے ان کو پکڑ کے دے مارا۔ وہ ایک صندوق پر گرے۔ میں بھاگ گیا۔ گھر کے طالب علم لوگ مجھ کو پکڑنے کو دوڑے۔ میں مدرسہ عالیہ کے متعلق جو تالاب ہے، اس کے اندر گیا اور تالاب اور مدرسہ کے درمیان ریل ہے، اس کو پھاند کے مدرسہ کے اندر گیا۔ جو طالب علم لوگ مجھ کو پکڑنے کو گئے، وہ لوگ ریل پر چڑھے کہ پھاند کر مدرسہ میں جا کے مجھ کو پکڑیں، میں نے چور چور کہہ کیں پکار کے شور کیا کہ ریل کو پھاند کر جانا منع تھا۔ وہ لوگ تالاب کی طرف رہ گئے۔ میں مولوی واحد اللہ خاں بہادر ڈپوٹی مجسٹریٹ کے کمرے میں گیا کہ وہ ان دنوں تحصیل علم کرتے تھے اور وہیں شب کو سو رہا۔ علی الصباح سب کے اٹھنے کے آگے مدرسہ سے نکل گیا اور خالہ ماجدہ کے مکان میں جا کے رہا۔ کھانے کے وقت رہتا تھا، بعد ازاں چلا جاتا تھا۔ تیسرے دن نواب عبداللطیف خان بہادر وہاں گئے اور مجھ کو ساتھ لے آئے۔ بعد ازاں مجھ کو عربی پڑھانے کے لئے مولوی محمد فیض صاحب باشندہ کمرلہ مقرر ہوئے۔ مجھ کو یہ بات ناگوار ہوئی کہ میں ان دنوں مدرسۂ عالیہ میں سب سے عمدہ شطرنج کھیلتا تھا اور ان کو شطرنج میں گویا اپنا شاگرد سمجھتا تھا لیکن ساتھ اس کے ان کا رعب مجھ پر چھا گیا۔ وہ جس روز سے مجھ کو پڑھانے کے لئے مقرر ہوئے، اسی روز

سے شطرنج چھوڑ دی اور کہیں شطرنج کا ذکر نہیں کیا اور ان کو پڑھانے کا بہت عمدہ قاعدہ معلوم تھا۔ انہوں نے کبھی کوئی لفظ سخت بھی مجھ کو نہیں کہا۔ ان سے میں نے 'میزان' سے 'شرح ملا' تک از بر پڑھا اور میرے ذہن کا یہ حال تھا کہ صبح کو بعد آموختہ کے وہ ایک بار سبق پڑھا دیتے تھے دوسری بار میں پھر اس سبق کو پڑھ کے سنا دیتا تھا۔ وہ چلے جاتے تھے بعد ازاں شام کو وہ آتے تھے میں ایک بار پھر ان کو سبق پڑھ کے سنا دیتا تھا۔ دوسرے روز صبح کو ان کو اپنا سبق از بر سنا کے نیا سبق لیتا تھا یعنی تین بار کے پڑھنے میں مجھ کو از بر ہو جاتا تھا۔

انہیں دنوں کہ میرا سن ۱۲-۱۳ برس کا تھا، میں اور مدرسے کا اور ایک طالب علم ایک جامن کے درخت پر چڑھا تھا۔ میں جس شاخ پر تھا، وہ ٹوٹ گئی اور میں گر گیا اور اس کو کسی سے کہا نہیں۔ کئی دن کے بعد جا کے ناپا تو معلوم ہوا کہ بائیس ہاتھ کی بلندی پر سے گرا تھا۔ انہیں دنوں میں بزرگوں کی رائے ہوئی کہ ہم لوگوں کو یعنی مجھ کو اور میرے منجھلے بھائی مولوی عبدالباری صاحب کو ہگلی میں پڑھنے کے واسطے بھیج دیں۔ ان دنوں ہم لوگ دونوں مدرسہ کے انگریزی اسکول کی اوّل جماعت میں پڑھتے تھے۔ چنانچہ ہم لوگ ہگلی میں ۱۸۴۷ء میں گئے اور جوڑا گھاٹ کے قریب ایک دو منزلہ مکان کرایہ لے کے ٹھہرے اور ہگلی کالج میں داخل ہوئے اور جناب مولوی رمضان اللہ مرحوم مدرس مدرسہ ہوگلی سے عربی پڑھنے لگے۔ وہاں جناب مولوی کرامت علی صاحب، متولی امام باڑہ حاجی محمد محسن سے اور مولوی محمد اکبر شاہ مرحوم و خواجہ محمد مستقیم مرحوم مدرس مدرسہ ہگلی سے ملاقات ہوئی۔ خواجہ مستقیم مرحوم بھی فارسی شعر کہتے تھے، اس لئے ان سے ربط زاید رہا اور ان کا مکان بھی میرے مکان کے قریب تھا اور مولوی محمد عالم صاحب، منصف اولوبٹریہ سے بھی ملاقات ہوئی۔ مولوی محمد اکبر شاہ صاحب مرحوم مدرسہ میں مدرس اول تھے اور بہت بڑے معقولی عالم تھے اور مولوی رمضان اللہ صاحب 'شرح ملا' پڑھانے میں بے مثل تھے۔ ان سے بہتر 'شرح ملا' پڑھانے والا نظر نہیں آتا۔ بہت سے طالب علم جابجا سے 'شرح ملا' پڑھنے کیلئے ہگلی میں جاتے تھے اور 'شرح ملا' پڑھ کے چلے آتے تھے۔ ہگلی میں مولوی محمد اصغر صاحب ابن مولوی محمد اکبر شاہ صاحب مرحوم فن شعر میں میرے شاگرد ہوئے تھے، ان کا تخلص اور شعر یاد نہیں۔

میری موجودہ زندگی

جوش ملیح آبادی

(۱۸۹۴ء - ۱۹۵۸ء)

اپنی اس آخری زندگی کا حال کیا بتاؤں۔ جان کی اماں پاؤں تو زبان ہلاؤں — اللہ اللہ یہ آب وہوا کی ناسازگاری، یہ کراچی کے علم بیزاری — یہ پرانی یادوں کی کٹاریاں، یہ نئے ماحول کی آریاں — یہ مولد و منشا سے دوری، یہ غربت کی رنجوری — سینے میں، یہ کھٹکتی پھانسیں، یہ حالات کی اکھڑی سانسیں — یہ دل پر چلتے بان، یہ سر پر کڑکتی کمان — یہ، اخباروں کی ریشہ دوانیاں، یہ حکومت کی سرگرانیاں — یہ دوستوں کا فقدان یہ معاشی بحران — اور، یہ چہرۂ زندگی پر گرد و غبار کا۔ زہ اور، یہ دوش پر عزت نفس کا جنازہ —

میری جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو، خون تھوک تھوک کر، مر چکا ہوتا — لیکن مجھے دیکھو کہ میں اب بھی جی رہا ہوں اور فقط جی ہی نہیں رہا ہوں، آلام حیات پر، مسکرا بھی رہا ہوں۔ ان دردمندیوں کے بولتے گرداب میں لوہے کا جگر درکار ہے۔ بحمد اللہ میرا جگر لوہے کا ہے۔ میں ایک دقیقے کے واسطے بھی، اپنے کو اداس نہیں ہونے دیتا، غم کو برابر ٹھکراتا رہتا، اور:

چوں غمِ تو ، نہ تواں یافت ، مگر دردلِ شاد

ما ، بامید غمت ، خاطرِ شادے طلبیم

کے سانچے میں اپنی زندگی کو ڈھالے رہتا ہوں میں، خارج سے خوشی کی طلبگاری نہیں کرتا۔ خارج میں رکھا ہی کیا ہے۔ میں اپنے باطن میں خوشی بوتا خوشی کی آب یاری کرتا۔ خوشی اگا تا اور خوشی کی بالیاں کاٹتا رہتا ہوں اور ہستی کے عالم میں دنیا کے تمام بے دردوں کو۔ مخاطب کر کے۔ گنگناتا رہتا ہوں کہ:

تھوڑی سی زندگی تھی ، بہر حال کٹ گئی

تم کو ، جو ہم پہ رحم نہ آیا ، تو کیا ہوا!

حسب معمول قدیم، تاروں کی چھاؤں میں۔ بلا ناغہ، ہر روز، دو یا تین بجے صبح کو بیدار ہو کر خوب اچھی طرح کلیاں اور غرارے کرتا۔ ڈغڈ غا کر کٹورا بھر پانی پیتا۔ منہ پر دو چار چھپکے مار کر تولیا سے منہ پوچھتا، اور لکھنے پڑھنے بیٹھ جاتا ہوں۔ میز پر اگر بتی جلتی رہتی ہے اور وہاں پہنچ جاتا ہوں، جس عالم کا، کوئی نام اب تک رکھا ہی نہیں گیا ہے۔

اس وقت، کبھی کبھی میرے گردو پیش، ہلکی ہلکی گھنٹیاں سی بجنے لگتیں اور دماغ کے ایوان میں وہ راگنیاں چھڑ جاتی ہیں کہ بقول حضرتِ اقبال: من ازاں نغمہ تپیدم کہ سرودن نہ تواں۔ بعض اوقات طبع میں اس قدر نازکی ہوتی ہے کہ، موذن کی آواز گراں گزرتی ہے اور بعض اوقات جب اذان کی آواز سنتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمام کرہ ارض، عرش کی جانب پرواز کرتا چلا جا رہا ہے اور تمام ثوابت و سیار، زمین کی جانب جھکتے چلے آ رہے ہیں۔

اور جب رات کی گہری سیاہی، سانولے پن میں تبدیلی ہونے لگتی ہے۔ تو کتاب و قلم سے دست بردار ہو کر، کبھی کبھی انگنائی میں آتا اور آسمان کی طرف نگاہ اٹھا کر یہ سوچنے لگتا ہوں کہ آخر یہ سب کچھ ہے کیا، اور جب کچھ جواب نہیں ملتا تو، بلبلا بلبلا کر۔ پوچھتا ہوں:

اے ، پچھلے پہر کے غم گسارو بولو

اے مجمرِ گردوں کے شرارو ، بولو

اس پردۂ رنگ و بو میں ، پوشیدہ ہے کون؟

بولو اے ڈوبتے ستارو ، بولو!

اس کے بعد، اگر ہمت ہوتی ہے، تو ٹہلنے کے واسطے نکل جاتا ہوں، یا پھر مکان ہی میں، ورزش کر کے خط بناتا، نہاتا، ناشتہ کرتا۔ اور پھر لکھنے پڑھنے بیٹھ جاتا ہوں — اور یہ سلسلہ سہ پہر کو دو یا تین بجے تک، بڑے تسلسل کیساتھ جاری رہتا ہے۔ پھر نیند آئے یا نہ آئے، ایک گھنٹے کے واسطے لیٹ جاتا ہوں اور اس کے بعد دوبارہ حمام کر کے، نوشت وخواند کا سہ بارہ آغاز کر دیتا ہوں اور شام ہوتے ہی منہ ہات دھو کر مغرب کی طرف نگاہ اٹھا کر، سوال کرتا ہوں:

اے دشمنِ بے پناہ کب ہوگا غروب؟
اے سنگِ رہِ گناہ ، کب ہوگا غروب؟
پیاسے بیٹھے ہیں کب سے ، رندانِ کرام
اے شعلۂ روسیاہ ، کب ہوگا غروب؟

اور آفتاب غروب ہو جاتا ہے، تب:

دل کی جانب ، رجوع ہوتا ہوں میں
سر تابقدم ، خضوع ہوتا ہوں میں
جب ، مہر مبیں ، غروب ہو جاتا ہے
پیمانہ بکف ، طلوع ہوتا ہوں میں

اس دشمن بے پناہ کی تجہیز و تکفین کی خوشی میں، بڑے چاؤ اور انوکھے رچاؤ کے ساتھ، پیمانہ بھرتا ہوں، اور یہ سوچ کر کہ اس کرۂ آفات میں، آج کا دن بھی، محض حسنِ اتفاق سے بخیریت گزر گیا۔ یہ رباعی پڑھ کر:

جو سامنے آیا تھا ، وہ عفریت گیا
میں ہارنے والا تھا ، مگر جیت گیا
اس مرد فگن ، صبر شکن ، دنیا میں
صد شکر کہ دن آج . کا بھی بیت گیا

گدڑی کا لال : نور خاں

مولوی عبدالحق

(۱۸۷۰ء - ۱۹۶۱ء)

لوگ بادشاہوں اور امیروں کے قصیدے اور مرثیے لکھتے ہیں۔ نامور مشہور لوگوں کے حالات قلمبند کرتے ہیں۔ میں ایک غریب سپاہی کا حال لکھتا ہوں، اس خیال سے کہ شاید کوئی پڑھے اور سمجھے کہ دولت مندوں، امیروں اور بڑے لوگوں ہی کے حالات لکھنے اور پڑھنے کے قابل نہیں ہوتے بلکہ غریبوں میں بھی بہت سے ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی زندگی ہمارے لئے سبق آموز ہو سکتی ہے۔ انسان کا بہترین مطالعہ انسان ہے اور انسان ہونے میں امیر غریب کا کوئی فرق نہیں ہے:

پھول میں گر آن ہے کانٹے میں بھی ایک شان ہے

نور خاں مرحوم کنٹنجنٹ کے اول رسالے میں سپاہی سے بھرتی ہوئے۔ انگریزی افواج میں حیدر آباد کی کنٹنجنٹ خاص حیثیت اور امتیاز رکھتی تھی۔ ہر شخص اس میں بھرتی نہیں ہو سکتا تھا، بہت دیکھ بھال ہوتی تھی، بعض اوقات نسب نامے تک دیکھے جاتے تھے، تب کہیں جا کر ملازمت ملتی تھی۔ کوشش یہ ہوتی تھی کہ صرف شرفاً اس میں بھرتی کئے جائیں۔ یہی وجہ تھی کہ کنٹنجنٹ والے عزت کی

نظر سے دیکھے جاتے تھے لیکن بعد میں یہ قید بھی اُٹھ گئی اور اس میں اور انگریزوں کی دوسری فوجوں میں کوئی فرق نہیں رہا۔ پہلے زمانے میں سپاہ گری بہت معزز پیشہ سمجھا جاتا تھا، اب اس میں اور دوسرے پیشوں میں کوئی فرق نہیں رہا۔ بات یہ ہے کہ اشراف کا سنبھالنا بہت مشکل کام ہے۔ اس میں ایک آن بان اور خودداری ہوتی ہے، جو بہادری اور انسانیت کا اصل جوہر ہے۔ ہر کوئی اس کی قدر نہیں کرسکتا، اس لئے شریف روتا اور ذلیل ہنستا ہے۔ یہ جتنا پھیلتا ہے، وہ اتنا ہی سکڑتا ہے۔ کرنل نواب افسر الملک بہادر بھی نور خاں مرحوم ہی کے رسالے کے ہیں۔ کنٹجنٹ کے بہت سے لوگ اکثر تو کرنل صاحب موصوف کے توسط سے نواب، کرنیل میجر، کپتان اور بڑے بڑے عہدیدار ہیں لیکن دیکھنا یہ ہے کہ کوئی نور خاں بھی ہے؟

اول رسالے کے بعض لوگوں سے معلوم ہوا کہ خاں صاحب مرحوم فوج میں بھی بڑی آن بان سے رہے اور سچائی اور فرض شناسی میں مشہور تھے۔ یہ ڈرل انسٹرکٹر تھے یعنی گوروں کو جو نئے بھرتی ہو کر آتے تھے، ڈرل سکھاتے تھے۔ اس لئے اکثر گورے افسروں سے واقف تھے۔ وہ بڑے شہسوار تھے اور گھوڑے خوب پہچانتے تھے۔ بڑے بڑے سرکش گھوڑے جو پُٹھے پر ہاتھ نہ دھرنے دیتے تھے، انہوں نے درست کیے۔ گھوڑے کو سدھانے اور پھیرنے میں انہیں کمال تھا۔ چونکہ بدن کے چھریرے اور ہلکے پھلکے تھے۔ گھوڑ دوڑ میں گھوڑے دوڑاتے تھے اور اکثر شرطیں جیتتے تھے۔ ان کے افسر، اُن کی مستعدی، خوش تدبیری اور سلیقے سے بہت خوش تھے لیکن کھرے پن سے وہ اکثر اوقات ناراض ہو جاتے تھے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ان کے کمانڈنگ افسر نے کسی بات پر خفا ہو کر جیسا کہ انگریزوں کا عام قاعدہ ہے، انہیں ڈیم کہہ دیا۔ یہ تو گالی تھی، خاں صاحب کسی کی ترچھی نظر کے بھی روادار نہ تھے۔ انہوں نے فوراً رپورٹ کردی۔ لوگوں نے چاہا کہ معاملہ رفع دفع ہو جائے اور آگے نہ بڑھے مگر خاں صاحب نے ایک نہ سنی، معاملے نے طول کھینچا اور جنرل صاحب کو لکھا گیا۔ کمانڈنگ افسر کا کورٹ مارشل ہوا اور اس سے کہا گیا کہ خاں صاحب سے معافی مانگے، ہر چند اس نے بچنا چاہا مگر پیش نہ گئی اور مجبوراً اسے معافی مانگنی پڑی۔ ایسی خودداری اور نازک مزاجی پر ترقی کی توقع رکھنا عبث ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ دفعداری سے آگے نہ بڑھے۔

اچھے بُرے ہر قوم میں ہوتے ہیں۔ شریف افسر خاں صاحب کی سچائی، دیانت اور جفاکشی

کی بہت قدر کرتے تھے اور ان کو اپنی اردلی میں رکھتے مگر بعض ایسے بھی تھے، جن کے سر میں خناس سمایا ہوا تھا۔ انہیں خاں صاحب کے یہ ڈھنگ پسند نہ تھے اور وہ ہمیشہ ان کے نقصان کے در پے رہتے تھے۔ ایسے لوگ اپنی اور اپنی قوم والوں کی خودداری کو جو ہر شرافت سمجھتے تھے لیکن اگر یہی جوہر کسی دیسی میں ہوتا تو اسے غرور اور گستاخی پر محمول کرتے ہیں، تاہم ان کے اکثر انگریز افسران پر بہت مہربان تھے۔ خاص کر کرنل فرن ٹین ان پر بڑی عنایت کرتے تھے اور خاں صاحب پر اس قدر اعتبار تھا کہ شاید کسی اور پر ہو۔ جب کرنل صاحب نے اپنی خدمت سے استعفیٰ دیا تو اپنا تمام مال و اسباب اور سامان جو ہزار ہا روپے کا تھا، خاں صاحب کے سپرد کر گئے۔ یہ امر انگریز افسروں کو بہت ناگوار ہوا۔ اس وقت کے کمانڈنگ افسر سے نہ رہا گیا اور اس نے کرنل موصوف کو لکھا کہ آپ نے ہم پر اعتماد نہ کیا اور ایک دیسی دفعدار کو اپنا تمام قیمتی سامان حوالے کر گئے۔ اگر آپ یہ سامان ہمارے سپرد کر جاتے تو اسے اچھے داموں میں فروخت کر کے قیمت آپ کے پاس بھیج دیتے۔ اب بھی اگر لکھیں، تو اس کا انتظام ہوسکتا ہے۔ کرنل نے جواب دیا کہ مجھے نور خاں پر تمام انگریز افسروں سے زیادہ اعتماد ہے۔ آپ کو زحمت کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس پر یہ لوگ اور برہم ہوئے۔ ایک بار کمانڈنگ افسر یہ سامان دیکھنے آیا اور کہنے لگا کہ فلاں فلاں چیز میم صاحب نے ہمارے ہاں سے منگائی تھی، چلتے وقت واپس کرنی بھول گئے۔ اب تم یہ سب چیزیں ہمارے بنگلے پر بھیج دو۔

خاں صاحب نے کہا میں ایک چیز بھی نہیں دوں گا۔ آپ کرنل صاحب کو لکھئے۔ وہ اگر مجھے لکھیں گے تو مجھے دینے میں کوئی عذر نہ ہوگا۔ وہ اس جواب پر بہت بگڑا اور کہنے لگا تم ہمیں جھوٹا سمجھتے ہو؟ خاں صاحب نے کہا میں آپ کو جھوٹا نہیں سمجھتا۔ یہ سامان میرے پاس امانت ہے اور ہمیں کسی کو اس میں سے ایک تنکا بھی دینے کا مجاز نہیں۔ غرض وہ بڑبڑاتا ہوا کھسیانا ہو کر چلا گیا۔ خاں صاحب نے ایک انگریزی محرر سے اس سامان کی مکمل فہرست تیار کرائی اور کچھ تو خود خریدی، کچھ نیلام کے ذریعہ بیچ کر ساری رقم کرنل صاحب کو بھیج دیا۔

نہ معلوم یہی کرنل تھا یا کوئی دوسرا افسر، جب ملازمت سے قطع تعلق کر کے جانے لگا تو اس نے ایک سونے کی گھڑی، ایک عمدہ بندوق اور پانسو روپے نقد خاں صاحب کو بطور شکرانے کے دیئے۔ خاں صاحب نے لینے سے انکار کیا اور اس کی بیوی نے بہتیرا اصرار کیا مگر انہوں نے سوائے

ایک بندوق کے، دوسری کوئی چیز نہ لی اور باقی سب چیزیں واپس کر دیں۔

کرنل اسٹوارٹ بھی جو ہنگولی چھاؤنی کے کمانڈنگ افسر تھے، ان پر بہت مہربان تھے۔ رسالے کے شریف انگریزوں سے کہا کرتے تھے کہ ہمارے بعد انگریز افسر تم کو بہت نقصان پہنچائیں گے۔ وہ ان کی روش سے خوش نہ تھے اور خوش کیوں کر ہوتے، خوشامد سے انہیں چڑتھی اور غلامانہ اطاعت آتی نہیں تھی۔ ایک بار کا ذکر ہے کہ اپنے کرنل کے ہاں کھڑے تھے کہ ایک انگریز افسر گھوڑے پر سوار آیا۔ گھوڑے سے اُتر کر اس نے خاں صاحب سے کہا کہ گھوڑا پکڑو۔ انہوں نے کہا میں سائیس نہیں ہوں۔ اس نے ایسا جواب کاہے کو سنا تھا، بہت چیں بہ جبیں ہوا مگر کیا کرتا۔ آخر باگ درخت کی ایک شاخ سے اٹکا کر اندر چلا گیا۔ اب نہ معلوم یہ خاں صاحب کی شرارت تھی یا اتفاق کہ باگ شاخ سے نکل گئی اور گھوڑا بھاگ نکلا۔ اب جو صاحب باہر آئے تو گھوڑا ندارد، بہت جھنجھلایا، بڑی مشکل سے تلاش کر کے پکڑوایا تو جگہ جگہ سے زخمی پایا۔ اس نے کرنل صاحب سے خاں صاحب کی بہت شکایت کی۔ معلوم نہیں کرنل نے اس انگریز کو کیا جواب دیا لیکن وہ خاں صاحب سے بہت خوش ہوا اور کہا تم نے خوب کیا۔

خاں صاحب نے جب یہ رنگ دیکھا تو خیر اسی میں دیکھی کہ کسی طرح وظیفہ لے کر الگ ہو جائیں۔ وہ بیمار بن گئے اور ہسپتال میں رجوع ہوئے۔ کرنل اسٹوارٹ نے ڈاکٹر سے کہہ کر ان کو مدد دی اور اس طرح وہ کچھ دنوں بعد ڈاکٹر کی رپورٹ پر وظیفہ لے کر فوجی ملازمت سے سبکدوش ہو گئے۔ سچ ہے انسان کی برائیاں ہی اس کی تباہی کا باعث نہیں ہوتیں، بعض اوقات اس کی خوبیاں بھی اسے لے ڈوبتی ہیں۔

کرنل اسٹوارٹ نے بہت چاہا کہ وہ مسٹر ہنکن ناظم پولیس سے سفارش کر کے انہیں ایک اچھا عہدہ دلا دیں مگر خاں صاحب نے اسے قبول نہ کیا اور کہا کہ اب میں اپنے وطن دولت آباد ہی میں رہنا چاہتا ہوں۔ اگر آپ صوبے دار صاحب اورنگ آباد سے سفارش فرما دیں تو بہت اچھا ہو۔ کرنل صاحب بہت اصرار کرتے رہے کہ دیکھو تمہیں پولیس میں بہت اچھی خدمت مل جائے گی، انکار نہ کرو مگر یہ نہ مانے۔ آخر مجبور ہو کر نواب مقتدر جنگ بہادر صوبے دار صوبۂ اورنگ آباد سے سفارش کی۔ صوبے دار صاحب کی عنایت سے وہ قلعۂ دولت آباد کی جمعیت کے جمعدار ہو گئے اور

بہت خوش تھے۔

نواب مقتدر جنگ کے بعد نواب بشیر نواز جنگ اورنگ آباد کی صوبے داری پر آئے۔ وہ بھی خاں صاحب پر بہت مہربان تھے۔ اسی زمانے میں لارڈ کرزن وائسرائے دولت آباد تشریف لائے۔ خاں صاحب نے سلامی دینے کی تیاری کی، کئی توپیں ساتھ ساتھ رکھ کر سلامی دینی شروع کی۔ لارڈ کرزن گھڑی نکال کر دیکھ رہے تھے۔ جب سلامی ختم ہوئی تو نواب صاحب سے خاں صاحب کی تعریف کی۔ سلامی ایسے قاعدے اور انداز سے دی کہ ایک سکنڈ کا فرق نہ ہونے پایا۔ نواب صاحب نے اس کا تذکرہ خاں صاحب سے کیا اور کہا کہ میاں اب تمہاری خیر نہیں معلوم ہوتی۔

لارڈ کرزن جب قلعہ کے اوپر بالا حصار پر گئے تو وہاں ستانے کے لئے کرسی پر بیٹھ گئے اور جیب سے سگریٹ دان نکال کر سگریٹ پینا چاہا۔ دیا سلائی نکال کر سگریٹ سلگایا ہی تھا کہ یہ فوجی سلامی کر کے آگے بڑھے اور کہا کہ یہاں سگریٹ پینے کی اجازت نہیں ہے۔ لارڈ کرزن نے جلتا ہوا سگریٹ نیچے پھینک دیا اور جوتے سے رگڑ ڈالا۔ یہ حرکت دیکھ کر نواب بشیر نواز جنگ بہادر اور دوسرے عہدیداران کا رنگ فق ہو گیا مگر موقع ایسا تھا کہ کچھ کہہ نہیں سکتے تھے، لہو کے گھونٹ پی کر چپ رہ گئے۔ بعد میں بہت کچھ لے دے کی مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ خاں صاحب نے قاعدے کی پوری پابندی کی تھی، اس پر چون و چرا کی گنجائش نہ تھی۔

اب اسے اتفاق کہئے یا خاں صاحب کی تقدیر کہ لارڈ کرزن نے جانے کے بعد ہی فنانس کی معتمدی کے لئے مسٹر واکر کا انتخاب کیا۔ ریاست کے مالیے کی حالت اس زمانے میں بہت خراب تھی۔ مسٹر واکر نے اصلاحیں شروع کیں۔ اس لپیٹ میں قلعۂ دولت آباد بھی آ گیا۔ اوروں کے ساتھ خاں صاحب بھی تخفیف میں آ گئے۔

دولت آباد میں ان کی کچھ زمین تھی۔ اس میں باغ لگانا شروع کر دیا۔ مسٹر واکر دورے پر دولت آباد آئے تو ایک روز ٹہلتے ٹہلتے ان کے باغ میں آ پہنچے۔ خاں صاحب بیٹھے گھاس کھرپ رہے تھے۔ مسٹر واکر کو آتے دیکھا تو اُٹھ کر سلام کیا۔ پوچھا کیا حال ہے، کہنے لگے آپ کی جان و مال کو دعا دیتا ہوں۔ آپ کی بدولت گھاس کھودنے کی نوبت آ گئی ہے۔ مسٹر واکر نے کہا کہ یہ تو بہت اچھا کام ہے، دیکھو تمہارے درخت انجیروں سے کیسے لدے ہوئے ہیں، ایک ایک آنے کو ایک

ایک اُنجیر بیچو تو کتنی آمدنی ہو جائے گی، خاں صاحب گھبرائے کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ کمبخت انجیروں پر بھی ٹیکس لگا دے، تڑ سے جواب دیا کہ آپ نے انجیر لدے ہوئے تو دیکھ لئے اور یہ نہ دیکھا کہ کتنے سڑ گل جاتے ہیں، کتنے آندھی ہوا سے گر پڑتے ہیں، کتنے پرندے کھا جاتے ہیں اور پھر ہماری دن رات کی محنت۔ مسٹر واکر مسکراتے ہوئے چلے گئے۔

اسی زمانے میں ڈاکٹر سیّد سراج الحسن صاحب اورنگ آباد کے صدر مہتمم تعلیمات ہو کر آئے تھے۔ ڈاکٹر صاحب بلا کے مردم شناس ہیں۔ تھوڑی ہی دیر میں اور چند ہی باتوں میں آدمی ایسا پرکھ لیتے تھے کہ حیرت ہوتی ہے، پھر جیسا وہ آدمی کو سمجھتے ہیں، ویسا ہی نکلتا ہے۔ کبھی خطا ہوتے نہیں دیکھی۔ ڈاکٹر صاحب ایسے قابل جوہروں کی تلاش میں رہتے ہیں۔ فوراً ہی خاں صاحب کو اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا۔ ڈاکٹر صاحب کا برتاؤ ان سے بہت شریفانہ اور دوستانہ تھا۔ نواب برزور جنگ اس زمانے میں صوبے دار تھے، مقبرہ کا باغ ان کی نگرانی میں تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے سفارش کر کے باغ سے پانچ روپے ماہانہ الاؤنس مقرر کرا دیا۔

نواب برزور جنگ کے پاس ایک گھوڑا تھا، وہ اسے بیچنا چاہتے تھے۔ کلب میں کہیں اس کا ذکر آیا۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا مجھے گھوڑے کی ضرورت ہے۔ میں اسے خرید لوں گا مگر پہلے نور خاں کو دکھا لوں، وہاں سے آ کر ڈاکٹر صاحب نے خاں صاحب سے یہ واقعہ بیان کیا اور کہا کہ بھئی اس گھوڑے کو دیکھ آؤ کوئی عیب تو نہیں، خاں صاحب نے کہا آپ نے غضب کیا، میرا نام لے دیا۔ گھوڑے میں کوئی عیب ہوا تو میں چھپاؤں گا نہیں اور صوبے دار صاحب مفت میں مجھ سے ناراض ہو جائیں گے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا تم خواہ مخواہ وہم کرتے ہو، کل جا کے گھوڑا ضرور دیکھ لو۔ خاں صاحب گئے۔ گھوڑا نسل کا تو اچھا تھا مگر پانچوں شرعی عیب موجود تھے۔ انہوں نے صاف صاف آ کے کہہ دیا اور ڈاکٹر صاحب نے خریدنے سے انکار کر دیا۔ صوبیدار آگ بگولا ہو گئے۔ دوسرے روز مقبرے میں آئے اور باغ کا رجسٹر منگایا اور نور خاں کے نام پر اس زور سے قلم کھینچا کہ اگر حرفوں اور لفظوں میں جان ہوتی تو وہ بلبلا اُٹھتے۔ ڈاکٹر صاحب کو معلوم ہوا تو بہت افسوس کیا مگر انہوں نے اس کی تلافی کر دی۔ یہ سن کر صوبیدار صاحب اور بھی جھنجھلائے۔

ڈاکٹر صاحب ترقی پا کر حیدر آباد چلے گئے۔ ان کی خدمت کا دوسرا انتظام ہو گیا۔ کچھ دنوں

بعد ڈاکٹر صاحب ناظم تعلیمات ہو گئے اور میں ان کی عنایت سے صدر مہتمم تعلیمات ہو کر اورنگ آباد آیا۔ ڈاکٹر صاحب ہی نے مجھے نور خاں سے ملایا اور ان کی سفارش کی۔ ڈاکٹر صاحب نے انہیں عارضی طور پر دولت آباد میں مدرس کر دیا تھا۔ میں نے عارضی طور پر اپنے دفتر میں محرر کر دیا۔ وہ مدرسی اور محرری تو کیا کرتے مگر بہت سے مدرسوں اور محرروں سے زیادہ کارآمد تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے جب باغ کی نگرانی میرے حوالے کی تو خاں صاحب کا الاؤنس بھی جاری ہو گیا۔

اعلیٰ حضرت واقدس بعد تخت نشینی اورنگ آباد رونق افروز ہوئے تو یہاں کی خوش آب و ہوا کو بہت پسند فرمایا اور ایک عظیم الشان باغ لگانے کا حکم دیا۔ یہ کام ڈاکٹر صاحب کے سپرد ہوا اور ان سے بہتر کوئی یہ کام کر بھی نہیں سکتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کی مہربانی سے آخر اس باغ کے عملے میں خاں صاحب کو بھی ایک اچھی سی جگہ مل گئی جو ان کی طبیعت کے مناسب تھی اور آخر دم تک وہ اسی خدمت پر رہے اور جب تک دم میں دم رہا، اپنے کام کو بڑی محنت اور دیانت سے کرتے رہے۔

یوں محنت سے کام تو اور بھی کرتے لیکن خاں صاحب میں بعض ایسی خوبیاں تھیں جو بڑے بڑے لوگوں میں بھی نہیں ہوتیں۔ سچائی، بات کی اور معاملے کی، ان کی سرشت میں تھی۔ خواہ جان پر ہی کیوں نہ بن جائے، وہ سچ کہنے سے کبھی نہیں چوکتے تھے۔ اسی میں انہیں نقصان بھی اُٹھانے پڑے مگر وہ سچائی کی خاطر سب کچھ گوارا کر لیتے تھے۔ مستعد ایسے تھے کہ اچھے اچھے جوان ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ دن ہو، رات ہو، ہر وقت کام کرنے کے لئے تیار۔ اکثر دولت آباد سے پیدل آتے جاتے تھے۔ کسی کام کو کہیے تو ایسی خوشی سے کرتے تھے کہ کوئی اپنا کام بھی اس قدر خوشی سے نہ کرتا ہوگا۔ دوستی کے بڑے پکے اور بڑے وضع دار تھے۔ چونکہ ادنیٰ اعلیٰ سب ان کی عزت کرتے تھے، اس لئے ان سے غریب دوستوں کے بہت سے کام نکلتے تھے۔ ان کا گھر مہمان سرائے تھا۔ اورنگ آباد کے آنے جانے والے کھانے کے وقت بے تکلف ان کے گھر پہنچ جاتے اور وہ ان سے بہت خوش ہوتے تھے۔ بعض لوگ جو مسافر بنگلے میں آ کر ٹھہر جاتے تھے، ان کی بھی دعوت کر دیتے تھے، بعض اوقات ٹولیوں کی ٹولیاں پہنچ جاتی تھیں اور وہ ان کی دعوتیں بڑی فیاضی سے کرتے تھے۔ اس قدر قلیل معاش ہونے پر ان کی یہ مہمان نوازی دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ ان کی بیوی بھی ایسی نیک بخت تھی کہ دفعتاً مہمانوں کے پہنچ جانے سے کبھی کبیدہ خاطر نہ ہوتی تھی بلکہ خوشی

خوشی کام کرتی اور کھلاتی تھی۔ خودداراایسے کہ کسی سے ایک پیسے کے روادار نہ ہوتے تھے۔ ڈاکٹر سراج الحسن ہر چند طرح طرح سے ان کے ساتھ سلوک کرنا چاہتے تھے مگر وہ ٹال جاتے تھے۔ مجھ سے انہیں خاص انس تھا، میں کوئی چیز دیتا تو کبھی انکار نہ کرتے تھے بلکہ کبھی کبھی خود فرمائش کرتے تھے۔ مٹھاس کے بے حد شائق تھے۔ ان کا قول تھا کہ کسی کو اگر کھانے کو میٹھا ملے تو نمکین کیوں کھائے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ: "نمکین کھانا مجبوری سے کھاتا ہوں۔ مجھ میں اگر استطاعت ہو تو ہمیشہ مٹھاس ہی کھایا کروں اور نمکین کو ہاتھ نہ لگاؤں۔" انہیں مٹھاس کھاتے دیکھ کر حیرت ہوتی تھی، اکثر جیب میں گڑ رکھتے تھے۔ ایک بار میرے ساتھ دعوت میں گئے۔ قسم قسم کے تکلف کے کھانے تھے۔ خاں صاحب نے چھوٹتے ہی میٹھے پر ہاتھ ڈالا۔ ایک صاحب جو دعوت میں شریک تھے، یہ خیال کرکے کہ خاں صاحب کو دھوکا ہوا، کہنے لگے کہ: "حضرت! یہ میٹھا ہے۔" مگر انہوں نے کچھ پروا نہ کی اور برابر کھاتے رہے۔ جب وہ ختم ہو گیا تو دوسرے میٹھے پر ہاتھ بڑھایا۔ ان صاحب نے پھر ٹوکا کہ حضرت! یہ میٹھا ہے، انہوں نے کچھ جواب نہ دیا اور اسے بھی ختم کر ڈالا۔ جب کبھی وہ کسی دوست کے ہاں جاتے، وہ انھیں ضرور میٹھا کھلاتے اور یہ خوش ہو کر کھاتے۔

خاں صاحب بہت زندہ دل تھے۔ چہرے پر ہمیشہ مسکراہٹ رہتی تھی، جسے دیکھ کر خوشی ہوتی تھی۔ وہ بچوں میں بچے، جوانوں میں جوان اور بوڑھوں میں بوڑھے تھے۔ غم اور فکر کو پاس نہ آنے دیتے تھے اور ہمیشہ خوش رہتے تھے اور دوسروں کو بھی خوش رکھتے تھے۔ ان سے ملنے اور باتیں کرنے سے غم غلط ہوتا تھا۔ آخر دم تک ان کی زندہ دلی ویسی ہی رہی۔

ڈاکٹر سراج الحسن صاحب جب کبھی اورنگ آباد آتے تو اسٹیشن سے اُترتے ہی اپنا روپیہ پیسہ سب ان کے حوالے کر دیتے اور سب خرچ انہیں کے ہاتھ سے ہوتا تھا۔ جانے سے ایک روز قبل وہ حساب لے کر بیٹھتے، بعض وقت جب بدھ نہ ملتی تو آدمی آدمی رات تک لئے بیٹھے رہتے۔ ہر چند ڈاکٹر صاحب کہتے کہ خاں صاحب! یہ تم کیا کرتے ہو؟ جو خرچ ہوا، باقی جو بچا ہے، وہ دے دو یا زیادہ خرچ ہوا ہو تو لے لو مگر وہ کہاں مانتے تھے۔ جب تک حساب ٹھیک نہ بیٹھتا، انہیں اطمینان نہ ہوتا۔ چلتے وقت کہتے کہ لیجیے صاحب، یہ آپ کا حساب ہے۔ اتنا خرچ ہوا اور اتنا بچا۔ یا کچھ زیادہ خرچ ہو جاتا تو کہتے اتنے پیسے ہمارے خرچ ہوئے، یہ ہمیں دلوائیے۔ کبھی ایسا ہوا کہ انہیں کچھ شبہ

ہوا تو جانے کے بعد پھر حساب لے کر بیٹھتے اور خط لکھ کر بھیجتے کہ اتنے آپ کے رہ گئے تھے، وہ بھیجے جاتے ہیں، یا اتنے پیسے میرے زیادہ خرچ ہو گئے تھے، وہ بھیج دیجیے گا۔ ڈاکٹر صاحب ان باتوں پر بہت جھنجھلاتے تھے۔

وہ حساب کے کھرے، بات کے کھرے اور دل کے کھرے تھے۔ وہ مہر و وفا کے پتلے اور زندہ دِلی کی تصویر تھے۔ ایسے نیک نفس، ہمدرد، مرنج و مرنجان اور وضع دار لوگ کہاں ہوتے ہیں؟ ان کے بڑھاپے پر لوگوں کو رشک آتا تھا اور ان کی مستعدی دیکھ کر دل میں اُمنگ پیدا ہوتی تھی۔ ان کی زندگی بے لوث تھی اور ان کی زندگی کا ہر لمحہ کسی نہ کسی کام میں صرف ہوتا تھا۔ مجھے وہ اکثر یاد آتے ہیں اور یہی حال ان کے دوسرے جاننے والوں اور دوستوں کا ہے اور یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ وہ کیسا اچھا آدمی تھا۔ قومیں ایسے ہی لوگوں سے بنتی ہیں۔ کاش ہم میں بہت سے نور خاں ہوتے۔

حالی

مولوی عبدالحق

غالباً ۱۸۹۲ء یا ۹۳ء کا ذکر ہے جب میں مدرستہ العلوم مسلمانان علی گڑھ میں طالبعلم تھا، مولانا حالؔی اس زمانے میں یونین کی پاس کی بنگیاں میں مقیم تھے۔ میں اس سال تعطیلوں کے زمانہ میں وطن نہیں گیا تھا بورڈنگ ہاؤس ہی میں رہا۔ اکثر مغرب کے بعد کچھ دیر کے لئے مولانا کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا۔ مولوی صاحب اس زمانے میں "حیات جاوید" کی تالیف میں مصروف تھے اور ساتھ ہی ساتھ "یادگار غالب" کو بھی ترتیب دے رہے تھے۔ انھیں دنوں میں میرے ایک عزیز میرے ہاں مہمان تھے، میں جو ایک دن مولانا کے ہاں جانے لگا تو وہ بھی میرے ساتھ ہوئے ۔ کچھ دیر مولانا سے بات چیت ہوتی رہی۔ لوٹتے وقت رستے میں عزیز مہمان فرمانے لگے کہ ملنے سے اور باتوں سے تو یہ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ وہی مولوی حالؔی ہیں جنھوں نے "مسدس" لکھا ہے۔ یہ مولانا کی فطری سادگی تھی جو اس خیال کا باعث ہوئی۔

ایک دوسرا واقعہ جو میری آنکھوں کے سامنے پیش آیا اور جس کا ذکر میں نے کسی دوسرے موقع پر کیا ہے۔ یہ ۱۹۰۵ء کا ذکر ہے جب غفران مآب اعلیٰ حضرت مرحوم کی حویلی بلدۂ حیدر آباد اور

تمام ریاست میں بڑے جوش اور شوق سے منائی جارہی تھی۔ مولانا حالی بھی اس حویلی میں سرکار کی طرف سے مدعو کیے گئے تھے اور نظام کلب کے ایک حصے میں ٹھہرائے گئے۔ زمانۂ قیام میں اکثر لوگ صبح سے شام تک ان سے ملنے کے لئے آتے رہتے تھے۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ ایک صاحب جو علی گڑھ کالج کے گریجویٹ اور حیدر آباد میں ایک معزز عہدے پر فائز تھے، مولانا سے ملنے آئے، ٹم ٹم پر سوار تھے۔ زینے کے قریب اترنا چاہتے تھے۔ سائیس کی جو شامت آئی تو اس نے گاڑی دو قدم آگے جا کر کھڑی کی۔ یہ حضرت اس ذرا سی چوک پر آپے سے باہر ہو گئے اور ساڑ ساڑ کئی ہنٹر غریب کے رسید کر دیئے۔ مولانا یہ نظارہ اوپر برآمدہ میں کھڑے دیکھ رہے تھے اس کے بعد وہ کھٹ کھٹ کر کے سیڑھیوں پر سے چڑھ کر اوپر آئے۔ مولانا سے ملے۔ مزاج پرسی کی اور کچھ دیر باتیں کر کے رخصت ہو گئے۔ میں دیکھ رہا تھا مولانا کا چہرہ بالکل متغیر تھا، وہ برآمدے میں ٹہلتے جاتے تھے اور کہتے تھے: ''ہائے ظالم نے کیا کیا—'' اس روز کھانا بھی اچھی طرح نہ کھا سکے، کھانے کے بعد قیلولے کی عادت تھی، وہ بھی نصیب نہ ہوا۔ فرماتے تھے: ''یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا وہ ہنٹر کسی نے میری پیٹھ پر مارے ہیں۔'' اس کیفیت سے جو کرب اور درد مولانا کو تھا وہ شاید اس بدنصیب سائیس کو بھی نہ ہوا ہوگا۔

مولانا کی سیرت میں یہ دو ممتاز خصوصیتیں تھیں۔ ایک سادگی اور دوسری درد دلی اور یہی شان ان کے کلام میں ہے۔ ان کی سیرت اور ان کا کلام ایک ہے یا یوں سمجھئے کہ ایک دوسرے کا عکس ہیں۔

مجھے اپنے زمانے کے نامور اصحاب اور اپنی قوم کے اکثر بڑے شخصوں سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے لیکن مولانا حالی جیسا پاک سیرت اور خصائل کا بزرگ مجھے ابھی تک کوئی نہیں ملا۔ نواب عماد الملک فرمایا کرتے تھے کہ سرسید کی جماعت میں بحیثیت انسان کے مولانا حالی کا پایہ بہت بلند تھا، اس بات میں سرسید بھی انھیں نہیں پہنچتے تھے، جن لوگوں نے انھیں دیکھا ہے، جو ان سے ملے ہیں، وہ ضرور اس قول کی تصدیق کریں گے۔

خاکساری اور فروتنی خلقی تھی، اس قدر بڑے ہونے پر بھی چھوٹے بڑے سب سے جھک کر اور خلوص سے ملتے تھے۔ جو کوئی ان سے ملنے آتا خوش ہو کر جاتا اور پھر عمر بھر ان کے حسن اخلاق کا مداح رہتا تھا۔ ان کا رتبہ بڑا تھا مگر انھوں نے کبھی اپنے آپ کو بڑا نہ سمجھا۔ بڑوں کا ادب اور چھوٹوں

پر شفقت تو وہ کرتے ہی تھے لیکن بعض اوقات وہ اپنے چھوٹوں کا بھی ادب کرتے تھے۔ طالب علمی کے زمانہ میں ایک بار جب وہ علی گڑھ میں مقیم تھے، میں اور مولوی حمید الدین مرحوم ان سے ملنے گئے تو وہ سروقد تعظیم کے لئے کھڑے ہو گئے۔ ہم اپنے دل میں بہت شرمندہ ہوئے۔ مولوی حمید الدین نے کہا بھی کہ آپ ہمیں تعظیم دے کر مجوب کرتے ہیں۔ فرمانے لگے کہ آپ لوگوں کی تعظیم نہ کروں تو کس کی کروں، آئندہ ہی تو قوم کے ناخدا ہونے والے ہیں۔

اس سے بڑھ کر خاکساری کا ثبوت کیا ہوگا کہ انھوں نے اپنی کتابوں پر جو اصلی معنوں میں تصنیف ہوتی تھیں، ہمیشہ ''مرتبہ'' لکھا۔ کبھی ''مولفہ'' یا ''مصنفہ'' کا لفظ نہیں لکھا۔

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے مشہور سفیر مولوی انوار احمد مرحوم کہتے تھے کہ ایک بار وہ پانی پت گئے۔ جاڑوں کا زمانہ تھا۔ اندھیرا ہو چکا تھا۔ اسٹیشن سے سیدھے مولانا کے مکان پر پہنچے۔ دالان کے پردے پڑے ہوئے تھے۔ انھوں نے پردہ اٹھایا اور جھانک کر دیکھا۔ مولوی صاحب فرش پر بیٹھے تھے اور سامنے آگ کی انگیٹھی رکھی تھی۔ انھیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور اٹھ کر ملے اور اپنے پاس بٹھالیا مزاج پرسی کے بعد کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں، اس کے بعد کھانا منگوایا، انوار احمد مرحوم کھانے کے بہت شوقین تھے۔ پانی پت کی ملائی بہت مشہور تھی۔ ان کے لئے ملائی منگوائی۔ کھانا کھانے کے بعد کچھ وقت بات چیت میں گزرا پھر ان کے لئے پلنگ بچھوا کر بستر کرا دیا اور خود آرام کرنے کے لئے اندر چلے گئے۔ یہ بھی تھکے ہوئے تھے پڑ کر سو رہے۔ مولوی انوار احمد کہتے تھے کہ رات کے بارہ ایک بجے انھیں ایسا محسوس ہوا کہ کوئی شخص ان کی رضائی کو آہستہ آہستہ چھو رہا ہے۔ انھوں نے چونک کر پوچھا کون؟ مولوی صاحب نے کہا: ''میں ہوں۔ آج سردی زیادہ ہے۔ مجھے خیال ہوا کہ شاید آپ کے پاس اوڑھنے کا سامان نہ ہو تو یہ کمبل لایا تھا اور آپ کو اوڑھا رہا تھا۔'' انوار احمد صاحب کہتے تھے کہ مجھ پر ان کی اس شفقت کا ایسا اثر ہوا کہ عمر بھر نہیں بھول سکتا۔

مہمان کے آنے سے (اور اکثر ایسا ہوتا تھا) وہ بہت خوش ہوتے تھے اور سچے دل سے خاطر تواضع کرتے تھے اور اس کے خوش رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔

مولانا بہت ہی رقیق القلب تھے۔ دوسرے کی تکلیف کو دیکھ کر بے چین ہو جاتے تھے۔

اور جہاں تک اختیار میں ہوتا، اس کے رفع کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ حاجب مندوں کی حاجت روا کرنے میں بڑی فراخدلی سے کام لیتے تھے۔ باوجود یہ کہ ان کی آمدنی قلیل تھی لیکن اپنے پرانے خصوصاً مصیبت زدہ لوگوں کے ساتھ سلوک کرتے رہتے تھے۔ سفارشیں کرکے لوگوں کے کام نکالتے تھے۔ اس میں بڑے چھوٹے کی کوئی تخصیص نہ تھی۔ بامروت ایسے تھے کہ انکار نہیں کرسکتے تھے۔ اس قلیل آمدنی پر بھی حاجت مندان کے ہاں سے محروم نہیں جاتے تھے۔

تعصب ان میں نام کو نہ تھا۔ ہر قوم وملت کے آدمی سے یکساں خلوص اور محبت سے پیش آتے تھے۔ ہندو مسلم اتحاد کے بڑے حامی تھے۔ جب کبھی ہندو مسلم نزاع کا کوئی واقعہ سنتے تھے انہیں بہت رنج وافسوس ہوتا تھا۔ تحریر وتقریر میں تو کیا نج کی اور بے تکلفی کی گفتگو میں بھی ان کی زبان سے بھی کوئی کلمہ ایسا سننے میں نہیں آیا جو کسی فرقے کی دل آزاری کا باعث ہو بلکہ اگر کوئی ایسی بات کہتا تو برا مانتے اور نصیحت کرتے تھے۔ بے تعصبی کا وصف انہی لوگوں میں پایا جاتا ہے جن کی طبیعت میں انصاف ہوتا ہے۔

ہندی اردو کا جھگڑا ان کے زمانے میں پیدا ہو چکا تھا اور اس نے ناگوار صورت اختیار کرلی تھی لیکن باوجود اس کے کہ انھوں نے عمر بھر اردو کی خدمت کی اور اپنی تحریروں سے اردو کا درجہ بہت بلند کردیا۔ وہ انصاف کی بات کہنے سے کبھی نہ چوکے۔ چنانچہ ''خم خانۂ جاوید'' کے تبصرے میں لکھتے ہیں:

> ''آج کل اہلِ ملک کی بدقسمتی ہے جو اختلاف ہندو اور مسلمانوں میں اردو زبان کی مخالفت یا اس کی حمایت کی وجہ سے برپا ہے، اس کی رفعداد ہوسکتی ہے تو اس طریقے سے ہوسکتی ہے کہ ہندو تعلیم یافتہ اصحاب کشادہ دلی اور فیاضی کے ساتھ اردو زبان میں جو درحقیقت برج بھاشا کی ایک ترقی یافتہ صورت اور اس کی ایک پروان چڑھی ہوئی اولاد ہے اسی طرح تصنیف وتالیف کریں۔ جس طرح ہمارے ہردلعزیز ہیرو نے اس طولانی تذکرے کو ختم کرنے کا ارادہ کیا ہے اور مسلمان مصنفین بے ضرورت اردو میں عربی فارسی کے غیر مانوس الفاظ استعمال کرنے سے جہاں تک ہوسکے پرہیز

کریں اوران کی جگہ برج بھاشا کے مانوس اور عام فہم الفاظ سے اردو کو مالا
مال کرنے کی کوشش کریں اوراس طرح دونوں قوموں میں آشتی اور صلح کی
بنیاد ڈالیں اور ایک متنازع فیہ زبان کو مقبولۂ فریقین بنائیں جیسی کہ لکھنؤ
جانے سے پہلے تقریباً اہلِ دہلی کی زبان تھی۔ مذکورہ بالا اختلاف کے متعلق
جو تعصب اور ناگواری کا الزام ہندوؤں پر لگایا جاتا ہے۔ اس قسم کا بلکہ اس
سے زیادہ سخت الزام مسلمانون پر لگایا جاسکتا ہے کون نہیں جانتا کہ مسلمان
باوجود یہ کہ تقریباً ایک ہزار برس سے ہندوستان میں آباد ہیں مگر اس طویل
مدت میں انھوں نے چند مستثنیات کو چھوڑ کر کبھی سنسکرت یا برج بھاشا کی
طرف باوجود سخت ضرورت کے آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا جس سنسکرت کو یورپ
کے محقق لاطینی و یونانی سے زیادہ فصیح، زیادہ وسیع اور زیادہ باقاعدہ بتاتے
ہیں اور جس کی تحقیقات میں عمریں بسر کردیتے ہیں۔ مسلمانوں نے عام
طور پر کبھی اس کو قابل التفات نہیں سمجھا۔ اگر یہ کہا جائے کہ سنسکرت کا سیکھنا
کوئی آسان کام نہیں ہے تو برج بھاشا جو بمقابلۂ سنسکرت کے نہایت سہل
الوصول ہے اور جس کی شاعری نہایت لطیف، شگفتہ اور فصاحت و بلاغت
سے لبریز ہے اس کو بھی عموماً بیگانہ وار نظروں سے دیکھتے رہے حالانکہ جو
اردو ان کو اس قدر عزیز ہے اس کی گریمر کا دارومدار بالکل برج بھاشا یا
سنسکرت کی گریمر پر ہے۔ عربی فارسی سے اس کو اس قدر تعلق ہے کہ دونوں
زبانوں کے اسماء اس میں کثرت کے ساتھ سامل ہو گئے ہیں۔ باقی تمام
اجزائے کلام جن کے بغیر کسی زبان کی نظم و نثر مفید معنی نہیں ہوسکتی، برج
بھاشا یا سنسکرت کی گریمر سے ماخوذ ہیں۔ سچ یہ ہے کہ مسلمانوں کا ہندوستان
رہنا اور سنسکرت یا کم سے کم برج بھاشا سے بے پروا یا متنفر ہونا بالکل اپنے
تئیں اس مثل کا مصداق بناتا ہے کہ ''دریا میں رہنا اور مگر مچھ سے بیر۔''

یہ بات بعض لوگوں کو بہت ناگوار گزری اور بعض اردو اخباروں نے اس کی تردید بھی چھاپی

لیکن جو سچی بات تھی وہ کہہ گزرے، اس خیال کا اظہار انھوں نے کئی بار کیا ہے کہ جو شخص اردو کا ادیب اور محقق ہونا چاہتا ہے اسے سنسکرت یا کم سے کم ہندی بھاشا کا جاننا ضروری ہے ''مقدمہ شعرو شاعری'' میں ایک مقام پر فرماتے ہیں:

> ''اردو پر قدرت حاصل کرنے کے لئے صرف دلّی یا لکھنؤ کی زبان کا تتبع ہی کافی نہیں ہے بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ عربی فارسی سے کم متوسط درجے کی لیاقت اور نیز ہندی بھاشا میں فی الجملہ دستگاہ بہم پہنچائی جائے۔ اردو زبان کی بنیاد جیسا کہ معلوم ہے ہندی بھاشا پر رکھی گئی ہے، اس کے تمام افعال اور تمام حروف اور غالب حصہ اسماء کا ہندی سے ماخوذ ہے اور اردو شاعری کی بنا فارسی شاعری پر جو عربی شاعری سے مستفاد ہے قائم ہوئی ہے، نیز اردو زبان میں بڑا حصہ اسماء کا عربی اور فارسی سے ماخوذ ہے۔ پس اردو زبان کا شاعر جو ہندی بھاشا کو مطلق نہیں جانتا اور محض عربی و فارسی کے تان گاڑی چلاتا ہے وہ گویا اپنی گاڑی بغیر پہیوں کے منزلِ مقصود تک پہنچانی چاہتا ہے اور جو عربی و فارسی سے نابلد ہے اور صرف ہندی بھاشا یا محض مادری زبان کے بھروسہ پر اس بوجھ کا متحمل ہوتا ہے وہ ایسی گاڑی ٹھیلتا ہے جس میں بیل نہیں جوتے گئے۔''

ایک بار جب اردو لغت کی ترتیب کا ذکر ان سے آیا تو فرمانے لگے کہ اردو لغات میں ہندی کے وہ الفاظ جو عام بول چال میں آتے ہیں یا جو ہماری زبان میں کھپ سکتے ہیں بلا تکلف کثرت سے داخل کرنے چاہئیں۔ خود اپنی نظم و نثر میں وہ ہندی الفاظ ایسی خوبصورتی سے لکھ جاتے تھے کہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ گویا اسی موقع کے لئے وضع ہوئے تھے۔ انھوں نے بہت سے ایسے الفاظ اردو ادب میں داخل کئے جو ہماری نظروں سے اوجھل تھے اور جن کا آج تک کسی ادیب یا شاعر نے تو کیا ہندی ادیبوں اور شاعروں نے بھی استعمال نہیں کیا تھا۔ لفظ کا صحیح اور برمحل استعمال جس سے کلام میں جان پڑ جائے اور لفظ خود بول اٹھے کہ لکھنے والے کے دل میں کیا چیز کھٹک رہی ہے ادیب کا بڑا کمال ہے اور یہ کوئی حالی سے سیکھے دلوں میں گھر کر لینے کے جو گر ادب میں ہیں، ان میں سے ایک

یہ بھی ہے۔

نام ونمود چھو کر نہیں گیا تھا۔ ورنہ شہرت وہ بد بلا ہے کہ جہاں یہ آتی ہے کچھ نہ کچھ شیخی آہی جاتی ہے۔ ہمارے شاعروں میں تو تعلّی عیب ہی نہیں رہی۔ بلکہ شیوہ ہو گئی ہے۔ وہ سیدھی سادی باتیں کرتے تھے اور جیسا کہ عام طور پر دستور ہے باتوں باتوں میں شعر پڑھنا، بحث کر کے اپنی فضیلت جتانا اور اشارے کنائے میں دوسروں کی تحقیر اور در پردہ اپنی بڑائی دکھانا ان میں بالکل نہ تھا۔ ہاں شعر میں البتہ کہیں کہیں تعلّی آ گئی ہے، مگر وہ بھی ایسے لطیف پیرائے میں کہ خاکساری کا پہلو وہاں بھی ہاتھ سے جانے نہیں پایا۔ مثلاً:

گرچہ حالؔی اگلے استادوں کے آگے ہیچ ہے
کاش ہوتے ملک میں ایسے ہی اب دو چار ہیچ

یا

مال ہے نایاب پر گاہک ہیں اس سے بے خبر
شہر میں کھولی ہے حالؔی نے دکاں سب سے الگ

ان کا ذوقِ شعر اعلیٰ درجہ کا تھا جیسا کہ ''حیاتِ سعدی''، ''یادگارِ غالب'' اور ''مقدمۂ شعرو شاعری'' سے ظاہر ہے لیکن وہ خواہ مخواہ اس کی نمائش نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ہاں جب کوئی پوچھتا یا اتفاق سے بات آ پڑتی تو وہ کھل کر اس کے نکات بیان کرتے تھے۔

ہمارے ہاں یہ دستور سا ہو گیا ہے کہ جب کبھی تو کوئی کسی شاعر سے ملتا ہے تو اس سے اپنا کلما سنانے کی فرمائش کرتا ہے۔ شاعر تو شاعر سے اس لئے فرمائش کرتا ہے کہ اسے بھی اپنا کلام سنانے کا شوق گدگداتا ہے اور جانتا ہے کہ اس کے بعد مخاطب بھی اس سے یہی فرمائش کرے گا اور بعض اوقات تو اس کی بھی ضرورت نہیں پڑتی، بغیر فرمائش ہی اپنے کلام سے محفوظ فرمانے لگتے ہیں۔ دوسرے لوگ اس لئے فرمائش کرتے ہیں کہ شاعر ان سے اس کی توقع رکھتا ہے (بعض شاعر تو اس کے لئے بے چین رہتے ہیں) لیکن بعض لوگ سچے دل سے اس بات کے آرزومند ہوتے ہیں کہ کسی شاعر کا کلام اس کی زبان سے سنیں۔ لوگ مولانا حالی سے بھی فرمائش کرتے تھے، وہ کسی نہ کسی طرح ٹال جاتے تھے اور اکثر یہ عذر کر دیتے تھے کہ میرا حافظ بہت کمزور ہے اپنا لکھا بھی یاد

نہیں رہتا۔ یہ محض عذر لنگ ہی نہ تھا اس میں کچھ حقیقت بھی تھی۔ لیکن اصل بات یہ تھی کہ وہ خود نمائی سے بہت بچتے تھے۔

جن دنوں مولانا حالی کا قیام حیدر آباد میں تھا ایک دن گرامی مرحوم نے چائے کی دعوت کی۔ چند اور احباب کو بھی بلایا، چائے وغیرہ کے بعد جیسا کہ معمول ہے فرمائش ہوئی کہ کچھ اپنا کلام سنایئے۔ مولانا نے وہی حافظ کا عذر کیا ہر چند لوگوں نے کہا کہ جو کچھ بھی ہو یاد وہ فرمایئے۔ مگر مولانا عذر ہی کرتے رہے اتنے میں ایک صاحب کو خوب سوجھی، وہ چپکے سے اٹھے اور کہیں سے دیوان حالی لے آئے اور رلا کے سامنے رکھ دیا۔ اب مجبور ہوئے کہ کوئی عذر نہیں چل سکتا تھا۔ آخر انھوں نے یہ غزل سنائی جس کا مطلع تھا:

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب ٹھیرتی ہے دیکھئے جا کر نظر کہاں

آج کل تو ہمارے اکثر شاعر لے سے یا خاص طور سے گا کے پڑھتے ہیں۔ ان کا ذکر نہیں لیکن جو تحت اللفظ پڑھتے ہیں، ان میں بعض طرح طرح سے چشم و ابرو، ہاتھ، گردن اور جسم سے کام لیتے اور بعض اوقات ایسی صورتیں بناتے ہیں کہ بے اختیار ہنسی آجاتی ہے۔ مولانا سیدھے سادے طور سے پڑھتے تھے۔ البتہ موقع کے لحاظ سے اس طرح ادا کرتے کہ اس سے اثر پیدا ہوتا تھا۔ ایک بار علی گڑھ کالج میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ جلسہ تھا۔ مولانا کا مزاج کچھ علیل تھا انھوں نے اپنی نظم پڑھنے کے لئے مولوی وحیدالدین سلیم صاب کو دی جو بہت بلند آواز مقرر، پڑھنے میں کمال رکھتے تھے۔ سلیم صاحب ایک ہی بند پڑھنے پانے تھے کہ مولانا سے نہ رہا گیا۔ نظم ان کے ہاتھ سے لے لی اور خود پڑھنی شروع کی۔ ذرا سی دیر میں ساری مجلس میں کہرام مچ گیا۔

سرسید تو اس زمانے میں خیر مورد لعن وطعن تھے ہی اور ہر کس و ناکس ان پر منھ آتا تھا۔ لیکن اس کے بعد جس پر سب سے زیادہ اعتراضات کی بوچھاڑ پڑی وہ حالؔی تھے۔ ایک تو ہر وہ شخص جس کا تعلق سید احمد خاں سے تھا، یوں ہی مردود سمجھا جاتا تھا، اس پر ان کی شاعری جو عام رنگ سے جدا تھی اور نشانہ ملامت بن گئی تھی اور ''مقدمۂ شعر و شاعری'' نے تو خاصی آگ لگا دی۔ اہلِ لکھنؤ اس معاملے میں چھوئی موئی سے کم نہیں، وہ معمولی سی تنقید کے بھی روادار نہیں ہوتے۔ انھیں یہ وہم ہو گیا

تھا کہ یہ ساری کاروائی انھیں کی مخالفت میں کی گئی ہے۔ پھر کیا تھا ہر طرف سے نکتہ چینی اور طعن وتعریض کی صدا آنے لگی۔ ''اودھ پنچ'' میں ایک طویل سلسلۂ مضامین ''مقدمہ'' کے خلاف مدت تک نکلتا رہا جو ادبی تنقید کا عجیب وغریب نمونہ تھا وہ صرف بے تکے اور مہمل اعتراضات ہی کا مجموعہ نہ تھا بلکہ پھکڑ اور پھبتیوں تک نوبت پہنچ گئی تھی، جن مضامین کا عنوان:

ابتر ہمارے حملوں سے حالی کا حال ہے
میدان پانی پت کی طرح پائمال ہے

تو اس سے سمجھ لیجئے کہ اس عنوان کے تحت کیا کچھ خرافات نہ بکی گئی ہوگی، مولانا یہ سب کچھ سہتے رہے لیکن کبھی ایک لفظ زبان سے نہ نکالا:

کیا پوچھتے ہو کیوں کر سب نکتہ چیں ہوئے چپ
سب کچھ کہا انھوں نے پر ہم نے دم نہ مارا

لیکن آخر ایک وقت آیا کہ نکتہ چینوں کی زبانیں بند ہوگئیں اور وہی لوگ جو انھیں شاعر تک نہیں سمجھتے تھے، ان کی تقلید کرنے لگے:

غل تو بہت یاروں نے مچایا پر گئے اکثر مان ہمیں

مخالفت سہنے کا ان میں عجیب وغریب مادہ تھا۔ کیسا ہی اختلاف ہو، وہ صبر کے ساتھ رہتے تھے۔ جواب دیتے تھے لیکن حجت نہیں کرتے تھے بعض اوقات نامعقول بات اور کٹ حجتی پر غصہ آتا تھا لیکن ضبط سے کام لیتے تھے۔ ضبط اور اعتدال ان کے بہت بڑے اوصاف تھے اور یہ دو خوبیاں ان کے کلام میں بھی اکاہل طور پر پائی جاتی ہیں۔ یہ ادیب کا بڑا کمال ہے یہ بات صرف اساتذہ کے کلام میں پائی جاتی ہے۔ ورنہ جوش میں آکر آدمی سر رشتۂ اعتدال کھو بیٹھتا ہے اور بہک کر کہیں کا کہیں نکل جاتا ہے اور بجائے کچھ کہنے کے چیخنے چلانے لگتا ہے۔

ان کا ایک نواسہ تھا ماں اس کی بیوہ تھی اور اس کا ایک ہی لڑکا تھا۔ اکلوتا لڑکا بڑا لاڈلا ہوتا ہے اس پر ایک آفت یہ تھی کہ صرع کی بیماری میں مبتلا تھا اس لئے ہر طرح اس کی خاطر اور رضا جوئی منظور تھی۔ وہ مولانا کو بہت دق کرتا مگر وہ اف تک نہ کرتے۔ وہ اینڈے بینڈے سوالات کرتا۔ یہ بڑے تحمل سے جواب دیتے۔ وہ فضول فرمائشیں کرتا۔ یہ اس کی تعمیل کرتے۔ وہ خفا ہوتا اور بگڑتا، یہ

اس کی دلدہی کرتے۔ وہ روٹھ جاتا۔ یہ اسے مناتے وہ لڑ کر گھر سے بھاگ جاتا یہ اسے ڈھونڈتے پھرتے۔ پانی پت سے کہیں باہر جاتے تو وہ انہیں دھمکی آمیز خط لکھتا۔ یہ شفقت آمیز خط لکھتے اور سمجھاتے بجھاتے۔ کچھ اس کی دکھیا ماں کا پاس، وہ سب سے زیادہ اس پر شفقت فرماتے اور اس کی ہٹ، خفگی، روٹھنے مچلنے کو سہتے اور کبھی آزردگی یا بیزاری کا اظہار نہ کرتے۔ اگرچہ جوان ہو گیا تھا مگر مزاج اس کا بچوں کا تھا۔ سلیم مرحوم فرماتے تھے یہ ایک بار اس نے مولانا کو ایسا دھمکایا کہ وہ گر پڑے۔ کہیں خواجہ سجاد حسین صاحب نے دیکھ لیا۔ وہ بہت برہم ہوئے اور شاید اس کے ایک تھپڑ مار دیا۔ مولوی صاحب اس پر سخت ناراض ہوئے اور خواجہ صاحب سے بات چیت موقوف کر دی اور جب تک انھوں نے اس لڑکے سے معافی نہیں مانگ لی، ان سے صاف نہ ہوئے۔

مولانا نے دنیاوی جاہ و مال کی کبھی ہوس نہیں کی۔ جس حالت پر تھے، اس پر قانع تھے اور خوشی خوشی زندگی بسرت کرتے اور اس میں اوروں کی بھی مدد کرتے رہتے تھے۔ ان کی قناعت کا ثبوت اس سے بڑھ کر کیا ہوگا کہ انہیں عربک اسکول میں ساٹھ روپیہ ماہانہ تنخواہ ملتی تھی۔ جب حیدر آباد میں ان کی وظیفے کی کاروائی ہوئی تو انھوں نے ساٹھ سے زیادہ طلب نہ کئے جس کے تخمیناً ۷۵ر حالی ہوتے ہیں۔ ایک مدت تک ۷۵ر ہی ملتے رہے۔ بعد میں پچیس کا اضافہ ہوا۔ ریاست حیدر آباد سے معمولی آدمیوں کو بیش قرار وظیفے ملتے ہیں، وہ چاہتے تو کچھ مشکل نہ تھا مگر انھوں نے کبھی زیادہ کی ہوس نہ کی اور جو ملتا تھا وہ اس کے لئے بہت شکر گزار تھے۔

غالباً سوائے ایک آدھ کے انھوں نے کبھی اپنی کسی کتاب کی رجسٹری نہ کرائی۔ جس نے چاہا چھاپ لی۔ ان کی تصانیف مال یغما تھیں۔ مسدس تو اتنا چھپا کہ شاید ہی کوئی کتاب چھپی ہو۔ یہ کیسی سیر چشمی اور حالی ظرفی کی بات ہے۔ خصوصاً ایسے شخص کے لئے جس کی آمدنی محدود اور بڑھتی ہوئی ضرورتوں سے کم ہو۔

مروت کے پتلے تھے۔ جب تک خاص مجبوری نہ ہو، کسی کی درخواست رد نہیں کرتے تھے۔ وقت بے وقت لوگ آجاتے اور فضول باتوں میں وقت ضائع کرتے، وہ بیٹھے سنا کرتے لیکن محض دل آزاری کے خیال سے یہ نہ ہوتا کہ خود اٹھ کر چلے جاتے یا کنایتاً اشارتاً کوئی ایسی بات کہتے کہ لوگ اٹھ جاتے حیدر آباد کے قیام میں میں نے اس کا خوب تماشا دیکھا۔

اس طرح طبیعت میں حیا بھی تھی۔ جس سال حیدر آباد تشریف لائے، سرسید کی برسی کا جلسہ بھیا نہیں کی موجودگی میں ہوا۔ ان سے خاص طور سے درخواست کی گئی کہ اس جلسے کے لئے سرسید کی زندگی پر کوئی مضمون پڑھیں۔ نواب عماد الملک بہادر صدر تھے۔ مولانا نے اس موقع کے لئے بہت اچھا مضمون لکھا تھا۔ مضمون ذرا طویل تھا۔ پڑھتے پڑھتے شام ہوگئی، اس لئے آخری حصہ چھوڑ دیا قیامگاہ واپس آ کر فرمانے لگے میرا گلا بالکل خشک ہو گیا تھا اور حلق میں کانٹے پڑ گئے تھے۔ اچھا ہوا جو اندھیرا ہو گیا، ورنہ اس سے آگے ایک حرف نہ پڑھا جاتا۔ میں نے کہا وہاں پانی شربت وغیرہ کا سب انتظام تھا، آپ نے کیوں نہ فرمایا اسی وقت پانی یا شربت حاضر کر دیا جاتا کہنے لگے اتنے بڑے مجمع میں پانی مانگتے ہوئے شرم معلوم ہوئی۔

جب کسی ہونہار تعلیم یافتہ نوجوان کو دیکھتے تو بہت خوش ہوتے اور حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ قدردانی کا یہ حال تھا کہ جہاں کوئی اچھی تحریر نظر سے گزرتی تو اس کی فوراً داد دیتے اور خط لکھ کر لکھنے والے کی ہمت بڑھاتے تھے۔ ”پیسہ“ اخبار جب روزانہ ہوا تو سب سے پہلے مولانا نے مبارک باد کا تار دیا۔ مولوی ظفر علی خاں کی کارگزاریوں سے خوش ہو کر ان کی تعریف میں نظم لکھی ”ہمدردی“ اور مولانا محمد علی کی مدح سرائی کی اور جب کبھی کوئی ایسی بات دیکھتے جو قابلِ اعتراض ہوتی تو بڑی ہمدردی اور شفقت سے سمجھاتے اور اس کا دوسرا پہلو سمجھاتے۔ ان کے خطوں میں ایسے بہت سے اشارے پائے جاتے ہیں۔ ان کے بعض ہمعصر اس بات سے ناراض ہوتے تھے کہ مولانا داد دینے اور تعریف کرنے میں بڑی فیاضی برتتے ہیں۔ جس سے لوگوں کا دماغ پھر جاتا ہے۔ ممکن ہے یہ صحیح ہو۔ لیکن اس کا دوسرا پہلو بھی تو ہے۔ ان کی ذرا سی داد سے کتنا دل بڑھ جاتا تھا اور آئندہ کام کرنے کا حوصلہ ہوتا تھا۔

ہم عصروں اور ہم چشموں کی رقابت پرانی چیز ہے اور ہمیشہ سے چلی آ رہی ہے، جہاں تک مجھے ان سے گفتگو کرنے کا موقع ملا اور بعض وقت چھیڑ چھیڑ کر اور کرید کرید کر دیکھا اور ان کی تحریروں کے پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ مولانا اس عیب سے بری معلوم ہوتے ہیں۔ محمد حسین آزاد اور مولانا شبلی کی کتابوں پر کیسے اچھے تبصرے لکھے ہوئے اور جو باتیں قابل تعریف ہیں ان کی دل کھول کر داد دی ہے۔ مگر ان بزرگوں میں سے کسی نے مولانا کی کسی کتاب کے متعلق کچھ نہیں لکھا۔ آزاد مرحوم ان کا

نام تک سننے کے روادار نہ تھے۔ اس معاملے میں ان کی طبیعت کا رنگ بعینہ ایسا تھا جیسے کسی سوت کا ہوتا ہے۔ لاہور میں کرنل ہالرائڈ کی زیر ہدایت جو جدید رنگ کے شاعر ہوئے ان میں دونوں میں طبع آزائی کی۔ ''برکھارت''، ''حبِ وطن''، ''نشاطِ امید'' اسی زمانے کی نظمیں ہیں۔ مولانا کی ان نظموں کی جو تعریفیں ہوئیں تو یہ امر حضرت آزاد کی طبع نازک کی گرہ گزرا۔ اس وقت سے ان کا رخ ایسا پھرا آخر دم تک یہ پھانس نہ نکلی۔ آزاد اپنے رنگ کے بے مثال نثار ہیں مگر شعر کے کوچہ میں ان کا قدم نہیں اٹھتا لیکن مولانا کی انصاف پسندی ملاحظہ کیجئے، کیسے صاف لفظوں میں اس نئی تحریک کا سہرا آزاد کے سر باندھتے ہیں:

> ''۱۸۷۴ء میں جب کہ راقم پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو سے متعلق اور لاہور میں مقیم تھا مولوی محمد حسین آزاد کی تحریک اور کرنل ہالرائڈ ڈائرکٹر سر رشتہ تعلیم پنجاب کی تائید انجمن پنجاب نے ایک شاعرہ قائم کیا تھا جو ہر مہینے ایک بار انجمن کے مکان میں منعقد ہوتا تھا۔''

بات میں یہ بات نکل آتی ہے، جب ''حیات جاوید'' شائع ہوئی تو مولانا نے تین نسخے مجھے بھیجے تھے۔ ایک میرے لئے ایک مولوی عزیز مرزا کے لئے اور تیسرا ایک محترم بزرگ اور ادیب جو اس وقت اتفاق سے حیدرت اتفاق سے حیدر آباد میں وارد تھے۔ میں نے لے جا کر یہ کتاب ان کی خدمت میں پیش کی۔ شکریہ تو رہا ایک طرف دیکھتے ہی فرمایا کہ ''یہ کذب وافترا کا آئینہ ہے'' وہاں اور بھی کئی صاحب موجود تھے۔ میں یہ سن کر دم بخود رہ گیا یوں بھی کچھ کہنا سرادب تھا لیکن جہاں پڑھنے سے پہلے ایسی رائے کا اظہار کر دیا ہو وہاں زبان سے کچھ نکالنا بیکار تھا۔

اب اس کے مقابلے میں ایک واقعہ سنئے۔ قیام حیدر آباد میں ایک روز مولوی ظفر علی خاں مولانا سے ملنے آئے۔ اس زمانے میں وہ ''دکن ریویو'' نکالتے تھے۔ کچھ عرصے پہلے اس رسالے میں ایک دو مضمون مولانا شبلی کی کسی کتاب یا رسالے پر شائع ہوئے تھے۔ ان میں کسی قدر بے جا شوخی سے کام لیا گیا تھا، مولانا نے اس کے متعلق ظفر علی خاں سے ایسے شفقت آمیز پیرائے میں نصیحت کرنی شروع کی کہ ان سے کوئی جواب نہ بن پڑا، اور سر جھکائے آنکھیں نیچی کئے چپ چاپ سنا کئے۔ مولانا نے یہ فرمایا کہ میں تنقید سے منع نہیں کرتا۔ تنقید بہت اچھی چیز ہے اور اگر آپ لوگ

تنقید نہ کریں گے تو ہماری اصلاح کیونکر ہوگی لیکن تنقید میں ذاتیات سے بحث کرنا یا ہنسی اڑانا منصب تنقید کے خلاف ہے۔

خود مولانا پر بہت سی تنقیدیں لکھی گئیں اور نکتہ چینیاں کی گئیں لیکن انھوں نے کبھی اس کا برانہ مانا۔ مولانا حسرت موہانیکا واقعہ جو مجھ سے مولوی سلیم مرحوم نے بیان فرمایا اور ابشیخ اسمٰعیل صاحب نے اپنے مضمون میں لکھا ہے بہت ہی پر لطف ہے۔

۱۹۰۳ء جب مولوی فضل الحسن صاحب حسرت موہانی نے علی گڑھ سے ''اردو معلٰی'' جاری کیا تو جدید شاعری کے اس مجدد اعظم پر بھی اعتراضات کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع کیا۔ مولانا کے پاس اگر چہ ''اردو معلٰی'' باقاعدہ پہنچتا تھا مگر نہ آپ نے کبھی اعتراضات کا جواب دیا اور نہ مخالفت پر ناراضگی کا اظہار فرمایا۔

علی گڑھ کالج میں کوئی عظیم الشان تقریب تھی۔ نواب محسن الملک مرحوم کے اصرار پر مولانا حالی بھی اس میں شرکت کی غرض سے تشریف لائے اور حسب معمول سید زین العابدین مرحوم کے مکان پر فروکش ہوئے۔ ایک صبح حسرت موہانی دوستوں کو ساتھ لئے ہوئے مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ چندے ادر ادھر کی باتیں ہوا کیں اتنے میں سید صاحب موصوف نے بھی اپنے کمرے سے حسرت کو دیکھا۔ ان مرحوم میں لڑکپن کی شوخی اب تک باقی تھی۔ اپنے کتب خانے میں گئے اور ''اردو معلٰی'' کے دو تین پرچے اٹھالائے۔

حسرت اور ان کے دستوں کا ماتھا ٹھنکا کہ اب خیر نہیں اور اٹھ کر جانے پر آمادہ ہوئے مگر زین العابدین کب جانے دیتے تھے۔ خود پاس بیٹھ گئے۔ ایک پرچہ کے ورق الٹنا شروع کئے اور مولانا حالی کو مخاطب کر کے حسرت اور ''اردو معلٰی'' کی تعریفوں کے پل باندھ دیئے۔ کسی مضمون کی دو چار سطریں پڑھتے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

اتنے میں سید صاحب مصنوعی حیرت بلکہ وحشت کا اظہار کر کے بولے: ''اے مولانا! یہ دیکھئے، آپ کی نسبت کیا لکھا ہے؟ اور کچھ اس قسم کے الفاظ شروع کئے۔'' سچ تو یہ ہے کہ حالی سے بڑھ کر محروب زبان کوئی ہو نہیں سکتا اور جتنی جلد اپنے قلم کو اردو کی خدمت سے روکیں اتنا ہی اچھا ہے۔

فرشتہ منش حالی ذرا مکدّر نہیں ہوئے اور مسکرا کر کہا: ''تو یہ کہا کہ نکتہ چینی اصلاح زبان کا ایک بہترین ذریعہ ہے۔اور یہ عیب میں داخل نہیں۔''

کئی روز بعد ایک دوست نے حسرت سے پوچھا کہ: ''حالی کے خلاف اب بھی کچھ لکھو گے؟'' جواب دیا کہ: ''جو کچھ لکھ چکا ہوں، اسی کا ملال اب تک دل پر ہے۔''

(رسالہ زمانہ، ماہ دسمبر، ۱۹۰۸ء، جلد:۱۱، نمبر:۶، ص:۲۹۸-۲۹۹، ماخوذ از تذکرۂ حالی، ص:۱۹۵-۱۹۸)

مولانا حالی انگریزی مطلق نہیں جانتے تھے، ایک آدھ بار سیکھنے کا ارادہ کیا، نہ ہوسکا لیکن حیرت یہ ہے کہ مغربی تعلیٰ و تہذیب کے منشا کو جیسا کہ وہ سمجھتے تھے اس وقت بہت سے انگریز تعلیم یافتہ نہیں سمجھتے تھے۔ان کا کلام اور ان کی تصانیف اس کی شاہد ہیں اور جو یہ سمجھتے تھے وہ کر کے دکھایا آج سینکڑوں تعلیم یافتہ موجود ہیں لیکن ان میں سے کتنے ہیں جنھوں نے اس کا عشر عشیر بھی کیا ہو پھر یہی نہیں کہ ہمارے شاعروں اور مصنفوں کی طرح بالکل خیالی شخص تھے بلکہ جو کہتے اور سمجھتے تھے اس پر عامل بھی تھے۔آدمی مفکر بھی ہو اور عملی بھی ایسا شاذ ہوتا ہے، تاہم مولانا نے اپنی بساط کے موافق عملی میدان میں بھی اپنی دو یادگاریں چھوڑی ہیں۔ایک تو انھوں نے اپنے وطن پانی پت میں مدرسہ قائم کیا جو اب حالی مسلم ہائی اسکول کے نام سے موسوم ہے اور ایک پبلک اورینٹل لائبریری قائم کی جو پانی پت میں سب سے بلند اور پر فضا مقام پر واقع ہے۔اس میں کتابوں کا ایک اچھا خاص ذخیرہ ہے جس سے پانی پت والے مستفید ہوتے۔

مولانا کمزوروں اور بے کسوں کے بڑے حامی تھے۔خاص کر عورتوں کی جو ہمارے ہاں سب سے بے کس فرقہ ہے، انھوں نے ہمیشہ حمایت کی۔''مناجاتِ بیوہ'' اور ''چپ کی داد'' یہ دو ایسی نظمیں ہیں جن کی نظیر ہماری زبان میں کیا، ہندوستان کی کسی زبان میں نہیں۔ان نظموں کے ایک ایک مصرع سے خلوص، جوش، ہمدردی اور اثر ٹپکتا ہے۔یہ نظمیں نہیں، دل و جگر کے ٹکڑے ہیں۔لکھنا تو بڑی بات ہے، کوئی انھیں بے چشم نم پڑھ بھی نہیں سکتا۔

جن لوگوں نے صرف ان کا کلام پڑھا ہے شاید وہ سمجھتے ہوں گے کہ مولانا ہر وقت روتے اور بسورتے رہتے ہوں گے۔اس میں شک نہیں کہ ان کا دل درد سے لبریز تھا اور ذرا سی ٹھیس سے چھلک اٹھتا تھا۔مگر وہ بڑے شگفتہ مزاج اور خوش طبع تھے۔خصوصاً اپنے ہم صحبت یاروں میں بڑی

ظرافت اور شوخی سے باتیں کرتے تھے۔ ان کے کلام میں بھی کہیں کہیں ظرافت اور زیادہ تر طنز کی جھلک نظر آتی ہے۔

جدید تعلیم کے بڑے حامی تھے اور اس کی اشاعت اور تلقین میں مقدور بھر کوشش کرتے رہے لیکن آخر عمر میں ہمارے کالجوں کے طلباء کو دیکھ کر انھیں کسی قدر مایوسی ہونے لگی تھی۔ مجھے خوب یاد ہے کہ جب ان کے نام حیدر آباد میں ایک روز "اولڈ بوائے" آیا تو اسے پڑھ کر بہت افسوس کرنے لگے کہ اس میں سوائے مسخرا پن کے کچھ بھی نہیں ہوتا۔ انھیں علی گڑھ کے طلباء سے اس سے اعلیٰ توقع تھی۔

ان کی بڑی خواہش تھی کہ اردو زبان میں اعلیٰ درجہ کے ناول خصوصاً ڈرامے لکھے جائیں اور اس بات پر افسوس کرتے تھے کہ یورپین زبانوں سے بہترین ناولوں اور ڈراموں کا اردو میں ترجمہ نہیں کیا گیا تا کہ وہ نمونے کا کام دیں۔ یہ گفتگو انھوں نے کچھ اس ڈھنگ سے کی جس سے مترشح ہوتا تھا کہ انکا جی چاہتا تھا کہ خود کوئی ڈرامہ لکھیں لیکن اسٹیج سے واقف نہ ہونے اور کوئی عمدہ نمونہ سامنے نہ ہونے سے مجبور ہیں۔

آخر میں ان کی دو بڑی تمنائیں تھیں۔ ایک تو اردو زبان میں تذکیر وتانیث کے اصول منضبط کرنا اور ایک کوئی اور بات تھی جو اس وقت میرے بے ذہن سے بالکل نکل گئی ہے۔ جب میرا تقرر اورنگ آباد پر ہوا تھا تو میں نے مولانا کی خدمت میں لکھا کہ یہاں کی ہوا بہت معتدل اور خوش گوار ہے۔ پانی بہت لطیف ہے اور خصوصاً جس مقام پر میں رہتا ہوں وہ بہت ہی پر فضا ہے۔ آپ کچھ دنوں کے لئے یہاں تشریف لے آیئے۔ صحت کو بھی فائدہ ہوگا اور جو کام آپ کرنا چاہتے ہیں وہ بھی آسانی سے انجام پا جائے گا۔ کوئی مخلِ اوقات بھی نہ ہوگا اور یقین ہے کہ آپ یہاں آ کر بہت خوش ہوں گے۔ وہ آنے کے لئے بالکل آمادہ تھے مگر ان کے فرزند خواجہ سجاد حسین صاحب اور دوسرے عزیز واقارب رضامند نہ تھے۔ عذر یہ تھا کہ دور دراز کا سفر ہے، ضعیفی کا عالم ہے۔ طبیعت یوں بھی ناساز رہتی ہے، ایسی حالت میں اتنی دور کا سفر خلاف مصلحت ہے۔ مولانا نے یہ سب کیفیت مجھے لکھ بھیجی اور ساتھ ہی یہ بھی لکھ دیا کہ جب تم ادھر آؤ تو دو ایک روز کے لئے پانی پت بھی چلے آنا، اس وقت میں تمہارے ساتھ ہو لوں گا، پھر کوئی چوں وچرا نہیں کرے گا۔ جب میں گیا تو وہ

بیمار ہو چکے تھے اور بیماری نے اتنا طول کھینچا کہ جان لے کر گئی۔

مرحوم ہمارے قدیم تہذیب کا بے مثل نمونہ تھے۔ شرافت اور نیک نفسی ان پر ختم تھی۔ چہرے سے شرافت، ہمدردی اور شفقت ٹپکتی تھی اور دل کو ان کی طرف کشش ہوتی تھی۔ ان کے پاس بیٹھنے سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی چیز ہم پر اثر کر رہی ہے۔ درگزر کا یہ عالم تھا کہ کوئی ان سے کیسی بدمعاملگی اور بدسلوکی کیوں نہ کرے، ان کے تعلقات میں کبھی فرق نہ آتا۔ جب ملتے تو اسی شفقت وعنایت سے پیش آتے اور کیا مجال کہ اس کی بدسلوکی اور بدمعاملگی کا ذکر زبان پر آنے پائے۔ اسی سے نہیں کسی دوسرے سے بھی کبھی ذکر نہ آتا۔ اس سے بڑھ کر کیا تعلیم ہوگی۔ ایسے لوگ جن سے ہر شخص عذر کرتا جب ان سے ملتے تو ان کے حسن سلوک اور محبت کا کلمہ پڑھتے ہوئے جاتے تھے پرلے درجے کے نکتہ چیں جو دوسروں کی عیب گیری کیے بغیر مانتے ہی نہیں ان کے ڈنک یہاں آ کر گر جاتے تھے۔ اخلاق اگر سیکھنے کی چیز ہے تو وہ ایسے ہی پاک نفس۔ بزرگوں کی صحبت میں آ سکتے ہیں۔ ورنہ یوں دنیا میں پند و نصائح کی کوئی کمی نہیں، دفتر کے دفتر بھرے پڑے ہیں۔ کیسا ہی برا زمانہ کیوں نہ ہو دنیا کبھی اچھوں سے خالی نہیں ہوتی۔ اب بھی بہت سے صاحبِ علم وفضل، باکمال، ذی وجاہت، نیک سیرت اور نیک دل لوگ موجود ہیں مگر افسوس کہ کوئی حالی نہیں۔

محمد علی

رشید احمد صدیقی

(۱۸۹۶ء - ۱۹۷۷ء)

ولادت تو مادر زاد ہوتی ہے لیکن محمد علی کی موت خانہ زاد تھی! عام طور پر موت اپنا انتخاب خود کرتی ہے لیکن محمد علی نے خود موت کا انتخاب کیا اور یہی وہ چیز ہے جس نے محمد علی کی زندگی اور موت دونوں کو ایک برگزیدہ حقیقت بنا دیا۔۔۔ سنگیں اور صالح!

محمد علی کی زندگی اور موت دونوں ان کی انفرادی اور شخصی افتادِ طبع کی ایک جلوہ گری تھی اور شخصیت کی اسی جلوی گری کا نام آرٹ ہے۔۔۔۔ صحیح اور گرانمایہ!

محمد علی کی زندگی کے مختلف نشیب و فراز تھے کس کی زندگی میں نہیں ہوتے لیکن ان کی موت نے ہر نشیب کو فراز اور ہر فراز کو پر شوکت بنا دیا۔

محمد علی کو بدتوفیقیوں اور بدمذاقوں سے سابقہ پڑا۔ ایسے بدتوفیق بد مذاق جو بھوکے تھے، بوالہواس اور کینہ پرور بھی محمد علی نے ان سب سے انتقام لیا لیکن اپنی زندگی میں نہیں اپنی

موت سے!

محمد علی کے باب میں بعض کہتے ہیں کہ وہ بڑے تھے لیکن ان کا کوئی کارنامہ نہیں ہے۔ یہ تنگ دلوں اور تنگ نظروں کا فیصلہ ہے۔ ہماری قومی زندگی میں آج کتنے دھارے بہ رہے ہیں۔ کتنے چشمے ابل رہے ہیں۔ کتنے عزائم بیدار اور کتنی روحیں دار ورسن کی طلب گار ہیں۔ یہ کس کا فیضان ہے۔ محمد علی نے ہمارے خون کو رگوں میں دوڑنا پھرنا ہی نہیں بتایا بلکہ وہ آج خود ہماری آنکھوں سے خون بن کر ٹپک رہے ہیں! مردِ غازی کے کارناموں کا اندازہ مقبوضات کی وسعت، مالِ غنیمت کی فراوانی جشن وجلوس ہمہمی وطرب انگیزی، برگستواں کی زینت، تمغہ اور اسلحہ کی چمک اور جھنکار سے نہیں کیا جاتا بلکہ اس کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ٹوٹی ہوئی تلوار بکھری ہوئی زرہ، بہتے ہوئے لہو، دہکتی ہوئی روح اور دمکتے ہوئے چہرہ —— ڈوبتے ہوئے سورج سے۔

محمد علی کا قلب حزیں تھا لیکن روح تابندہ وتپاں۔ بشارت ازلی بھی حزیں یوں کہ جن کو وہ محبوب رکھتے تھے۔ وہ بھی ان کے مخالف تھے، کیسی مخالفت! اصولی نہیں بلکہ اکثر ذاتی مفاد، نفس پروری اور تن آسانی کے لئے۔ وہ ایک شیر کی مانند تھے جس کو شیروں سے نہیں، لومڑی اور بھیڑیوں سے سابقہ ہو۔ بشارت ازلی اس لئے کہ شخصیت کامیاب رہی۔ شخص کا انجام نا قابلِ التفات۔ توفیق انسانی اور تقدیر الٰہی اکثر برگزیدہ افراد کی ناکامی میں جلوہ گر ہوتی ہیں۔ اسے ناکامی نہیں کامرانی بتایا گیا ہے۔

محمد علی کی ذہانت اور فطانت اب کہاں ملے گی۔ وہ تیغ اصیل تھی جو رزم بے پناہ تھی اور بزم میں جلوہ گری۔

وہ مخالفت اور مقابلہ میں بے باک اور بے پناہ تھے وہ چھوٹوں پر شفقت کرتے تھے۔ ان کو پناہ دیتے تھے ان کا دل دہی اور دل آسائی کرتے۔ ان کے لئے مارنے مرنے پر تیار رہتے، محمد علی کی آغوش میں رحمت تھی۔ ان کی مدد لینے کے معنیٰ یہ تھے کہ اب ساری ذمہ داری! ساری فلاکت وہلاکت محمد علی کی، اور کامیابی یا شہرت مدد لینے والے کی!

وہ آغوشِ مادر، بازوئے برادر راحتِ عزیزاں تھے!

کس بلا کے بولنے اور لکھنے والے تھے (بولتے تو معلوم ہوتا ابوالہول کی آواز اہرامِ مصر سے ٹکرا رہی ہے) لکھتے تو معلوم ہوتا کرپ کے کارخانے میں توپیں ڈھل رہی ہیں یا پھر شاہجہاں کے ذہن میں تاج کا نقشہ مرتب ہو رہا ہے۔ میں نے ان کو اسٹیج پر آتے اور بولتے سنا ہے اور خود محمد علی کو داد دینے سے پہلے انیس کو داد دی ہے:

ضیغم ڈکارتا ہوا نکلا کچھار سے

اسٹیج پر محمد علی جس طرح جھومتے بل کھاتے پہنچتے، جس کڑک، تڑپ غریو اور غلبہ سے بولتے وہ بہتوں نے دیکھا ہوگا، وہ بولنے میں تلوار اور گرز دونوں سے کام لیتے۔ وہ ہر حربہ کا جواب صرف اپنی تقریر سے دے سکتے تھے۔

محمد علی پر دولت وشہرت کی بارش ہوئی، محمد علی نے ان دونوں کو سیلاب کی طرح بہا دیا۔ دونوں نے مفارقت کی بدنامی اور مفلسی سے بھی سابقہ پڑا۔ لیکن یہ چیزیں جسم وجان کی تھیں، ان کی روح پاک تھی۔ طاہر کیا معلوم زندہ رہتے تو کیا ہوتا۔ بوریائے بوذرؓ اور سریر سلیمان کو یکساں سمجھنے والے کی موت آخر کیا شہادت دیتی ہے۔

محمد علی کی موت کی خبر سنی تو تھوڑی دیر کے لئے یقین نہیں آیا، رہ رہ کر یہ خیال آتا رہا کہ محمد علی کو آخر موت نے زیر کس طور پر کیا — خود موت پر کیا گزری ہوگی!

پھر سوچنے لگا کہ اگر قضا وقدر یہ چارۂ کار پیش کرتے کہ محمد علی کی بجائے ہندوستان کے اور مسلمان لیڈر کو حوالہ کرو۔ یہ سوال آتے ہی خدا جانے یہ فیصلہ دل میں کیسے آیا اور کسی بہت جلد اور بڑی قطعیت کے ساتھ کہ محمد علی کے بدلہ میں ہندوستان کا بڑے سے بڑا لیڈر دیا جا سکتا تھا اور اس کا ماتم نسبتاً کم ہوتا۔ لوگ آزردہ نہ ہوں۔ انسان کے دل میں عجیب عجیب خیالات آتے رہتے ہیں۔ انہی خیالات کو کبھی الہام قرار دیا جاتا ہے اور کبھی یہ مہمل بھی ہوتے ہیں لیکن خیال کے عجیب تر ہونے کے معنی ہمیشہ مہمل ہونے کے تو نہیں ہیں۔ محمد علی میں کمزوریاں بھی تھیں لیکن ان کی کمزوریاں

ایک اچھے شعر کی کمزوریاں تھیں، جن سے شعر کے لطف بے ساختگی میں کوئی فرق نہیں آتا۔

ملک وملت کی جنگ اب بھی جاری ہے۔لیکن نعرۂ جنگ خاموش ہے۔ فتح وشکست تو اسی لئے بنائے گئے ہیں کہ فتح وشکست ہوتی رہے لیکن جنگ آزما کہاں ہے۔ شہادت کس کو نصیب ہوگی۔ ایسا حسینؓ کہاں جس کی خود یزید کو تلاش ہو!

آیئے جہاں کل فاتح بیت المقدس نے سر جھکایا تھا، وہاں آج محمد علی کی معراج منائیں!

اَللّٰہُ اَکْبَرْ اَللّٰہُ اَکْبَرْ اَللّٰہُ اَکْبَرْ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ و اللّٰہُ اَکْبَرْ اللّٰہُ اَکْبَرْ وَلِلّٰہِ الْحَمْد۔

یلدرم کی یاد میں

رشید احمد صدیقی

اپنے رفقاء اور طلباء سے مجھے اکثر اس مسئلہ پر ''بحثنے'' کا اتفاق ہوا ہے کہ کوئی نا معقول شخص معقول شاعر نہیں ہوسکتا جس شخص میں شریفوں کے اطوار نہ ہوں، اس میں فن شریفہ کے آثار کیسے مل سکتے ہیں، مرحوم اصغر گونڈوی اور سید سجاد حیدر میرے پیش نظر ہیں ان کی ہر دل افروز شاعری اور انشاء پردازی تمام تر ان کی دل آویز شخصیت کی آئینہ دار ہے میرے سامنے ایسے اشخاص بھی ہیں، جو شاعر اور انشاء پرداز کی حیثیت سے مشہور ہیں لیکن ان کی شاعری اور انشاء پردازی میں خامی بھی اسی حد تک ملتی ہے، جس حد تک بحیثیت انسان یہ گھٹیا واقع ہوئے ہیں۔

میرے نزدیک فن کی قدریں اور انسان کی قدریں یکساں ہیں، ایسا کوئی فن نہیں ہے، جو انسان سے اونچا یا اس سے علیحدہ ہو!

یلدرم مرحوم علی گڑھ کے ساختہ پرداختہ تھے اور علی گڑھ کے اس زمانہ کے طالب علم تھے، جب زندگی خوش باشی نہ تھی، تو کچھ نہ تھی نہ اب جب زندگی سوا خوش باشی سب کچھ ہے، میں نے ان کی طالب علمی نہ دیکھی لیکن علی گڑھ کا وہ زمانہ دیکھا ہے جب:

بزم کو برہم ہوئے مدت نہ گزری تھی بہت

جب سے اب تک زمانہ کے رویہ اور روانی میں بہت کچھ فرق آ گیا ہے، کیسا کچھ فرق، جن قدروں پر جب مرنے والے لاکھوں تھے، ''اب ان پر'' رونے والا کوئی نہیں لیکن سجاد حیدر کی حیثیت جداگانہ تھی، ان میں شروع سے آخر تک بہت کم تبدیلی ہوئی اور یہ ان کی سیرت شخصیت کا بہت بڑا اہم اور مہتم بالشان پہلو ہے۔

انہوں نے روزگار کی بہت سی کروٹیں دیکھیں اور سہیں، ایسی کروٹیں جو معمولی اشخاص کو یکسر زیروزبر کرسکتی تھیں، لیکن یلدرم میں فن کا ایسا اعتماد وامید آفرینی تھی، کہ ان کو بدلنے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی، سیاسی فرائض بھی ان کے سپرد ہوئے انتظامی اور ادبی بھی لیکن وہ شروع سے آخر تک اور سر سے پاؤں تک شریف شاعر اور ادیب رہے۔

مسلم یونیورسٹی کے ابتدائی عہد میں سجاد حیدر اس کے رجسٹرار رہے انہوں نے مہاراجہ صاحب محمود آباد، صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب، نواب سر مزمل اللہ خاں، ڈاکٹر ضیاء الدین احمد سب کے ساتھ کام کیا، ان میں سے ہر ایک کا وتیرہ جداگانہ تھا اور ان سب سے جدا سجاد حیدر کا تھا۔ انہوں نے کام سب کے ساتھ کیا، سازش کسی سے نہ کی، میرے نزدیک یہی ایک بات یلدرم کی شرافت نفسی اور سیرت کی پختگی کی بڑی محکم دلیل ہے۔

سجاد حیدر کو ڈپٹی کلکٹری راس آئی نہ رجسٹراری وہ یونیورسٹی میں بھی رہے اور کالا پانی میں بھی لیکن روزگار کی یہ ستم ظریفی بھی دیدنی ہے کہ وہ کالا پانی تو گئے لیکن کسی کردہ یا نا کردہ گناہ کی پاداش میں نہیں جس کے بغیر کالا پانی کے تصور میں نہ گرمی آتی ہے نہ روشنی اور یونیورسٹی آئے تو ایسے منصب پر جسے دنیا بھر کی سرگرمیوں سے سروکار ہوسکتا ہے اِلّا شعر وادب سے، اس یونیورسٹی میں شعر وادب کے دیوانے میں نے دو ہی پائے، دونوں ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو چکے ہیں۔ ایک مولانا احسن مارہروی، دوسرے سجاد حیدر یلدرم، ترکی، ترک اور ترکی ادب سے سجاد حیدر کو عشق تھا، ان کا نام آتے ہی ان پر عجیب وارفتگی طاری ہوتی تھی، میں ترکی سے واقف نہیں ہوں لیکن ادب سے آشنا، مختلف اصحاب کے ترکی کے اردو تراجم دیکھے ہیں، سجاد حیدر اور دوسروں کے ترجموں میں آسمان زمین کا فرق ہے۔ میں نے ایک بار سید صاحب سے پوچھا کہ ترکی ادب ہی جاندار ہے یا اس میں

آپ کی شائبہ خوبی تحریر کا بھی کچھ دخل ہے، ایک دفعہ جھوم ہی تو گئے، آنکھوں میں روشنی پیدا ہو گئی اور چہرہ جگمگا اٹھا کہنے لگے۔ جناب (سید صاحب جوش میں آتے تو جناب کا لفظ ضرور استعمال کرتے اور اس پر مخصوص انداز سے زور دیتے) ترکی زبان جانتے ہیں کس کی زبان ہے ہماری آپ کی نہیں ہے، میں نے بات کاٹ کر کہا، یہی تو میں بھی کہہ رہا تھا کہ میری تو یقیناً نہیں ہے، آپ کی تو کہیں نہیں ہے، مسکرائے اور بولے ترکی ترکوں ہی کی زبان ہے اور ان ہی کی ہو سکتی ہے۔ یہ ان لوگوں کی زبان ہے جو نہ کبھی غلام رہے۔ نہ کسی کو غلام رکھا۔ معرکہ آراؤں کی زبان ہے، اس میں ترک تازی ہے سید صاحب پر اب کیفیت طاری ہو چکی تھی، چنانچہ اب وہ اپنے بس کے تھے نہ میرے، ناحق کمال کا مشہور ڈرامہ جلال الدین خوارزم شاہ میری ہی درخواست پر سید صاحب نے اردو میں منتقل کرنا شروع کر دیا تھا جس کا بیشتر حصہ سہیل میں شائع ہوا، سید صاحب قلم کاغذ لے کر خود ترجمہ نہیں کرتے تھے بلکہ کسی کو مامور کر دیا جاتا، سید صاحب ترجمہ بولتے جاتے وہ لکھتا جاتا، شاذ و نادر کہیں ترمیم کرتے، ایسا معلوم ہوتا، جیسے ترجمہ پڑھتے جا رہے ہیں، میں تو نہیں بتا سکتا کہ مترادفات کیسے ہوتے ہیں، لیکن جہاں تک اردو الفاظ فقروں اور ترکیبوں کا تعلق ہے، میں سید صاحب کے اس کمال کا معترف ہوں کہ وہ بڑے چھوٹے بڑے جاندار اور بڑے گوار اردو الفاظ استعمال کرتے تھے، الفاظ کے انتخاب اور ترکیبوں کی اختراع کا ترجمہ میں بڑا دخل ہوتا تھا، اور یہ بات صرف کیس غیر معمولی مترجم کے حصہ میں آتی ہے، یہاں مجھے مولوی عبداللہ مرحوم دہلوی یاد آتے ہیں، جن سا باکمال ترجمہ کرنے والا اردو ادب میں شاید ہی کوئی دوسرا ہو، اردو انگریزی دونوں زبانوں کو سمجھنے کی استعداد عنایت اللہ مرحوم کیخرق عادات کی حد تک پہنچ گئی تھی۔ یہ بات ان ہی کے حصہ میں آ بھی سکتی تھی کہ وہ اردو کے گہوارہ میں نہیں پلے تھے بلکہ اردو ان کے گہوارہ میں پلی تھی، وہ اہل زبان ہی نہیں تھے، متمدن بھی تھے۔

یلدرم نے ترکی سے تراجم زیادہ کئے ہیں اردو مضامین نسبتاً کم ہیں، ترکی انشاء پردازی کا انداز ان میں کچھ ایسا رچ گیا تھا کہ اردو لکھنے میں ان کا قلم ترکی مال و سم قبول کر لیتا تھا۔ سید صاحب کے اس رنگ و امن پر بعض لوگوں میں چہ مگوئیاں بھی ہوئی ہیں۔ بذات خود میں اردو میں انداز کا نہ کو بڑا اچھا اضافہ سمجھتا ہوں۔

سید کے اسالیب انشاء اوران کی موضوعات سید کی شخصیت کی بڑی ترجمانی کرتے ہیں، اردو میں انشاءلطیف کی ابتدا شرر ریاض، یلدرم کی تحریروں سے ہوئی، انشاءلطیف کا رشتہ کھینچ تان کر ملا وجہی کی سب رس سے بھی ملایا جاتا ہے لیکن میرے نزدیک سب رس کا انداز ہ متغزلانہ تصوف کا ہے، جو انشاءلطیف سے جوڑ نہیں کھاتا، انشاءلطیف نے آگے چل کر ٹیگوریت کا رنگ اختیار کرلیا اور ٹیگور نے اردو میں سستے اور ادنیٰ درجہ کی تحریروں کو اس درجہ عام اور مقبول بنایا کہ ثقاوت ادب کو سختی سے احتساب کرنا پڑا اور یہ انداز جلد ہی نظروں سے گر گیا۔ یہاں تک کہ جو اصحاب اس کے سب سے بڑے حامی تھے وہ سب سے پہلے تائب ہوئے۔ اردو میں ٹیگور کی جس طرح ابتداً ہوئی اور جیسا کہ اس کا انجام ہوا، مجھے کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نئے شعروادب کا بھی یہی حشر ہونے والا ہے جس کے آثار نمایاں ہو چکے ہیں۔

شررؔ اور ریاضؔ کے عاشقانہ مضامین اور یلدرم کی انشاءلطیف میں فرق ہے۔ شررؔ کا اسلوب انشاء اران کا عشق دونوں کتابی، بندھے ٹکے، ڈھلے ڈھلائے شخصی تاثرات کی ترجمانی نہیں، شاعرانہ زبان وبیان کی نمائش ملتی ہے، ریاض میں زبان وبیان کا مظاہرہ شرر سے زیادہ غیر معتدل ہے، ریاض کی شاعری میں پرلطف لیکن سطحی شوخی ملتی ہے، وہ ان کی نثر میں پہنچ کر ستی اور عامیانہ بن گئی ہے، شاعری میں جو انداز بیان شاعری کا حسن ہے، وہ نثر میں پہنچ کر مصنوعی اور مہمل بن جاتا ہے، موضوع اور مطمح کے یکساں ہونے کے باوجود نثر اور نظم کی مقتضیات میں فرق ہے ریاض اور ناصر علی دہلوی نے اس امتیاز کو اپنی اپنی نثر میں نظر انداز کر دیا ہے۔

یلدرم کے ہاں بھی حسن ومحبت کا کاروبار ہے لیکن یلدرم میں مجاز کی طرفگی تازگی ہے۔ شررؔ اور ریاض کی پیداوار یکسر مشینی ہے، سجاد کی دوستی، سجاد انصاری کو بھی انشاءلطیف کا قرار دیا جاتا ہے لیکن مجھے اس سے اتفاق نہیں ہے سجاد انصاری کے یہاں نفسیاتی تحلیل ملتی ہے، جس کو انشائے لطیف سے براہ راست کوئی تعلق نہیں، انشائے لطیف اور غزل سرائی کا سرچشمہ ایک ہے بقولے:

وہی اک بات ہے جو یاں نفس واں نکہت گل ہے

لیکن جس طرح غزلوں میں آرٹ اور اقدار کے اختلافات ملتے ہیں، ادب لطیف میں بھی یہ امتیازات نظر آتے ہیں، یلدرم اور ادب لطیف کے بعض دوسرے علم برداروں میں یہ فرق واضح

ہے۔ سجاد حیدر کے ہاں شوخی بھی ہے شرارت بھی لیکن شہد پن نام کو نہیں، یلدرم کے ہاں عورت کا بڑا عمل دخل ہے لیکن ان کے ہاں خیالات کی رعنائی ملتی ہے۔ اعصاب کا تشنج نہیں، مہدی آفادی کے ہاں خیالات کی رعنائی اتنی نہیں ہے، جتنی جذبات کی رنگینی، مہدی کے اعصاب پر اگر عورت سوار نہیں ہے تو کچھ پیدل بھی نہیں ہے، افادی کہیں کہیں تو شوق کی مثنویوں سے جا ملے ہیں اور میرا خیال ہے کہ ان دونوں کی تحریروں میں جہاں تک عورت کا تعلق ہے، مراتب جنسی کا اتنا ہی فرق ہے جتنا تفاوت زمانی کی بنا پر ہونا چاہئے، اگر ان دونوں کو ایک دوسرے کے عہد میں منتقل کر دینا ممکن ہوتا تو مہدی، شوق بن جاتے اور شوق مہدی۔

سجاد حیدر کی تحریروں میں ایک بات نہایت واضح طور پر ملتی ہے۔ یعنی وہ جذبات کی رو اور روانی میں بھی اپنے وزن اور دتحاد کو بہہ نہیں جانے دیتے۔ سجاد صاحب کے جذبات کچھ زیادہ تیز اور تند نہ تھے، جس کے ہاں خیالات کی رعنائی ہو، اس کے ہاں جذبات کا ہیجان وطغیان یوں بھی کم ہوتا ہے، پھر بھی جہاں کہیں ایسے مواقع آگئے ہیں، سجاد صاحب نے ایک ہی کی جنبشِ قلم سے ان کو معتدل کر دیا ہے اور اس طور پر معتدل کیا ہے کہ اظہار مطلب میں کوئی فرق نہ آیا اور شرم وشرافت کا دامن بھی داغ دار نہ ہو۔

میرے نزدیک انشائے لطیف میں خیال کی رنگینی اور نزاکت کے ساتھ جذبہ کی متانت و عفت کو جس طرح یلدرم نے متوازن رکھا ہے کسی اور نے نہیں رکھا ہے۔ سجاد حیدر کی تحریروں میں جذبات سے زیادہ تخیل کی کارفرمائی ہے۔ قاضی عبدالغفار اس بارے میں یلدرم سے ملتے جلتے ہیں، لیکن دونوں کی ذہنی پرداخت میں تفاوت ہے۔ غفار کی تحریر میں طنز کی تیزی وتلخی بھی شامل رہتی ہے۔ اس طور پر یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ عبدالغفار، سجاد حیدر کی بجائے سجاد انصاری سے زیادہ قریب ہیں، مجھے اکثر یہ محسوس کر کے خوشی اور اطمینان ہوا ہے کہ انشائے لطیف کے تین بڑے اچھے اور مکمل نمونے ہمارے یہ تین چوٹی کے انشاء پرداز بڑی خوبی سے پیش کرتے ہیں۔ سجاد حیدر، سجاد انصاری اور قاضی عبدالغفار۔

بعض اعتبار سے سجاد حیدر شروع سے آخر تک نوجوان رہے، وہ اس زمانہ میں بھی جوان تھے، جب جسم وجان کے اعتبار سے نحیف ونزار ہو چکے تھے، تعلیم نسواں، اردو ٹائپ، اسالیب

شاعری میں نئے تجربات اور اس قبیل کی اور باتوں میں اوائل عمر سے سجاد حیدر ترقی پذیر واقع ہوئے تھے اور ٹائپ کو مقبول بنانے میں تمام عمر کوشاں رہے، عظمت اللہ خاں مرحوم کی نئی شاعری کے بڑے مداح تھے، اور ان کی ایک مخصوص نظم بڑے مزے لے لے کر پڑھتے تھے۔

اسی زمانہ میں ایک فارسی مجلہ نامی برلن سے ٹائپ میں شائع ہوتا تھا، اس کا پہلا نسخہ سجاد صاحب کو موصول ہوا، اسی سلسلہ میں ایک لطیفہ مجھے کبھی نہ بھولے گا۔ سجاد صاحب اپنی کوٹھی سے دفتر آ رہے تھے، سر بمہر بہت سارے لفافے، کاغذات کے کچھ منتشر اجزا ایک آدھ اخبار و رسالے بغل میں دبائے ایک رسالہ پڑھتے چلے جا رہے تھے، میں ان سے کوئی بیس بائیس قدم پیچھے آ رہا تھا، اس کی خبر سجاد صاحب کو نہ تھی، سید صاحب کے چلنے کا خاص انداز تھا، خود ہلکے پھلکے تھے، رفتار اس سے بھی ہلکی پھلکی، ہموار، کسی قدر تیز چھوٹے چھوٹے قدم لیتے تھے، نگاہ نیچی تقریباً عمودی، دس بارہ قدم چل کر اک ذرا کی ذرا رک سے جاتے اور ٹھیک سامنے ایک اچٹتی سی نظر ڈال کر پھر گرم رفتار ہو جاتے، اس پر ان کے ایک بے تکلف دوست نے ایک فقرہ چست کیا تھا کہ سجاد تم چلنے میں سانپ کو شرماتے ہو، وہ بھی چلتے چلتے رک جاتا ہے۔ سر اٹھا کر ادھر ادھر دیکھتا ہے اور پھر چل دیتا ہے اس فقرے سے بہت محظوظ ہوئے، کہنے لگے سانپوں میں رہ کر صرف سانپوں کی چال آئی، اس کی تعریف نہ کرو گے، اسی انداز سے چلے جا رہے تھے کہ یکا یک ایک لفافہ سرک کر زمین پر آ رہا، سجاد صاحب کو مطلق خبر نہ ہوئی میں نے اٹھا لیا، کچھ ہی دور اور بڑھے تھے کہ دوسرا لفافہ گرا وہ بھی میں نے اٹھا لیا۔ باب العلم کے قریب پہنچے کہ تیسرے لفافہ نے مفارقت کی وہ بھی میں نے قبضہ میں کیا، سجاد صاحب برابر رسالہ کے مطالعہ میں منہمک رہے، سید صاحب کے پیچھے میں بھی یونیورسٹی آفس پہنچا۔ آفس پہنچ کر موصوف نے بچے ہوئے لفافے متعلقہ لوگوں کے حوالے کئے معلوم ہوا تو تین لفافے گم ہیں، چونک پڑے اور تھوڑی دیر تک متفکر رہے میں نے تینوں لفافے کچھ کچھ وقفہ سے واپس کئے سید صاحب فرمانے لگے کہ آپ بھی کمال کرتے ہیں فوراً کیوں نہ دے دیئے، اس وقت مجھ پر کیا گزر گئی، میں نے کہا آپ مطالعہ میں منہمک تھے میں نے مخل ہونا مناسب نہ سمجھا۔

میرا یہ کہنا تھا کہ سب کچھ بھول گئے فرمایا خوب یاد دلایا یہ ملاحظہ فرمایا: ''ایمان شہر'' ہے، ٹائپ میں کتنا ستھرا چھپا ہے اور کیسے اچھے اور جاندار مضامین و نظمیں ہیں ایرانی وطن پرستوں نے

برلن سے اسے شائع کیا ہے کاش اردو میں ایسا پاکیزہ اور دیدہ زیب ٹائپ رواج پا جائے۔ اور جناب بات یہ ہے کہ جب تک آپ ''بت سنگی'' (لیتھو کی چھپائی) سے رشتہ نہ توڑیں گے اردو کی اشاعت مسدود رہے گی، میں نے کہا: سید صاحب ''بت سنگی'' کا تو ہمارے شعر وادب میں ایک درجہ بھی ہے، بت آہنی میں کیا رکھا ہے۔ بقولے شخصے:

حرف پڑھنا پڑا ہے ٹاپ کا

کسی قدر تیز ہو کر فرمایا یہی تو ستم ہے، آپ سب کا اب یہی کام رہ گیا ہے، کہ اچھی بھلی باتوں میں بھس ملا دیتے ہیں، اکبر نے ٹائپ کی خواہ مخواہ مٹی پلید کر دی، میں نے عرض کیا سید صاحب اکبر نے کہیں بھس نہیں ملایا۔ صرف بھس میں چنگاری لگائی ہے، ہنسے پھر فرمایا اور جناب بھی تو کچھ دور نہیں کھڑے ہیں۔

سید صاحب نے نظمیں بھی کہی ہیں، یلدرم کوئی غیر معمولی شاعر نہ تھے، ان کی سب سے پہلی نظم مرزا پھویا بتائی جاتی ہے، اس میں شاعرانہ خوبیاں کچھ بہت زیادہ نہیں ہیں لیکن گذشتہ علی گڑھ کی زندگی کے بعض دلکش پہلو لطف سے بیان کئے گئے ہیں۔ ہلکی پھلکی تفریحی نظموں میں اس کو اچھا درجہ دیا جا سکتا ہے۔ سید صاحب کی نقاشی نازک خطوط اور ہلکے رنگوں کی ہے۔ ان کا مزاج رومانی ہے۔ وہ رومان جو انسان کو بلندی کی طرف لے جاتا ہے۔ پستی کے طرف ہرگز نہیں موجودہ عہد میں رومان کی حیثیت مسخ کر دی گئی ہے۔ اس کو مزاج وخیال کی رنگینی کی بجائے مطالبات جنسی قرار دیا گیا ہے وہ بھی اس طور پر کہ جو چیز صحت کی دلیل تھی، وہ مستقبل (اور لاعلاج) مرض قرار پائی۔

سجاد صاحب کی ایک نظم جوان کی رنگینی، رسائی طبع، سیرت کی پاکیزگی اور ان کے نقطہ نظر کی دل آویزی کی ترجمان ہے، شملہ کا لکالائن پر ایک نظارہ کے عنوان سے سب سے پہلے 'سہیل' میں شائع ہوئی۔

سید صاحب کی یاد کے ساتھ یہ نظم ہمیشہ وابستہ رہے گی:

ماتھے پہ بندی آنکھ میں جادو ہونٹوں کی بجلی گرتی تھی ہر سو
چال لچکتی بات لہکتی جیسے کسی نے پی ہو دار ہو
انگھٹر جال ایسی جن میں تھے رقصاں لحہ میں رادھا لحہ میں راہو

ایسی بھڑک تھی خلق تھی حیراں　　ریل پر آیا کہاں سے آہو

سجاد صاحب کو جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں، ترکی، ترکی ادب اور ترکوں سے والہانہ شغف تھا، ان میں سے کسی کا نام آتا تو سید صاحب وجد میں آتے۔

جس زمانہ میں وہ مسلم یونیورسٹی کے رجسٹرار تھے، ایک بار ان کو ترکی جانے کا موقع مل گیا، میں کیا بتاؤں ان پر کیا نشاط طاری تھا، صحت اچھی نہ تھی، میں نے کہا، سید صاحب سفر طویل ہے تکلیف دہ بھی، کیسی گزرے گی؟ فرمایا ترکی کے خیال میں طبیعت مگن ہے، یہ شگون اچھا ہے اور اعتبار سے اچھا، یا یہ خاک وہاں کی خاک میں مل جائے گی، یا پھر دیکھئے گا کیسا رقصاں وشاداں واپس آتا ہوں چند ماہ بعد واپس آئے، سید صاحب یوں بھی سبک رفتار تھے واپسی پر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے پاؤں میں اسپرنگ لگے ہوئے ہیں، جسم میں توانائی چہرہ پر بشاشت اور سرخی آگئی تھی۔ میں نے پوچھا، ترکی میں کوئی تبدیلی پائی؟ فرمایا شروع سے آخر تک تبدیلی ہی تبدیلی نظر آئی۔ لیکن مجھے تو ترکی سے الفت ہے اس کے بدلنے نہ بدلنے سے کیا سروکار۔

ترکی ادیبہ خالدہ خانم اور ان کی ابتدائی تحریروں کے بڑے دلدادہ تھے، موصوفہ علی گڑھ تشریف لائیں تو یونین میں سجاد صاحب نے ان کا خیر مقدم کیا اور ضمناً موصوفہ کے ابتدائی مضامین اور انشاء پردازی کو بڑے لطف سے سراہا، خالدہ خانم نے فرمایا کہ اب وہ اپنے اگلے اسلوب انشاء سے تائب ہوگئی ہیں اور اسے صرف ایام جہالت کی یادگار سمجھتی ہیں۔ سجاد صاحب خاموش ہوگئے، بعد میں ایک صحبت میں اس واقعہ کا ذکر آیا تو فرمانے لگے خالدہ خانم کو کیا معلوم ان کی ایام جہالت کی باتوں نے کیا شگوفے کھلائے، پھر غلط مبحث سے کیا حاصل، سوال یہ نہیں ہے کہ خالدہ خانم کو کیا پسند ہے، اصل یہ ہے کہ میں کیا پسند کرتا ہوں۔

سجاد حیدر بڑے پاکیزہ اور معصوم سرشت انسان تھے، ان کو توڑ جوڑ بالکل نہ آتا تھا، وہ اپنے آپ پر کبھی فخر کرتے نہیں سنے گئے، دوسروں پر بڑی فیاضی سے اکثر فخر کرتے پائے گئے، ایک سچے آرٹسٹ اور ادیب کی طرح وہ اہل مناصب سے بھی مرعوب نہ ہوئے، لیکن فن کے کمال کی داد دینے میں بڑے سخی تھے، سید کو میں نے شاید ہی کبھی ''تم'' کے لفظ سے کسی کو مخاطب کرتے سنا ہو۔ انھوں نے اپنے منصب اور اپنی غیر معمولی مقبولیت کو ذاتی رفعت اور منفعت کا کبھی وسیلہ نہیں بنایا ان کو میں

نے برہمی میں آپے سے باہر نہ پایا اور ہنسی دل لگی میں ان کے منہ سے کبھی ایسے الفاظ نہ سنے جو مذاق سلیم پر بار ہوں، یلدرم جیسے کڑھے ہوئے آدمی بہت کم دیکھے گئے ہیں، وہ تمام آداب ان میں رچے ہوئے تھے، جو ثقافت کی جان وجواز ہیں، ان آداب کو وہ اس لطف اور آسانی سے برتتے تھے، جیسے ایک تندرست سانس لیتا ہے۔ یا ایک حسین اپنے حسن کا حامل ہوتا ہے۔ بغیر کسی ارادے یا تکلف کے یلدرم میں رسمی تکلف بالکل نہ تھا۔ ان کی بے تکلفی میں نہ دوستانہ اور شریفانہ شان پائی جاتی تھی، وہ اسی حد تک شرافت اور سلیقہ کا اقتضا ہوتا تھا اور بے تکلف بی اسی حد تک ہوتے تھے۔ جس حد تک بے تکلفی، حسن معاشرت کا جزو اعظم سمجھی جاتی ہے۔ وہ ان لوگوں میں تھے جو اونچی سے اونچی اور بڑی سے بڑی صحبتوں میں ہماری اور خود اپنی نمائندگی کر سکتے تھے۔ شعر وادب کا ان کو ذوق محض فطری نہ تھا بلکہ وہ شعر وادب کے رنگ ورفتار پر حکیمانہ نظر بھی رکھتے تھے، وہ اچھی اور بے تکلف انگریزی لکھتے تھے، یہ بات ان کے عہد کے ہندوستانیاں میں بہت کم ملتی ہے۔ ان کی قدر کرنے والوں کا حلقہ بڑا وسیع اور متنوع تھا، شعر وشرافت کے جو لوگ حامل یا قدردان تھے۔ وہ تمام کے تمام خواہ ہندوستان کے کسی گوشہ میں ہوں، یلدرم سے واقف اور ان کی خوبیوں کے معترف تھے۔

سید سجاد حیدر ان لکھنے والوں میں تھے، جن کا قائل نہ ہونا کم سواد ہونے کی دلیل ہے۔ کم لوگ ایسے دیکھے گئے ہیں، جن کی تحریر اور شخصیت میں اس درجہ یک رنگی اور توازن ہو۔

وہ ہم سے جدا ہو گئے لیکن ہم اور ہمارے بعد آنے والے ان سے کبھی جدا نہ ہوں گے۔ مجھے یقین ہے، فردوس میں ان کو وہ رنگینیاں اور نزہتیں بھرپور نصیب ہوں گی، جن کی صرف جھلکیاں ان کی تحریروں میں ہم کو نصیب ہیں۔

بیمار بلبل

احمد حسین وافر جہانگیر نگری

(وفات : ۱۹۰۴ء)

بعد حمد خدائے عزوجل ونعت احمد مرسل، ہیچ میرز سراپا قصور شیخ احمد حسین متخلص بہ وآفر شاگرد جناب مولانا مولوی عبدالغفور خان صاحب بہادر متخلص بہ نسآخ ارباب فن واصحاب شعور کے خدمت میں عرض رسا ہی[1] کہ فقیر اس ناٹک مسمی بہ "بیمار بلبل" کو لکھ کر اوستادی کا دم نہیں بھرتا ہے نہ شاعری کا دعویٰ کرتا ہی[2] جو کچھ لکھا ہی خاص فرمائش سے دوستوں کے لکھا ہی[3] اور اونہیں کی ترغیب سے چھپوایا ہی[4]۔ کلام اس کا ہنروران سخن اور شاعران نو وکہن کے نزدیک چست نہیں بلکہ سست نظر آوی[5] گا۔ کس واسطے کہ اردو زبان میں آج تک اس طرز کی کتاب چھپی نہیں ہی[6] مگر جنہوں نے انگریزی میں دست گاہ حاصل کی ہی[7] اور بنجانسن اور شیکس[8] پیار وغیرہ کی[9] ڈراما بغور ملاحظہ کی[10] نہی[11] وہ البتہ اس کتاب سے حظ اوٹھائیں گے کیوں کہ یہ ہو بہو انگریزی طرز پر لکھی گئی ہی[12] حرف شناسوں کے نزدیک اس کے اکثر الفاظ غلط نظر آویں گی[13] اسے وہ یہ نہ سمجھیں کہ خود مصنف

(۱) ہے (۲) ہے (۳) ہے (۴) ہے (۵) آوے گا (۶) ہے (۷) ہے (۸) شیکسپیر (۹) کا (۱۰) کیا (۱۱) ہے (۱۲) ہے
(۱۳) آویں گے

اردو کی اصطلاح اور محاورے سے ناواقف اور ناآشنا ہی[14] بلکہ سمجھیں کہ اکثر جگہ اس کی قصداً غلط لکھی گئی ہی[15] کیوں کہ ناٹک اوسکو کہتے ہیں کہ جس کی جو زبان ہو، ہو بہو ویسا ہی کلام ہو۔ اس میں فصاحت اور بلاغت کو ذرا بھی دخل نہیں۔ اس کتاب میں اکثر جگہ مذکر کو مونث اور مونث کو مذکر لکھا گیا ہی[16] اور کہیں کہیں اشعار میں بھی زحاف ہی[17] جو لوگ راگ راگنی[18] سے ماہر ہیں اور علم موسیقی پر قادر ،وہ البتہ اس کتاب سے حظ اوٹھائیں گے۔ امید ہی[19] کہ اگر سوای[20] عیب مذکور کے اور کسی طرح کی غلطی ملاحظہ فرمائیں تو اس کو اپنے دامن مہربانی سے چھپائیں اور اس فقیر کو ممنون احسان کریں۔

واللہ ولی التفیق[21] وھو خیر الرفیق

●

ڈرامٹیس[22] پرسنی

یعنی

روپ لانے والے

مرد :

لال خاں	
چپٹے	(لال خاں کا حبشی غلام)
فرہاد	(بیمار بلبل کا عاشق)
لڑکے وغیرہ	

عورت :

ماہ لقا	(معروف بہ بیمار بلبل)
عظمت بی	(ماہ لقا کی دایہ)

(کھیل شروع ہونا ''بیمار بلبل'' کا اور غزل گانی گویا کی پردے کے اندر سے)

---

(۱۴) ہے (۱۵) ہے (۱۶) ہے (۱۷) ہے (۱۸) کے

(۱۹) ہے (۲۰) سوائے (۲۱) ولی التوفیق

(۲۲) ڈرامے کے کردار —— (Dramatis Personae)

راگنی کھماج — تال پستو

تماشا صاحبو! کچھ آج تو دیکھئے بھلا
عجب اک محفل سرود ہی[۱] اور ہوش ربا
کھیل تو بلبل بیمار کا ہوگا یارو!
جس میں پیروں کی ہیں ثابت محبو! حرص وہوا!
بعد تشویش کے بوڑھوں کو ہوا سوچ ، خطر
بھلا پیدا نہیں کچھ جن کو ہوا خوف خطا
جائے عبرت ہی[۲] محبو! ہی[۳] ضعیفی در پیش
عیش پیری کو کرو ترک، جپو سبحہ خدا
لال خاں کی طرح کچھ نہ خطا پیری میں
ورنہ افسوس کروگے تو پھر اِی[۴] اہل ذکا
قول وافر کا نہیں ، قول ہی[۵] داناؤں کا
چاہئے ہاتھ میں لانا محبو! صدق و صفا

پہلا ایکٹ —— پہلا منظر

(بیمار بلبل کوٹھے پر بیٹھے ہوئے غم کی شکل بنا کے یہ غزل گاوی[۶])

راگنی بروا — تال پستو

اب تو زنداں میں بڑا حال پریشاں ہوں میں
ہای حیراں ہوں میں
ایک مدت سے بری[۷] حال سے نالاں ہوں میں
خود پشیماں ہوں میں

---

(۱) ہے (۲) ہے (۳) ہے (۴) اے (۵) ہے (۶) گائے (۷) بُرے

گھر یہ بوڑھے کا نہیں اب تو مجھے بھاتا ہے
دم نکل جاتا ہی

اپنے قسمت سے خود انگشت بہ دنداں ہوں میں
ہوش پراں ہوں میں

کس بلا میں مجھے پھیکا ہے الٰہی تو نے
اب خبر میرے تو لے

خوب بیزار نہ گردش دوراں ہوں میں
زیر پیکاں ہوں میں

(فرہاد یہ غزل گاوی کبھی حاضرین اور کبھی بیمار بلبل کے طرف دیکھ کے)

راگ ملھار —— تال ٹھمری

سبحان اللہ یہ کس پیکر کی بھولی بھولی صورت ہے
عجب ہی حسن، عجب چتون، عجب ہیرے کی مورت ہے
خدا جانے دکھایا کس نے دن اون کا، نہیں جانوں
اگر ہی حسن میں یکتا، مگر دل میں کدورت ہی

دیگر

سبحان اللہ یہ حوروں کی صفت ان میں تو ساری ہی
رسیلا ہی نین اون کی جی، صورت پیاری پیاری ہی
بتا اپنا بتا مجھ کو، مری سر کی قسم تجھ کو
بھلا کس کی ہی دختر تو، بھلا کس کی دولاری ہی
تو مجھ سے مل جاوی پیاری تو ئی دل میں سمائی ہی

ترے مژگاں سے اب دل میں لگی میری کٹاری ہی
خدارا لے خبر میری نہیں تو جان دوں گا میں
ترے ہجراں کی باعث تو مجھے اب زیست بھاری ہی
ستائی ہی ستاتی ہی تیری ، ہجرت تو اب مجھ کو
نکلتا شعلہ اب دل سے ، لبوں پر آہ وزاری ہی
(بیمار بلبل چونک کر یہ غزل گاوی)

راگنی پیلو —— تال جد

اب آنکھیں لڑاؤ نہ تم یار ہم سے
نور نہار ہم سے ، نور نہار ہم سے
پڑی ہی مصیبت میں جان اپنے ظالم
ہوئی خلق ساری ہیں بیزار ہم سے
امیر کی ہیں دختر سنو غور سے تم
گھر اپنا تھا واللہ گل زار ہم سے
ہی بیمار بلبل صنم نام اپنا
چھٹے ہای افسوس گھر بار ہم سے
نکاح کرنے بوڑھے میاں جی نے لایا
نہ ہونے کی یہ بات دل دار ہم سے
(فرہاد یہ چیز حاضرین اور بلبل کی طرف دیکھ کر گاوی)

راگنی سن — تا ل یک تالہ قوالی انترہ

روت روت دل مور البھائی ری
موری خانی

من نہیں مانے مورا ، کچھ نہیں بھاوی جانی

بیکل بیکل جای

جیا بیکل بیکل جاوی

کیا موری سنائی ری

او موری جانی

تج شا پری سے موری لاگی لگن پیاری

بچن رچن سے

میٹھے بچن رچن سے

تو موری بہلائی ری

لپکے جھپکے آؤ اترو کوٹھے سے پیاری

ٹھوکے ٹھوکے ری

پیاری ٹھوکے ٹھوکے ری

جھلک دکھائی ری

اوموری جانی

(بیمار بلبل یہ چیز گھبرا کے گاوی اور فرہاد کے طرف دیکھے)

راگنی للت —— تال ادھا اکھٹا

او موری چھتیا پھڑکن لاگے

کیا کہوں توری آگے

او پیارے کیا کہوں توری آگے

پھڑکن لاگے

لال خاں لاوت مورے آنک رکھت ہی

کفل چڑ اوت راکھے

کٹھن مصیبت میں جان موری اٹکی

کہو کس طرح اب یہ بھاگے

جاؤ جاؤ موری پیاری ادھر سے

ورنہ بلا میں پھنسوگے

لال خاں آوت پیاری ، لال خاں آوت ہی

توہارے بلا میں پھساوے

پھڑکن لاگے

پیارے اب ادھر سے جلد تشریف لے جاؤ، بوڑھے میاں کا آنے کا وقت ہوا ورنہ بلا میں پھنسوگے۔ مجھ سے ملنا منظور ہو تو باغ میں تشریف لے جانا، وہاں میں جاؤں گی مگر گویا کے بھیس میں جانا۔

(فرہاد یہ گاتے ہوئے اور بیمار بلبل کی طرف بتاتے ہوئے چلا جاوے)

راگنی —— تال پستو

ترے ہجر میں ای دل ربا نہیں مجھ کو صبر و قرار ہی

ہر اک رگ باغبان نظروں میں اپنے تو خار ہی

مجکو نہ چلنے کی رہی طاقت مرے سر و سہی

ترے عشق کے آزار نے ایسا کیا ناچار ہی

ٹل جاتا یاں سے ای پری ، رشک بتان آذری

اب نیم جاں ہو کر کے میں، دامن میں نہ مرے تار ہی

بس باغ میں ملنا صنم ، کہتا ہوں میں باچشم نم

بن کر گویا جاؤں ، فرہاد تو ہشیار ہی

جنگل کا پردہ گرتا ھے

(دوسرا منظر)

(لڑکے سب اس کو گاویں اور ہنسی کھیل کریں اور اس طرح کی حرکت کریں)

راگنی شہانہ —— تال چھپکا

آؤ بھائی چین کریں اور ہم سب مل کر کھیلیں اب
کھیلیں اور دکھلائیں یاں پر اپنا کرتب سب
اٹا گولی کھیلیں یا کہ ڈنڈا گولی کھیلیں اب
کھیلیں اور دکھلائیں یاں پر اپنا کرتب سب
دھول جھکر کا کھیل کریں یا اٹھا بیٹھا کھیلیں اب
کھیلیں اور دکھلائیں یاں پر اپنا کرتب سب
لوگ بیٹھانی کھیلیں اب ، یا بٹ کا پتا کھیلیں اب
کھیلیں اور دکھلائیں یاں اپنا کرتب سب
ایرا میرا کھیلیں اب یا چوک چیرا کھیلیں اب
کھیلیں اور دکھلائیں یاں اپنا کرتب سب
ڈھول منجیرا کھیلیں یا لکھا سمندر کھیلیں اب
کھیلیں اور دکھلائیں یاں پر اپنا کرتب سب

شبراتی : کھیل نہیں معلوم ہی تجکو ، چل ہٹ یاں سے ای ناداں
پچکوڑی : چل ہٹ ، چل ہٹ کیا بکتا ہی توڑیں گے تیرے دنداں

او بھائی چین کریں اور ہم سب مل کر کھیلیں اب
کھیلیں اور دکھلائیں یاں پر اپنا کرتب سب

تینا : توڑ تو دیکھیں کس طرح تو ، توڑے گا اس کا دندان
دبن : میں حمایت کروں گا تری نکال تو اپنا ارمان

او بھائی چین کریں اور ہم سب مل کر کھیلیں اب
کھیلیں اور دکھلائیں یاں اپنا کرتب سب

کلو : میں نے تجکو دیکھا تھا تو لنگٹی پنکے پھرتا تھا
دبن : تو تو ہی تیلی کا ڈینگو ، بڑائی یہاں کرتا ہی کیا

او بھائی چین کریں اور ہم سب مل کر کھیلیں اب
کھیلیں اور دکھلائیں یاں پر اپنا کرتب سب

ببن : تو بڑا موذی ہی ، ہر وقت کرتا ہی فتنہ برپا
شبراتی : دیکھ بچے ماریں گے تھپڑ ، تو اس کو کہتا ہی کیا
آؤ بھائی چین کریں اور ہم سب مل کر کھیلیں اب
کھیلیں اور دکھلائیں یاں اپنا کرتب سب

لالو : میں نہیں کھیلوں گا جا بے ، تو بڑا بکتا ہی یاں
تینا : کان پکڑ کے نکال اوس کو تو اسے اب بھائی جان
آؤ بھائی چین کریں اور ہم سب مل کر کھیلیں اب
کھیلیں اور دکھلائیں یاں اپنا کرتب سب

لالو : دیکھ بلا کر باپ کو اپنا لاتا ہوں جا کر اس آن
کلو : کل ترا دادا کا ، لے بے ، کاٹا تھا میں نے یاں کان
آؤ بھائی چین کریں اور ہم سب مل کر کھیلیں اب
کھیلیں اور دکھلائیں یاں اپنا کرتب سب

پچکوڑی : کون یہاں آتا ہے دیکھو ، عقل تو ہی میری حیران
شبراتی : بابا بابا مجکو برای حق بچاؤ بھائی جان
دبن : پنپے دیکھو اتا ہی ، لو وہ تو ہی حبشی نادان

(سب کوئی مل کر)

ہم اس کو چل کر چھیڑیں گے ہرگز اس کو یٹریں گے، چاروں طرف سے گھیریں گے۔

(پنپے آوے اور تمام لڑکے اس کو گاویں مسخری کے ساتھ)

راگنی لوم کھماج —— تال مجرا

روی سیاہ سیاہ ہی رو کالا ہے گا تیرا منھ کان سے آیا ہے گا تو

روی سیاہ ، سیاہ ہی رو

چپٹے ترا تو نام ہی　　زلف تری شب فام ہی　　یاں ترا کیا کام ہے

روی سیاہ ، سیاہ ہی رو

اتنا بڑا شکم ترا　　کس طرح بتا ذرا　　کھاتا ہی تو کیا بھلا

روی سیاہ ، سیاہ ہی رو

جھبوے ہی ترا بال　　سر میں تیرے بدخصال　　اسے کروں میں پائمال

روی سیاہ ، سیاہ ہی رو

(شیدی اس کو گاوے اور تمام لڑکے کو ڈر دکھاوے بلکہ کسی کو گھونسا بھی لگادے۔
اس کے بعد دھکیلتے ہوئے اندر لے جاوے)

انگریزی ڈھن

چلو　چپ　چپ　نہیں لات ماروں گا　چل ہٹ، تو بے ایمان

مسخری　مت　کر　چل　ہٹ　تو　نہیں تو توڑ گے دندان

چلے　جا　لوچّے　سر تیرا پھوڑیں گے　نہیں تو چلا جا ای نادان

تیسرا منظر

پردہ اٹھے : (یہ گاتے ہوئے لال خاں نظر آوے)

راگنی پرج کلنگڑا —— تال جد

موری گئی رے ، ہاں جوانی رے　　میں تو بوڑا ہوا ہوں

موری گئی رے ہاں جوانی

چاند سی صورت گئی ساری موری　　چہرا نہیں ہی نورانی

ارے ہاں رے لا، لا، چہرا نہیں ہی نورانی رے

میں تو بوڑا ہوا ہوں

آگے کی ملاقات نہیں ہے گی مجھ میں　　رہی ہی فقط ناتوانی

ارے ہاں رے لا، لا، رہی ہی فقط ناتوانی رے

میں تو بوڑا ہوا ہوں

بچھڑے ہیں مجھ سے جو تھی مرے دل پر　　　بروز شباب و جوانی

ارے ہاں رے لا، لا، بروز شباب وجوانی رے

میں تو بوڑا ہوا ہوں

تاریکی گر ہی ضعیفی کی ظاہر　　　دل میں بھری ہی جوانی

ارے ہاں رے لا، لا، دل میں بھری ہی جوانی رے

میں تو بوڑا ہوا ہوں

کہتا ہوں اپنے کو تم سے زلیخا　　　اب تک ماہ کنعانے

ارے ہاں رے لا ، لا ، اب تک ماہ کنعانی رے

میں تو بوڑا ہوا ہوا

شادی کروں میں جو ہوں خوبصورت　　　پھر مجکو ہو شادمانی

ارے ہاں رے لا ، لا ، پھر مجکو ہو شادمانی رے

میں تو بوڑا ہوا ہوں

پہلو میں دو چار رکھوں اپنے دل پر　　　خوشیاں کروں جادوانی

ارے ہاں رے لا ، لا ، خوشیاں کروں جاودانی رے

میں تو بوڑا ہوا ہوں

طاقت ہی کیا جو کوئی گھر میں آوے　　　ہشیاری میں ہیں ، لاثانی

ارے ہاں لا ، لا ، ہشیاری میں لاثانی رے

میں تو بوڑا ہوا ہوں

دروازے میں دو ، دو قفل چڑاؤں　　　اس طرح کروں پاسبانی

ارے ہاں رے لا ، لا ، اسی طرح کروں پاسبانی رے

میں تو بوڑا ہوا ہوں

لال خاں　:　عظمت بی، عظمت بی، عظمت بی۔

عظمت بی　:　حاضر ہوئی۔

لال خاں	:	مری دل ربا کدر ہی۔
عظمت بی	:	مکان میں صاحب۔
لال خاں	:	(چابی اس کے ہاتھ میں دے کر) دیکھ ان کلیدوں کو نگاہ رکھنا، دیکھ یہ بڑے دروازے کی کلید ہی (دیکھا کر) یہ اس دروازے کی کلید، یہ اپر کے چھجو کے کلید، عظمت بی خوب ہشیاری سے رہنا، ماہ لقا جوان عورت ہی وقت پر دغا نہ دے۔
عظمت بی	:	لو صاحب کچھ اندیشہ نہ کرو، وہ جوان ہی، تو میں بوڑی ہوں۔ اس کی دو آنکھیں ہیں تو، میں دس کی مالک ہوں۔ اس کا دو ہاتھ ہی تو میں یہ دو ہاتھ سے ہزار ہاتھ کا کام کرتی ہوں۔ ہو فن وفریب میں جوان ہی تو، میں فن وفریب کرتے کرتے بوڑی ہوگئی ہوں صاحب! آپ کچھ اندیشہ نہ کرو۔
لال خاں	:	عظمت بی، تو جانتی ہی کہ میں نے بلبل کو اس کے والدین سے اس شرط پر لایا ہوں کہ میں اس کو ایک مہینہ اپنے مکان میں رکھو، اور اس کے حال اور چلن کو بغور دیکھوں اور اگر اتنی مدت میں وہ مج کو پسند کرے تو میں اس سے شادی کروں ورنہ مج کو بیس ہزار اشرفیاں جرمانہ دینا پڑے گا اور بلبل کو اس کے والدین کے مکان میں واپس دینا ہوگا۔
عظمت بی	:	ہاں حضور! میں جانتی ہوں۔
لال خاں	:	دیکھ عظمت بی! اب ایک مہینہ کی مدت پوری ہوتی ہی۔ میں چاہتا ہوں کہ بلبل کے مکان پر جاؤں اور ان لوگوں کو اپنے ارادہ سے آگاہ کروں، دیکھ عظمت! یہ گھر اور بلبل میں تج کو سونپ جاتا ہوں، نگہبانی کیجئے۔
عظمت بی	:	

راگنی بھاگ —— تال پستو

جانے نہ دوں گی ان کو میں ہر گز نہیں نہیں

باہر کی کیا ہی بات تو ہرگز کہیں نہیں
افسوس تم کو ہی نہیں میرا بھی اعتبار
کیا بات ہی کہ آپ کا مجھ پر یقیں نہیں
اقرار کر کے آپ سے انکار کب کیا
ہوگا خلاف ہم سے تو ای مہ جبیں نہیں
گھر سے نکلنے ان کو تو ہرگز نہ دوں گی میں
مجھ سے تو ہوگی بات یہ عزلت نشیں نہیں
ممکن کیا، جو دیکھ لے ان کو ، کوئی بھلا
اہل زمیں نہیں ہی اور اہل بریں نہیں

لال خاں :

راگنی پیلو —— تال جد

ضعیفا ہی مج کو بھروسا تمہارا
ہی ما بعد خالق تمہارا سہارا
خبردار ہو ، گھر میں رہنا ہی لازم
نہیں ہونے پاوے کسی کا گزارا
حفاظت سے بیار بلبل کو رکھنا
نہیں جانے پاوے کہیں ماہ پارا
میں جاتا ہوں گھر سے برائے سفر اب
نظر بیچ رکھیو تم اس کو خدارا

فرہاد :

(ماہ لقا(بلبل) کو لے کر گاتے ہوئے نکلے)

راگنی کھماج —— تال قوالی

جاگو جاگو مورا رے کلیجاوا بلبلا میرے اٹھو بلبلا میرے

تو ہارے کارن موری چھتیا تڑے پیارے چومو چومو پیارے مورے مکھوا
بلبلا میرے — اٹھو بلبلا میرے
تمہارے گلے موہے کاہے نہ لگاون پیارے رات دن کریں پیارے رپٹوا
بلبلا میرے — اٹھو بلبلا میرے
سو نہ سو نہ، مورانینوں کا تارا پیارے کرت کرت پیارے جھپٹوا
بلبلا میرے — اٹھو بلبلا میرے

(وہ لال خاں کو دیکھ کر انگشت بہ دنداں ہوا اور لال خاں گاتے ہوئے اُٹھے)

راگنی پیلو — **تال جد**

لال خاں	ماہ لقا
ای میری بلبل	کیا کہتے ہو
یہاں دیکھ ذرا	ہاں جی میاں
میں نا ہی بوڑا	حقیقت میں نئ
پر دل میں جوان	ہاں جی میاں
مان بات میری	بے شک کہیے
دیکھ جان ذرا	ہاں جی میاں
کر مجھ پر نظر	دیکھی میں نے
لے ہاتھ میرا	واہ جی میاں
میں جان تجھ پر دوں	ہاں ہاں ہاں ہاں ہاں
دیکھ میری وفا	ہاں جی میاں
شادی کروں	پھر آگے کیا
تجھے دل تو دیا	ہاں جی میاں
سن ای بلبل	لال خاں کہیے
دے ایک بوسہ	واہ جی میاں

(ماہ لقا جا کر بیٹھ جائے اور لال خاں حاضرین اور اس کی طرف دیکھ دیکھ کر اس کو
گاوے پھر چلا جاوے)

راگنی سن —— تال جد

میں نا ہی بوڑا سنو میرے دل بر
کل جگ کی باتیں جھوٹی ہیں اکثر
ظاہر میں گرچہ ہوا ہوں میں بوڑا
دل میں بھریں ہیں ، جوانی اخگر
تم کو رکھیں عیش و عشرت میں ہر دم
راضی اگر ہو تو ہم سے ، ہو بہتر
زر و مال و حشمت میں کس سے میں کم ہوں
جبیں پر میرے کیسے چمکے ہی اختر
میں بھی ابھی جا کے بن ٹھن آؤں
واللہ نظر آؤں گا جب تو خوش تر

(ماہ لقا اس کو گاتے ہوئے چلی جائے)

راگنی جیجو نتی ملھار —— تال قوالی

ٹھوکے ٹھوکے کیسے ناز سے وہ جاوے
دیکھو ذرا بھم کیا روپ وہ لاوے
کیسے جھپٹوا کرے ہی بوڑا
یونہی سبھی کا وہ دل کو لبھاوے
دیکھو جوانی کی نہیں ہی صورت
تو بھی جواں وہ آپنکو بتاوے
پست ہوئی ہی کمان سے کیا کم
تو بھی آنکڑتے ہوئے وہ تو جاوے

جیسے چاہے وہ کرے سجاوٹ

مجسا جواں کا کب ہاتھ وہ پاوے

جنگل کا پردہ گرتا ھے

چوتھا منظر

(فرہاد اپنے دوست سے کہتا ہوا نکلے)

فرہاد : اس شخص کا نام لال خاں ہی، اس کا گھر آگے نظر آتا ہے اس کے دو نوکریں ہیں۔ ایک عظمت نام کی دایہ اور دوسرا اپنے نام کا حبشی غلام۔

دوست : یہ عجیب احمق الذی ہی کہ اسی نوے برس کا سن ہوا ہی تو بھی شادی کی خواہش نہیں چھوڑتا ہی۔ ایک سولہ برس کی لڑکی پر فدا ہی وہ عجب بے وقوف ہی۔

فرہاد : کیا وہ اس لڑکی پر فدا ہی، دوست میں بھی اس لڑکی کو بہ جان ودل چاہتا ہوں۔

دوست : وہ بھی تم کو چاہتی ہی۔

فرہاد : بے شک میں اس پر بہ جان ودل فدا ہوں، دیکھو اب میں کوئی ترکیب سے اس کو اس بوڑھے کے پنجے سے چھوڑاتا ہوں۔

دوست : تو اس کو کیں کر چھوڑا سکے۔

فرہاد : دوست! تم یہ جانتے ہو کہ میں آواز بدل سکتا ہوں۔ گویا کا بھیس پکڑ کے اس بوڑھے کا مکان تک جا پہنچتا ہوں اور ایک آنکھ میں پٹی لگا کر اپنے کو اندھا بناتا ہوں پھر ایک پاؤں سے لنگڑاتے ہوئے اپنے کو وہاں تک پہونچاتا ہوں اور بنے سے دوستی کرتا ہوں پھر ماہ لقا میری ہی۔

دوست : جب تو میں جاتا ہوں۔ سلام علیکم

فرہاد : وعلیکم السلام

(فرھاد یہ گاتے ھوئے چلا جائے)

راگ ملھار — تال پستو

اس عشق میں کیا کیا نہیں صدمہ میں اٹھاتا

مدت سے عزیزو

دیکھوں گلِ مقصد مرا ، کب ہاتھ میں آتا
قدرت سے عزیزو
اپنی میں حقیقت بھلا ، یاں کس کو بتاؤں
کس سے کروں اظہار
صورت ہوئی تبدیل مری ، دھوپ کی واللہ!
حدت سے عزیزو
عشاق کے ملت نے مری دل کو بگاڑا
افسوس صد افسوس
یہ داغ نیا دل پہ میں اپنی ہی لگایا
ملت سے عزیزو

(پردہ اٹھے)

پانچواں منظر

(لال خاں کہتے ہوئے نکلے)

لال خاں : میں نے تو ساری کلید عظمت بی کے حوالے کی مگر جب بھی مجھ کو شک ہی کہ وہ بے وفائی نہ کرے، مجھ کو لازم ہی کی باہر کی ڈیوڑی میں قفل لگاؤں کہ کوئی اندر نہ آنے پاوے۔ خیر، پنے کو آنے دیجئے وہ بازار گیا ہی اب آتا ہوگا۔ پھر میں اپنے سفر کو جاؤں۔

(پنے یہ گا کر بیٹھ جائے اور اپنے پاؤں دابے پھر لال خاں آوے اور پنے اس کو دیکھ کر کھیل بازی کرے اور گیت گاوے)

لنگریزی دھن

صاحب کا اپنے میں خریدہ ہوں غلام
کرتا ہوں کام - بھرتا ہوں جام صبح سے تا شام
اپنی خصال سے کھانے ہیں جوتی ہم

رکھتے قدم ناز سے بہم پھرتے دم بہ دم

مرے خدا کرے منیب میرے اب

کیوں کہ غضب بلا سبب کرتا بد نصیب

صاحب کا اپنے میں خریدہ ہوں

پنیے : چلام چاب، بجار لایا۔ حجو راور کچھ حوکوم۔

لال خاں : ارے تو میرے آنے کے آگے یہاں کیا کیا بڑبڑا رہا تھا۔

پنیے : حجو رکو دعا کرتا تھا چاب۔

لال خاں : (رومال کی طرف دیکھ کر) اس کو کیوں نیچے رکھا۔ اٹھا اٹھا شیطان زادے۔

(بعد توقف کے) دیکھ میں سفر کو جاتا ہوں، آج شب کو نہیں آؤں گا۔

پنیے : مت آؤ چاب۔

لال خاں : ارے گدھا دیکھ مکان میں ہشیاری سے رہنا کوئی اندر آنے نہ پاوے۔

پنیے : چوٹی (چیونٹی) آوے چاب تو۔

لال خاں : ارے کیا بکتا ہی۔

پنیے : ہاتھی آوے تو۔

لال خاں : (آنکھیں لال کر کے اور بعد توقف کے) دیکھ ہشیاری سے رہنا۔ دروازے پر چوکی دینی، پھر کل تم کو میں خوب سا انعام دوں گا۔ نہیں تو تیرا سر اور میری جوتی۔

پنیے : بہت سا انعام دوگے چاب، اگر ہشیاری نہ رہوں چاب تو تمرا چیرا اور میرا جوتی۔

(لال خاں مارنے چاھے تو پنیے کھے)

نہیں، نہیں، نہیں، میرا چیرا ر تمرا جوتی چاب

لال خاں : خوب ہشیار سے رہنا، دیکھ میں جاتا ہوں۔

(لال خاں تالا دے کر چلا جاوے اور فرہاد لے کر آوے)

چنے : **انگریزی دھن**

گورا سب ہی کالا ، کالا ہوں میں آپ سے
ماں بھی کالا ، باپ بھی کالا اور کالا میں آپ سے
کالا سب سے عالی ، گورے کو نہ پوچھو
گل سے بھی ہی کالا بہتر ، گل کو تم نہ پوچھو

فرہاد : (خود گوئی) آج میں نے اس بوڑے کو باہر جاتے دیکھا، ابھی بلبل سے ملنے کا موقع ہی۔

چنے : (فرہاد کو دیکھ کر) حوکوم دہراراررا۔

فرہاد : (فریب کر کے) حضور میں وہ غریب گویا ہوں جو کل حضور کو گا کے بجا کے خوش کیا تھا۔ آج بھی حضور کو گانا بجانا سنانے آیا ہوں (شراب کا بوتل دے کر) لیجئے یہ شراب۔

چنے : تم بہت اچھا آدمی ہو، یہ کیا چراب ہی۔ اب مجے اڑائیں گے۔

فرہاد : یہ شام چین ہی۔

انگریزی دھن

گیت

چنے : جام چین ہی اچا ہم یہاں پر ناچیں واہ، واہ
اور مچائیں گے طوفان ہی مہیا عشرت کا سب
اور یہ باڑی ہی سن سان
ہم یاں پر ناچیں، واہ واہ، مچائیں گے طوفان
ویری کوڈ، اچھی چراب ہی بہتر، اور کوئی دیں گے ہرگز اور کوئی دیں گے ہرگز، اور کوئی دیں گے ہرگز، ہم یہاں پر ناچیں واہ، واہ، اور مچائیں گے طوفان۔
عظمت بی اوپر کے کہے

انگریزی دھن

عظمت بی	پنبے	فرہاد
پٹے پٹے	کیا رے بوڑے	———
نیچے کیوں ہی تیرا دھیان	بڑبڑ مت کر	———
کیوں رے گدھا	———	آتی ہوگی میری جان
دیکھ ذرا تو	کیا کہتی ہی	———
توڑیں گے تیرا دندان	چل ہٹ چل ہٹ	———
کیا رے موا	———	دایہ ہی مستان
اچھا موذی	ارے ہی کیا	———
آتا ہوگا اب لال خاں	میرا ہی کیا	———
کہہ دوں گی میں	چل ہٹ یاں سے بے ایمان	———
———	جرم نہیں ہی	دھیان رکھو جی
گھر میں کرتا کیوں گمان	خواہش اپنی	———
واہ رے غلبا	———	گھر جن کا میدان
دیکھ ادھر تو	کیا رے نکٹی	———
کون کھڑا ہی	رفیق میرا	———
کہاں سے آیا تو انسان	———	———

(فرہاد یہ گیت گاوے)

راگنی کھماج — تال ٹھمری

حالت اپنی کہوں بھلا کیا، غریب اک انسان ہوں میں
کدھر سے آؤں، کدھر میں جاؤں، خبر نہیں، نادان ہوں میں
بجا کے گا کے، پیٹ بھرت ہوں، غریب گویا تو ہوں میں
سنئے دایہ مری حقیقت، غم سے تو نالاں ہوں میں

رحم کرو کچھ حال پہ میرے ، مری مہربان ، بہر خدا
گذر گیا میں جان سے اپنی، بھوک سے بس بے جان ہوں میں

عظمت بی : یہاں سے جاؤ بابا، یہاں رہنے کا حکم نہیں ہی۔

چپٹے : تیرا لال خاں کا سر موڑوں، یہا کیا بکتی ہی۔

عظمت بی : اس واسطے میں تج کو جانے کہتی ہوں۔ کیوں کہ میرے آقا کا یہاں کسی کو رہنے کا حکم نہیں ہی مگر تیرا حال پر مج کو رحم آتا ہی۔ اچھا بھلا تج کو کچھ گانا آتا ہی۔

فرہاد : ہاں صاحب آتا ہی۔ حکم ہو تو گاؤں

عظمت بی : آہ! میں بھی جب جوان تھی، تب ایسی گاتی تھی کہ میرا گانا سن کر ساری مخلوقات اپنی حرکت سے باز آتی تھیں اور دھیان لگا کر سنتی تھیں۔

چپٹے : اور اب جو تو گاتی ہی تو چپ کوئی تج کو جھاڑو مارتے ہیں، ارا را را جا بکتی کیوں۔

عظمت بی : بھلا گویا۔ تیرا ایک پیر کیوں کر کٹا

فرہاد : لڑائی میں، کچھ خفیف قصور کے باعث کاٹا گیا

عظمت بی : لڑائی میں کاٹا گیا۔

چپٹے : بابا، بابا، بوڑی کو کیا کیا نئی سوچتا ہی۔ یہ بڑی مستانی ہی ارے اس کا پیر کٹا تو تیرا کیا ہوا، تیرا بھی تو ناک کاٹا گیا، واہ رے نکٹی۔

عظمت بی : (بلبل کو دیکھ کر) بی بی تم یہاں سے جاؤ، میں اس گویا سے کچھ بات کر آتی ہو۔ وہ تم کو دیکھے گا تو کیا کہے گا۔

بیمار بلبل :

راگنی بھاگ — تال پستو

دو کہو نہ مجھ کو کچھ تو یہاں مہرباں مری
غم میں کٹی ہی عمر تو یہ جاوداں مری

جانے دو مجھ کو باغ میں اب تو برای سیر

گھر میں اکیلی رہتی ہو ، ای پاسباں مری

فرہاد :

راگنی کلنگڑا — تال ٹھمری

غرض بھلا ان کی دیا ذرا مانو

دیا ذرا مانو

آج کی رینا کسی چھکی ہی جانے دو اسے بانو

دیا ذرا مانو

غرض بھلا ان کی دیا ذرا مانو

چنپے : عظمت دایا چل چل، باغ میں جائیں، یہاں کیا بیٹھی رہی ہی چل چل بوڑی چلی جائیں۔

عظمت بی : ہاں چل، جائیں میں بھی بیٹھے گھبرا گئی ہوں، ارے گوئیے اس جالی کے اندر سے یہاں آ۔

فرہاد : یہ تو بند ہی، کیوں کر آؤں۔

عظمت بی : کیا بند ہی، کاہے سے بند ہی

چنپے : (جھانک کر) ارے بہت بڑا اکلفا سے، ہمارا چیر سے بھی بڑا۔

عظمت بی : کیا لال خاں نے مجھ کو اعتبار نہیں کیا تو میں بھی برخلاف اسکے کرونگی۔

فرہاد : مج کو ایک راہ معلو ہی، حکم ہو تو آؤں۔

چنپے : ارے، آ جا، آ جا۔

فرہاد : (خود گوئی) واہ! اب کیسا اچھا ہوا۔

(پھر سب کوئی مل کر اس کو گاویں)

انگریزی دھن

چلو آؤ ہم سب یہاں سے جائیں

باغ میں جائیں ، باغ میں جائیں

چلو آؤ ہم سب یہاں سے جائیں
باغ میں چین کریں

چنبے : باغ میں جا، گت بھریں

فرہاد : چین کریں، چین کریں

عظمت بی : باغ میں جا، گت بھریں
چین کریں، اور گائیں

چنبے : چین کریں اور چین کریں

(سب کوئی) : دوڑے آؤ، دوڑے آؤ
باغ میں جا، گت بھریں، چین کریں اور گائیں

(سب کوئی) : دوڑ ٦ بار ، چل ٦ بار
باغ میں جا گت، بھریں، چین کریں اور گائیں

چھٹا منظر

پردہ گرے (پھر عظمت بی اور فرہاد نکلے)

فرہاد : بی بی ہم کو ذرا بلبل سے ملا دو گی

عظمت بی : (منھ پھیر کر) واہ ، مان یہ کیا ۔ (فرہاد کی طرف مخاطب ہوکر) تو صاحب آپ پھانسے جاؤ، بھلا لال خاں دیکھے گا تو کیا کہے گا۔

فرہاد : (خود گوئی) ارے اس کا ذری خوش آمد کرنی چاہئے، نہیں تو یہ نہیں سنے گی (عظمت بی کی طرف پھر کر) واہ واہ! آپ بھی جوانی میں بڑی حسین تھیں اور ابھی بھی ماشاءاللہ کیا کم ہیں۔

عظمت بی : ہاں صاحب! میں جوانی میں بڑی حسین تھی، میرا عشق کا دم بھرتے بھرتے لاکھوں مر مٹے، اچھا، میں تجھ کو بلبل سے ملا دوں گی، اچھا، ادھر تو، آ تیری صورت مجھ کو نہایت پسند آئی، تو ہو بہ ہو میرے مرحوم شوہر کی طرح ہی، اچھا ادھر تو آ، مجھ کو ایک بوسہ تو دے بھلا (فرہاد کا منھ پھیر

لینا اور کچھ نہ کہنا)

(پھر وصل ہرنا فرہاد کا بیمار بلبل سے اور بہم غزل گانی)

راگنی جھنجھوٹی — تال پستو

صد شکر ہے کہ دل کا اب مقصود بر آیا
دل دار مرے گھر میں تو اب بے خطر آیا
اب خوف مجھ کو کچھ نہیں ترے سر کی ہی قسم
کاٹوں گا سر گھر میں جو کوئی اگر آیا
تجھ کو گلے سے اپنے لگاؤں نہ کیوں صنم
دل میں سرور اپنا تو اب سربہ سر آیا
گھٹتا ہی غم رفیق مرے دل سے جا بہ جا
واللہ کیا کہوں کہ یہ جان و جگر آیا

(آنا لال خاں کا اور ملاقات ہونی پنے سے اور باجا کی آواز سنی)

لال خاں : ہی یہ باجا کی آواز باغ سے کیوں آرہی ہی، یہ کیا ماجرا، (پنے کو دیکھ کر) ارے تیں یہاں کیا کر رہا ہی، باجے کی آواز کیوں آرہی ہی۔ وہاں جوان جوان بی بی، جوان جوان مرد سے مجا اڑاتا، تم یہاں کیا کرتا، آ۔ ارے تو کیا کہتا ہی، میں ابھی جاتا ہوں۔

(آنا لال خاں کا باغ میں اور عظمت بی اور فرہاد کا ڈر جانا)

انگریزی دھن

(عظمت بی اور ماہ لقا، لال خاں کو دیکھ کر)

جاؤ یہاں سے بھاگو تم، جاؤ یہاں سے بھاگو تم
کیوں کر آیا، کیوں کر آیا، کون ہی تو

لال خاں : (فرہاد کی طرف آنکھیں لال کر کے) اے تو کون ہی۔ یہاں تو کیوں کر آیا، کس نے تجھ کو یہاں آنے کی اجازت دی، ارے تو میری متاع

پر دست اندازی کی ارادہ کیا۔

راگ بھاگ — تال پستو

دہشت نہ آئی تجھ کو بھلا مرد نا بہ کار
عورت کو دوسرے کی بنیا ہی تو نے یار
آنے کا قصد کس لئے تو نے کیا یہاں
کس نے بلایا تجھ کو یہاں مرد نا بہ کار
اندر مکان کے گیا میرا تو بے دریغ
دل میں نے لایا تو نے بھلا خوف کردگار
ٹل جا یہاں سے ورنہ مزا ہم چکھائیں گے
کھائے گا موکیاں تو ہمارا بھی بے شمار

راگنی سارنگ — تال پستو

فرہاد :
میری تقصیر و خطا معاف خدارا کیجئے
چشم رحمت سے مری طرف اشارہ کیجئے
آپ دانہ ہیں ، زیادہ کہوں میں اور کیا
اپنے دشمن سے ہی لازم کہ مدارا کیجئے
پیر پڑ تا ہوں بہ خالق مجھے معذور کیجئے
قہر کے تیغ سے سر کو نہ دو پارہ کیجئے

لال خاں : (فرہاد کا ہات پکڑ کے) دیکھ اب میں تجھ کو کیا مزا چکھاتا ہوں۔

ہاتف :

راگنی کھماج — تال ٹھمری

ارے ٹھیر ذرا یہ تو کرتا ہی کیا، تجھے خوف خطا کیا ذرا ہی نہیں یہ جوان کی عجز پہ دھیان لگا، اس پہ دست جفا تو اٹھا ہی نہیں۔

لال خاں : نہیں نہیں، یہ اس کا کچھ قصور نہیں، یہ میری سراسر جہالت اور حماقت ہی کہ میں نے اسی، نوے برس کا سن میں شادی کا قصد کیا، بیشک یہ مجھ سے حماقت ہوئی ہے۔

راگنی سن کھماج — تال پستو

لازم نہیں ہی مجھ کو جو تجھ پر جفا کروں
گرچہ کروں میں ایسی تو بے شک خطا کروں
شادی کا میں نے قصد کیا بس ضعیفی میں
اس کے سبب سے کان میں اپنا ملا کروں
کرنا نہیں بھلا ہی ضعیفی میں شادیاں
اچھا نہیں کروں ، مگر اپنا برا کروں
مولا یہ جائے بوڑوں کو ایسا خیال دے
ہر دم خدا کے پاس یہی التجا کروں

(پھر سوئپنا لال خاں کا بیمار بلبل کو ہاتھ میں فرہاد کے اور سب کی مبارک گانی)

راگنی کھماج — تا ل قوالی

خوشی کریں چلو سب مل کے سکھیاں
پیارے دن ہی آج ہمن کا
سب سکھی آؤ آؤ منگل گاؤں آج
لعل لٹائیں شیریں سخن کا
خوشی کرت ہی ، سب سکھی مل کے
رہا نہ نام رنج و محن کا
آج کا دن ہو مبارک شادی پیارے
قائم رہے جوڑا نل و دمن کا

(کھیل کا تمام ہونا اور ڈراپ سین کا گرنا)

کفن

منشی پریم چند

(۱۸۸۰ء - ۱۹۳۶ء)

جھونپڑے کے دروازے پر باپ اور بیٹا دونوں ایک بجھے ہوئے الاؤ کے سامنے خاموش بیٹھے ہوئے تھے اور اندر بیٹے کی جوان بیوی بدھیا دردِ زہ سے پچھاڑیں کھا رہی تھی اور رہ رہ کر اس کے منہ سے ایسی دلخراش صدا نکلتی تھی کہ دونوں کلیجہ تھام لیتے تھے۔ جاڑوں کی رات تھی، فضا سناٹے میں غرق، سارا گاؤں تاریکی میں جذب ہو گیا تھا۔ گھیسو نے کہا: ''معلوم ہوتا ہے کہ بچے گی نہیں۔ سارا دن تڑپتے گزر گیا۔ جا دیکھ تو آ۔''

مادھو چڑھ کر بولا: ''مرنا ہے تو جلدی مر کیوں نہیں جاتی۔ دیکھ کر کیا کروں؟''

''تو بڑا بے درد ہے بے! سال بھر جس کے ساتھ سکھ چین سے رہا، اسی کے ساتھ اتنی بیوفائی؟''

''تو مجھ سے تو اس کا تڑپنا اور ہاتھ پاؤں پٹکنا دیکھا نہیں جاتا۔''

چماروں کا کنبہ تھا اور سارے گاؤں میں بدنام، گھیسو ایک دن کام کرتا تو تین دن آرام۔

مادھو اتنا کام چور تھا کہ گھنٹہ بھر کام کرتا تو گھنٹہ بھر چلم پیتا، اس لئے انہیں کہیں مزدوری نہیں ملتی تھی۔ گھر میں مٹھی بھر اناج ہوتو ان کے لئے کام کرنے کی قسم تھی۔ جب دو ایک فاقے ہو جاتے تو گھیسو درختوں پر چڑھ کر لکڑیاں توڑ لاتا اور مادھو بازار میں بیچ آتا اور جب تک وہ پیسے رہتے، دونوں ادھر ادھر مارے پھرتے۔ جب فاقے کی نوبت آجاتی تو پھر لکڑیاں توڑ لاتے یا کوئی مزدوری تلاش کرتے۔ گاؤں میں کام کی کمی نہ تھی۔ کاشتکاروں کا گاؤں تھا' محنتی آدمی کے لئے پچاس کام تھے مگر ان دونوں کو لوگ اسی وقت بلاتے جب دو آدمیوں سے ایک کا کام پاکر بھی قناعت کر لینے کے سوا اور کوئی چارہ نہ ہوتا۔

کاش! دونوں سادھو ہوتے تو انہیں قناعت اور توکل کے لئے ضبط نفس کی مطلق ضرورت نہ ہوتی۔ یہ ان کی فطرت تھی۔ عجیب زندگی تھی ان لوگوں کی۔ گھر میں دو چار مٹی کے برتنوں کے سوا کوئی اثاثہ نہیں تھا۔ پھٹے چیتھڑوں سے اپنے ننگے پن کو ڈھانکے ہوئے جیے جاتے تھے۔ دنیا کی فکروں سے آزاد قرض سے لدے ہوئے' گالیاں بھی کھاتے، مار بھی کھاتے مگر کوئی غم نہیں، مسکین اتنے کہ وصولی کی مطلق امید نہ رہنے پر بھی لوگ انہیں کچھ نہ کچھ قرض دے دیتے تھے۔ مٹر یا آلو کی فصل میں کھیتوں سے آلو مٹر اکھاڑ لاتے اور بھون بھون کر کھاتے یا دس پانچ اونکھ توڑ لاتے اور راتوں کو چوستے۔ گھیسو نے اسی صوفیانہ انداز سے ساٹھ سال کی عمر کاٹ دی تھی اور مادھو بھی سعادت مند بیٹے کی طرح باپ کے نقش قدم پر چل رہا تھا بلکہ اس کا نام اور بھی روشن کر رہا تھا۔ اس وقت بھی دونوں الاؤ کے سامنے بیٹھے آلو بھون رہے تھے جو کسی کے کھیت سے کھود کر لائے تھے۔ گھیسو کی بیوی کا تو مدت ہوا انتقال ہو گیا۔ مادھو کی شادی پچھلے سال ہوئی تھی، جب سے یہ عورت آئی تھی اس نے اس خاندان میں تہذیب کی بنیاد ڈالی تھی اور ان دونوں بے غیرتوں کا دوزخ بھرتی رہتی تھی۔ جب سے وہ آئی' یہ دونوں اور بھی آرام طلب ہو گئے تھے بلکہ کچھ اکڑنے بھی لگے تھے۔ کوئی کام کرنے کو بلاتا تو شانِ بے نیازی سے دوگنی مزدوری مانگتے۔ وہی عورت آج دردزہ سے مر رہی تھی اور یہ دونوں شاید اس انتظار میں تھے کہ یہ مر جائے تو آرام سے سوئیں۔

گھیسو نے آلو چھیلتے ہوئے کہا: ''جا دیکھ تو، کیا حالت ہے اس کی؟ چڑیل کا پھساد ہوگا اور کیا یہاں تو اوجھا بھی ایک روپیہ مانگتا ہے۔''

مادھو کو اندیشہ تھا کہ وہ کوٹھری میں گیا تو گھیسو آلوؤں کا بڑا حصہ صاف کر دے گا۔ بولا:

''مجھے وہاں ڈر لگتا ہے۔''

''ڈر کس بات کا ہے' میں تو ہوں ہی۔''

''تو تم ہی جا کر دیکھو نا؟''

''میری عورت مری تھی تو تین دن اس کے پاس سے ہلا بھی نہیں اور پھر یہ مجھ سے لجائے گی کہ نہیں کبھی اس کا منہ نہیں دیکھا۔ آج اس کا اگھرا ہوا بدن دیکھوں، اسے تن کی سدھ بھی تو نہ ہوگی۔ مجھے دیکھ لے گی تو کھل کر ہاتھ پاؤں بھی نہ پٹک سکے گی۔''

''میں سوچتا ہوں کوئی بال بچہ ہو گیا تو کیا ہوگا۔ سونٹھ، گڑ، تیل کچھ بھی تو نہیں ہے گھر میں۔''

''سب آجائے گا۔ بھگوان دیں تو جو لوگ ابھی پیسہ نہیں دے رہے ہیں، وہی تب بلا کر دیں گے۔ میرے نولڑ کے ہوئے گھر میں کبھی کچھ نہ ہوتا تھا مگر بھگوان نے کسی نہ کسی طرح بیڑا پار لگایا۔''

جس سماج میں رات دن محنت کرنے والوں کی حالت ان کی حالت سے کچھ بہت اچھی نہ تھی اور کسانوں کے مقابلہ میں وہ لوگ جو کسانوں کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھانا جانتے تھے کہیں زیادہ فارغ البال تھے، وہاں اس قسم کی ذہنیت کا پیدا ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہیں تھی۔ ہم تو کہیں گے گھیسو کسانوں کے مقابلے میں زیادہ باریک بین تھا اور کسانوں کی تہی دماغ جمعیت میں شامل ہونے کے بدلے بیٹھک بازوں کی جماعت میں شامل ہو گیا تھا۔ ہاں اس میں یہ صلاحیت نہ تھی کہ بیٹھک بازوں کے اصولوں کی پابندی کرتا، اس لئے جہاں اس کی جماعت کے اور لوگ گاؤں کے سرغنہ اور مکھیا بنے ہوئے تھے۔ اس پر سارا گاؤں انگلی اٹھاتا تھا، پھر بھی اسے یہ تسکین تو تھی ہی کہ اگر خستہ حال ہے تو اسے کم از کم کسانوں کی سی جگر توڑ محنت تو نہیں کرنی پڑتی اور اس کی سادگی اور بے زبانی سے دوسرے بھی فائدہ تو نہیں اٹھاتے۔

دونوں آلو نکال نکال کر جلتے جلتے کھانے لگے۔ کل سے کچھ نہیں کھایا تھا اتنا صبر نہ تھا کہ انہیں ٹھنڈا ہو جانے دیں۔ کئی بار دونوں کی زبانیں جل گئیں۔ چھل جانے پر آلو کا بیرونی حصہ بہت زیادہ گرم نہ معلوم ہوتا تھا لیکن دانتوں تلے پڑتے ہی اندر کا حصہ زبان اور تالو اور حلق کو جلا دیتا تھا اور

اس انگارے کو منہ میں رکھنے سے زیادہ خیریت اسی میں تھی کہ وہ اندر پہنچ جائے، وہاں اسے ٹھنڈا کرنے کے لئے کافی سامان تھا، اس لئے دونوں جلدی جلدی نگل جاتے تھے۔ حالانکہ اس کوشش میں ان کی آنکھوں سے آنسو نکل آتے۔

گھیسو کو اس وقت ٹھاکر کی بارات یاد آئی جس میں بیس سال پہلے وہ گیا تھا۔ اس دعوت میں اسے جو سیری نصیب ہوئی تھی، وہ اس کی زندگی میں ایک یادگار واقعہ بن گئی تھی اور آج بھی اس کی یاد تازہ تھی۔ بولا: ''وہ بھوج نہیں بھولتا۔ تب سے اس طرح کا کھانا اور بھر پیٹ نہیں ملا۔ لڑکی والوں نے سب کو بھر پیٹ پوریاں کھلائی تھیں۔ سب کو..... چھوٹے بڑے سب نے پوریاں کھائیں اور اصلی گھی کی..... چٹنی، رائتہ، تین طرح کے سوکھے ساگ، ایک رس دار ترکاری کتنا سواد ملا، مٹھائی اب کیا بتاؤں کہ اس بھوج میں کتنا سواد ملا کوئی روک ٹوک نہیں تھی۔ جو چیز چاہو مانگو اور جتنی چاہو کھاؤ۔ لوگوں نے تو ایسا کھایا ایسا کھایا کہ کسی سے پانی نہ پیا گیا مگر پروسنے والے ہیں کہ سامنے گرم گرم اور گول گول مہکتی کچوڑیاں ڈالے دیتے ہیں۔ منع کرتے ہیں کہ نہیں چاہئے۔ پتل کو ہاتھ سے روکے ہوئے ہیں مگر وہ ہیں کہ دیئے جاتے ہیں اور جب سب نے منہ دھولیا تو ایک ایک بیڑا پان بھی ملا مگر مجھے پان لینے کی کہاں سدھ تھی۔ کھڑا نہیں ہوا جاتا تھا۔ چٹ پٹ جا کر اپنے کمبل پر لیٹ گیا۔ ایسا دریا دل تھا وہ ٹھاکر۔''

مادھو نے ان کھانوں کا دل ہی میں مزہ لیتے ہوئے کہا:

''اب ہمیں کوئی ایسا بھوج نہیں کھلاتا۔''

''اب کوئی کیا کھلائے گا وہ جمانا تو دوسرا تھا۔ اب تو سب کو کپھایت سوجھی ہے۔ شادی بیاہ میں مت کھرچ کرو، کریا کرم میں مت کھرچ کرو، پوچھو غریبوں کا مال بٹورنے میں تو کمی نہیں ہے۔ ہاں کھرچ میں کپھایت کی ہی سوجھتی ہے۔''

''تم نے بیس پوڑیاں کھائی ہوں گی؟''

''بیس سے جیادہ کھائی تھی۔''

''میں پچاس کھا جاتا۔''

''پچاس سے کم میں نے بھی نہ کھائی ہوں گی۔''

اچھا پٹھا تھا، تُو تو میرا آدھا بھی نہیں ہے۔"

آلو کھا کر دونوں نے پانی پیا اور وہیں الاؤ کے سامنے دھوتیاں اوڑھ کر پاؤں پیٹ میں ڈالے سو رہے، جیسے دو بڑے اژدر گنڈلیاں مارے پڑے ہوں۔ بدھیا ابھی تک کراہ رہی تھی۔

صبح کو مادھو نے کوٹھری میں جا کر دیکھا تو اس کی بیوی ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ اس کے منہ پہ مکھیاں بھنک رہی تھیں۔ پتھرائی آنکھیں اوپر ٹنگی ہوئی تھیں۔ سارا جسم خاک میں لیت پت ہو رہا تھا۔ اس کے پیٹ میں بچہ مر گیا تھا۔

مادھو بھاگا ہوا گھیسو کے پاس گیا، پھر دونوں زور زور سے ہائے ہائے کرنے لگے اور چھاتی پیٹنے لگے۔ پڑوس والوں نے یہ آہ و زاری سنی تو دوڑتے ہوئے آئے اور رسم قدیم کے مطابق ان ابھاگوں کو تشفی کرنے لگے۔

مگر زیادہ رونے دھونے کا موقع نہ تھا۔ کفن اور لکڑی کی بھی فکر کرنی تھی۔ گھر میں پیسہ اس طرح غائب تھا، جیسے چیل کے گھونسلے میں سے مانس۔

باپ بیٹے روتے ہوئے گاؤں کے زمیندار کے پاس گئے۔ وہ ان دونوں کی صورت سے نفرت کرتے تھے۔ کئی بار انہیں ہاتھوں سے پٹ چکے تھے۔ چوری کرنے کے لئے، وعدے پر کام نہ آنے کے لئے۔ پوچھا: "کیا ہے بے گھیسو! روتا کیوں ہے؟ اب تو تیری صورت ہی نظر نہیں آتی۔ معلوم ہوتا ہے کہ تو اس گاؤں میں رہنا نہیں چاہتا۔"

گھیسو نے زمین پر سر رکھ کر آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے کہا: "سرکار! بڑی بپتا میں ہوں۔ مادھو کی گھر والی گجر گئی۔ دن بھر تڑپتی رہی سرکار، ساری رات ہم دونوں اس کے سرہانے بیٹھے رہے۔ دوا دارو جو کچھ ہو سکا کیا مگر وہ ہمیں دگا دے گئی۔ اب کوئی ایک روٹی دینے والا نہیں۔ مالک تباہ ہو گئے۔ گھر اجڑ گیا۔ آپ کا گلام ہوں اب آپ کے سوا کون اس کی مٹی پار لگائے گا۔ ہمارے پاس جو کچھ تھا، وہ سب دوا دارو میں اٹھ گیا۔ سرکار ہی کی دیا ہو گی تو اس کی مٹی اٹھے گی۔ آپ کے سوا اور کس کے در پر جاؤں؟"

زمیندار صاحب رحم دل آدمی تھے مگر گھیسو پر رحم کرنا کالے کمبل پر رنگ چڑھانا تھا۔ جی میں تو آیا کہہ دیں: "چل دور ہو یہاں سے۔ یوں تو بلانے سے بھی نہیں آتا۔ آج جب غرض پڑی تو

آ کر خوشامد کر رہا ہے۔ حرام خور کہیں کا، بدمعاش۔'' مگر یہ غصہ یا سزا کا موقع نہیں تھا۔ دل میں کڑھتے ہوئے دو روپے نکال کر پھینک دیئے مگر تشفی کا ایک کلمہ بھی منہ سے نہ نکلا۔ اس کی طرف تاکا تک نہیں۔ گویا سر کا بوجھ اتارا ہو۔

جب زمیندار صاحب نے دو روپے دیئے تو گاؤں کے بنئے مہاجنوں کو انکار کی جرأت کیوں کر ہوتی۔ گھیسو زمیندار کے نام سے ڈھنڈورا پیٹتا جاتا تھا۔ کسی نے دو آنے دیئے کسی نے چار آنے۔ ایک گھنٹہ میں گھیسو کے پاس پانچ روپے کی معقول رقم جمع ہوگئی۔ کسی نے غلہ دیا، کسی نے لکڑی اور دوپہر کو گھیسو اور مادھو بازار سے کفن لانے چلے۔ ادھر لوگ بانس وانس کاٹنے لگے۔

گاؤں کی نرم دل عورتیں آ آ کر لاش دیکھتی تھیں اور اسکی بے بسی پر دو بوند آنسو گرا کر چلی جاتی تھیں۔

بازار میں پہنچ کر گھیسو بولا: ''لکڑی تو اسے جلانے بھر کو مل گئی ہے۔ کیوں مادھو؟''

مادھو بولا: ''ہاں لکڑی تو بہت ہے اب کفن چاہئے۔''

''تو چلو کوئی ہلکا کفن لے لیں۔''

''ہاں اور کیا۔ لاش اٹھتے اٹھتے رات ہو جائے گی۔ رات کو کفن کو کون دیکھتا ہے۔''

''کیسا برا رواج ہے کہ جسے جیتے جی تن ڈھانکنے کو چیتھڑا بھی نہ ملے، اسے مرنے پر نیا کفن چاہئے۔''

''کفن لاش کے ساتھ جل ہی تو جاتا ہے۔''

''اور کیا رکھا ہے۔ یہی پانچ روپے پہلے ملتے تو کچھ دوا دارو کرتے۔''

دونوں ایک دوسرے کے دل کی بات تاڑ رہے تھے۔ بازار میں ادھر ادھر دیکھتے رہے۔ کبھی اس بزاز کی دوکان پر گئے، کبھی اس دوکان پر طرح طرح کے ریشمی اور سوتی کپڑے دیکھے مگر کچھ جچا نہیں۔ یہاں تک کہ شام ہوگئی۔ دونوں اتفاق سے یا عمداً ایک شراب خانے کے سامنے آ پہنچے اور گویا کسی طے شدہ فیصلے کے مطابق اندر چلے گئے اور وہاں ذرا دیر تک دونوں تذبذب میں پڑے رہے۔ پھر گھیسو نے گدی کے سامنے جا کر کہا:

''ساہو جی! ایک بوتل ہمیں بھی دینا۔ اس کے ساتھ چبینا لیا۔''

تلی ہوئی مچھلی آئی اور دونوں برآمدے میں بیٹھ کر مزے سے پینے لگے۔ کئی گلاس تابڑ توڑ پینے کے بعد دونوں سرور میں آگئے۔

گھیسو بولا:

''کپھن لانے سے کیا ملتا ہے؟ آ کھر جل ہی تو جاتا، کچھ بہو کے ساتھ تو نہ جاتا۔''

مادھوآسمان کی طرف دیکھ کر بولا: ''گویا دیوتاؤں کو اپنی معصومیت کا گواہ بنا رہا ہو۔''

''دنیا کا دستور ہے۔ یہی لوگ بامنوں کو ہجاروں روپے کیوں دے دیتے ہیں؟ کون دیکھتا ہے پرلوک میں ملتا ہے کہ نہیں۔''

''بڑے آدمیوں کے پاس دھن ہے، پھونکیں ہمارے پاس پھونکنے کو کیا ہے۔''

''لیکن لوگوں کو کیا جواب دو گے؟ لوگ پوچھیں گے نہیں کہ کپھن کہاں ہے؟''

گھیسو ہنسا: ''اب کہہ دیں گے کہ روپے کمر سے کھسک گئے۔ بہت ڈھونڈا ملے ہی نہیں۔ لوگوں کو یقین نہ آئے گا مگر پھر وہی روپے دیں گے۔''

مادھو بھی ہنسا۔ اس غیر متوقع خوش نصیبی پر، قدرت کو اس طرح شکست دینے پر بولا:

''بڑی اچھی تھی بچاری۔ مری بھی تو خوب کھلا پلا کر۔''

آدھی بوتل سے زیادہ ختم ہوگئی۔ گھیسو نے دو سیر پوریاں منگوائیں۔ چٹنی، اچار اور چٹ پٹی کلیجی۔ شراب خانے کے سامنے ہی دکان تھی۔ مادھو لپک کر دو پتلوں میں سارا سامان لے آیا۔ پورے ڈیڑھ روپے خرچ ہوگئے۔ صرف تھوڑے سے پیسے بچ رہے تھے۔

دونوں اس وقت اس شان سے بیٹھے ہوئے پوریاں کھا رہے تھے، جیسے جنگل میں کوئی شیر اپنا شکار اڑا رہا ہو۔ نہ جواب دہی کا خوف تھا، نہ بدنامی کی فکر۔ ان سب جذبوں کو انہوں نے بہت پہلے جیت لیا تھا۔ گھیسو فلسفیانہ انداز سے بولا: ''ہماری آتما پرسن ہو رہی ہے تو اسے کیا پن ہوگا۔''

مادھو نے عقیدت سے سر جھکا کر تصدیق کی: ''جرور ہوگا۔ بھگوان تم تو انتریامی ہو، اسے بے کنٹھ لے جانا۔ ہم دونوں ہردے سے آشیرواد دے رہے ہیں۔ آج جو بھوجن ملا وہ کبھی عمر بھر نہ ملا تھا۔''

ایک لمحے کے بعد مادھو کے دل میں ایک تشویش پیدا ہوئی۔ کیوں دادا! ہم لوگ بھی تو ایک

نہ ایک دن وہاں جائیں گے ہی؟

گھیسو نے اس بھولے بھالے سوال کا جواب نہ دیا۔ وہ پرلوک کی باتیں سوچ کر اس مزے میں خلل نہ ڈالنا چاہتا تھا۔

''جو وہاں ہم لوگوں سے وہ پوچھے گی کہ تم نے ہمیں کفن کیوں نہ دیا تو کیا کہو گے؟''

''کہیں گے تمہارا سر!''

''پوچھے گی تو جرور۔''

''تو کیسے جانتا ہے کہ کفن نہ ملے گا، تو مجھے ایسا گدھا سمجھتا ہے۔ میں ساٹھ سال کی دنیا میں گھاس کھودتا رہا ہوں۔ اس کو کفن ملے گا اور بہت اچھا ملے گا۔''

مادھو کو یقین نہ آیا۔ بولا: ''کون دے گا؟ روپے تو تم نے چٹ کر لئے۔ وہ تو مجھ سے پوچھے گی۔ اس کی مانگ میں تو سیندور میں نے ہی ڈالا تھا۔''

گھیسو گرم ہو کر بولا: ''میں کہتا ہوں کہ اسے کفن ملے گا تو مانتا کیوں نہیں۔''

''کون دے گا؟ بتاتے کیوں نہیں؟''

''وہی لوگ دیں گے، جنہوں نے اب کی دیا۔ ہاں وہ روپے ہمارے ہاتھ نہ آئیں گے۔''

جوں جوں اندھیرا بڑھتا تھا اور ستاروں کی چمک تیز ہوتی تھی، مے خانے کی رونق بھی بڑھتی جاتی تھی۔ کوئی گاتا تھا، کوئی ڈینگ مارتا تھا، کوئی اپنے ساتھی کے گلے لپٹا جاتا تھا، کوئی اپنے دوست کے منہ سے کلھڑ لگائے دیتا تھا۔ وہاں کی فضا میں سرور تھا، ہوا میں نشہ، کتنے چلو ہی مست ہو جاتے تھے۔ شراب سے زیادہ یہاں کی ہوا ان پر نشہ کرتی تھی۔ زندگی کی مشکلیں یہاں کھینچ لاتی تھیں اور کچھ دیر کے لئے وہ بھول جاتے تھے کہ وہ زندہ ہیں یا مردہ! یا نہ جیتے ہیں نہ مرتے ہیں۔

اور یہ دونوں باپ بیٹے اب مزے سے چسکیاں لے رہے تھے۔ سب کی نگاہیں ان کی طرف جمی ہوئی تھیں۔ کتنے خوش نصیب ہیں دونوں۔ پوری بوتل بیچ میں ہے۔

بھر پیٹ کھا کر مادھو نے بچی ہوئی پوریوں کا پتل اٹھا کر بھکاری کو دے دیا جو کھڑا ان کی طرف بھوکی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ''پینے'' کے غرور اور ''دینے'' کی برتری اور مسرت کا اپنی زندگی میں پہلی بار احساس ہوا۔

گھیسو نے کہا: ''لے جا کھوب کھا اور اسیر باد دے جس کی کمائی ہے وہ تو مر گئی مگر تیرا آسیر بادا سے ضرور پہنچے گا۔ روئیں روئیں سے آسیر باد دے بڑھی گاڑھی کمائی کے پیسے ہیں۔''

مادھو نے پھر آسمان کی طرف دیکھ کر کہا:

''بے کنٹھ میں جائے گی دادا۔ بے کنٹھ کی رانی بنے گی۔''

گھیسو کھڑا ہو گیا اور جیسے مسرت کی لہروں میں تیرتا ہوا بولا:

''ہاں بیٹا بے کنٹھ میں جائے گی۔ کسی کو ستایا نہیں، کسی کو دبایا نہیں، مرتے وقت ہماری زندگی کی سب سے بڑی لالسا پوری کر گئی۔ وہ بے کنٹھ میں نہ جائے گی تو کیا یہ موٹے موٹے لوگ جائیں گے جو گریبوں کو دونوں ہاتھوں سے لوٹتے ہیں اور اپنے پاپ کو دھونے کے لئے گنگا میں نہاتے ہیں اور مندر میں جل چڑھاتے ہیں۔''

یہ خوش اعتقادی کا رنگ بدلا۔ تلون نشے کی خاصیت ہے۔ یاس وغم کا دورہ پڑا۔ مادھو بولا:

''بچاری نے جندگی میں بڑا دکھ بھوگا۔ کتنا دکھ جھیل کر مری۔''

وہ آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر رونے لگا۔ چیخیں مار مار کے۔

گھیسو نے سمجھایا: ''کیوں روتا ہے بیٹا۔ کھس ہو کہ وہ مایا جال سے مکت ہو گئی۔ جنجال سے چھوٹ گئی۔ بڑی بھاگوان تھی جو اتنی جلدی مایا موہ کے بندھن توڑ دیئے۔''

اور دونوں وہیں کھڑے ہو کر گانے لگے۔

''ٹھگنی کیوں نینا جھمکائے ٹھگنی!''

سب پینے والوں کی آنکھیں ان پر لگی ہوئی تھیں اور یہ دونوں شرابی محویت کے عالم میں گائے جاتے تھے پھر دونوں ناچنے لگے۔ اُچھلے بھی، کودے بھی، گرے بھی، مٹکے، بھاؤ بھی بتائے اور اداکاری بھی کی اور آخر نشے سے بدمست ہو کر وہیں گر پڑے۔

تائی ایسری

کرشن چندر

(۱۹۱۴ء - ۱۹۷۷ء)

میں گرانٹ میڈیکل کالج کلکتہ میں ڈاکٹر کا فائنل کورس کر رہا تھا اور اپنے بڑے بھائی کی شادی پر چند روز کے لئے لاہور آ گیا تھا۔ یہیں شاہی کے محلے کے قریب کوچہ ٹھاکر داس میں جہاں ہمارا آبائی گھر تھا، میری ملاقات پہلی بار تائی ایسری سے ہوئی —

تائی ایسری ہماری سگی تائی تو نہ تھیں لیکن ایسی تھیں کہ انھیں دیکھ کر ہر ایک کا جی انھیں تائی کہنے کے لئے بے قرار ہو جاتا تھا — محلے کے باہر جب ان کا تانگہ آ کے رکا اور کسی نے کہا: ''لو تائی ایسری آ گئیں۔'' تو بہت سے بوڑھے جوان مرد اور عورتیں انھیں لینے کے لئے دوڑے۔ دو تین نے سہارا دے کر تائی ایسری کو تانگے سے نیچے اتارا کیونکہ تائی ایسری فربہ اندام تھی اور چلنے سے یا باتیں کرنے سے یا محض کسی کو دیکھنے ہی سے ان کی سانس پھولنے لگتی تھی۔ دو تین رشتے داروں نے یکبارگی اپنی جیب سے تانگے کے کرائے کے پیسے نکالے مگر تائی ایسری نے اپنی پھولی ہوئی سانسوں میں ہنس کر سب سے کہہ دیا کہ وہ تو پہلے ہی تانگے والے کو کرائے کے پیسے دے چکی ہے اور جب وہ

یوں اپنی پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان باتیں کرتے کرتے ہنسیں تو مجھے بہت اچھی معلوم ہوئیں۔ دوتین رشتے داروں کا چہرہ اتر گیا اور انھوں نے اپنے پیسے جیب میں ڈالتے ہوئے کہا: "یہ تم نے کیا کیا تائی؟" "ہمیں اتنی سی خدمت کا موقع بھی نہیں دیتی ہوا" اس پر تائی نے کچھ جواب نہیں دیا انھوں نے اپنے قریب کھڑی ہوئی ایک نوجوان عورت سے پنکھی لے لی اور اسے جھلتے ہوئے مسکراتے ہوئے آگے بڑھ گئیں۔

تائی ایسری کی عمر ساٹھ سال سے کم نہ ہوگی۔ ان کے سر کے بال کھچڑی ہو چکے تھے۔ اور ان کے بھرے بھرے گول مٹول گندمی چہرے پر بہت اچھے لگتے تھے۔ ان کا پھولی پھولی سانسوں میں معصوم باتیں کرنا تو سب کو اچھا لگتا ہی تھا۔ لیکن مجھے ان کے چہرے میں ان کی میلوں دور تک پھیلے ہوئے کھیتوں کا خیال آیا ہے۔ کسی بڑی اور گہری دریائی بسیط چادر آب کا خیال آیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ خیال بھی آیا ہے کہ ان آنکھوں کے اندر جو محبت ہے اس کا کوئی کنارہ نہیں، جو معصومیت ہے، اس کی کوئی تھاہ نہیں۔ جو درد ہے اس کا کوئی درماں نہیں۔

میں نے آج تک ایسی آنکھیں کسی عورت کے چہرے پر نہیں دیکھیں۔ جو اس قدر وسیع اور بے کنار ہوں، کہ زندگی کو بڑے سے بڑا اور تلخ سے تلخ تجربہ بھی ان کے لئے ایک تنکے سے زیادہ حیثیت نہ رکھے۔ ایسی آنکھیں جو اپنی پہنائیوں میں سب کچھ بہا لے جائیں۔ ایسی انوکھی معاف کرنے والی، درگزر کر دینے والی آنکھیں میں نے آج تک نہیں دیکھیں۔

تائی ایسری نے کاسنی شاہی کا گھاگھرا پہن رکھا تھا جس پر سنہری گوٹے کا لہریہ چمک رہا تھا۔ ان کی قمیض بسنتی ریشم کی تھی جس پر زری کے پھول کڑھے ہوئے تھے۔ سر پر دوہری ململ کا قرمزی دوپٹہ تھا۔ ہاتھوں میں سونے کے گھوکھرو تھے۔ جب وہ گھر کے دالان میں داخل ہوئیں تو چاروں طرف شور مچ گیا۔ بہوئیں اور خالائیں اور نندیں اور بھاوجیں، موسیاں اور چچیاں سب تائی ایسری کے پاؤں چھونے کو دوڑیں۔ ایک عورت نے جلدی سے ایک رنگین پیڑھی کھینچ کر تائی ایسری کے لئے رکھ دی اور تائی ایسری ہنستے ہوئے اس پر بیٹھ گئیں اور باری باری سب کو گلے لگا کر بس کے سر پر ہاتھ پھیر کر سب کو دعا دینے لگیں۔

ان کے قریب ہیرو مہری کی بیٹی سوتری خوشی سے اپنی باچھیں کھلائے زور زور سے پنکھا

جھل رہی تھی۔ تائی ایسری گھر سے رنگین پچھی کی ایک ٹوکری لے کر آئی تھی جو ان کے قدموں میں ان کے پیڑھی کے پاس ہی پڑی تھی۔ وہ باری باری سے سب کو دعائیں دیتی جاتیں اور پچھی والی ٹوکری کھول کر اس میں سے ایک چونی نکال کر دیتی جاتیں۔ کوئی ایک سو چونیاں انھوں نے اگلے بیس منٹ میں بانٹ دی ہوں گی۔ جب سب عورتیں اور مرد، لڑکے اور بچے بالے ان کے پاؤں چھو کر اپنی اپنی چونی لے چکے تو انھوں نے اپنی تھوڑی اونچی کر کے پنکھا جھلنے والی لڑکی کی طرف دیکھا اور اس سے پوچھا:

"تو کون ہے؟"

"میں سوتری ہوں۔" بچی نے شرماتے ہوئے جواب دیا۔

"آئے ہائے تو جے کرشن کی لڑکی ہے؟ میں تو بھول ہی گئی تھی۔ تجھے آ جا گلے سے لگ جا..."

تائی ایسری نے اسے گلے سے لگا لیا۔ بلکہ اس کا منھ بھی چوم لیا اور جب انھوں نے اپنی پچھی والی ٹوکری سے نکال کر چونی دی تو تو گھر کی ساری عورتیں قہقہہ مار کر ہنس پڑیں اور موسی کرتارو اپنی نیلم کی انگوٹھی والی انگلی نچا کر بولی:

"تائی یہ تو جے کشن کی بیٹی سوتری نہیں ہے۔ یہ تو ہیرو مہری کی بیٹی سوتری ہے!"

"ہائے میں مرگئی!" تائی ایسری ایک دم گھبرا کر بولیں اور ان کی سانس پھول گئی۔ "ہائے اب تو مجھے نہانا پڑے گا۔ میں نے تو اس کا منھ بھی چوم لیا۔ اب کیا کروں؟"

تائی ایسری نے بڑی بڑی حیران نگاہوں سے مہری کی بیٹی سوتری کی طرف دیکھا جو اب اس طرح دھتکارے جانے سے سسکنے لگی تھی۔ یکا یک تائی کو اس پر رحم آ گیا۔ انھوں نے پھر اسے بانہہ سے پکڑ کر چمٹا لیا—" ناں! ناں تو کیوں روتی ہے۔ تُو تو انجان ہے۔ تُو تو دیوی ہے تُو تو کنواری ہے۔ تیرے من میں تو پرمیسر بستے ہیں۔ تُو کیوں روتی ہے؟ مجھے تو اپنے دھرم کے کارن نہانا پڑے گا۔ پر تو کیوں روتی ہے۔ لے ایک چونی اور لے......"

تائی ایسری نے اسے دوسری چونی دی۔ دوسری چونی پا کر مہری کی بیٹی سوتری اپنے آنسو پونچھ کر مسکرانے لگی۔ تائی ایسری نے ایک بازو اٹھا کر پرے دالان میں گزرتی ہوئی ہیرو مہری کو دیکھ کر بلند آواز میں کہا:

''نی ہیرو۔ میرے اشنان کے لئے پانی رکھ دے۔ تجھے بھی ایک چونی دوں گی!''

اس پر ساری محفل پھر لوٹ پوٹ ہوگئی۔

تائی ایسری کو کئی لوگ چونی والی تائی کہتے تھے۔ کئی لوگ کنواری تائی کہتے تھے کیونکہ یہ بھی مشہور تھا کہ جس دن سے تایا یودھ راج نے تائی ایسری سے شادی کی تھی، اس دن سے آج تک وہ کنواری کی کنواری چلی آرہی تھیں کیونکہ سنانے والے کہتے ہیں کہ تایا یودھ راج نے اپنی شادی سے پہلے جوانی میں اتنی خوبصورت عورتیں دیکھ ڈالیں تھیں کہ جب ان کی شادی گاؤں کی اس سیدھی سادی لڑکی سے ہوئی تو شادی کے پہلے روز ہی وہ انھیں بالکل پسند نہ آئیں۔ جب سے انھوں نے شادی کر کے انھیں بالکل اکیلا چھوڑ دیا تھا مگر کسی طرح کی سخت نہیں کرتے تھے۔ تایا یودھ راج ہر ماہ پچھتر روپے اسے بھیجتے تھے۔ وہ گاؤں میں رہتی تھیں۔ اپنے سسرال کے ہاں—اور سب کی خدمت کرتی تھیں اور تایا یودھ راج جالندھر میں لوہے کا بیوپار کرتے تھے اور کئی کئی سال اپنے گاؤں میں نہیں جاتے تھے۔ میکے والوں نے کئی بار آ کر تائی کو لے جانا چاہا مگر انھوں نے انکار کر دیا۔ میکے والوں نے یہ بھی چاہا کہ ان کی شادی پھر سے کر دی جائے مگر تائی اس کے لئے بھی راضی نہ ہوئیں وہ ایسے انہماک سے اپنے سسرال کے لوگوں کی خدمت کرتی رہیں کہ سسرال والے خود اسے اپنی بیٹی اور بہو سے زیادہ چاہنے لگے۔ تایا یودھراج کے باپ مالک چند نے تو اپنے گھر کی ساری چابیاں تائی ایسری کے سپرد کر دی تھیں اور ساس بھی اس حد تک چاہنے لگی تھیں کہ انھوں نے اپنے سارے گہنے پاتے نکال کر تائی ایسری کی تحویل میں دے دیئے تھے۔ ویسے بہت سی عورتوں کو دیکھ کر یہ خیال بھی آتا ہے کہ جوانی میں یہ کیسی رہی ہوں گی؟ مگر تائی ایسری کو دیکھ کر کبھی یہ خیال نہ آیا۔ ہمیشہ یہی خیال آتا کہ تائی ایسری شاید بچپن سے، بلکہ جنم ہی سے ایسی پیدا ہوئی ہوں گی۔ پیدا ہوتے ہی انھوں نے پتی کو ہاتھ پھیلا کر آشیرواد دی ہوں گی اور شاید بڑے میٹھے مہربان لہجے میں یہ بھی کہا ہو:

''تجھے میرے لئے بہت دکھ اٹھانے پڑے، اس لئے یہ لیجئے ایک چونی!''

شاید اسی لئے اپنے شوہر سے بھی ان کے تعلقات بے حد خوشگوار تھے۔ تایا یودھ راج ہمارے رشتے داروں کی نظر میں شرابی کبابی اور رنڈی باز تھے۔ وہ لوہے کے بڑے بیوپاری تھے تو کیا ہوا۔ انھیں اس طرح سے تائی ایسری کی زندگی برباد کرنا نہ چاہئے۔ مگر جانے کیا بات تھی تائی ایسری کو قطعاً اپنی زندگی برباد ہونے کا کوئی غم نہ تھا۔ ان کے طرز عمل سے معلوم ہوتا تھا، جیسے انھیں

اس بات کا بھی علم نہیں ہے کہ کسی نے ان کی زندگی برباد کی ہے...... ہر وقت ہنستی، کھیلتی، باتیں کرتی۔ ہر ایک کے سکھ اور دکھ میں شامل ہونے اور خدمت کرنے کے لئے تیار نظر آتیں۔ یہ تو بالکل ناممکن تھا کہ پڑوس میں کسی کے ہاں خوشی ہو اور وہ اس میں شریک نہ ہوں۔ کسی کے ہاں کوئی غم ہو اور وہ اس میں حصہ نہ بٹائیں۔ تائی ایسری کے شوہر امیر تھے مگر وہ خود تو امیر نہ تھیں۔ پچھتر روپے جو انھی ماہوار ملتے تھے وہ انھیں ہمیشہ دوسروں پر خرچ کر دیتی تھیں مگر وہ سستے زمانے کے پچھتر روپے تھے۔ اسی لئے بہت سے لوگوں کے دکھ درد دور ہو جاتے تھے۔ مگر لوگ ان سے انکی وقت بے وقت کی مدد کی وجہ سے پیار نہیں کرتے تھے۔ ایسے ہی بہت سے موقع آتے تھے جب تائی ایسری کی جیب میں ایک چھدام تک نہ ہوتا تھا۔ اس وقت بھی لوگ بے مزہ نہ ہوئے بلکہ یہی کہتے سنے گئے کہ تائی ایسری کے تو چرن چھو لینے ہی سے دل کو شانتی مل جاتی ہے۔

مگر جتنی اچھی تائی ایسری تھیں، تایا یودھا اتنے ہی برے تھے۔ تیس برس تک تو انھوں نے تائی ایسری کو اپنے ماں باپ کے گھر گاؤں ہی میں رکھا اور جب ان کے ماں اور باپ دونوں ہی مر گئے اور گھر خالی ہو گیا، گھر کے دوسرے افراد بڑے ہو گئے اور شادیاں کر کے اور اپنے گھر بسا کے دوسری جگہوں پر چلے گئے تو انھیں بادلِ نخواستہ تائی ایسری کو بھی جالندھر بلوانا پڑا مگر یہاں تائی ایسری چند دنوں سے زیادہ نہ رہ سکیں کیونکہ پکا باغ کے معزز پٹھانوں کی ایک لڑکی سے تایا یودھ راج نے یارانہ گانٹھنے کی کوشش کی تھی۔ نتیجے میں انھیں جالندھر سے بھاگ کر لاہور آنا پڑا۔ کیونکہ پکا باغ کے پٹھانوں نے آ کر تائی ایسری سے کہہ دیا تھا کہ صرف تمہاری وجہ سے ہم نے اسے زندہ چھوڑ دیا ہے۔ اب بہتر یہی ہے کہ تم اپنے گھر والے کو لے کر کہیں چلی جاؤ، ورنہ ہم اسے زندہ نہ چھوڑیں گے اور تائی ایسری اس واقعہ کے چند روز بعد ہی تایا کو لے کر لاہور آ گئیں محلہ ونجاراں میں انھوں نے ایک چھوٹا سا مکان لے لیا تھا۔ خوش قسمتی سے یا بدقسمتی سے یہاں بھی تایا یودھ کا بیوپار چند مہینوں ہی میں چمک گیا۔ اسی اثناء میں انھوں نے شاہی محلے کی ایک طوائف پچھی سے دوستی کر لی اور ہوتے ہوتے یہ قصہ یہاں تک بڑھا کہ اب انھوں نے مستقل طور پر اسی پچھی کے گھر رہنا شروع کر دیا تھا اور محلہ ونجاراں میں قدم تک نہ دھرتے تھے۔ لیکن تائی ایسری کو دیکھ کر کبھی کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ انھیں اس امر کا اتنا سا بھی ملال ہوا ہوگا۔

یہی وہ زمانہ تھا جب تایا یودھ راج اور اسی طوائف کا قصہ زوروں پر تھا۔ انہی دنوں ہمارے

بڑے بھائی صاحب کی شادی ہوئی۔ شادی یودھ راج تو شریک نہ ہوئے لیکن تائی نے رشتے داروں، مہمانوں اور برات کی خدمت گذاری میں دن رات ایک کردیا۔ ان کی خوش مزاجی سے پیچیدہ سے پیچیدہ گتھیاں سلجھ گئیں۔ چہرے پر چڑھی ہوئی تیوریاں اتر گئیں اور جبینیں شکنوں سے صاف اور منور ہوتی گئیں۔ اس میں تائی کی کاوش کو کوئی دخل نہ تھا۔ سکون کی شعاعیں گویا خود بخود ان کے جسم سے پھوٹتی تھیں۔ انھیں دیکھتے ہی ہر ایک کا غصہ اتر جاتا۔ پیچیدہ سے پیچیدہ الجھنیں خود بخود سلجھ جاتیں گھر بھر میں بشاشت بکھر جاتی۔ ایسی تھی تائی ایسری!

میں نے تائی ایسری کو کبھی کسی کی برائی کرتے نہیں دیکھا۔ کبھی قسمت کا گلہ کرتے نہیں دیکھا۔ کبھی رنجور یا اداس نہیں دیکھا۔ ہاں ایک بار ان کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک دیکھی تھی اور وہ واقعہ بھی اسی شادی سے متعلق ہے۔

بڑے بھائی صاحب تو رات بھر شادی کی بیدی پر بیٹھے رہے۔ صبح کے پانچ بجے شادی کے بعد لڑکی والوں نے اپنے گھر کے ہال کو جہیز کا سامان دکھانے کے لئے سجادیا۔ پرانے زمانے تھے وہ اس زمانے میں صوفوں کے بجائے رنگین پیڑھیاں دی جاتی تھیں اور منقش پایوں والے پلنگ دیئے جاتے تھے۔ اس زمانے میں ڈرائینگ روم کو بیٹھک یا دیوان خانہ کہا جاتا تھا۔ میرے بڑے بھائی کے سسر ملٹری میں ایگزیکٹو آفیسر تھے۔ چونکہ وہ پہلے ہندوستانی ایکو یکٹو آفیسر تھے، اس لئے انھوں نے جہیز میں بہت کچھ دیا تھا اور ساری ہی نئے فیشن کی چیزیں دیں تھی۔ ہماری برادری میں پہلی بار جہیز میں صوفہ سیٹ دیا گیا۔ ساری برادری میں اس صوفہ سیٹ کی دھوم مچ گئی۔ دور دور کے محلوں سے بھی عورتیں ''انگریجی پیڑھیوں'' کو دیکھنے کے لئے آنے لگیں۔ تائی ایسری کے لئے بھی صوفہ سیٹ دیکھنے کا پہلا موقعہ تھا۔ پہلے تو بڑی حیرانی سے اسے دیکھتی رہیں۔ اس پر ہاتھ پھیر کر بار بار من ہی من میں کچھ بڑبڑاتی رہیں۔ آخر ان سے رہا نہ گیا تو انھوں نے مجھ سے پوچھ ہی لیا:

''دے کاکا۔ اس کو صوفہ سیٹ کیوں بولتے ہیں؟''

ابمیں اس کا جواب کیا دیتا۔ سر ہلا کر کہنے لگا:

''مجھے نہیں معلوم تائی!''

''اچھا تو اس کی دو کرسیاں چھوٹی کیوں ہیں اور وہ تیسری کرسی لمبی کیوں ہے؟''

میں پھر لا جواب ہو گیا۔ خاموشی سے انکار میں سر ہلا دیا۔

تائی دیر تک سوچتی رہیں۔ پھر یکا یک جیسے ان کی سمجھ میں کچھ آ گیا۔ ان کا چہرہ ان کی معصوم سی مسکراہٹ سے روشن ہوا تھا۔ بولیں: ''میں بتاؤں؟''

میں نے کہا: ''بتاؤ تائی!''

وہ ہم سب کو بچوں کی طرح سمجھاتے ہوئے بولیں: ''دیکھو میرا خیال یہ ہے کہ یہ لمبا صوفہ تو اس لئے بنا ہے کہ جب دونوں میاں بیوی میں صلح ہو تو وہ دونوں اس لمبے صوفے پر بیٹھیں اور جب ان دونوں میں لڑائی ہو تو الگ الگ ان دو چھوٹے چھوٹے صوفوں پر بیٹھیں۔ سچ مچ یہ انگریج بڑے عقل مند ہوتے ہیں۔ جبھی تو ہم پر حکومت کرتے ہیں۔''

تائی کی دلیل سن کر محفل میں ایک زوردار قہقہہ پڑا مگر میں نے دیکھا کہ تائی یہ سوچ کر اور بات کہہ کر کچھ چپ سی رہ گئیں۔ کیا اس وقت اپنا اور اپنے خاوند کا جھگڑا یاد آیا تھا؟ یہ تو میں نہیں کہہ سکتا۔ میں نے جب غور سے ان کی آنکھوں میں دیکھا تو ایک پل کے لئے مجھے ان کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک نظر آئی، پھر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے دریا کا پاٹ بہت چوڑا ہو گیا ہو!

کلکتے میں ایم. بی. ایس کرنے کے بعد میں نے وہیں ایک بنگالی لڑکی سے شادی کر لی اور دھرم تلے میں پریکٹس کرنے لگا۔ کئی سال کوشش کرتا رہا مگر پریکٹس نہ چلی۔ چنانچہ اپنے بڑے بھائی صاحب کے اصرار پر لاہور چلا آیا۔ بھائی صاحب نے کوچہ ٹھاکر داس کے نکڑ پر مجھے دوکان کھول دی اور میں نے اپنے گھر میں یعنی اپنے محلے میں، اپنی برادری ہی کے سہارے پریکٹس چلانے لگا۔ کلکتے میں بالکل اناڑی تھا، نوجوان تھا اور زندگی کا تجربہ بھی نہ تھا۔ یہاں آ کر آٹھ دس برسوں میں گاہک کو پھانسنے کی ترکیب سمجھ میں آئی تو پریکٹس خود بخود چل نکلی۔ اب دن رات مصروف رہتا تھا۔ بچے بھی آ گئے تھے۔ اس لئے زندگی سوت کی انٹی کی طرح ایک ہی مدار پر چکر کھانے لگی۔ ادھر ادھر جانے کا موقعہ کم ملتا تھا۔ اب تو کئی برس سے تائی ایسری کا منہ نہ دیکھا تھا مگر اتنا سن رکھا تھا کہ تائی ایسری اسی مکان میں محلہ ونجاراں میں رہتی ہیں اور تایا یودھ راج شاہی محلے کے اسی پکھی کے مکان میں رہتے ہیں اور کبھی کبھی دوسرے تیسرے مہینے تائی ایسری کی خبر لینے آ جاتے ہیں۔

ایک روز میں صبح کے وقت مریضوں کی بھیڑ میں بیٹھا نسخے تجویز کر رہا تھا کہ محلہ ونجاراں کے ایک آدمی نے آ کر کہا: ''جلدی چلئے ڈاکٹر صاحب، تائی ایسری مر رہی ہیں۔''

میں اسی وقت سب کام چھوڑ چھاڑ کر اس آدمی کے ساتھ ہو لیا۔ محلہ ونجاراں کے بالکل اس

آخری سرے پر تائی کا مکان تھا۔ پہلی منزل کی سیڑھیاں چڑھ کر جب میں آہنی سلاخوں والے موکھے سے گزر کر ان کے نیم تاریک کمرے میں داخل ہوا تو وہ بڑے بڑے تکیوں کا سہارا لئے پلنگ سے لگی بیٹھی تھیں۔ ان کی سانس زور زور سے چل رہی تھی اور انھوں نے بڑے زور سے اپنے دائیں ہاتھ سے بائیں طرف گویا اپنے دل کو پکڑ رکھا تھا۔ مجھے دیکھ کر ہی وہ پھولے پھولے سانسوں میں مسکرانے لگیں۔ بولیں: ''تو آ گیا پتر! اب میں بچ جاؤں گی!''

''تکلیف ہوگئی ہے تائی؟''

''ہوتا کیا موت کا بلاوا آ گیا تھا۔ دو دن مجھے سخت کس رہی (بخار) پھر ایکا ایکی جسم ٹھنڈا ہونے لگا۔'' (بیان کرتے کرتے تائی کی آنکھوں کی پتلیاں پھیلنے لگیں) پہلے ٹانگوں سے جان گئی۔ ٹانگوں کو ہاتھ لگاؤں تو ٹھنڈی یخ۔ چٹکی بھروں تو کچھ محسوس نہ ہو۔ پھر دھیرے دھیرے میری جان کمر سے بھی نکل گئی اور جب میری جان اوپر سے بھی نکلنے لگی تو میں نے زور سے اپنے کلیجے کو پکڑ لیا۔ تائی اپنے دائیں ہاتھ سے بائیں طرف اپنے دل والے حصے کو اور زور سے پکڑ کر بولیں۔ ''تو میں نے زور سے اپنے کلیجے کو پکڑ لیا اور چلائی: ''ارے کوئی ہے، کوئی ہے؟ تو جائے اور جے کشن کے بیٹے رادھا کشن کو بلا کر لائے۔ وہی مجھے ٹھیک کر سکتا ہے! اب تم آ گئے ہو اب — اب میں بچ جاؤں گی!'' تائی ایسری نے مکمل طمانت سے کہا۔

میں اپنا ہاتھ تائی کے دائیں ہاتھ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا: ''تائی! ذرا اپنا یہ ہاتھ ادھر کرو۔ تمہاری نبض تو دیکھوں؟''

ایک دم تائی دوسرے ہاتھ سے میرا ہاتھ جھٹک کر بولیں: ''ہائے دے! تم کیسے ڈاکٹر ہو؟ تجھے اتنا معلوم نہیں کہ اس ہاتھ سے تو میں نے اپنی جان پکڑ رکھی ہے۔ اس ہاتھ کی نبض تجھ کو کیسے دکھا سکتی ہوں!''

تائی چند ہفتوں میں اچھی ہوگئیں۔ انھیں تو بلڈ پریشر کی شکایت تھی۔ جب وہ جاتی رہی تو پھر اٹھ کر گھومنے لگیں اور اپنے پرائے سب کے سکھ دکھ میں بدستور شریک ہونے لگیں لیکن جب وہ اچھی ہوئیں تو اس کے چند ماہ بعد ہمارے تایا یودھ راج کا انتقال ہوا۔ وہی پھپھی کے گھر شاہی محلے میں ان کا ہارٹ فیل ہوا۔ وہیں سے ان کی ارتھی اٹھی کیونکہ تائی نے ان کی لاش کو گھر لانے کی اجازت نہیں دی تھی۔ تائی نہ ارتھی کے ساتھ گئیں، نہ انھوں نے شمشان گھاٹ کا رخ کیا۔ نہ ان کی

آنکھوں سے آنسو کا ایک قطرہ تک نکلا تھا۔ انھوں نے خاموشی سے اپنے سہاگ کی چوڑیاں توڑ ڈالیں۔ رنگین کپڑے اتار کر سپید دھوتی پہن لی اور اپنے ماتھے کا سیندور پونچھ کر چولہے کی راکھ اپنے ماتھے پر لگالی مگران کے دھرم کرم میں اور کسی طرح کا فرق نہ آیا بلکہ اپنے سفید بالوں سے وہ اب اس سفید دھوتی میں اور بھی اچھی لگ رہی تھیں۔ تائی کی اس حرکت پر برادری میں چہ میگوئیاں ہوئیں۔ سب کو اچنبھا ہوا۔ کچھ لوگوں نے برا بھی مانا مگر تائی کی عزت اس قدر زیادہ تھی کہ ان کے سامنے زبان کھولنے کی کسی کو ہمت نہ پڑی!

چند برس اور گزر گئے۔ اب میری پریکٹس اس قدر چمک اٹھی تھی کہ میں نے محلہ ٹھاکرداس کے علاوہ شاہ عالمی گیٹ کے اندر کوچہ کرماں اور چھووالی کے چوک میں بھی پریکٹس شروع کردی تھی۔ صبح میں محلہ ٹھاکرداس میں بیٹھتا تھا۔ شام کو چھووالی میں۔ زندگی کچھ اس نہج سے گزر رہی تھی کہ تائی ایسری کو دیکھے ہوئے ڈیڑھ ڈیڑھ دو برس گزر جاتے تھے۔ گھر گھر کی عورتوں سے تائی ایسری کی خیریت کی خبر ملتی رہتی تھی۔ تایا یودھ راج نے اپنے بینک کا سارا روپیہ تو پچھی کو سونپ دیا تھا مگر جالندھر کی دکان اور مکان تائی ایسری کے نام لکھ دیئے تھے۔ ان سے ہر ماہ تائی ایسری کو ڈیڑھ سو روپیہ کا کرایہ آجاتا تھا۔ وہ بدستور اسی طرح محلہ ونجاراں میں رہتی تھی۔ اور دن رات اپنے دھرم کرم میں ڈوبی رہتی تھیں۔

ایک روز اتفاق سے جب میں شاہی محلے میں ایک مریض کو دیکھ کر لوٹ رہا تھا تو مجھے تایا یودھ راج کی یاد آگئی اور ان کی یاد سے پچھی کی یاد آگئی کیونکہ پچھی بھی تو اسی شاہی محلے میں کہیں رہتی تھی اور جب پچھی کی یاد آئی تو میرا ذہن فوراً تائی ایسری کی طرف منتقل ہو گیا اور میرا ضمیر مجھے ملامت کرنے لگا۔ غالباً بارہ پندرہ مہینوں سے میں تائی ایسری کو دیکھنے نہ گیا تھا۔ میں نے سوچا کہ میں کل یا پرسوں پہلی فرصت ہی میں تائی ایسری کو دیکھنے جاؤں گا۔

ابھی میں سوچ رہا تھا کہ شاہی محلے کی ایک گلی سے میں نے تائی ایسری کو نکلتے دیکھا۔ قرمزی شاہی کے اب وہ سیاہ شاہی کا گھاگھرا پہنے تھیں جس پر نہ گوٹا تھا نہ لچکا قمیض بھی سفید رنگ کی تھی اور سر پر انھوں نے سفید ململ کا دوہرا دوپٹہ لے رکھا تھا جس میں ان کا گول مٹول چہرہ میڈونا کی طرح معصوم اور پراسرار نظر آرہا تھا۔

جس لمحے میں نے انھیں دیکھا۔ اسی لمحے انھوں نے بھی مجھے دیکھا اور مجھے دیکھتے ہی شرما

سی گئیں اور فوراً مجھ سے کترا کر واپس گلی میں جانے لگیں کہ میں نے انھیں فوراً آواز دے دی۔ میری آواز میں ایک ایسی حیرت تھی جو ایک چیخ سے مشابہ تھی۔ یہ تائی ایسری یہاں طوائفوں کے محلے میں کیا کر رہی تھیں؟

''تائی ایسری'' میں چلا کر کہا۔ ''تائی ایسری— '' میں نے پھر آواز دی۔

میری آواز سن کر وہ پلٹ آئیں۔ سامنے آ کر ایک گناہ گار مجرم کی طرح کھڑی ہوگئیں۔ ان کی نگاہیں اوپر نہ اٹھتی تھیں۔

''تائی ایسری! تم یہاں کیا کرنے آئی ہو؟''

میں نے کچھ حیرت سے کچھ غصے سے ان سے کہا۔

وہ اسی طرح سر نیچا کر کے آہستہ آہستہ جھجکتے جھجکتے بولیں۔ ''وے پتر! کیا بتاؤں! وہ....... وہ....... میں نے سنا تھا کہ پچھی بیمار ہے۔ بہت سخت بیمار ہے، میں نے سوچا اسے دیکھ آؤں.......!''

''تم یہاں پچھی کو دیکھنے آئی تھیں؟'' میں نے غم اور غصے سے تقریباً چیخ کر کہا: ''پچھی کو....... پچھی کو... ...اس بدذات چھنال کو؟....... جس نے....... جس نے.......!''

تائی ایسری نے اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا اور میں کہتے کہتے رک گیا۔

''ناکاکا! اس کو کچھ نہ کہو.......'' تائی ایسری نے اپنی ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں اوپر اٹھائیں اور ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولیں: ''مرنے والے کی یہی ایک نشانی رہ گئی تھی آج وہ بھی چل بسی!''

۴۷ء کے فسادات میں ہم لوگ لاہور چھوڑ کر جالندھر میں پناہ گزیں ہوئے کیونکہ یہاں پر تائی ایسری کا گھر تھا۔ خاصہ کھلا دو منزلہ گھر تھا۔ اوپر کی منزل انھوں نے اپنے رشتے دار پناہ گزینوں کو دے ڈالی تھیں۔ نچلی منزل میں وہ خود رہتی تھیں۔ ہر روز وہ رفیوجی کیمپوں میں سیوا کرنے جاتیں اور کبھی کبھار دو ایک یتیم بچے اٹھا لائیں۔ چار پانچ ماہ ہی میں انھوں نے چار لڑکے اور تین لڑکیاں اپنے پاس رکھ لیں کیونکہ ان کے ماں باپ کا کچھ پتہ نہیں چلتا تھا۔ پچھواڑے کے آنگن اور سامنے کے دالان میں بھی انھوں نے مختلف پناہ گزینوں کو سونے اور کھانا پکانے کی اجازت دے دی تھی ہوتے ہوتے اچھا خاصا گھر ایک سرائے میں تبدیل ہوگیا مگر میں نے تائی ایسری کے ماتھے پر کبھی ایک شکن نہیں دیکھی۔ وہ اپنے گھر میں بھی باہر سے اس طرح آتی تھیں، جیسے وہ گھر ان کا نہ ہو۔ ان پناہ گزینوں کا ہو جنھیں انھوں نے اپنے گھر میں رہنے کی خود اجازت دی تھی۔ عورتوں میں

شخصی جائیداد کی حس بہت تیز ہوتی ہے مگر میں نے عورتوں میں تو کیا مردوں میں بھی ایسا کوئی فرد مشکل ہی سے دیکھا ہوگا، جسے تائی ایسری کی طرح شخصی جائیداد کا اس قدر کم احساس ہو۔ قدرت نے ان کے دماغ میں شاید یہ خانہ ہی خالی رکھا تھا۔ ان کے پاس جو کچھ تھا دوسروں کے لئے وقت تھا۔ جالندھر آ کر وہ صرف ایک وقت کھانا کھانے لگی تھیں۔ میں ان کی ان حرکتوں سے بہت چڑتا تھا کیونکہ میں نے اپنی قیمتی پریکٹس لاہور میں کھو دی تھی۔ میری ماڈل ٹاؤن والی کوٹھی بھی وہیں رہ گئی تھی اور اب میرے پاس سر چھپانے کو کہیں جگہ نہ تھی۔ میرے پاس نہ ڈھنگ کے کپڑے تھے، نہ روپیہ پیسہ تھا۔ نہ کھانا پینا تک کا ہو سکتا تھا۔ جو ملا کھا لیا، جب ملا کھا لیا، نہ ملا تو بھوکے رہ گئے۔ انہی دنوں مجھے خونی بواسیر لاحق ہوگئی۔ دوائیں تو میں نے طرح طرح کی استعمال کیں کیونکہ میں خود ڈاکٹر تھا مگر اس بے سروسامانی میں اس علاج کے ساتھ پرہیز ضروری ہے، وہ کہاں سے ہوتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میں دن بدن کمزور ہوتا چلا گیا۔ کچھ روز تک تو میں نے تائی سے اپنی حالت کو چھپائے رکھا مگر ایک دن انھیں پتہ چل ہی گیا۔ فوراً گھبرائی گھبرائی میرے پاس پہنچیں اور مجھ سے کہنے لگیں: ''کاکا! میں تم سے کہتی ہوں کہ یہ خونی بواسیر ہے۔ یہ ڈاکٹر علاج سے ٹھیک نہ ہوگی۔ تم ایسا کرو کرایہ مجھ سے لے لو اور سیدھے گوجرانوالہ چلے جاؤ۔ وہاں محلہ سنیاریاں میں چاچا کریم بخش جراح رہتا ہے۔ اس کے پاس ایک ایسی دوائی ہے جس سے خونی بواسیر ٹھیک ہو جاتی ہے۔ تیرے تایا کو آج سے بیس سال پہلے یہ تکلیف ہوگئی تھی اور اسے چاچا کریم بخش ہی نے ٹھیک کر دیا تھا۔ دس دن میں وہ ٹھیک ہو کر گوجرانوالے سے واپس جالندھر آ گئے تھے۔''

یہ سن کر مجھے بے حد غصہ آیا۔ میں نے کہا: ''تائی! تجھے معلوم ہے اب میں گوجرانوالہ نہیں جا سکتا۔''

''کیوں نہیں جا سکتا۔ ٹکٹ کے پیسے میں دیتی ہوں!''

''ٹکٹ کا سوال نہیں ہے، گوجرانوالہ اب پاکستان میں ہے۔''

''پاکستان میں ہے تو کیا ہوا؟ کیا ہم دوا دارو کے لئے بھی وہاں نہیں جا سکتے؟ وہاں اپنا چاچا کریم بخش——''

میں نے تایا کی بات کاٹ کر کہا: ''تائی! تجھے کچھ معلوم تو ہے نہیں، خواہ مخواہ الٹی سیدھی باتیں کرتی ہو۔ مسلمانوں نے اب اپنا دیس الگ کر لیا ہے۔ اس کا نام پاکستان ہے۔ ہمارے دیس

کا نام ہندوستان ہے۔اب نہ ہندوستان والے پاکستان جا سکتے ہیں نہ پاکستان والے یہاں آ سکتے ہیں۔اس لئے پاسپورٹ کی ضرورت ہوگی۔''

تائی کے ماتھے پر شکنیں پڑ گئیں۔بولیں:

''پاسپورٹ؟ کیا اس کے لئے کچہری جانا پڑتا ہے؟''

''ہاں ہاں، اس کے لئے کچہری ہی جانا پڑتا ہے!'' میں نے جلدی سے ٹالنے کے لئے کہہ دیا اب اس بڑھی کو کون سمجھائے۔

نہ بیٹا کورٹ جانا تو اچھا نہیں ہے۔شریفوں کے بیٹے کبھی کچہری نہیں جاتے مگر وہ چاچا کریم بخش......''

''بھاڑ میں جائے چاچا کریم بخش۔'' میں نے چلا کر کہا۔

''بیس برس پہلے کی بات کرتی ہو۔جانے وہ تمہارا چاچا کریم بخش آج زندہ بھی ہے کہ مر گیا مگر تم وہی اپنا چاچا کریم بخش رٹے جا رہی ہو۔''

تائی روتی ہوئی وہاں سے چلی گئیں۔ان کے جانے کے بعد مجھے اپنی تنگ مزاجی پر بے حد افسوس ہوا۔کیوں میں نے اس معصوم عورت کا دل دکھایا۔اگر تائی آج کی زندگی کی بہت سی دشواریوں کو نہیں سمجھ سکتی ہیں تو اس میں ان کا کیا قصور ہے؟

میں دراصل ان دنوں بہت ہی تلخ مزاج ہو چلا تھا۔کالج کے دنوں میں اکثر انقلاب کی باتیں کیا کرتا تھا، پھر جب زندگی نے مجھے کامرانی بخشی اور میری پریکٹس چل نکلی تو انقلاب کا جوش سرد پڑ گیا اور ہوتے ہوتے یہ لفظ ہی میرے ذہن سے محو ہو گیا۔اب جالندھر آ کر جو یہ افتاد پڑی تو میرے دل میں پھر سے انقلاب کے خیال نے کروٹ اور میں اپنی طرح کے چند جوشیلے اور لٹے پٹے لوگوں کی صحبت میں بیٹھ کر پھر سے اسی تلخی تیزی اور تندہی سے انقلاب کی باتیں کرنے لگا۔

یہ سب لوگ اکثر تائی ایسری کی دوسری منزل میں میرے کمرے میں ملتے۔چائے کا دور چلتا اور دنیا جہاں کی باتیں ہوتیں اور میں جوش سے اپنا مکا ہوا میں لہرا کر کہتا: ''ہم سے انصاف نہیں ہو رہا ہے اور ان لوگوں سے انصاف کی توقع بھی نہیں ہے۔یقیناً اس ملک میں پھر ایک انقلاب آئے گا اور ضرور آ کے رہے گا وہ انقلاب!''

''بیٹا! کیا مسلمان یہاں پھر آئیں گے؟''

نہیں تائی! تم سے یہ کس نے کہا؟''

''تو تم یہاں کس انقلاب کا ذکر کر رہے تھے جو یہاں آئے گا؟''

تائی نے انقلاب کو مسلمان سمجھا تھا! جب یہ بات ہماری سمجھ میں آئی تو ہم سب ہندو ہے، نہ مسلمان ہے جو سب کا انقلاب ہے ہم تو اس انقلاب کا ذکر کر رہے ہیں، جو نہ ہندو ہے، نہ مسلمان ہے۔ جو سب کا انقلاب ہے، ہم تو اس انقلاب کو لانا چاہتے ہیں!''

مگر تائی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ وہ ہولے سے سر ہلا کر بولیں:

''اچھا تم لوگ باتیں کرو۔ میں تمہارے لئے چائے بنا کے لاتی ہوں!''

تائی نے میری مدد کرنے کے لئے اپنا سولہ تولے کا ایک گوکھرو بیچ دیا اس رقم کو لے کر میں اپنی فیملی کے ساتھ دہلی آ گیا کیونکہ جالندھر میں بے حد افراتفری تھی ان غیر یقینی سی حالت ہر وقت چھائی رہتی تھی۔ دہلی آ کر میں نے پھر پریکٹس شروع کر دی۔ چند سالوں ہی میں میری پریکٹس پھر چمک اٹھی۔ میں قرول باغ میں پریکٹس کرتا تھا اور قرول باغ لاہور کے بہت سے رفیوجیوں سے بھرپڑا تھا، جو مجھے جانتے تھے۔ ہولے ہولے میں نے اپنا اڈہ ٹھیک سے جما لیا۔ پریکٹس چمک اٹھی۔ دس سال میں نے قرولباغ میں اپنی کوٹھی کھڑی کر لی، گاڑی بھی خرید لی۔ اب قرول باغ کے سرکردہ افراد میں میرا شمار ہوتا ہے۔ اب میں انقلاب کی باتیں بھول گیا۔ میری خونی بواسیر بھی ٹھیک ہو گئی اور تلخی کے بجائے مزاج میں شگفتگی عود کر آئی، جو ایک ڈاکٹر کے مزاج کیلئے بیحد ضروری ہے۔

تیرہ سال کے بعد گذشتہ مارچ میں مجھے ایک عزیز کی شادی میں جالندھر جانا پڑا۔ اس تیرہ سال کے عرصے میں تائی ایسری کو بالکل بھول بھال گیا تھا۔ رشتے دار تو اس وقت یاد آتے ہیں، جب مریض نہ ہوں لیکن جالندھر پہنچتے ہی مجھے تائی ایسری کی یاد آئی۔ ان کے احسانات یاد آئے۔ وہ سونے کا گوکھرو یاد آیا، جسے بیچ کر میری پریکٹس چلانے کی رقم بہم پہنچائی گئی تھی۔ وہ رقم میں نے آج تک تائی ایسری کو ادا نہیں کی تھی۔ جالندھر اسٹیشن پر اترتے ہی میں سیدھا تائی ایسری کے گھر چلا گیا۔

شام کا جھٹپٹا تھا۔ ہوا ایندھن کے دھوئیں، تیل کی بو اور گھر واپس آتے ہوئے بچوں کی آوازوں سے معمور تھی، جب میں تائی ایسری کے مکان کی نچلی منزل میں داخل ہوا۔

گھر میں اس وقت تائی کے سوا کوئی نہ تھا۔ وہ اپنے کمرے میں بھگوان کی مورتی کے سامنے

گھی کا دیا جلائے، پھول چڑھا کر ہاتھ جوڑ کر واپس گھوم رہی تھیں جب کہ انھوں نے میری آہٹ پا کر پوچھا:

''کون ہے؟''

''میں ہوں!'' میں نے کمرے میں دو قدم آگے بڑھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

تائی دو قدم آگے بڑھیں مگر مجھے پہچان نہ سکیں۔ تیرہ برس کا عرصہ بھی ایک عرصہ ہوتا ہے۔ اس عرصے میں وہ بے حد نحیف و نزار ہو گئی تھیں۔ ان کا چہرہ بھی دبلا ہو گیا تھا اور وہ ہولے ہولے قدم اٹھاتی تھیں۔

''میں رادھا کشن ہوں۔''

''جے کشن کا کا؟'' تائی کی آواز بھرّا گئی۔ ممکن تھا وہ جلدی سے آگے بڑھنے کی کوشش میں گر پڑتیں مگر میں نے انھیں جلدی سے تھام لیا اور وہ میرے بازو سے لگ کر رونے لگیں۔ انھوں نے میری بلائیں لیں، میرا منھ چوما۔ میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور بولیں:

''اتنے دن کہاں رہے بیٹا؟ اپنی تائی کو بھی بھول گئے؟''

انتہائی شرمندگی سے میرا سر جھک گیا۔ میں کچھ کہنا چاہا مگر کچھ نہ کہہ سکا۔ تائی نے میری پریشانی کو فوراً بھانپ لیا۔ جلدے سے پھولے پھولے سانسوں میں اکھڑے اکھڑے لہجے میں بولیں: ''سروج راضی خوشی ہے نا؟''

''ہاں تائی۔''

''اور وڈا کاکا؟''

''ڈاکٹری میں پڑھتا ہے۔''

''اور نکا؟''

''کالج میں پڑھتا ہے۔''

''اور شانو اور بٹو؟''

''وہ دونوں بھی کالج میں پڑھتی ہیں۔ کملا کی میں نے شادی کر دی ہے۔''

''میں نے بھی سوتری کی شادی کر دی ہے۔ پورن اب رڑکی پڑھتا ہے۔ نمی اور بنی کے ماں باپ مل گئے تھے وہ آ کر ان کو چھ سال کے بعد لے گئے تھے۔ کبھی کبھی ان کی چٹھی پتری آ جاتی

ہے۔ میرے پاس صرف گوپی رہ گیا ہے۔ اگلے سال وہ بھی ریلوے ورکشاپ میں کام سیکھنے کے لئے چلا جائے گا۔"

یہ تائی کے ان یتیم بچوں کی داستان تھی جو انھوں نے فساد میں لے کر پالے تھے ہے۔

میں نے ناخن سے اپنی ٹھوڑی کھجاتے کھجاتے کہا۔ وہ تیرا قرضہ مجھ پر باقی ہے۔ کیسے بتاؤں۔ کتنا شرمندہ ہوں اب تک نہ بھیج سکا۔ اب دِلّی جاتے ہی بھیج دوں گا۔"

"کیسا قرضہ بیٹا؟" تائی نے حیران ہو کر پوچھا۔

"وہی گوکھر و والا۔"

"اچھا وہ؟" یکایک تائی کو یاد آیا اور وہ بڑے میٹھے انداز میں مسکرانے لگیں پھر میرے سر پر ہاتھ پھیر کر بولیں۔

"وہ تو تیرا قرضہ تھا بیٹا، جو میں نے چکا دیا!"

"میرا کیسا قرضہ تھا تائی؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"یہ زندگی دوسروں کا قرضہ ہے بیٹا!" تائی سنجیدہ رو ہو کر بولیں۔ "اسے چکاتے رہنا چاہئے تو کیا اس سنسار میں خود پیدا ہوا تھا؟ نہیں۔ تجھے تیرے ماں باپ نے زندگی دی تھی، تو پھر تیری زندگی کسی دوسرے کا قرضہ ہوئی کہ نہیں؟ پھر یہ قرضہ ہم نہیں چکائیں گے تو یہ دنیا آگے کیسے چلے گی۔ ایک دن پرلے آجائے گی...... بیٹا! اسی لئے تو کہتی ہوں۔ میں نے تیرا قرضہ چکایا ہے۔ تو کسی دوسرے کا قرضہ چکا دے...... ہر دم چکاتے رہنا۔ جیون کا دھرم ہے۔" تائی اتنی لمبی بات کر کے ہانپنے لگیں۔

میں کیا کہتا۔ روشنی سے سایہ کہہ بھی کیا سکتا ہے؟ اسی لئے میں سب کچھ سن کر چپ ہو گیا۔ وہ بھی چپ ہو گئیں، پھر آہستہ سے بولیں: "اب میرے ہاتھ پاؤں کام نہیں کرتے، ورنہ تیرے لئے کھانا پکاتی۔ اب گوپی آئے گا تو کھانا بنائے گا تیرے لئے۔ کہاں کھا کر جانا...... میں؟"

"نہیں تائی! اس کی کیا ضرورت ہے، وہاں بھی تیرا ہی دیا کھاتے ہیں۔" میں نے آہستہ سے کہا۔ "میں یہاں تیج پال کی شادی پر آیا تھا۔ اسٹیشن سے سیدھا تمہارے گھر آ رہا ہوں۔ اب شادی والے گھر جاؤں گا۔"

"بلاوا تو مجھے بھی آیا ہے مگر دو دن سے میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اس لئے میں نہیں

جا سکتی۔ شگن میں نے بھیج دیا تھا۔ تم میری طرف سے تیج پال کے سر پر پیار دینا۔"

"بہت اچھا تائی!" کہہ کر میں تائی کے چرنوں میں جھکا۔ انھوں نے مجھے بڑے پیار سے اپنے گلے لگا لیا۔ میرے سر پر ہاتھ پھیر کر سو سو دعائیں دے کر بولیں: "بیٹا میرا ایک کام کرو گے؟"

"حکم کرو تائی۔"

"کیا کل تم صبح یہاں آ سکتے ہو؟"

تائی جھجکتے جھجکتے بولیں۔ "میری آنکھیں کمزور ہو چکی ہیں۔ رات میں مجھے کچھ نظر نہیں آتا۔ ایسا جنم جلا اندھیرا چھایا ہے کہ کچھ نظر نہیں آتا۔ اگر تم صبح کو کسی وقت دن میں آ جاؤ تو میں تمہیں اچھی طرح دیکھ لوں گی۔ تیرہ سال سے تجھے نہیں دیکھا ہے کا کا!"

میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے گلوگیر لہجے میں کہا:

"آ جاؤں گا تائی!"

دوسرے دن بارات کے کچھ لوگ آنے والے تھے۔ صبح ہی ہم لوگوں کو پیشوائی کے لئے اسٹیشن پر جانا پڑا۔ وہاں سے لوٹتے وقت مجھے یاد آیا تو میں ان لوگوں سے معذرت کر کے تائی ایسری کے گھر کی طرف ہو لیا۔ گلی کے موڑ پر مجھے دو دو چار چار کی ٹولیوں میں لوگ سر جھکائے ملے۔ مگر میں جلدی جلدی سے قدم بڑھاتا ہوا آگے چلا گیا۔ مکان کی نچلی منزل پر مجھے اور بہت سے لوگ روتے ملے۔ معلوم ہوا آج صبح تائی ایسری کی موت واقع ہو گئی اور جب ہم لوگ اسٹیشن گئے ہوئے تھے، وہ چل بسیں۔

اندر کمرے میں ان کی لاش پڑی تھی۔ ایک سفید چادر میں ملبوس۔ چہرہ کھلا رہنے دیا تھا۔ کمرے میں کافور اور لوبان کی خوشبو تھی اور ایک پنڈت ہولے ہولے وید منتر پڑھ رہا تھا۔

تائی ایسری کی آنکھیں بند تھیں اور ان کا معصوم بھورا بھورا چہرہ پر سکون خاموش اور گہرے خوابوں میں کھویا ہوا ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے وہ تائی ایسری کا چہرہ نہ ہو دھرتی کا پھیلا ہوا لامتناہی چہرہ ہو جس کی آنکھوں سے ندیاں بہتی ہیں نہ جس کے ہر شکن میں لاکھوں وادیاں انسانی بستیوں کو اپنی آغوش میں لئے مسکراتی ہیں، جس کے انگ انگ سے بے غرض پیار کی مہک پھوٹتی ہے، جس کی معصومیت میں تخلیق کی پاکیزگی جھلکتی ہے، جس کے دل میں دوسروں کیلئے وہ بے پناہ ممتا جاگتی

ہے، جس کا مزہ کوئی کو کھ رکھنے والی ہستی ہی پہچان سکتی ہے!

میں ان کے پاؤں کے قریب کھڑا ان کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ یکا یک کسی نے آہستہ سے میرے شانے پر ہاتھ رکھا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو میرے سامنے بائیس تئیس برس کا ایک نوجوان کھڑا تھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں کو دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ ابھی روئی ہیں اور ابھی پھر رو دیں گی۔

اس نے آہستہ سے کہا: ''میں گوپی ناتھ ہوں۔''

میں سمجھ تو گیا مگر خاموش رہا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کہوں۔ کیا نہ کہوں۔

''میں تیج پال کے گھر آپ کو ڈھونڈنے گیا تھا مگر آپ اسٹیشن پر گئے ہوئے تھے۔''

وہ پھر بولا۔

میں پھر بھی چپ رہا۔

گوپی ناتھ دھیرے سے بولا: ''صبح تائی نے آپ کو بہت یاد کیا۔ انھیں معلوم تھا کہ آپ آنے والے ہیں، اس لئے وہ مرتے مرتے بھی آپ کا انتظار کرتی رہیں۔ آخر جب انھیں یقین ہو گیا کہ مرنے کا وقت قریب آن پہنچا ہے اور آپ نہیں آئیں گے تو انھوں نے مجھ سے کہا:

''جب میرا بیٹا رادھا کشن آئے تو اسے یہ دے دینا!''

یہ کہہ کر گوپی نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور میری ہتھیلی پر ایک چونی رکھ دی!

چونی دیکھ کر میں رونے لگا۔

مجھے معلوم نہیں ہے آج تائی ایسری کہاں ہیں؟ لیکن اگر وہ سورگ میں ہیں تو وہ اس وقت بھی یقیناً ایک رنگین پیڑھی پر بیٹھی، اپنی پچھی سامنے کھول کر بڑے اطمینان سے دیوتاؤں کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے انھیں چونیاں ہی بانٹ رہی ہوں گی!

کالو بھنگی

کرشن چندر

میں نے اس سے پہلے ہزار بار کالو بھنگی کے بارے میں لکھنا چاہا ہے لیکن میرا قلم ہر بار یہ سوچ کر رُک گیا ہے کہ کالو بھنگی کے متعلق لکھا ہی کیا جاسکتا ہے۔ مختلف زاویوں سے میں نے اس کی زندگی کو دیکھنے، پرکھنے، سمجھنے کی کوشش کی ہے لیکن کہیں وہ ٹیڑھی لکیر دکھائی نہیں دیتی جس سے دلچسپ افسانہ مرتب ہوسکتا ہے۔ دلچسپ ہونا تو درکنار، کوئی سیدھا سادا افسانہ، بے کیف و بے رنگ، بے جان مرقع بھی تو نہیں لکھا جاسکتا، کالو بھنگی کے متعلق۔ پھر نہ جانے کیا بات ہے، ہر افسانہ کے شروع میں میرے ذہن میں کالو بھنگی آن کھڑا ہوتا ہے اور مجھ سے مسکرا کے پوچھتا ہے:

''چھوٹے صاحب! مجھ پر کہانی نہیں لکھو گے؟ کتنے سال ہوگئے تمہیں لکھتے ہوئے۔''

''آٹھ سال۔''

''کتنی کہانیاں لکھیں تم نے؟''

''ساٹھ اور دو باسٹھ۔''

''مجھ میں کیا برائی ہے چھوٹے صاحب؟ تم میرے متعلق کیوں نہیں لکھتے؟ دیکھو کب سے میں

اس کہانی کے انتظار میں کھڑا ہوں۔ تمہارے ذہن کے ایک کونے میں مدت سے ہاتھ باندھے کھڑا ہوں چھوٹے صاحب، میں تو تمہارا پرانا حلال خور ہوں۔ کالو بھنگی! آخر تم میرے متعلق کیوں نہیں لکھتے؟"

اور میں کچھ جواب نہیں دے سکتا۔ اس قدر سیدھی سپاٹ زندگی رہی ہے کالو بھنگی کی کہ میں کچھ بھی تو نہیں لکھ سکتا۔ اس کے متعلق ۔ یہ نہیں کہ اس کے بارے میں کچھ لکھنا ہی نہیں چاہتا۔ دراصل کالو بھنگی کے متعلق لکھنے کا ارادہ ایک مدت سے کر رہا ہوں لیکن کبھی نہیں لکھ سکا۔ ہزار کوشش کے باوجود نہیں لکھ سکا۔ اس لئے آج تک کالو بھنگی اپنی پرانی جھاڑو لئے، اپنے پھٹے پھٹے بدہیئت پاؤں لئے اپنی سوکھی ٹانگوں پر ابھری دریدیں لئے، اپنے کولھوں کی ابھری ہڈیاں لئے، اپنے بھوکے پیٹ اور اس کی خشک جلد کی سیاہ سلوٹیں لئے، اپنے سکڑے سکڑے ہونٹوں، پھیلے پھیلے نتھنوں، جھریوں والے گال اور اپنی آنکھوں کے نیم تاریک گڑھوں پر ننگی چندیا ابھارے میرے ذہن کے کونے میں کھڑا ہے اب تک، کئی کردار آئے اور اپنی زندگی بتا کر، اپنی اہمیت جتا کر، اپنی ڈرامائیت ذہن نشین کرا کے چلے گئے۔ حسین عورتیں، خوبصورت تخیلی ہیولے، شیطان کے چہرے، اس کے ذہن کے رنگ و روغن سے آشنا ہوئے۔ اس کی چار دیواری میں اپنے اپنے دیئے جلا کر چلے گئے۔ لیکن کالو بھنگی بدستور جھاڑو سنبھالے، اسی طرح کھڑا ہے، اس نے اس گھر کے اندر آنے والے ہر کردار کو دیکھا ہے۔ اسے روتے ہوئے، گڑگڑاتے ہوئے، محبت کرتے ہوئے، نفرت کرتے ہوئے، سوتے ہوئے، جاگتے ہوئے، قہقہے لگاتے ہوئے، تقریر کرتے ہوئے، زندگی کے ہر رنگ میں، ہر نہج سے، ہر منزل میں دیکھا ہے، بچپن سے، بڑھاپے سے، موت تک اس نے ہر اجنبی کو، اس کے دروازے کے گھر تک دیکھا ہے اور اسے اندر آتے ہوئے دیکھ کر اس کے لئے راستہ صاف کر دیا ہے۔ وہ خود پرے ہٹ گیا ہے۔ ایک بھنگی کی طرح ہٹ کر کھڑا ہو گیا ہے۔ حتیٰ کہ داستان شروع ہو کر ختم بھی ہو گئی، حتیٰ کہ کردار اور تماشائی دونوں رخصت ہو گئے ہیں لیکن کالو بھنگی اس کے بعد بھی وہیں کھڑا ہے۔ اب صرف ایک قدم اس نے آگے بڑھا لیا ہے اور ذہن کے مرکز میں آ گیا ہے تاکہ میں اچھی طرح دیکھ لوں، اس کی ننگی چندیا چمک رہی ہے اور ہونٹوں پر ایک خاموش سوال ہے۔ ایک عرصے سے میں دیکھ رہا ہوں، سمجھ میں نہیں آتا کیا لکھوں گا؟ اس کے بارے میں لیکن آج یہ بھوت ایسے مانے گا نہیں۔ اسے کئی سالوں تک ٹالا ہے، آج اسے بھی الوداع

کہہ دیں گے۔

میں سات برس کا تھا جب میں نے کالو بھنگی کو پہلی بار دیکھا۔ اس کے بیس برس بعد جب وہ مرا، میں نے اسی حالت میں دیکھا۔ کوئی ذوق نہ تھا۔ وہی گھٹنے، وہی پاؤں، وہی رنگت، وہی چہرہ، وہی چندیا، وہی ٹوٹے ہوئے دانت، وہی جھاڑو، جو ایسا معلوم ہوتا تھا، ماں کے پیٹ سے اٹھائے چلا آرہا ہے۔ کالو بھنگی کی جھاڑو اس کے جسم کا ایک حصہ معلوم ہوتی تھی۔ وہ ہر روز مریضوں کا بول وبراز صاف کرتا تھا۔ ڈسپنسری میں فنائل چھڑکتا تھا، پھر ڈاکٹر صاحب اور کمپونڈر صاحب کے بنگلوں میں صفائی کا کام کرتا تھا، کمپونڈر صاحب کی بکری اور ڈاکٹر صاحب کی گائے کو چرانے کے لئے جنگل لے جاتا، اور دن ڈھلتے ہی انہیں واپس، ہسپتال میں لے آتا اور مویشی خانہ میں باندھ کر اپنا کھانا تیار کرتا اور اسے کھا کر سو جاتا، بیس سال سے اسے یہی کام کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ ہر روز بلا ناغہ، اس عرصے میں وہ کبھی ایک دن کے لئے بھی بیمار نہیں ہوا۔ یہ امر تعجب خیز ضرور تھا لیکن اتنا بھی نہیں کہ محض اسی کے لئے ایک کہانی لکھی جائے۔ خیر یہ کہانی تو زبردستی لکھوائی جارہی ہے۔ آٹھ سال سے میں اُسے ٹالتا آیا ہوں لیکن یہ شخص نہیں مانا۔ زبردستی کام لے رہا ہوں۔ یہ ظلم مجھ پر بھی ہے اور آپ پر بھی۔ مجھ پر اس لئے کہ مجھے لکھنا پڑ رہا ہے۔ آپ پر اس لئے کہ آپ کو اسے پڑھنا پڑ رہا ہے۔ دراصل اس میں کوئی ایسی بات ہے ہی نہیں جس کے لئے اس کے متعلق اتنی سر دردی مول لی جائے، مگر کیا کیا جائے کالو بھنگی کی خاموش نگاہوں کے اندر ایک ایسی کھنچی کھنچی سی ملتجیانہ کاہش ہے، ایک ایسی مجبور بے زبانی ہے، ایک ایسی محبوس گہرائی ہے کہ مجھے اس کے متعلق لکھنا پڑ رہا ہے اور لکھتے لکھتے یہ بھی سوچتا ہوں کہ اس کی زندگی کے متعلق کیا لکھوں گا میں۔ کوئی پہلو بھی تو ایسا نہیں جو دلچسپ ہو۔ کوئی کونہ ایسا نہیں جو تاریک ہو، کوئی زاویہ ایسا نہیں جو مقناطیسی کشش کا حامل ہو، ہاں آٹھ سال سے میرے ذہن میں کھڑا ہے۔ نہ جانے کیوں۔ اس میں اس کی ہٹ دھرمی کے سوا اور تو مجھے کچھ نظر نہیں آتا۔ جب میں نے آنگی کے افسانے میں چاندنی کے کھلیان بچھائے تھے۔ اور یرقانیت کے رومانی نظریئے سے دنیا کو دیکھا تھا۔ اس وقت بھی یہ وہیں کھڑا تھا۔ جب میں نے رومانیت سے آگے سفر اختیار کیا اور حُسن اور حیوان کی بوقلمونی کیفیتیں دیکھتا ہوا ٹوٹے ہوئے تاروں کو چھونے لگا، اس وقت بھی یہ وہیں تھا۔ جب میں نے بالکونی سے جھانک کر ان داتاؤں کی غربت دیکھی اور پنجاب کی سرزمین پر خون کی ندیاں بہتی دیکھ کر اپنے وحشی ہونے کا علم حاصل کیا اور اس وقت بھی یہ وہیں میرے ذہن کے دروازے پر کھڑا تھا۔ صُمٌ بُکمٌ مگر یہ اب جائے گا ضرور۔ اب کے

اسے جانا ہی پڑے گا، اب میں اس کے بارے میں لکھ رہا ہوں۔ للہ اس کی بے کیف، بے رنگ، پھیکی، میٹھی کہانی بھی سن لیجئے تاکہ یہ یہاں سے دور دفان ہو جائے، اور مجھے اس کے غلیظ قرب سے نجات ملے، اور اگر آج بھی میں نے اس کے بارے میں نہ لکھا اور نہ آپ نے اسے پڑھا تو یہ آٹھ سال بھی یہیں جما رہے گا اور ممکن ہے کہ زندگی بھر یہیں کھڑا رہے۔

لیکن پریشانی تو یہ ہے کہ اس کے بارے میں کیا لکھا جاسکتا ہے۔ کالو بھنگی کے ماں باپ بھنگی تھے اور جہاں تک میرا خیال ہے اس کے سارے آباواجداد بھنگی تھے اور سینکڑوں برس پہلے سے یہیں رہتے چلے آئے تھے۔ اسی طرح اسی حالت میں۔ پھر کالو بھنگی نے شادی نہ کی تھی، اس نے کبھی عشق نہ کیا تھا، اس نے کبھی دور دراز کا سفر نہیں کیا تھا۔ حد تو یہ ہے کہ وہ کبھی اپنے گاؤں سے باہر نہیں گیا تھا، وہ دن بھر اپنا کام کرتا اور رات کو سو جاتا اور صبح اٹھ کر پھر اپنے کام میں مصروف ہو جاتا۔ بچپن ہی سے وہ اس طرح کرتا چلا آیا تھا۔

ہاں کالو بھنگی میں ایک بات ضرور دلچسپ تھی اور وہ یہ کہ اسے اپنی ننگی چندیا پر کسی جانور، مثلاً گائے یا بھینس کی زبان پھرانے سے بڑا لطف حاصل ہوتا تھا۔ اکثر دوپہر کے وقت میں نے اسے دیکھا ہے کہ نیلے آسمان تلے، سبز گھاس کے مخملیں فرش پر کھلی دھوپ میں وہ ہسپتال کے قریب ایک کھیت میں مینڈھ پر اکڑوں بیٹھا ہے، اور گائے اس کا سر چاٹ رہی ہے۔ بار بار اور وہ وہیں اپنا سر چٹواتا اونگھ اونگھ کر سو گیا ہے، اسے اس طرح سوتے دیکھ کر میرے دل میں مسرت کا ایک عجیب سا احساس اُجاگر ہونے لگتا تھا اور کائنات کے تھکے تھکے غنودگی آمیز آفاقی حسن کا گمان ہونے لگتا تھا، میں نے اپنی چھوٹی زندگی میں دنیا کی حسین ترین عورتیں، پھولوں کے تازہ ترین غنچے، کائنات کے خوبصورت ترین مناظر دیکھے ہیں لیکن نہ جانے کیوں ایسی معصومیت، ایسا حسن، ایسا سکون کسی منظر میں نہیں دیکھا، جتنا اس منظر میں کہ جب میں سات برس کا تھا اور وہ کھیت بہت بڑا اور وسیع دکھائی دیتا تھا اور آسمان بہت نیلا اور صاف اور کالو بھنگی کی چندیا شیشے کی طرح چمکتی تھی اور گائے کی زبان آہستہ آہستہ اس کی چندیا چاٹتی ہوئی اُسے گویا سہلاتی ہوئی کُسر کُسر کی خوابیدہ آواز پیدا کرتی جاتی تھی۔ جی چاہتا تھا میں بھی اسی طرح سر گھٹا کے اس گائے کے نیچے بیٹھ جاؤں۔ ایک دفعہ میں نے ایسا کرنے کی کوشش بھی کی تو والد صاحب نے مجھے وہ پیٹا وہ پیٹا اور مجھ سے زیادہ غریب کالو بھنگی کو وہ پیٹا کہ میں خود ڈر کے مارے چیخنے لگا کہ کالو بھنگی کہیں ان کی ٹھوکروں سے مر نہ جائے لیکن کالو بھنگی کو اتنی مار کھا کے بھی کچھ نہ ہوا، دوسرے روز وہ بدستور جھاڑو دینے کے لئے ہمارے بنگلے میں موجود تھا۔

کالو بھنگی کو جانوروں سے بڑا لگاؤ تھا۔ ہماری گائے تو اس پر جان چھڑکتی تھی اور کمپونڈر صاحب کی بکری بھی، حالانکہ بکری بے وفا ہوتی ہے، عورت سے بھی بڑھ کے لیکن کالو بھنگی کی بات اور تھی۔ ان دونوں جانوروں کو پانی پلائے تو کالو بھنگی، چارہ کھلائے تو کالو بھنگی، جنگل میں چرائے تو کالو بھنگی اور رات کو مویشی خانے میں باندھے تو کالو بھنگی، وہ اس کے اشارے کو اس طرح سمجھ جاتیں جس طرح کوئی انسان کسی انسان کے بچے کی باتیں سمجھتا ہے۔ میں کئی بار کالو بھنگی کے پیچھے گیا ہوں، جنگل میں، راستے میں، وہ انہیں بالکل کھلا چھوڑ دیتا تھا لیکن پھر بھی گائے اور بکری دونوں اس کے ساتھ قدم سے قدم ملائے چلے آتے تھے، گویا تین دوست سیر کرنے نکلے ہیں۔ راستے میں گائے نے سبز گھاس دیکھ کر منھ مارا تو بکری بھی جھاڑی سے پتیاں کھانے لگتی اور کالو بھنگی ہے کہ سنبلو توڑ توڑ کے کھا رہا ہے اور بکری کے منہ میں ڈال رہا ہے، اور خود بھی کھا رہا ہے اور آپ ہی آپ برابر باتیں باتیں کئے جا رہا ہے اور وہ دونوں جانور بھی کبھی غرّا کر، کبھی کان پھٹپھٹا کر، کبھی پاؤں ہلا کر، کبھی دُم دبا کر، کبھی ناچ کر، کبھی گا کر، ہر طرح سے اس کی گفتگو میں شریک ہو رہے ہیں، اپنی سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا تھا کہ یہ لوگ کیا باتیں کرتے تھے، پھر چند لمحوں کے بعد کالو بھنگی آگے چلنے لگتا تو گائے چرنا چھوڑ دیتی اور بکری بھی جھاڑی سے پرے ہٹ جاتی اور کالو بھنگی کے ساتھ ساتھ چلنے لگتی۔ آگے کہیں چھوٹی سی ندی آتی یا کوئی ننھا منا سا چشمہ، تو کالو بھنگی وہیں بیٹھ جاتا بلکہ لیٹ کر وہیں چشمے کی سطح سے اپنے ہونٹ ملا دیتا اور جانوروں کی طرح پانی پینے لگتا اور اسی طرح وہ دونوں جانور بھی پانی پینے لگتے۔ کیونکہ بچارے انسان تو نہیں تھے کہ اوک سے پی سکتے، اس کے بعد اگر کالو بھنگی سبزے پر لیٹ جاتا تو بکری بھی اس کی ٹانگوں کے پاس اپنی ٹانگیں سکیڑ کر دعائیہ انداز میں بیٹھ جاتی اور گائے تو اس انداز سے اس کے قریب ہو بیٹھتی کہ مجھے ایسا معلوم ہوتا کہ وہ کالو بھنگی کی بیوی ہے اور ابھی ابھی کھانا پکا کے فارغ ہوئی ہے۔ اس کی ہر نگاہ میں اور چہرے کے ہر اُتار چڑھاؤ میں ایک سکون آمیز گرہستی انداز جھلکنے لگتا اور جب وہ جگالی کرنے لگتی تو مجھے معلوم ہوتا گویا کوئی بڑی سگھڑ بیوی کروشیا لئے سوزن کاری میں مصروف ہے اور یا کالو بھنگی کا سوئیٹر بن رہی ہو۔

اس گائے اور بکری کے علاوہ ایک لنگڑا کتا تھا، جو کالو بھنگی کا بڑا دوست تھا۔ وہ لنگڑا تھا اور اس لئے دوسرے کتوں کے ساتھ زیادہ چل پھر نہ سکتا تھا اور اکثر اپنے لنگڑے ہونے کی وجہ سے دوسرے کتوں سے پٹتا، بھوکا اور زخمی رہتا۔ کالو بھنگی اکثر اس کی تیمارداری اور خاطر تواضع میں لگا رہتا اور کبھی تو صابن سے اُسے نہلاتا، کبھی اس کی چچڑیاں دور کرتا، اس کے زخموں پر مرہم لگاتا،

اسے مکی کی روٹی کا سوکھا ٹکڑا دیتا لیکن یہ کتا بڑا خود غرض جانور تھا۔ دن میں صرف دو مرتبہ کالو بھنگی سے ملتا۔ دوپہر کو اور شام کو اور کھانا کھا کے اور زخموں پر مرہم لگوا کے پھر گھومنے کے لئے چلا جاتا۔ کالو بھنگی اور اس لنگڑے کتے کی ملاقات بڑی مختصر ہوتی تھی اور بڑی دلچسپ، مجھے تو وہ کتا ایک آنکھ نہ بھاتا تھا لیکن کالو بھنگی اس سے ہمیشہ بڑے تپاک سے ملتا تھا۔

اس کے علاوہ کالو بھنگی کی جنگل کے ہر جانور، چرند اور پرند سے شناسائی تھی۔ راستے میں اس کے پاؤں میں کوئی کیڑا آجاتا تو وہ اسے اٹھا کر جھاڑی پر رکھ دیتا۔ کہیں کوئی بنولہ بولنے لگتا تو یہ اس کی بولی میں اس کا جواب دیتا۔ تیتر، ستگلہ، گٹاری، لال چڑا، سبزہ تجی، ہر پرندے کی زبان وہ جانتا تھا۔ اس لحاظ سے وہ رالف سنکر اتائین سے بڑا اپنڈٹ تھا۔ کم از کم میرے جیسے سات برس کے بچے کی نظروں میں تو وہ مجھے اپنے ماں باپ سے بھی اچھا معلوم ہوتا تھا اور پھر وہ مکی کا بھٹا ایسے مزے کا تیار کرتا تھا اور آگ پر اسے اس طرح مدھم آنچ پر بھونتا تھا کہ مکی کا ہر دانہ کندن بن جاتا اور ذائقے میں شہد کا مزا دیتا، اور خوشبو بھی ایسی سوندھی، میٹھی میٹھی، جیسے دھرتی کی سانس، نہایت آہستہ آہستہ بڑے سکون سے، بڑی مشاقی سے وہ بھٹے کو ہر طرف سے دیکھ دیکھ کر اُسے بھونتا تھا، جیسے برسوں سے وہ اس بھٹے کو جانتا تھا، ایک دوست کی طرح وہ بھٹے سے باتیں کرتا۔ اتنی نرمی اور مہربانی اور شفقت سے اس سے پیش آتا، گویا وہ بھٹا اس کا اپنا رشتہ دار یا سگا بھائی تھا اور لوگ بھی اپنا بھٹا بھونتے تھے مگر وہ بات کہاں۔ اس قدر کچے، بدذائقہ اور معمول سے بھٹے ہوتے تھے وہ کہ انہیں بس مکی کا بھٹا ہی کہا جاسکتا ہے لیکن کالو بھنگی کے ہاتھوں میں پہنچ کے وہی بھٹا کچھ کا کچھ ہو جاتا اور جب وہ آگ پر سینک کے بالکل تیار ہو جاتا تو بالکل ایک نئی نویلی دلہن کی طرح عروسی لباس پہنے سنہرا سنہرا چمکتا نظر آتا۔ میرے خیال میں خود بھٹے کو یہ اندازہ ہو جاتا تھا کہ کالو بھنگی اس سے کتنی محبت کرتا ہے۔ ورنہ محبت کے بغیر اس بے جان شے میں اتنی رعنائی کیسے پیدا ہو سکتی تھی۔ مجھے کالو بھنگی کے ہاتھ کے سینکے ہوئے بھٹے کھانے میں بڑا مزا آتا تھا اور میں انہیں بڑے مزے میں چھپ چھپ کے کھاتا تھا۔ ایک دفعہ پکڑا گیا تو بڑی ٹھکائی ہوئی بری طرح۔ بچارا کالو بھنگی بھی پٹا مگر دوسرے دن وہ پھر بنگلے پر جھاڑو لئے اسی طرح حاضر تھا۔

اور بس کالو بھنگی کے متعلق اور کوئی دلچسپ بات یاد نہیں آرہی ہے۔ میں بچپن سے جوانی میں آیا اور کالو بھنگی اسی طرح رہا۔ میرے لئے اب وہ کم دلچسپ ہو گیا تھا بلکہ یوں کہئے کہ مجھے اس سے کسی طرح کی دلچسپی نہ رہی تھی۔ ہاں کبھی کبھی اس کا کردار مجھے اپنی طرف کھینچتا۔ یہ ان دنوں کی

بات ہے جب میں نے نیا نیا لکھنا شروع کیا تھا۔ میں مطالعہ کے لئے اس سے سوال پوچھتا اور نوٹ لینے کے لئے فائنٹن پن اور پیڈ ساتھ رکھ لیتا۔

''کالو بھنگی! تمہاری زندگی میں کوئی خاص بات ہے؟''

''کیسی چھوٹے صاحب؟''

''کوئی خاص بات، عجیب، انوکھی، نئی۔''

''نہیں چھوٹے صاحب۔''

(یہاں تک تو مشاہدہ صفر رہا۔ اب آگے چلئے، ممکن ہے.... ....!)

''اچھا تم یہ بتاؤ تم تنخواہ لے کر کیا کرتے ہو؟'' ہم نے دوسرا سوال پوچھا۔

''تنخواہ لے کر کیا کرتا ہوں۔'' وہ سوچنے لگتا۔ آٹھ روپئے ملتے ہیں مجھے، پھر وہ انگلیوں پر گننے لگتا ہے۔

''چار روپئے کا آٹا لاتا ہوں......ایک روپے کا نمک، ایک روپئے کا تمباکو، آٹھ آنے کی چائے، چار آنے کا گڑ، چار آنے کا مصالحہ، کتنے روپئے ہوگئے چھوٹے صاحب؟''

''سات روپئے۔''

''ہاں سات روپے۔ ہر مہینے ایک روپئے بنئے کو دیتا ہوں۔ اس سے کپڑے سلوانے کے لئے روپئے کرج لیتا ہوں نا۔ سال میں دو جوڑے تو چاہئیں۔ کمبل تو میرے پاس ہے۔ خیر، لیکن دو جوڑے تو چاہئیں اور چھوٹے صاحب، کہیں بڑے صاحب ایک روپیہ تنخواہ میں بڑھا دیں تو مجا آجائے۔''

''وہ کیسے؟''

''گھی لاؤں گا ایک روپئے اور مکی کے پراٹھے کھاؤں گا، کبھی پراٹھے نہیں کھائے مالک۔ بڑا جی چاہتا ہے۔''

اب بولئے، ان آٹھ روپوں پر کوئی کیا افسانہ لکھے۔

پھر جب میری شادی ہوگئی، جب راتیں جوان اور چمک دار ہونے لگتیں اور قریب کے جنگل سے شہد اور کستوری اور جنگلی گلاب کی خوشبوئیں آنے لگتیں اور ہرن چوکڑیا بھرتے ہوئے دکھائی دیتے اور تارے جھکتے جھکتے کانوں میں سرگوشیاں کرنے لگتے اور کسی کے رسیلے ہونٹ آنے والے بوسوں کا خیال کر کے کانپنے لگتے۔ اس وقت بھی کہیں کالو بھنگی کے متعلق کچھ لکھنا چاہتا اور

پنسل کاغذ لے کر اس کے پاس جاتا۔

''کالو بھنگی تم نے بیاہ نہیں کیا؟''

''نہیں چھوٹے صاحب۔''

''کیوں؟''

''اس علاقے میں ہی ایک بھنگی ہوں اور دور دور تک کوئی بھنگی نہیں ہے چھوٹے صاحب۔ پھر ہماری شادی کیسے ہوسکتی ہے۔'' (لیجئے یہ راستہ بھی بند ہوا)

''تمہارا جی نہیں چاہتا کالو بھنگی؟'' میں نے دوبارہ کوشش کر کے کچھ کریدنا چاہا۔

''کیا صاحب؟''

''عشق کرنے کے لئے جی چاہتا ہے تمہارا؟ شاید کسی سے محبت کی ہوگی تم نے، جبھی تم نے اب تک شادی نہیں کی۔''

''عشق کیا ہوتا ہے چھوٹے صاحب؟''

''عورت سے عشق کرتے ہیں لوگ۔''

''عشق کیسے کرتے ہیں صاحب؟ شادی تو ضرور کرتے ہیں سب لوگ، بڑے لوگ بھی عشق کرتے ہوں گے چھوٹے صاحب مگر ہم نے نہیں سنا وہ جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں۔ رہی شادی کی بات وہ میں نے آپ کو بتادی۔ شادی کیوں نہیں کی میں نے، کیسے ہوتی شادی میری، آپ بتایئے؟''..... (ہم کیا بتائیں خاک)

''تمہیں افسوس نہیں ہے کالو بھنگی؟''

''کس بات کا افسوس چھوٹے صاحب!''

میں نے ہار کر اس کے متعلق لکھنے کا خیال چھوڑ دیا۔

آٹھ سال ہوئے کالو بھنگی مر گیا۔ وہ جو کبھی بیمار نہیں ہوا تھا اچانک ایسا بیمار پڑا کہ پھر کبھی بستر علالت سے نہ اٹھا۔ اسے ہسپتال میں مریض رکھوا دیا تھا۔ وہ الگ وارڈ میں رہتا تھا۔ کمپونڈر دور سے اس کے حلق میں دوا ڈال دیتا اور ایک چپراسی اس کے لئے کھانا رکھ آتا، وہ اپنے برتن خود صاف کرتا، اپنا بستر خود کرتا، اپنا بول و براز خود صاف کرتا اور جب وہ مر گیا تو اس کی لاش کو پولس والوں نے ٹھکانے لگا دیا کیونکہ اس کا کوئی وارث نہ تھا۔ وہ ہمارے ہاں بیس سال سے رہتا تھا لیکن ہم کوئی اس کے رشتہ دار تھوڑی تھے، اس لئے اس کی آخری تنخواہ بھی بحق سرکار ضبط ہوگئی کیونکہ کوئی اس کا وارث نہ

تھا، اور جب وہ مرا اس روز بھی ہسپتال کھلا، ڈاکٹر صاحب نے نسخے لکھے۔ کمپونڈر نے تیار کیے۔ مریضوں نے دوالی اور گھر لوٹ گئے۔ پھر روز کی طرح ہسپتال بھی بند ہوا اور گھر آ کر ہم سب نے آرام سے کھانا کھایا اور ریڈیو سنا اور لحاف اوڑھ کر سو گئے۔ صبح اٹھے تو پتہ چلا کہ پولس والوں نے ازراہ کرم کالو بھنگی کی لاش ٹھکانے لگوادی۔ اس پر ڈاکٹر صاحب کی گائے اور کمپونڈر صاحب کی بکری نے دو روز تک نہ کچھ کھایا نہ پیا، اور وارڈ کے باہر کھڑے کھڑے چلاتی رہیں۔ جانوروں کی ذات ہے نا آخر۔

''ارے تو پھر جھاڑو لے کر آن پہنچا! آخر کیا چاہتا ہے؟ بتا دے۔''

کالو بھنگی ابھی تک وہیں کھڑا ہے۔

''کیوں بھئی، اب تو میں نے سب کچھ جو میں تمہاری بابت جانتا ہوں۔ اب بھی یہیں کھڑے ہو، پریشان کر رہے ہو، للہ چلے جاؤ، کیا مجھ سے کچھ چھوٹ گیا ہے؟ کوئی بھول ہوگئی ہے؟ تمہارا نام، کالو بھنگی۔ کام۔ بھنگی۔ اس علاقے سے کبھی باہر نہیں گئے، شادی نہیں کی، عشق نہیں لڑایا۔ زندگی میں کوئی ہنگامی بات نہیں ہوئی۔ کوئی اچنبھا معجزہ نہیں ہوا، جیسے محبوبہ کے ہونٹوں میں ہوتا ہے، اپنے بچے کے پیار میں ہوتا ہے، غالب کے کلام میں ہوتا ہے۔ کچھ بھی تو نہیں ہوا تمہاری زندگی میں۔ پھر میں کیا لکھوں؟ تمہاری تنخواہ آٹھ روپے اور چار روپئے کا آٹا، ایک روپئے کا نمک، ایک روپے کا تمباکو، آٹھ آنے کی چائے، چار آنے کا گڑ، چار آنے کا مصالحہ، سات روپئے، اور ایک روپے بنئے کا، آٹھ روپئے ہوگئے مگر آٹھ روپئے میں کہانی نہیں ہوتی۔ آج کل تو پچیس پچاس سو میں نہیں ہوسکتی پھر میں کیا لکھ سکتا ہوں تمہارے بارے میں۔ اب خلجی ہی کو لو، ہسپتال میں کمپونڈر ہے۔ بتیس روپئے تنخواہ پاتا ہے۔ وراثت سے نچلے متوسط طبقے کے ماں باپ ملے تھے، جنہوں نے مڈل تک پڑھا دیا پھر خلجی نے کمپونڈری کا امتحان پاس کرلیا، وہ جوان ہے، اس کے چہرے پر رنگت ہے۔ یہ جوانی، یہ رنگت کچھ چاہتی ہے۔ وہ سفید لٹھے کی شلوار پہن سکتا ہے۔ قمیض پر کلف لگا سکتا ہے، بالوں میں خوشبودار تیل لگا کر کنگھی کر سکتا ہے، سرکار نے اسے رہنے کے لئے ایک چھوٹا سا بنگلہ نما کوارٹر بھی دے رکھا ہے، ڈاکٹر چوک جائے تو فیس بھی جھاڑ لیتا ہے اور خوبصورت مریضاؤں سے عشق بھی کرلیتا ہے۔ وہ نوراں اور خلجی کا واقعہ تمہیں یاد ہوگا۔ نوراں نھیا سے آتی تھی۔ سولہ سترہ برس کی الڑھ جوانی، چار کوس سے سینما کے رنگین اشتہار کی طرح نظر آجاتی تھی۔ بڑی بیوقوف تھی۔ وہ اپنے گاؤں کے دو نوجوان کا عشق قبول کئے بیٹھی تھی۔ جب نمبردار کا لڑکا سامنے آجاتا تو اس کی ہو جاتی اور جب پٹواری کا لڑکا دکھائی دیتا تو اس کا دل اس کی طرف مائل ہونے لگتا اور وہ کوئی فیصلہ

نہیں کر سکتی تھی۔ بالعموم عشق کو لوگ ایک بالکل واضح، قاطع یقینی امر سمجھتے ہیں ورآنحالیکہ یہ عشق بہت بڑا متذبذب، غیر یقینی گومگو حالت کا حامل ہوتا ہے۔ یعنی عشق اس سے بھی ہے، اس سے بھی ہے اور پھر شاید کہیں نہیں ہے اور ہے بھی تو اس قدر وقتی، گرگٹی، ہنگامی، کہ ادھر نظر چوکی ادھر عشق غائب، سچائی ضرور ہوتی ہے لیکن ابدیت مفقود ہوتی ہے، اسی لئے تو نوراں کوئی فیصلہ نہیں کر پاتی تھی۔ اس کا دل نمبردار کے بیٹے کے لئے بھی دھڑکتا تھا اور پٹواری کے پوت کے لئے بھی اس کے ہونٹ نمبردار کے بیٹے کے ہونٹوں سے مل جانے کے لئے بیتاب ہو اٹھتے اور پٹواری کے پوت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہی اس کا دل یوں کانپنے لگتا جیسے چاروں طرف سمندر ہو، چاروں طرف لہریں ہوں اور ایک اکیلی کشتی ہو اور نازک سی پتوار ہو اور چاروں طرف کوئی نہ ہو اور کشتی ڈولنے لگے، ہولے ہولے ڈولتی جائے اور نازک سی پتوار نازک سے ہاتھوں سے چلتی تھم جائے اور سانس رکتے رکتے رک سی جائے اور آنکھیں جھکتی جھکتی جھک سی جائیں اور زلفیں بکھرتی بکھرتی بکھری سی جائیں اور لہریں گھوم گھوم کر گھومتی ہوئی معلوم دیں اور بڑے بڑے دائرے پھیلتے پھیلتے جائیں اور پھر چاروں طرف سناٹا پھیل جائے اور دل ایک دم دھک سے رہ جائے اور کوئی اپنی بانہوں میں بھینچ لے۔ ہائے۔ پٹواری کے بیٹے کو دیکھنے سے ایسی حالت ہوتی تھی نوراں کی اور کوئی فیصلہ نہ کر سکتی تھی۔ نمبردار کا بیٹا، پٹواری کا بیٹا، پٹواری کا بیٹا نمبردار کا بیٹا، وہ دونوں کو زبان دے چکی تھی۔ دونوں سے شادی کا اقرار کر چکی تھی، دونوں پر مرمٹی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ آپس میں لڑتے لڑتے لہولہان ہو گئے اور جب جوانی کا بہت سا لہو رگوں سے نکل گیا تو انہیں اپنی بیوقوفی پر بڑا غصہ آیا اور پہلے نمبردار کا بیٹا نوراں کے پاس پہنچا۔ اپنی چھری سے اسے ہلاک کرنا چاہا اور نوراں کے بازو پر زخم آ گئے اور پھر پٹواری کا پوت آیا اور اس نے اس کی جان لینی چاہی اور نوراں کے پاؤں پر زخم آ گئے مگر وہ بچ گئی کیونکہ وہ بروقت ہسپتال لائی گئی تھی اور یہاں اس کا علاج شروع ہو گیا۔ آخر ہسپتال والے بھی انسان ہوتے ہیں۔ خوبصورتی دلوں پر اثر کرتی ہے انجکشن کی طرح۔ تھوڑا بہت اس کا اثر ضرور ہوتا ہے۔ کسی پر کم۔ کسی پر زیادہ۔ ڈاکٹر صاحب پر کم تھا۔ کمپونڈر پر زیادہ تھا۔ نوراں کی تیمارداری میں خلجی دل و جان سے لگا رہا۔ نوراں سے بیگماں، بیگماں سے پہلے ریشماں اور ریشماں سے جانکی کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا مگر وہ خلجی کے ناکام معاشقے تھے کیونکہ وہ عورتیں بیاہی ہوئی تھیں، ریشماں کا تو ایک بچہ بھی تھا۔ بچوں کے علاوہ ماں باپ تھے اور خاوند تھے اور خاوند کی دشمن نگاہیں تھیں جو گویا خلجی کے سینے کے اندر گھس کے اس کی خواہشوں کے آخری کونے تک پہنچ جانا چاہتی تھیں۔ خلجی کیا کر سکتا تھا مجبور ہو کر رہ

جاتا، اس نے بیگماں سے عشق کیا، ریشماں سے اور جانکی سے بھی۔ وہ ہر روز بیگماں کے بھائی کو مٹھائی کھلاتا تھا، ریشماں کے ننھے بیٹے کو دن بھر اٹھائے پرتا تھا، جانکی کو پھولوں سے بڑی محبت تھی، وہ ہر روز صبح اُٹھ کے منہ اندھیرے جنگل کی طرف چلا جاتا اور خوبصورت لالہ کے گچھے توڑ کر اس کے لئے لاتا۔ بہترین دوائیں، بہترین غذائیں، بہترین، تیمارداری لیکن وقت پر جب بیگماں اچھی ہوئی تو روتے روتے اپنے خاوند کے ساتھ چلی گئی اور جب ریشماں اچھی ہوئی تو اپنے بیٹے کو لے کے چلی گئی اور جانکی اچھی ہوئی تو چلتے وقت اس نے خلجی کے دیئے ہوئے پھول اپنے سینے سے لگائے، اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور پھر اس نے اپنے خاوند کا ہاتھ تھام لیا اور چلتے چلتے گھاٹی کی اوٹ میں غائب ہوگئی۔ گھاٹی کے آخری کنارے پر پہنچ کر اس نے مڑ کر خلجی کی طرف دیکھا اور خلجی منہ پھیر کر وارڈ کی دیوار سے لگ کے رونے لگا۔ ریشماں کے رخصت ہوتے وقت بھی وہ اسی طرح رویا تھا۔ بیگماں کے جاتے وقت بھی وہ اسی شدت، اسی خلوص، اسی اذیت کے کربناک احساس سے مجبور ہو کر رویا تھا، لیکن خلجی کے لئے نہ ریشماں رکی، نہ بیگماں، نہ جانکی اور پھر اب کتنے سالوں کے بعد نوراں آئی تھی اور اس کا دل اسی طرح دھڑکنے لگا تھا اور یہ دھڑکن روز بہ روز بڑھتی چلی جاتی تھی۔ شروع شروع میں تو نوراں کی حالت غیر تھی، اس کا بچنا محال تھا مگر خلجی کی انتھک کوششوں سے زخم بھرتے چلے گئے۔ پیپ کم ہوتی گئی۔ سڑاند دور ہوتی گئی، سوجن غائب ہوتی گئی۔ نوراں کی آنکھوں میں چمک اور اس کے سپید چہرے پر صحت کی سرخی آتی گئی اور جس روز خلجی نے اس کے بازوؤں کی پٹی اتاری تو نوراں بے اختیار ایک اظہار تشکر کے ساتھ اس کے سینے سے لپٹ کر رونے لگی اور اس کے پاؤں کی پٹی اتری تو اس نے اپنے پاؤں میں مہندی رچائی اور ہاتھوں پر اور آنکھوں پر کاجل لگایا اور بالوں پر زلفیں سنواریں تو خلجی کا دل مسرت سے چوکڑیاں بھرنے لگا۔ نوراں خلجی کو دل دے بیٹھی تھی۔ اس نے خلجی سے شادی کا وعدہ کر لیا تھا۔ نمبردار کا بیٹا اور پٹواری کا بیٹا دونوں باری باری کئی دفعہ اسے دیکھنے کے لئے، اس سے معافی مانگنے کے لئے، اس سے شادی کا پیمان کرنے کے لئے ہسپتال آئے تھے اور نوراں انہیں دیکھ کر ہر بار گھبرا جاتی، کانپنے لگتی، مڑ مڑ کے دیکھنے لگتی اور اس وقت تک اسے چین نہ آتا، جب تلک وہ لوگ چلے نہ جاتے اور خلجی اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں نہ لے لیتا اور جب وہ بالکل اچھی ہوگی تو سارا گاؤں اس کا اپنا گاؤں اسے دیکھنے کے لئے امڈ پڑا۔ گاؤں کی چھوری اچھی ہوگئی تھی۔ ڈاکٹر صاحب اور کمپونڈر صاحب کی مہربانی سے اور نوراں کے ماں باپ بچھے جاتے تھے اور آج تو نمبردار بھی آیا تھا اور پٹواری بھی اور وہ دونوں خردماغ لڑکے بھی

جواب نوراں کو دیکھ دیکھ کے اپنے کئے پر پشیمان ہو رہے تھے اور پھر نوراں نے اپنی ماں کا سہارا لیا اور کاجل میں تیرتی ہوئی ڈبڈبائی آنکھوں سے خلجی کی طرف دیکھا اور چپ چاپ اپنے گاؤں چلی گئی۔ سارا گاؤں اسے لینے کے لئے آیا تھا اور اس کے قدموں کے پیچھے پیچھے نمبردار کے بیٹے اور پٹواری کے بیٹے کے قدم تھے اور یہ قدم اور دوسرے قدم اور سینکڑوں قدم جو نوراں کے ساتھ چل رہے تھے، خلجی کے سینے کی گھاٹی پر سے گزرتے گئے اور پیچھے ایک دھندلی گرد و غبار سے اٹی رہ گزر چھوڑ گئے۔

اور کوئی وارڈ کی دیوار کے ساتھ لگ کے سسکیاں لینے لگا۔

بڑی خوبصورت رومانی زندگی تھی خلجی کی، خلجی جو مڈل پاس تھا، بتیس روپے تنخواہ پاتا تھا۔ پندرہ بیس اوپر سے کما لیتا تھا۔ خلجی جو جوان تھا، جو محبت کرتا تھا، جو ایک چھوٹے سے بنگلے میں رہتا تھا، جو اچھے ادیبوں کے افسانے پڑھتا تھا اور عشق میں روتا تھا۔ کس قدر دلچسپ اور رومانی اور پر کیف زندگی تھی خلجی کی لیکن کالو بھنگی کے متعلق میں کیا کہہ سکتا ہوں سوائے اس کے کہ:

۱- کالو بھنگی نے بیگماں کی لہو اور پیپ سے بھری ہوئی پٹیاں دھوئیں۔

۲- کالو بھنگی نے بیگماں کا بول و براز صاف کیا۔

۳- کالو بھنگی نے ریشماں کی غلیظ پٹیاں صاف کیں۔

۴- کالو بھنگی ریشماں کے بیٹے کو مکی کے بھٹے کھلاتا تھا۔

۵- کالو بھنگی نے جانکی کی گندی پٹیاں دھوئیں اور ہر روز اس کے کمرے میں فینائل چھڑکتا رہا اور شام سے پہلے وارڈ کی کھڑکی بند کرتا رہا۔ اور آتش دان میں لکڑیاں جلاتا رہا تاکہ جانکی کو سردی نہ لگے۔

۶- کالو بھنگی نوراں کا پاخانہ اٹھاتا رہا۔ تین ماہ دس روز تک۔

کالو بھنگی نے ریشماں کو جاتے ہوئے دیکھا، اس نے بیگماں کو جاتے ہوئے دیکھا، اس نے جانکی کو جاتے ہوئے دیکھا، اس نے نوراں کو جاتے ہوئے دیکھا تھا لیکن وہ کبھی دیوار سے لگ کر نہیں رویا، وہ پہلے تو دو ایک لمحوں کے لئے حیران ہو جاتا، پھر اسی حیرت سے اپنا سر کھجانے لگتا اور جب کوئی بات اس کی سمجھ میں نہ آتی تو وہ ہسپتال کے نیچے کھیتوں میں چلا جاتا اور گائے سے اپنی چند یا چٹوانے لگتا لیکن اس کا ذکر تو میں پہلے کر چکا ہوں پھر اور کیا لکھوں تمہارے بارے میں کالو بھنگی، سب کچھ تو کہہ دیا۔ جو کچھ کہنا تھا۔ جو کچھ تم رہے ہو، تمہاری تنخواہ بتیس روپے ہوتی، تم مڈل پاس یا فیل ہوتے، تمہیں وراثت میں کچھ کلچر، تہذیب، کچھ تھوڑی سی انسانی مسرت اور اس مسرت کی

بلندی ملی ہوتی تو میں تمہارے متعلق کوئی کہانی لکھتا۔ اب تمہارے آٹھ روپئے میں کیا کہانی لکھوں۔ ہر بار ان آٹھ روپوں کو الٹ پھیر کے دیکھتا ہوں، چار روپئے کا آٹا، ایک روپئے کا نمک، ایک روپئے کا تمباکو، آٹھ آنے کی چائے، چار آنے کا گڑ، چار آنے کا مصالحہ، سات روپے اور ایک روپئے بنئے کا۔ آٹھ روپئے ہوگئے۔ کیسے کہانی بنے گی تمہاری کالو بھنگی، تمہارا افسانہ مجھ سے نہیں لکھا جائے گا۔ چلے جاؤ، دیکھو میں تمہارے سامنے ہاتھ جوڑتا ہوں۔

مگر یہ منحوس ابھی تک یہیں کھڑا ہے۔ اپنے اکھڑے پیلے پیلے گندے دانت نکالے اپنی پھوٹی ہنسی ہنس رہا ہے۔

تو ایسے نہیں جائے گا۔ اچھا بھئی! اب میں پھر اپنی یادوں کی راکھ کریدتا ہوں، شاید اب تیرے لئے مجھے بتیس روپوں سے نیچے اترنا پڑے گا اور بخت یار چپراسی کا آسرا لینا پڑیگا۔ بخت یار چپراسی کو پندرہ روپئے تنخواہ ملتی ہے اور جب کبھی وہ ڈاکٹر کمپونڈر یا ویکسی نیٹر کے ہمراہ دورے پر جاتا ہے تو اسے ڈبل بھتہ اور سفر خرچ بھی ملتا ہے۔ پھر گاؤں میں اس کی اپنی زمین بھی ہے اور ایک چھوٹا سا مکان بھی ہے جس کے تین طرف پیپل کے بلند و بالا درخت ہیں اور چوتھی طرف ایک خوبصورت سا باغیچہ ہے جو اس کی بیوی نے لگایا ہے۔ اس میں اس نے کرم کا ساگ بویا ہے اور پالک اور مولیاں اور شلغم اور سبز مرچیں اور بڑی الیں اور کدو، جو گرمیوں کی دھوپ میں سکھائے جاتے ہیں اور سردیوں میں جب برف پڑتی ہے اور سبزہ مر جاتا ہے تو کھائے جاتے ہیں۔ بخت یار کی بیوی یہ سب کچھ جانتی ہے، بخت یار کے تین بچے ہیں، اس کی بوڑھی ماں ہے جو ہمیشہ اپنی بہو سے جھگڑا کرتی رہتی ہے، ایک دفعہ بخت یار کی ماں اپنی بہو سے جھگڑا کر کے گھر سے چلی گئی تھی، اس روز گھر ابر آسمان پر چھایا ہوا تھا اور پالے کے مارے دانت بج رہے تھے، اور گھر سے بخت یار کا بڑا لڑکا اماں کے چلنے جانے کی خبر لے کر دوڑتا ہسپتال آیا تھا اور بخت یار اسی وقت اپنی ماں کو واپس لانے کے لئے کالو بھنگی کو ساتھ لے کر چل دیا تھا۔ وہ دن بھر جنگل میں اسے ڈھونڈتے رہے۔ وہ اور کالو بھنگی اور بخت یار کی بیوی جواب اپنے کئے پر پشیمان تھی اپنی ساس کو اونچی آوازیں دے دے کر روتی جاتی تھی۔ آسمان ابر آلود تھا اور سردی سے ہاتھ پاؤں شل ہوئے جاتے تھے، پھر بارش شروع ہوگئی، پھر کریڑی پڑنے لگی اور پھر چاروں طرف گہری خاموشی چھا گئی اور جیسے ایک گہری موت نے اپنے دروازے کھول دیئے ہوں اور برف کی پریوں کو قطار اندر قطار باہر زمین پر بھیج دیا ہو، برف کے گالے زمین پر گرتے گئے — ساکن، خاموش، بے آواز، سپید مخمل، گھاٹیوں، وادیوں، چوٹیوں

پر پھیل گئی۔

"اماں!" بخت یار کی بیوی زور سے چلائی۔

"اماں!" بخت یار چلایا۔

"اماں!" کالو بھنگی نے آواز دی۔

جنگل گونج کے خاموش ہو گیا۔

پھر کالو بھنگی نے کہا: "میرا خیال ہے وہ نکر گئی ہوگی تمہارے ماموں کے پاس۔" نکر کے دو کوس ادھر انہیں بخت یار کی اماں ملی۔ برف گر رہی تھی اور وہ چلی جا رہی تھی۔ گرتی پڑتی، لڑھکتی، تھمتی، ہانپتی، کانپتی، آگے بڑھتی جا رہی تھی اور جب بخت یار نے اسے پکڑا تو اس نے ایک لمحے کے لئے مزاحمت کی، پھر وہ اس کے بازوؤں پر گر کر بیہوش ہوگئی۔ بخت یار کی بیوی نے اسے تھام لیا اور راستے بھر وہ اسے باری باری سے اٹھاتے چلے آئے۔ بخت یار اور کالو بھنگی اور جب وہ لوگ واپس گھر پہنچے تو بالکل اندھیرا ہو چکا تھا اور انہیں واپس آتے دیکھ کر بچے رونے لگے اور کالو بھنگی ایک طرف ہو کے کھڑا ہو گیا اور اپنا سر کھجانے لگا، اور ادھر ادھر دیکھنے لگا، پھر اس نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور وہاں سے چلا آیا۔ ہاں بخت یار کی زندگی میں بھی افسانے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے خوب صورت افسانے مگر کالو بھنگی میں تمہارے متعلق اور کیا لکھ سکتا ہوں لیکن تمہارے متعلق اتنا کچھ کرید نے کے بعد بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہارا کیا کیا جائے، خدا کے لئے اب تو چلے جاؤ بہت ستالیا تم نے۔

لیکن مجھے معلوم ہے یہ نہیں جائے گا۔ اسی طرح میرے ذہن پر سوار رہے گا اور میرے افسانوں میں اپنی غلیظ جھاڑو لئے کھڑا رہے گا۔ اب میں سمجھتا ہوں تو کیا چاہتا، تو وہ کہانی سننا چاہتا ہے جو ہوئی نہیں لیکن ہو سکتی تھی، میں تیرے پاؤں سے شروع کرتا ہوں سن، تو چاہتا ہے تا کہ کوئی تیرے گندے، کھردرے پاؤں دھو ڈالے۔ دھو دھو کر ان سے غلاظت دور کرے۔ ان کی بیائیوں پر مرہم لگائے، تو چاہتا ہے، تیرے گھٹنوں کی ابھری ہوئی ہڈیاں گوشت میں چھپ جائیں، تیری رانوں میں طاقت اور سختی آجائے، تیرے پیٹ کی مرجھائی ہوئی سلوٹیں غائب ہو جائیں، تیرے کمزور سینے کے گرد وغبارے سے اٹے ہوئے بال غائب ہو جائیں۔ تو چاہتا ہے کوئی تیرے ہونٹوں میں رس ڈال دے، انہیں گویائی بخش دے۔ تیری آنکھوں میں چمک ڈال دے، تیرے گالوں میں لہو بھر دے، تیری چندیا کو گھنے بالوں کی زلفیں عطا کرے۔ تجھے ایک مصفا لباس دے دے، تیرے ارد گرد ایک چھوٹی چھوٹی چار دیواری کھڑی کر دے، حسین، مصفا، پاکیزہ، اس میں تیری بیوی راج

کرے، تیرے بچے قہقہے لگاتے پھریں، تو کچھ تو چاہتا ہے وہ میں نہیں کرسکتا۔ میں تیرے ٹوٹے پھوٹے دانتوں کی روتی ہوئی ہنسی پہچانتا ہوں۔ جب تو گائے سے اپنا سر چٹواتا ہے مجھے معلوم ہے تو اپنے تخلیل میں اپنی بیوی کو دیکھتا ہے جو تیرے بالوں میں اپنی انگلیاں پھیر کر تیرا سر سہلا رہی ہے۔ حتیٰ کہ تیری آنکھیں بند ہو جاتی ہیں، تیرا سر جھک جاتا ہے تو اس کی مہربان آغوش میں سو جاتا ہے اور جب تو آہستہ آہستہ آگ پر میرے لئے مکی کا بھٹا سینکتا ہے اور مجھے جس محبت اور شفقت سے وہ بھٹا کھلاتا ہے تو اپنے ذہن کی پہنائی میں اس ننھے بچے کو دیکھ رہا ہوتا ہے جو تیرا بیٹا نہیں ہے جو ابھی آیا۔ جو تیری زندگی میں کبھی نہیں آئے گا لیکن جس سے تو نے ایک شفیق باپ کی طرح پیار کیا ہے۔ تو نے اسے گودیوں میں کھلایا ہے، اس کا منہ چوما ہے، اسے اپنے کندھے پر بٹھا کر جہان بھر میں دیکھ لو یہ ہے میرا بیٹا، - یہ ہے میرا بیٹا اور یہ جب سب کچھ تجھے نہیں ملا تو تو سب سے الگ ہو کر کھڑا ہو گیا اور حیرت سے اپنا سر کھجانے لگا، اور تیری انگلیاں لاشعوری انداز میں گننے لگیں۔ ایک دو، تین، چار، پانچ، چھ، ساتھ، آٹھ۔ آٹھ روپئے۔ میں تیری وہ کہانی جانتا ہوں جو ہو سکتی تھی، لیکن ہو نہ سکی، کیونکہ میں افسانہ نگار ہوں، میں ایک نئی کہانی گھڑ سکتا ہوں، ایک نیا انسان نہیں گھڑ سکتا۔ اس کے لئے میں اکیلا کافی نہیں ہوں، اس کے لئے افسانہ نگار اور اس کا پڑھنے والا، اور ڈاکٹر اور کمپونڈر اور بخت یار اور گاؤں کے پٹواری اور نمبر دار اور دوکان دار اور حاکم اور سیاست دان اور مزدور کھیتوں میں کام کرنے والے کسان ہر شخص کی، لاکھوں، کروڑوں، اربوں آدمیوں کی اکٹھی مدد چاہئے۔ میں اکیلا مجبور ہوں، کچھ نہیں کرسکوں گا۔ جب تک ہم سب مل کر ایک دوسرے کی مدد نہ کریں، یہ کام نہ ہوگا، اور تو اسی طرح جھاڑو لئے میرے ذہن کے دروازے پر کھڑا رہے گا اور میں کوئی عظیم افسانہ نہ لکھ سکوں گا۔ جس میں انسانی روح کی مکمل مسرت جھلک اٹھے اور کوئی معمار عظیم عمارت نہ تعمیر کر سکے گا جس میں ہماری قوم کی عظمت، اپنی بلندیاں چھولے اور کوئی ایسا گیت نہ گا سکے جس کی پہنائیوں میں کائنات کی آفاقیت جھلک جائے۔

یہ بھرپور زندگی ممکن نہیں جب تک تو جھاڑو لئے یہاں کھڑا رہے گا۔

اچھا ہے کھڑا رہ۔ پھر شاید وہ دن کبھی آ جائے کہ کوئی تجھ سے تیری جھاڑو چھڑا دے اور تیرے ہاتھوں کو نرمی سے تھام کر تجھے قوسِ قزح کے اس پار لئے جائے۔

ببل

راجندر سنگھ بیدی

(۱۹۱۵ء - ۱۹۸۴ء)

درباری لال شام سے گھر ہی میں بیٹھا سیتا کے ساتھ بے کار ہو رہا تھا۔

کسی کے ساتھ بے کار ہونا اس حالت کو کہتے ہیں، جب آدمی دیکھنے میں ایوننگ نیوز یا غالب کی غزلیں پڑھ رہا ہو لیکن خیالوں میں کسی سیتا کے ساتھ غرق ہو۔

سیتا نے تو کہا تھا کہ وہ ٹھیک چھ بجے آرورا سنیما کی طرف سے آنے والی سڑک کے موڑ پر کھڑی ہوگی۔ اس کی ساڑھی کا رنگ کاسنی ہوگا لیکن ——

درباری کنگز سرکل میں رہتا تھا جس کا نام اب مہیشوری ادیان ہو گیا ہے، وہ لاؤڈ اسپیکروں کی ایک فرم میں کام کرتا تھا۔ آمدنی تو کوئی خاص نہ تھی لیکن پیسے کی کمی بھی نہ تھی۔ باپ مہتا گردھاری لال نے ایک ہی دن کی فارورڈ ٹریڈنگ میں تین چار لاکھ روپے بنا لئے تھے اور پھر ایکا ایکی ہاتھ کھینچ لئے جواب تک کھینچے ہوئے تھے۔ آج بھی کاٹن ایکسچینج میں ان کے ساتھی مہتا صاحب کے مکھن میں سے بال کی طرح سے نکل جانے پر گالیاں دیتے تو وہ جواب میں ہنس دیتے۔ ایسی ہنسی جو آدمی تین

چارلاکھ روپیہ اندر ڈال کر ہی ہنس سکتا ہے۔

پھر بڑے بھائی بہاری لال کی شادی مارواڑیوں کے گھر میں ہوئی جنھوں نے بیس سیر سونے کے کڑے اپنی لڑکی کے ہاتھوں میں ڈالے اور یوں اسے درباری کی بھابی بنایا۔ برس ایک بعد درباری کی اپنی بہن ستونتی نار ایک لکھ پتی اسماعیل صالح محمد کے ساتھ بھاگ گئی اور نکاح کر لیا۔ گلی، محلے، پورے شہر میں ہنگامہ ہوا۔ برسوں مہتا صاحب نے لڑکی اور داماد دونوں کو ''پریم کٹیر''— اپنے گھر میں گھسنے نہ دیا۔ آخر من منوتی ہو گئی۔ لڑکے کے رشتہ دار کہتے تھے لڑکی کو مشرف بہ اسلام کیا گیا ہے اور اس کا نام کنیز فاطمہ ہے اور مہتا صاحب کہتے تھے۔ لڑکے کو شدھ کرنے کے بعد اس کا نام سرداری موہن رکھا گیا ہے لیکن سرداری موہن یا صالح محمد اپنا نام ہمیشہ ایس۔ایم نواب ہی لکھا کرتا۔ چونکہ لڑکے کی اس قبیح حرکت پر غصہ نکالنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا، اس لئے درباری لال کے حواری جب بھی ستونتی نار کے پتی یا شوہر سے ملتے تو یہی کہتے: ''کیوں بے صالح......''

آج صالح یا سرداری اور ستونتی دونوں گھر پر تھے اور ان کے دو بچے بھی۔ اس سے بہاری اور بھابی گن وتی نے مل کر درباری کی شادی کا مسئلہ چھیڑ دیا۔ عورتیں مثالی مرد اور مثالی عورت کی باتیں کرتے کرتے آپس میں الجھنے لگیں۔ درباری برآمدے میں بیٹھا، اپنے بارے میں ساری گفتگو سن رہا تھا۔ ایکا ایکی وہ لپکا اور اپنے منھ کے لاؤڈ اسپیکر کو کھڑکی میں سے اندر کرتے ہوئے بولا: ''میں درباری لال مہتا، ولد گردھاری لال مہتا، ساکن ممبئی ہرگز ہرگز شادی نہیں کروں گا۔'' سب اس آواز پر چونک گئے۔ عورتوں اور بچوں کی تو جان ہی نکل گئی۔

درباری لال واپس اپنی جگہ پر آکر ایوننگ نیوز کے ورق الٹنے لگا اور پھر اروراسنیما کی طرف سے گھر کو مڑتی ہوئی سڑک پہ دیکھنے لگا، جہاں اسے کاسنی رنگ کی ساڑی کی تلاش تھی۔

اندر سب ہنس رہے تھے۔ ماں بھی ان میں آکر شامل ہو گئی تھی۔ درباری گھر بھر کا بانکا تھا۔ جس طریقے سے وہ بالوں پہ ہیر ٹانک لگاتا، محنت سے ان کو بٹھاتا، قینچی لے کر، آئینے کے سامنے گھنٹہ گھنٹہ دو دو گھنٹے مونچھوں کی نوک میں صرف کرتا، سب بانکپن کی دلیلیں ہی تو تھیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ شادی سے پہلے، عمر کے اس حصے میں لڑکے، لڑکیوں کی سی حرکتیں کرنے لگتے ہیں اور لڑکیاں لڑکوں کی سی پھر شادی ہوتی ہے۔ آپس میں ملتے ہیں تب کہیں جاکر اپنا اپنا کام سنبھالتے

ہیں.....درباری کی ان حرکتوں کو دیکھ کر گھر کی عورتیں کہتی تھیں، یہ سب شادی کی نشانیاں ہیں اور مرد کہتے تھے — بربادی کی!

برآمدے میں سکھ ترکھان نے جالی لگانے کا کام آج ہی شروع کیا تھا۔ وہ دن بھر ایک بے شکل بے قاعدہ اور کھردری سی لکڑی کو چھیلتا، اس پر رندہ کرتا رہا تھا اور اسی لئے سارے گھر میں لکڑی کے چھلکے اور چوٹھیاں بکھری ہوئی تھیں اور پیروں میں لگ رہی تھیں...... جبھی سامنے ڈان باسکو اسکول میں گھنٹی بجی اور سفید سفید قمیض اور نیلی نیلی نیکریں پہنے ہوئے لڑکے، ایک دوسرے پر گرتے پڑتے، ہاسٹل کے کمروں سے نکلے۔ شاید وہ شام کی دعا کے لئے گرجے کی طرف جارہے تھے۔ اسکول کی گراؤنڈ میں لمبا سا فرغل پہنے، ابھی تک فادر بچوں کو فٹ بال کھلا رہا تھا۔ اس نے بھی سیٹی بجادی، کھیل ختم کردیا مگر سیتا نہ آئی.......

اروراسینما کی طرف سے ادھر آنے والی سڑک پر کچھ گائیں السائی سی بیٹھی تھی اور جگالی کررہی تھیں، پھر اس جانب سے ایک کار اندر کی طرف مڑی اور دائیں طرف کی بلڈنگ کے پیچھے کھڑی ہوگئی، جبھی ایک موٹی سی عورت آتی ہوئی دکھائی دی۔ اس کے پیچھے مدراسی ہوٹل اڈپی کا مالک، راماسوامی آرہا تھا۔ وہ بھی موٹا تھا۔ اگرچہ وہ موٹی عورت اور اڈپی کا مالک رامام سوامی ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر تھے۔ تاہم یہاں درباری کے ہاں سے یہی معلوم ہورہا تھا، جیسے وہ ایک دوسرے کو ٹھیلتے، ڈھکیلتے کوئی عجیب سا کھیل کھیلتے آرہے ہیں۔

سیتا کے بجائے الٹی طرف سے مصری چلی آئی۔ ہمیشہ کی طرح، آج بھی اس کی گود میں بچہ تھا — ببل!

ببل ایک تندرست بچہ تھا۔ گول مٹول، نرم نرم، جیسے اسفنج کا بنا ہوا۔ اس نے تو کئی دانت نکال لئے تھے لیکن نیچے کے دو دانت نسبتاً بڑے سے تھے۔ کمینہ ہنستا تو والٹ ڈزنی کا خرگوش معلوم ہوتا۔ آج تک کوئی ایسا دکھائی نہ دیا، جو ببل کو ہنستے دیکھ کر بے اختیار نہ ہنس دیا ہو۔

''ببل!'' درباری نے پکارا اور ہاتھ بچے کی طرف پھیلا دیئے۔ مسکراتے ہوئے ببل نے درباری کی طرف دیکھا اور اندر کی کسی بے بس سی تحریک سے ایکا ایکی درباری کی طرف ہمکنا شروع کردیا۔ اب وہ اپنی ماں مصری سے سنبھالا نہ جارہا تھا۔

''ٹھہرو۔'' درباری نے کہا اور کرمرا لینے کے لئے اندر لپک گیا۔ وہ یہ بھی بھول گیا کہ سیتا آئے گی اور چلی جائے گی۔ ببل کے چہرے پر ایک پرخلوص مایوسی کی لہر دوڑ گئی اور پل بھر میں وہ یوں محسوس کرنے لگا جیسے کہہ رہا ہوں—— یہ ساری دنیا دھوکا ہے، پھر جیسے وہ مایوس ہو رہا تھا، ایسے ہی درباری کو آتے دیکھ کر خوش بھی ہو گیا۔

ببل کی ماں، مصری ایک بھکارن تھی۔ احتیاج کی بنا پر اتنی چھوٹی سی عمر میں اس نے ببل کو بھیک مانگنے کا فن سکھا دیا تھا۔ بازار میں جاتی ہوئی وہ بابو قسم کے کسی بھی آدمی کے پاس کھڑی ہو جاتی اور ببل ایک ریہرسل کئے ہوئے ایکٹر کی طرح اس آدمی کی دھوتی یا قمیص کو کھینچنے لگتا اور اس چیز کی طرف اشارہ کرنے لگتا جو اسے مطلوب ہوتی۔ آدمی دیکھتا، نظریں بچاتا، پھر دیکھتا اور بے اختیار وہ چیز خرید کر ببل کے ہاتھ میں تھما دیتا۔ مصری بابو کے چلے جانے کے بعد ببل کے ہاتھ سے وہ چیز لے لیتی—— ببل روتا چلاتا رہ جاتا۔

لیکن درباری کے ساتھ ببل اور اس کی ماں مصری کا رشتہ ایسا نہ تھا۔ کرمرا لے کر اسے بیچنے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا تھا؟ کرمرے کے ساتھ مصری کو سیدھے دونی یا چونی مل جاتی تھی جس سے ببل کو کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اسے تو اپنا کرمرا چاہئے تھا، جسے ماں نہیں چھینتی تھی اور نہ کسی دکان دار کو دیتی تھی۔ کرمرا وہ سیدھا منھ میں ڈال لیتا اور دانتوں میں پوپلتے ہوئے اسے ہمک ہمک کر، اچھل اچھل کر اپنی خوشنودی کا اظہار کرتا۔ آج جب درباری نے ببل کو گود میں اٹھایا تو ایک ہی بار میں کرمرے سے مٹھی بھرتے ہوئے وہ ماں کی طرف لوٹنے، لپکنے لگا۔ درباری نے ببل کو بہت روکا، پیار دلار کی کوشش کی لیکن وہ بھلا کہاں ماننے والا تھا۔ اوں اوں کرتا ہوا وہ تو جیسے ماں کی طرف گرا ہی جا رہا تھا——

درباری نے کہا: ''کمینے..... سالے.....''

اندر سے صالح یا سرداری کی آواز آئی: ''کیا حکم ہے حضور؟''

''آپ کو غرض نہیں کیا، فیض گنجور۔'' درباری نے اندر کی طرف منھ کرتے ہوئے جواب دیا اور پھر ببل کے پیارے، دلارے گالوں پر چپت لگاتے، اسے ماں کو لوٹاتے ہوئے بولا: ''اتنا خود غرض.....؟ سلام نہ دعا، شکریہ نہ دھنیہ واد..... کام نکل گیا تو اب تو کون اور میں کون؟''

مصری فٹ پاتھ کی زندگی نے شرم کو جس کے لیے ایک تکلف بنا دیا تھا۔ بے باکی سے

بولی: ''یہ سب ایسے ہی ہوتے ہیں، بابو جی!'' اور پھر ببل کو چھاتی میں چھپاتی، وہیں کھڑی وہ اپنی دونی یا چونی کا انتظار کرنے لگی۔

ببل ہمیشہ کی طرح الف نہیں تو ب ننگا ضرور تھا کیونکہ بدن پر کمر کے نزدیک وہ ایک کالا سا تاگا پہنے ہوئے تھا جس میں ایک تعویذ لٹک رہا تھا۔ اس ''لباس'' میں خوش ماں کے پاس پہنچتے ہی اس نے اپنا منہ مصری کی بڑی بڑی چھاتیوں میں چھپا دیا، جہاں سے وہ ایک بہت بڑے فاتح کی طرح مڑ کر دیکھنے لگا جیسے وہ کسی بہت بڑے قلعے میں پہنچ گیا ہے، پھر نظروں کے تیر و ترکش تانے وہ قلعے کے کنگروں پر بیٹھا، سامنے کسی جدال فوج کا جائزہ لینے لگا۔ یورش سے پہلے ہی جس کے چھکے چھوٹ گئے، پھر ایکا ایکی کسی پروں والے خیالی گھوڑے پر بیٹھا وہ کسی شہسوار کی طرح لپکنے لگا۔ آگے ہی آگے، اوپر ہی اوپر.....اور منزلیں تسخیر ہو ہو کر اس کے پیروں میں پڑی ہوتی ہیں۔

مصری ایک پکے بلکہ کالے رنگ کی ایک جوان عورت تھی اور ببل گورا چٹا.....یہ کیسے ہوا—دربار ی نے کبھی نہ پوچھا۔ وہ سمجھتا تھا یہ غریب عورتیں کتنی بے سہارا ہوتی ہیں۔ سڑک کے کنارے پڑی ہوئی مصری کو کوئی بابو آٹھ آنے روپے کے عوض ببل دے گیا ہوگا۔

''آپ کے پاس تو پھر بھی چلا آتا ہے بابو جی! ورنہ یہ لل کٹ.......کسی مرد کے پاس نہیں جاتا۔''

''کیوں کیوں؟'' درباری نے حیران ہو کر پوچھا۔

''معلوم نہیں۔'' مصری کہنے لگی اور پھر پیار سے ببل کی طرف دیکھتی ہوئی بولی:

''ہاں! عورتوں کے پاس چلا جاتا ہے۔''

درباری جی کھول کے ہنسا:

''بدمعاش ہے نا......ابھی سے عورتوں کی چاٹ لگی ہے۔ بڑا ہو کر کیا کرے گا؟''

مصری خوب شرمائی اور خوب ہی اترائی۔ اسے یوں لگا، جیسے وہ اپنی گود میں انگنت گوپیوں والے کنھیاں کو کھلا رہی ہے اور مصری کے تصور میں جو گوپیاں تھیں، وہ خود بھی ان میں سے ایک تھی جیسے ببل مصری کا من تھا اور مصری کی اپنی برتیاں اس کے ارد گرد ناچ رہی تھیں......ببل ابھی ایک گوپی کے ساتھ تھا پھر انیک کے ساتھ!

درباری نے جو مصری بائی کے ساتھ تھوڑی سی آزادی لی تھی، اسی سے گھبرا کر پوچھ بیٹھا:

"اس کا باپ کیا کام کرتا ہے مصری؟"

"اس کا باپ—؟" مصری کو جیسے سوچنے میں وقت لگا: "نہیں ہے۔"

اس جواب میں بہت سی باتیں تھیں۔ یہ بھی تھی کہ وہ مر چکا ہے اور یہ بھی کہ مرنے سے بھی بدتر ہو گیا ہے۔ مصری کہیں دور دیکھنے لگی اور پھر درباری لال کی نگاہوں کے تاسف کو دور کرتے ہوئے بولی: "ایک بار وہ پھر آیا تھا...... مجھے یوں ہی لگا، جیسے وہی ہے لیکن...... میں کیا کہہ سکتی تھی، بابو جی؟...... میں نے تو اسے جی بھر کے دیکھا بھی نہ تھا۔ جب تک میں نے اس بچے کو کوئی نام نہیں رکھا تھا۔ کبھی گوپو، کبھی ناریاں کہہ کے پکارتی تھی۔ جبھی اس نے اس کے ہاتھ پر پانچ کا ایک نوٹ رکھا اور بڑے پیار سے پکارا— ببل!...... جب سے میں نے اس کا نام ببل رکھ دیا ہے......"

اور مصری پھر سوچنے لگی: "اس کا باپ نہ ہوتا تو پانچ روپے دیتا؟"

درباری سوچنے لگا:

"ہو سکتا ہے وہ آدمی نہیں...... پانچ روپے کا نوٹ ہی اس بچے کا باپ ہو۔"

درباری نے آج اٹھنی مصری کے ہاتھ پر رکھنے کے بجائے ببل کے ہاتھ پر رکھ دی۔ ببل نے سکے کو ہاتھ میں لیا۔ زور زور سے بازو کو ہمکایا اور پھر اسے پھینک دیا۔

اٹھنی سڑک پر کے مین ہول میں گرنے ہی والی تھی کہ جیسے مصری کی تقدیر کو ایک خشک، بے بضاعت سے آم کے چھلکے نے اسے روک لیا۔ مصری نے جھک کر اٹھنی اٹھائی اور ببل کو سینے سے لپٹاتے ہوئے بولی: "لچا ہے نا......" اور پھر اسے چومتے ہوئے وہ درباری لال سے بولی:

"سچ پوچھو، تو میرا مرد یہی ہے۔"

"تیرا مرد—؟"

"ہاں!" مصری نے ببل کو سنبھالا جو اپنی ماں کے سر پر سے پلو کھینچ رہا تھا اور کہنے لگی:

"یہ کماتا ہے اور میں کھاتی ہوں۔"

مصری بہت باتونی تھی وہ اور بھی بہت کچھ کہتی۔ ببل اور بھی کرمرا مانگتا لیکن درباری کو اپنی نظروں کے افق پر کاسنی رنگ لہراتا ہوا نظر آیا۔ اس نے جلدی سے مصری کے آبنوسی حسن اور ببل کی گوری چٹی معصومیت کو جھٹک دیا اور— "میں چلا، صالح بھائی...... اچھا بھابھی۔" کہہ کر وہ جلدی سے باہر نکل گیا۔ ابھی وہ سڑک پر پہنچا بھی نہ تھا کہ پتلون کے پائنچے میں اسے لکڑی کے چھلکے اڑے

ہوئے دکھا دیئے۔ جنھیں درباری نے جھک کر باہر نکالا اور سیتا کے پاس جا پہنچا۔

شیواجی پارک میں، سمندر کے کنارے، کلب اور بھیل پوری والوں سے کچھ دور ہٹ کر درباری اور سیتا ایک دیوار کا سہارا لے کر بیٹھ گئے۔

سیتا اٹھارہ انیس برس کی ایک لڑکی تھی جس کی ماں تو تھی پر باپ مر چکا تھا۔ گھر کی حالت کچھ اتنی خراب بھی نہ تھی کیونکہ مکان اپنا تھا جس کے مکینوں سے کبھی کرایہ وصول ہوتا تھا اور کبھی نہیں۔ سیتا کی ماں لچھمن دیوی یوں تو اپنی بیٹی کی شادی کرنا چاہتی تھی لیکن شادی سے زیادہ اسے اس بات کا خیال تھا کہ کوئی ایسا آئے جو ہر مہینے اپنے 'رباب' سے کرایہ اگاہے تاکہ سیتا کے کہنے کے مطابق دروازے پر ہر مہینے جو بھیڑ یا دکھائی دیتا ہے۔ بھاگ جائے .... اور جینا سکھی ہو جائے۔ لچھمن دیوی سے سیتا نے درباری کی بات بھی کی۔ پہلے تو ماں شک اور وسوسے کا اظہار کرنے لگی لیکن جب اسے پتہ چلا درباری کا پورا نام درباری لال مہتا ہے تو اس نے جھٹ سے اجازت دے دی کیونکہ بمبئی میں جو لوگ اگاہتے ہیں، انھیں مہتا بولتے ہیں۔

سیتا کا قد درمیانہ تھا لیکن بدن کا تناسب ایسا جو مردوں کے دل میں جذبے بیدار کیا کرتا ہے اور کوئی بے خود سی سیٹی ان کے ہونٹوں پر چلی آتی ہے۔ چہرے کی تراش خراش اچھی تھی لیکن اس کا پاس آنے ہی سے پتہ چلتا تھا۔ پلکیں کچھ نم سی رہتیں کیونکہ سیتا کی آنکھیں تھوڑا اندر دھنسی ہوئی تھیں اور ان کے بچاؤ کے لئے پلکوں کو جھکنا پڑتا تھا لیکن ان دھنسی ہوئی آنکھوں ہی کی وجہ سے سیتا مرد کے دل میں بہت دور تک دیکھ سکتی تھی۔ وہ کسی کو کچھ کہے یا نہ کہے یہ الگ بات تھی لیکن جانتی وہ سب تھی۔ ہاں سیتا کے بال بہت لمبے تھے، جن کے کارن درباری اس سے پوچھا کرتا:

''تمہارے گھر میں کوئی کسی بنگالن کو بھی بیاہ کر لایا تھا؟'' اور سیتا کہتی: ''میں خود جو ہوں بنگالن..... میرا نام سیتا موجمدار ہے۔'' درباری کہتا: ''سیتا مزے دار۔'' اور سیتا ہنسنے لگتی۔ وہ خوش تھی کہ اس کا قد صرف اتنا ہے جس سے وہ اپنے حسین، کالے، چمکیلے اور لچکیلے بالوں والے سر کو درباری کی چھاتی پر رکھ سکتی ہے اور اپنے وجود کی روح تک کو کسی کے حوالے کر کے اپنے سارے دکھ بھول سکتی ہے اور تھوڑے سے فرق سے وہ پتی اور پتا کو ایک کر سکتی ہے۔

دیوار کی اوٹ میں بیٹھا ہوا درباری سیتا سے پیار کر رہا تھا۔ سیتا نہ چاہتی تھی کہ اس کا پیار اپنی حد سے گزر جائے۔ کمر کے گرد ہاتھ پڑتے ہی سیتا چوکنی ہونے لگی۔ اس نے درباری کو باتوں

میں لگانا چاہا۔ بلاؤز میں سے اس نے ایک چھوٹی سی چاندی کی ڈبیا نکالی اور درباری کے منہ کے پاس کرتے ہوئے بولی: ''دیکھو، میں تمہارے لئے کیا لائی ہوں؟''

''کیا لائی ہے؟'' درباری نے پوچھا اور ان جانے میں سیتا کی کمر سے ہاتھ نکال کر ڈبیا کی طرف بڑھا دیا۔

سیتا نے ڈبیا کو پرے ہٹا لیا اور بولی: ''ایسے نہیں، میں خود دکھاؤں گی۔'' اور پھر اسے درباری کی ناک کے پاس کرتے ہوئے بولی: ''سونگھو۔''

شامتِ اعمال درباری نے ڈبیا کو سونگھ لیا اور اسے چھینکیں آنے لگیں۔

محبت کا سارا کھیل رک گیا۔ درباری چھینک پر چھینک مار رہا تھا اور جیب سے رومال نکال کر بار بار اپنی ناک کو پونچھ رہا تھا اور سیتا پاس بیٹھی، ہنستی جا رہی تھی۔

''یہ درباری نے کہا اور پھر چھینکتے ہوئے بولا: ''کیا مذاق ہے؟''

سیتا کہنے لگی: ''تم اسے مذاق کہتے ہو؟ بیس روپے تولہ کی نسوار ہے۔''

''نسوار؟''

''ہاں۔'' سیتا بولی۔

''تم چھینکتے ہو تو مجھے بڑے اچھے لگتے ہو۔''

درباری نے سیتا کی طرف یوں دیکھا جیسے کوئی کسی پاگل کی طرف دیکھتا ہے۔ سیتا نے پیار بھری نگاہ اس پر ڈالی اور کہنے لگی: ''یاد ہے، پہلی بار تم مجھے کہاں ملے تھے؟''

''یاد نہیں۔'' درباری نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''صرف اتنا ہی پتہ ہے، تم سے کہیں پہلی بار ملا تھا۔''

''وہاں۔'' سیتا نے سامنے، مہاتما گاندھی سوئمنگ پول کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

''تم نہا رہے تھے اور چھینک رہے تھے۔ میرے ساتھ تین چار لڑکیاں اور تھیں۔ اس دن دفتر میں آدھے دن کی چھٹی ہو گئی تھی اور ہم یونہی گھومتی گھماتی ادھر جا نکلیں.....''

''ادھر کیوں؟''

''یونہی۔'' سیتا نے کہا۔

''چھٹی ہوتے ہی نہ جانے ہم سب لڑکیوں کو کیا ہونے لگتا ہے؟ ہم گھر بیٹھ ہی نہیں

سکتیں۔ ایسے ہی باہر نکل جاتی ہیں جیسے کوئی ہونے والا ہے، پھر ہوتا ہوا تا کچھ نہیں، جبھی پتہ چلا ہے ـــ کوکا کولا پی رہی ہیں!''

سیتا ہنسی تو ساتھ درباری بھی ہنس دیا۔ وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی: ''ہم سب تمہاری طرف دیکھ دیکھ کر ہنس رہی تھیں کیونکہ تم چھینکتے ہوئے بورڈ سے فوارے تک اور فوارے سے کنارے تک آ جا رہے تھے اور ایسا کرنے میں سر سے پیر تک دہرے تہرے ہوئے جاتے تھے ـــ بچے کی طرح میرا جی چاہا، بھاگ کے تمہیں پکڑلوں اور پلو سے تمہارا منھ، تمہاری ناک پونچھوں اور پیچھے ایک چپت لگا کے کہوں: ''اب جاؤ، مزے اڑاؤ.....''

درباری جیسے ایک ہی بات سوچ رہا تھا: ''دوسری لڑکیاں کون تھیں؟''

''ایک تو کمد تھی۔'' سیتا بولی۔

''دوسری جولی! وہاں کھاڑی کے پار ماؤنٹ میری کے پاس رہتی ہے۔'' تیسری ـــ اور پھر ایکا ایکی رکتے ہوئے کہنے لگی: ''تم کیوں پوچھ رہے ہو؟''

ایسے ہی۔'' درباری نے جواب دیا۔

تمہاری سہیلیاں تمہاری جوتی کی بھی ریس نہیں کرتیں۔''

''تم نے دیکھی ہیں؟''

''دیکھی تو نہیں۔''

سیتا کا چہرہ جو تھوڑا کھل اٹھا تھا، ماند پڑ گیا۔ جبھی ایک چھینک نے درباری کے چہرے پہ پر تولے لیکن رک گئی۔ وہ سامنے دیکھتے ہوئے بولا: ''آج دن ڈوبتا ہی نہیں۔''

سمندر میں جوار شروع ہو چکا تھا۔ لہریں کناروں کی طرف بڑھ رہی تھیں اور اپنے ساتھ بھیل پوری کے بے شمار تیل، گنڈیری اور مونگ پھلی کے چھلکے، ناریل کے خودے لا رہی تھیں پھر بیچ میں کہیں کوئلے بھی دکھائی دیتے تھے جو دور، اندرم دخانی کشتیوں اور بڑے بڑے جہازوں نے اپنا غم ہلکا کرنے کے لیے سمندر میں پھینک دیئے تھے۔ تیل کا الزام بھی خشکی پہ ٹال دیا تھا اور ان کا خالی کیا ہوا ڈیزل برستے پر پہنچ کر اس کے ایک بڑے سے حصے کو چکنا اور سیاہ بنا رہا تھا..... سیتا نے مڑ کر دیکھا، درباری کچھ عجیب سی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ سپاہیوں کے پرے اس کے چکنے چہرے پر چھٹ رہے تھے ـــ دن ڈوب رہا تھا۔ اس نے اپنے لانبے لانبے بازو دنیا کے دونوں

کناروں سے سمیٹے اور انھیں بغل میں دبا کر، ایک گہرے، کیسری رنگ کی گٹھری سی بنا، دور پچھم کے گہرے پانیوں میں اترنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر میں اس کا تیج زمین کی گولائیوں میں گم ہو گیا، اب کناروں اور اس کے مکانوں اور مکینوں پر وہی روشنی تھی جو آسمان کے آوارہ بادلوں پر سے ہوتے ہوئے نیچے زمین پر پڑتی ہے اور جو ہولے ہولے، دھیرے دھیرے، بڑے پیار سے اندھیرے کو اپنی جگہ دیتی ہے، جیسے کہہ رہی ہو: ''لو اب تمہارا راج ہے۔ جاؤ، موج اڑاؤ.....''

وہی چھینک جس نے درباری کو سیتا سے کوسوں دور پھینک دیا تھا، ایک ہی وار میں اس کے قریب بھی لے آئی..... سیتا کانپنے لگی، درباری ہانپنے لگا۔

اندھیرے کا تسلط ہوتے ہی پول اور کلب اور سڑک پر کے قمقمے تو ایک طرف، پھیری والوں کے جھابوں اور ٹھیلوں پر ٹمٹمانے والے دیئے بھی لرزنے لگے۔

''جبھی جیسے دیوار میں سے آواز آئی: ''درباری کیا کرتے ہو؟''

''اس کا مطلب ہے۔'' درباری نے اپنا ہاتھ ہٹاتے ہوئے کہا۔

''تم مجھ سے پیار نہیں کرتیں؟''

''پیار کا مطلب — یہ تھوڑے ہوتا ہے۔''

''میں سب جانتا ہوں۔'' اور درباری اٹھ کھڑا ہو گیا اور اپنے کپڑے ٹھیک کر کے جانے لگا۔ سیتا نے اسے روکنے کی کوشش کی اور التجا آمیز لہجے میں بولی:

''کیا کر رہے ہو، چاند؟'' اور ریت پر پڑی ہوئی سیتا درباری کے پیروں سے لپٹ گئی، جو غصے سے ہانپ رہا تھا۔

درباری نے اپنے پیر ایک جھٹکے کے ساتھ چھڑا لیئے اور بولا:

''Bitch! بڑی پاکیزہ بنتی ہے، سمجھتی ہے —''

''میں کچھ نہیں سمجھتی۔''

سیتا نے وہیں گھٹنوں کے بل گھسٹ کر پھر سے درباری کو پکڑتے ہوئے کہا۔

''میں تمہارا ہوں، چندا! نس نس، پور پور تمہاری ہوں، پر میں ایک بدھوا ماں کی بیٹی ہوں مجھ سے شادی کر لو، پھر......''

''کوئی شادی وادی نہیں۔'' درباری بولا۔

''تم سے جو کہہ دیا، کیا وہ کافی نہیں کیا؟ منتر پھیرے ضروری ہیں؟ قانون کی پکڑ، اس کی اوٹ ضروری ہے؟'' اور درباری لال رک گیا، جیسے اب بھی اسے امید تھی......

''ہاں ضروری ہے۔'' سیتا روتے ہوئے بولی۔

''یہ دنیا میں نے، تم نے نہیں بنائی۔''

درباری کی آخری امید بھی ٹوٹ گئی۔ بولا: ''میں اس پیار کو نہیں مانتا، جس کے بیچ کوئی بھی پردہ، کوئی بھی شرط ہو۔ روحوں کا ملنا ضروری تو جسموں کا ملنا بھی۔ اس میں سویم بھگوان ہوتے ہیں۔ ایسا شاستروں میں لکھا ہے۔''

''لکھا ہوگا۔'' سیتا بولی۔ ''سب تمہاری طرح اس بات کو مانتے ہوتے......''

''میں کسی کی پروا نہیں کرتا۔'' درباری نے غصے سے پیر زمین پر مارتے ہوئے کہا، جو ریت میں دھنس گئے اور پھر وہ انھیں کھینچتے، ریت سے نکالتے ہوئے چل دیا۔

سیتا پیچھے لپکی: ''سنو!'' ابھی درباری نے دیوار کی حد نہیں پھاندی تھی۔ اب بھی وہ اس کے سہارے بیٹھ سکتے تھے اور اندھیرے کو گلے لگا سکتے تھے۔

ایک دو لڑکے فضا میں تعجب سے دیکھ کر رک گئے، پھر چنے والا آیا، جس کی پھیری میں آگ سمندر کی طرف سے آنے والی تیز ہوا میں ہر لحظہ بڑھتی جا رہی تھی——

اب کے سیتا نے نہ صرف درباری کے پیر پکڑے بلکہ اپنا سر اور بنگالی زلفیں ان پر رکھ دیں اور نم آنکھیں بھی، ہونٹ بھی، درباری پیروں تک جل رہا تھا اور اندر کی آگ سے لرز رہا تھا۔ پیر چومتی، ان پر آنسو گراتے ہوئے سیتا نے تھوڑا اٹھ کر درباری کی طرف دیکھا اور کہنے لگی:

''تم سمجھتے ہو، میں کسی برف یا کسی پتھر کی بنی ہوں؟ میرا تم میں گھل مل جانے کو جی نہیں چاہتا، تم مجھ سے لگتے ہو تو میرا انگ انگ ٹوٹنے، دکھنے نہیں لگتا؟ پر تم کیا جانو، ایک لڑکی کے دکھ....''

اور پھر کسی انجانے ڈر سے کانپتی ہوئی بولی: ''میں یہ نہیں کہتی یہ دکھ تم نے دیئے ہیں یا بھگوان نے دیئے ہیں۔ بھگوان ہی نے عورت کے ساتھ بے انصافی کی ہے......''

''میں سب جانتا ہوں۔'' درباری نے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا:

''مرد سب سہہ سکتا ہے، توہین نہیں سہہ سکتا۔''

''کس کی توہین؟''

درباری نے جواب دینے کے بجائے سیتا کے ٹھوکر ماری اور وہ پیچھے کی طرف جا گری۔ خود وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا روشنیوں کی طرف نکل گیا—

سیتا ایک ایسے ڈر سے کانپے جا رہی تھی جو اپنی اس مختصر سی زندگی میں اس نے کبھی دیکھا تھا۔ جس کا تجربہ اس نے اپنے پتا کی موت پر بھی نہ کیا تھا۔ ماں کی چھاتی میں منھ چھپا کر وہ سب بھول گئی تھے جیسے جلتے ہوئے پھوڑے کے گرد، ہلکی ہلکی انگلیاں پھیرنے سے ایک طرح کا حظ، ایک قسم کا آرام آتا ہے۔ ایسے ہی ماں کے سر پر ہاتھ پھیرنے سے اس کے سارے دکھ دور ہو گئے تھے...... وہیں ریت پر پڑی سیتا دبی دبی سسکیاں لیتی رہی، بیچ میں کبھی کبھی وہ سر اٹھا کر دیکھ لیتی۔ کوئی دیکھ تو نہیں رہا۔ مدد کے لئے تو نہیں آ رہا جیسے مصیبت میں پڑی ہوئی عورت کے لئے کوئی نہ کوئی بانکا ضرور چلا آتا ہے...... یہ سامنے دیئے کی لو میں کوئی چیز چمکی۔ سیتا نے اٹھائی تو وہ چاندی کی ڈبیا تھی جو نیچے جا گری تھی اور اب—اس میں ریت چلی آئی تھی......

یہ حقیقت تھی کہ درباری سیتا سے پیار کرتا تھا، لیکن اتنا نہیں جتنا سیتا کرتی تھی سیتا تو جیسے اس دنیا میں اپنے نام کو بجا ثابت کرنے کے لئے آئی تھی اور اب اشوک باٹیکا میں پڑی دیکھ رہی تھی کوئی اوپر سے سندیسے میں انگوٹھی پھینکے لیکن رام جی کے زمانے سے آج تک بیچ میں کیا کچھ ہو گیا تھا، اب تو انگریزی 'فن' چلا آیا تھا جس سے درباری پورا لطف اٹھانا چاہتا تھا۔

گھر میں جالی لگ گئی تھی۔ تین دن خوب ہی پریشان کرنے کے بعد سکھ ترکھان چھٹی کر گیا تھا، صاف ستھرے برآمدے میں بیٹھے ہوئے، درباری خالی خولی نگاہوں سے سڑک کے اس موڑ کو دیکھ رہا تھا جہاں کبھی کاسنی اور کبھی دھانی اور کبھی جوگیا رنگ لہرایا کرتے تھے۔ پاس درباری کا بھانجا محمود یا بنواری سرکنڈے اور ٹین سے بنے ہوئے ایک بدوضع کھلونے سے کھیل رہا تھا جس سے اس کے ہاتھ کے کٹ جانے کا ڈر تھا۔ شاید اسی لئے اندر سے ستونتی یا کنیز بھاگی ہوئی آئی اور آتے ہی بچے سے اس کا کھلونا چھین لیا، بچہ رونے مچلنے لگا۔

''ہے ہے......'' درباری نے احتجاج کیا۔ ''کیا کر رہی ہو آپا؟''

''تم چپ رہو جی۔'' وہ بولی۔

''تم سے ہزار بار کہا ہے، مجھے آپا مت کہا کرو۔ دیدی کہتے کیا سانپ سونگھتا ہے؟''

''اچھا جی۔'' درباری بولا۔ اور اصل بات کی بات ہی نہیں۔ دیکھو تو کیسے رو رہا ہے......

ایسے تو لارڈ کچز بھی پورا بیڑہ ڈوب جانے پر نہیں رویا ہوگا..... دو اسے کھلونا۔"
"کیسے دوں؟ کہیں آنکھ پھوڑ لے—"
"سب بچے الٹے سیدھے کھلونوں سے کھیلنے آئے ہیں۔ کتنوں کی آنکھ پھوٹی ہے؟"
"جتنا یہ شیطان ہے، کوئی اور بھی ہے؟"
"سب ماؤں کو اپنا بچہ اتنا ہی شیطان معلوم ہوتا ہے۔"

اور محمود یا بنواری بڑی بیزاری سے رو رہا تھا۔ گھر بھر کو اس نے سر پر اٹھا لیا تھا۔ درباری نے طاق پر سے جاپانی بلی اٹھا کر دی جو چابی دیتے ہی بھاگنا اور قلابازیاں لگانا شروع کر دیتی تھی جسے دیکھ دیکھ کر بچے تو کیا بڑے بھی محفوظ ہونے لگتے تھے۔ لیکن بچوں کو تو وہی کھلونا چاہئے جو کسی نے چھینا ہے..... درباری نے بڑے بڑے منہ بنائے، کیسے کیسے خوخو، خاخا کیا، منہ میں انگلی ڈال کر ہنومان بنا، پھر جانی واکر، آغا..... لیکن وہ رو رہا تھا، اسے اپنا وہی کھلونا چاہئے تھا۔ درباری کا جی چاہا اسے تھپڑ مار دے۔ اگر بچے کے اور رونے کا ڈر نہ ہوتا تو وہ ضرور مار دیتا۔ درباری نے ایکا ایکی جھلا کر کہا: "اب بند بھی کر سالے......"

اندر سے آواز آئی: "رونے دے یار۔"
بچہ رو رہا تھا۔ آخر دیدی بھاگی آئی، الٹے پیروں: "ہے رام!"
"ہائے اللہ! کیوں نہیں کہتیں؟"
"بھگوان کے لئے تم چپ رہو۔"
"خدا کے لئے کہو تو......"

پھر ستونتی یا کنیز جیسے کھلونا چھین کر لے گئی تھی، ویسے ہی لوٹا بھی گئی: "لے میرے باپ۔" اس کھلونے کو بچے کے ہاتھ میں ٹھونستے ہوئے کہا اور پھر جیسے اس کی حالت زار دیکھ بھی نہ سکتی ہو، اسے اٹھایا، چھاتی سے لگایا، ہلورے دیئے، قمیص سے اس کا منہ پونچھا، ناک صاف کی۔ چوما چاٹا... اور اس کے کہے کے مطابق بڑی ٹھنڈ پڑی، پھر بہت گالیاں اپنے آپ کو دیں: "ہائے، مر جائے ایسی ماں..... نہ رہے اس دنیا میں، لال کو کتنا رلایا ہے۔"

اور پھر اپنے پتی یا شوہر کی طرف دیکھتے ہی برس پڑی:
"دیکھو تو کیا مزے سے بیٹھے ہیں۔"

وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ ....خاصے بے مزہ دکھائی دے رہے تھے۔
درباری بولا: ''اب چاہے ہاتھ نہیں، گردن بھی کاٹ لے۔''
''کاٹ لے۔'' دیدی بولی۔
''مروں گی میں......تم لوگوں کو اتنا سا بھی وہ نہ ہوگا۔''
''ہوگا یا نہیں؟'' درباری بولا۔
''کہتے ہیں نادان بھی وہی کرتا ہے جو دانا کرتا ہے لیکن ہزار جھک مارنے کے بعد.......
پہلے ہی چھیننے کی بےوقوفی نہ کی ہوتی۔''
''ہاں، میں بیوقوف ہوں۔'' دیدی کہتی ہوئی بچے کو اندر لے گئی۔
''ماں ہونا اور عقل بھی رکھنا الگ باتیں ہیں۔''
اور دیدی کے کاندھے پر سر رکھے بدمعاش محمود یا بنواری ہنستا ہوا دکھائی دیا، جیسے اپنی طاقت اور قدرت کو اچھی طرح سے جانتا ہو۔
جبھی سامنے اروا سینما کی طرف سے آنے والے موڑ پر نارنجی سا رنگ، دو تین بار لہرایا۔
درباری نے جلدی سے کپڑے ٹھیک کیے۔ سر پر ٹوپی رکھی اور باہر نکل گیا۔
موڑ پر سیتا کھڑی تھی۔ اس نے ایک بار درباری کی طرف تاکا اور پھر پرے دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھیں کچھ اور بھی دھنس گئی تھیں، پلکیں کچھ اور بھی نم ہو گئی تھیں۔
''کہئے حضور! کیا حکم ہے؟'' درباری نے پوچھا۔
سیتا نے کوئی جواب نہ دیا۔ درباری کو یوں لگا جیسے سیتا کچھ کانپ سی رہی ہو، درباری کچھ دیر اس کی طرف دیکھتا رہا اور بولا: ''اگر چپ ہی رہنا ہے، تو پھر......'' اور وہ لوٹنے لگا۔
''سنو سیتا ایکا ایکی مڑتی ہوئی بولی: ''مجھے چھما کر دو۔ اس دن مجھ سے بڑی بھول ہو گئی۔''
درباری نے رک کر اس کی طرف دیکھا: ''اب تو نہیں ہوگی؟''
سیتا نے نفی میں سر ہلا دیا۔
''جہاں کہوں گا، میرے ساتھ چلو گی؟''
سیتا نے اثبات میں سر ہلا دیا اور منہ پرے کرتے ہوئے ساری کے پلو سے اپنی آنکھیں پونچھ لیں۔ درباری کے بدن میں خون کا دورہ جیسے ایکا ایکی تیز ہونے لگا۔ اس نے اپنے کھردرے سے ہاتھ پھیلائے اور سیتا کا نرم سا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولا: ''تو تو ایسے ڈر رہی ہے سیتے!.......تجھے

دیکھ کر مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں بڑا نیچ ہوں۔''

سیتا جیسے یہی سننا چاہتی تھی بولی: ''نہیں......ایسا کیوں؟''

درباری اور سیتا وہیں پہنچ گئے۔ شیواجی پارک میں، دیوار کے نیچے..... دن ڈوب چکا تھا۔ آج آسمان پر کوئی بادل بھی نہ تھا، جو زمین کی گولائیوں سے آسمان پر منعکس ہونے والی روشنی کو ادھر زمین پر پھینک دے اس لئے اندھیرے نے جلدی ہی دنیا کو لپیٹ لیا، سامنے مہاتما گاندھی سوئمنگ پول کے اردگرد بنے ہوئے جنگلے، خاکے بنے اور پھر معدوم ہو گئے۔

درباری کے بڑھتے ہوئے پیار کے سامنے، سیتا منفعل سی بیٹھی رہی، درباری ایک دم جھلا اٹھا اور بولا: ''کچھ ہنسو بولو بھی نا—'' سیتا کو ہنسنا پڑا۔

درباری نے سیتا کی کھوکھلی ہنسی کی نقل اتاری اور سیتا سچ مچ ہی ہنس دی.....درباری حوصلہ پا کر بولا: ''تمہیں کیا سچ مچ مجھ پر وشواس نہیں؟''

''یہ بات نہیں۔'' سیتا بولی۔

''تم مجھ سے شادی کر بھی لوگے، تو بھی مجھے نفرت کی نگاہ سے دیکھو گے۔ سمجھو گے میں ایسی ہی تھی.....''

''نہیں سیتے، میں نہیں سمجھوں گا.....کبھی نہیں سمجھوں گا۔''

جبھی کچھ لوگ ہاتھ میں لوہے کی سلاخیں لئے چلے آئے۔ درباری چونکا، اس کی تسلی ہوئی جب انھوں نے سلاخیں، بریتے میں مارنی شروع کردیں۔ وہ بیوڑے کے اس دفینے کو دیکھ رہے تھے جو دو ایک دن پہلے انھوں نے بریتے میں دبایا ہوگا اور اب سمندر میں جوار آنے سے پہلے اسے برآمد کرنا، استعمال میں لانا چاہتے تھے۔ درباری اور سیتا اٹھ کر ذرا پرے دیوار کے دوسرے کنارے پر جا بیٹھے، مڑ کر دیکھا تو دیوار کے اوپر بمبئی کے برتن مانجھنے والے راما لوگ بیٹھے تھے اور آپس میں ٹھٹھا کر رہے تھے۔ درباری نے دیکھتے ہوئے بھی نہ دیکھنا چاہا۔ سیتا گھبرا رہی تھی، لجا رہی تھی، پسینہ پسینہ ہو رہی تھی۔ وہ مکمل طور پر درباری کے ہاتھوں میں تھی۔ آج اس کا اپنا ارادہ نہ تھا۔ وہ تو کسی روٹھے کو منانا چاہتی تھی اور اس کے لئے کوئی بھی قیمت دینے کو تیار تھی۔

جبھی کچھ من چلے ''اے مرے دل کہیں.....'' گاتے ہوئے پاس سے گزرے، پھر ایک پولیس مین آیا اور درباری جھلا کر اٹھ گیا۔ اس نے خونی آنکھوں سے اردگرد کے منظر کو دیکھا اور انگریزی میں ایک موٹی سی گالی دی اور بولا: ''چلو سیتے! جوہو چلیں گے۔''

''جوہو؟.....''

''ہاں! اٹھ کیڈل روڈ سے ٹیکسی لیتے ہیں۔''

سیتا چپ چاپ اٹھ کر درباری کے ساتھ چل دی۔

سیتا اور درباری جوہو کے بیچ میں ادھر ادھر پھر نہ سکتے تھے کیونکہ اس میں خطرہ تھا۔ روز کوئی نہ کوئی واردات ہوتی رہتی تھی۔ ابھی چند ہی دن ہوئے ایک قتل ہوا تھا۔ چند غنڈوں نے ایک میاں بیوی کو بحرِ زندگی کے دو کناروں پر جا کھڑا کیا تھا۔

لیکن اس دن جوہو کے سب ہوٹل، سب کاٹیج گاہکوں سے بھرے پڑے تھے۔ کوئی گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے بعد درباری اور سیتا فورٹ کی طرف جا رہے تھے۔ راستے میں سیتا کوئی بات کرتی تھی، درباری کوئی اور ہی جواب دیتا تھا۔ دیتا بھی تھا تو اکھڑا اکھڑا بے تعلق، زبان میں ایک عجیب طرح کی لکنت تھی جیسے کوئی نشے والی چیز منہ میں رکھ لی ہو، جس سے زبان پھول گئی ہو۔

ٹیکسی حاجی علی سے ہوتے ہوئے تارڈیو میں داخل ہوئی، وہاں سے اوپیرا ہاؤس ہوتے ہوئے ہارن بائی رود پر جا پہنچی جس کا نام اب مہاتما گاندھی روڈ ہو گیا ہے۔ ایک ہوٹل پر پہنچتے ہوئے درباری نے منیجر سے پوچھا: ''کوئی کمرہ ہے؟''

منیجر نے غور سے درباری کی طرف دیکھا جس کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی واردات کر کے آیا ہے یا کرنے جا رہا ہے۔ پیچھے سیتا کھڑی ہوئی زمین کی طرف دیکھتے ہوئے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ دونوں گناہ کے عادی نہ تھے۔ خام، بے رحم فطرت کے ہاتھوں گرفتار وہ دیوانے سے ہو رہے تھے، جبھی منیجر نے پوچھا: ''آپ کہاں سے آئے ہیں؟''

''جی؟'' درباری نے ایکا ایکی سوچتے ہوئے کہا۔ ''اورنگ آباد سے۔''

''خوب!'' منیجر نے پیچھے سیتا کی طرف اور پھر درباری کے سیاہ چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: ''آپ کا سامان کہاں ہے؟''

''جی سامان تو نہیں ہے۔''

''معاف کیجئے۔'' منیجر نے درباری کی طرف یوں دیکھتے ہوئے کہا، جیسے وہ کوئی نجس اور لجلجی شئے ہو اور بولا: ''اپنے پاس کوئی روم نہیں۔''

''کیا مطلب؟ ابھی تو ٹیلی فون پر ــــ؟''

بیرہ نمبر ۲۷ جو ایک ٹرے پر ویفر، مونگ کی دال، سوڈے کی بوتلیں اور چابی لے کر جا رہا تھا،

بول پڑا: "یہ ہوٹل عزت والے لوگوں کے لئے ہے صاحب!"

دربار ی کچھ نہ کہہ سکا۔ حالانکہ وہ جانتا تھا، وثوق سے جانتا تھا، اس بیرے کا ٹپ ایک روپے سے زیادہ نہ تھا اور قبلہ منیجر صاحب کی عزت پانچ روپے سے.........اور آج یہ سب کے سب ایک دم نیکی اور عزت اور شرافت کے پتلے بن بیٹھے تھے وہ عزت اور شرافت کے پتلے تھے یا نہیں۔ لیکن ایک بات طے تھی کہ زندگی میں کچھ بھی کرگزرنے کے لئے مشاق ہونے کی ضرورت ہے۔ نگاہوں میں ایک پیشہ ورانہ جرأت اور بے باکی اور بے حیائی لانی پڑتی ہے جس کے سامنے مدمقابل کا اخلاق، اس کی شرافت اور پارسائی جھوٹی پڑ جاتی ہے.....درباری اپنے اندر کہیں کمزور، کہیں بزدل تھا—وہ ایک ناتراشیدہ ہیرا تھا—

لوٹتے ہوئے وہ گالیاں بک رہا تھا، انگریزی میں، جنھیں وہ ہوٹل کے منتظمین کو سنانا بھی چاہتا تھا اور ان سے چھپانا بھی۔

"چلو سیتا!" درباری نے کہا۔ "پھر کبھی سہی۔"

اور دونوں ٹیکسی پر بیٹھ کر گھر کی طرف چل دیے.....

زندگی بے کیف ہوگئی تھی۔ اتنی ہزیمت کا احساس درباری کو کبھی نہ ہوا تھا۔ اس کی نگاہوں میں کئی لوگ ہیرو ہوگئے اور بہت سے ہیرو پیروں میں آگرے۔

آج اس کا کہیں جانے کا ارادہ نہیں تھا، کوئی پروگرام نہیں تھا۔ حالانکہ یہ ایک مبہم سے احساس کے ساتھ وہ دفتر سے جلدی چلا آیا تھا۔ تھکا تھکا، ٹوٹا ٹوٹا، مضمحل سا۔ اس شام کی شکست اور بے حرمتی کے بعد ایک تسکین کا احساس تھا جو تسکین بھی نہیں تھی۔ یہ آگ.....یا تو پیدا ہی نہ ہوتی۔ اسی لئے بڑے خیال کو بہت اہمیت دیتے ہیں یا تو یہ حضرت پیدا ہی نہ ہوں اور اگر ہوں تو آپ انسان کی اولاد کی طرح انھیں جھٹک نہیں سکتے، ان کا گلا نہیں گھونٹ سکتے کیونکہ ہر دو صورتوں میں سزا موت ہے۔ یہ دماغ کے کسی کونے میں چپکے دبکے پڑے رہیں گے اور اس وقت آلیں گے، جب آپ مکمل طور پر نہتے ہوں گے، بالکل بے دست و پا— غسل دی جانے والی میت کی طرح—

درباری اس وقت برآمدے میں بیٹھا ہوا ڈان باسکو کی دیوار کے ساتھ آگے ہوئے پیڑوں کو دیکھ رہا تھا جن کی چھاؤں میں محلے کی امراء کی موٹریں سستا رہی تھیں، کچھ تو یہ ان امیر مزدوروں کی تھیں جو گھر سے دفتر اور دفتر سے سیدھے گھر چلے آتے تھے اور بیوی کے ساتھ جھگڑے ہی سے ان کی پوری تسلی ہو جاتی تھی اور کچھ ایسے لوگوں کی، جنھوں نے انھیں چلتے پھرتے قحبہ خانے بنا رکھا

تھا۔ان کے ڈرائیوروں کو سر شام گاڑی چمکانے اور منہ سی رکھنے کی تنخواہ چپکے سے دے دی جاتی تھی۔
یہ بیرہ نمبر ۲۸ تھے۔

درباری نے کھینچ کھانچ کراس دن ہوٹل میں پیدا ہونے والی مایوسی کا کار میں افزائش پانے والی امید سے تعلق پیدا کرلیا لیکن کیا فائدہ؟ امید کو چمکانے دمکانے سے کار تھوڑے ملا کرتی ہے؟ باپ گردھاری لال مہتا تو پیسے کو ہوا بھی نہیں لگواتے تھے۔اگلے جنم میں بھی سانپ بن کر دفینے پر بیٹھ جانے کا ارادہ تھا۔

صالح بھائی یا سرداری لال مع اپنے بیوی بچوں کے اپنے گھر چلے گئے تھے۔ پیچھے ٹھنٹ سے بازوؤں والی بے بچہ بھابی رہ گئی تھی جس کی بھیا سے بچہ نہ ہونے پر تکرار ہی رہتی تھی۔ وہ کہتی تھی تم میں نقص ہے اور وہ کہتے تم میں۔ وہ کہتی: ''تم ڈاکٹر کو دکھاؤ، وہ کہتے تم اپنا معائنہ کراؤ۔'' اور ناپید بچے مایوسی سے انھیں دیکھتے رہتے اور اپنا سر پیٹ لیتے—

درباری مکمل طور پر بور ہو چکا تھا۔ وہ جانتا تھا اور تھوڑی دیر گھر میں رہے تو ماں شادی کی باتیں کرنے چلی آئے گی اور وہ شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ہاں، کچھ دن تو زندگی دیکھ لے، آخر تو ایک نہ ایک دن ہر کسی کی شادی ہوتی ہی ہے—

کس کے ساتھ شادی؟ سیتا لپک کر اس کے دماغ میں آتی تھی۔ سیتا ویسے ٹھیک تھی لیکن شادی کے سلسلے میں نہیں، وہ بہت ایثار والی لڑکی تھی۔ شکل وصورت سے بھی بری نہ تھی لیکن بیوی— بیوی کوئی اور ہی چیز ہوتی ہے۔ اسے کچھ تو چلبلا ہونا چاہئے۔ ادھر ادھر جھانکنا چاہئے تا کہ مرد کان پکڑ کر کہے: ''ادھر'' اور پھر بدھوا کی بیٹی مرد سے یوں چمٹی ہے، جیسے وہ اس کا شوہر نہیں، باپ ہے۔

میں کہاں کرائے اگاہتا پھروں گا؟

ہاں تھوڑی دیر کے پیار کے لئے سیتا سے اچھی کوئی نہیں۔۔ کیا جسم پایا ہے!

جبھی مصری دکھائی دی اور ببل دکھائی دیا......

مصری دور ہی سے ''بابوجی'' کی طرف انگلی کرتی ہوئی آرہی تھی اور ببل وہیں سے غوں غوں غاں غاں کرتا ہوا ہمک رہا تھا، پھر یکا یک ببل میں زندگی کی اچھل جیسے گیند زمین پر سے اچھلتا ہے۔اور مصری کو سنبھالنا مشکل ہو گیا۔

آج ببل خدا کے نہیں، انسان کے لباس میں تھا۔ایک میلی سی بنیان پہن رکھی تھی۔ ہاں نیچے اللہ ہی اللہ تھا۔

پاس آتے ہی ببل نے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے: ''کمینہ! جیسے اس کے لئے کرمرا لئے ہی تو کھڑا ہوں۔'' جیسے اندر جانا اور باہر آ کر اس کے حضور میں باج گذاری اس کے صبر کی آخری حد ہے۔

درباری کرمرا لے کر باہر آیا تو آج پہلی بار اسے خیال آیا — مصری ایک عورت ہے اور ببل اس کا بچہ اور یہ سب کتنا مقدس ہے۔ غریب لوگوں میں باپ ہوتا تو ہے، مگر محض تکلف کی چیز۔

جبھی درباری کا دماغ تیزی سے چلنے لگا۔ وہ ایک دائرے میں گھومتا تھا اور گھوم پھر کر وہیں آ جاتا تھا۔ پھر کوئی کشف کی سی کیفیت ہونے لگی۔ آنکھیں پھیلنے اور سمٹنے لگیں۔ درباری لال نے آج وہیں سے کرمرا ببل کو دے دیا تھا۔ جانے کیا بات تھی جو آج درباری ببل کو گود میں نہیں لے رہا تھا جیسے وہ شرما رہا تھا لیکن وہ ربڑ کی گیند — ببل — جیسے دیوار کے ساتھ لگ کر پھر لوٹ آتا۔ یہ نہیں کہ آج اسے کرمرا نہیں چاہئے تھا۔ اسے کرمرا بھی چاہئے تھا اور آسمان کی بادشاہت بھی۔ ببل حیران ہو رہا تھا — آج یہ بابو مجھے لیتا کیوں نہیں؟

''آج تم نے کتنے پیسے بنائے ہیں مصری؟'' درباری نے کچھ جھینپتے ہوئے پوچھا۔

''یہی کوئی چودہ آنے۔''

''کیوں؟ صرف چودہ آنے کیوں؟''

''آج میرا مرد ناگ پاڑے چلا گیا تھا۔'' مصری نے بے باکی سے کہا۔

''تیرا مرد؟'' درباری نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔ ''تم نے کوئی مرد کر لیا ہے؟''

مصری ہنسی اور ببل کو دونوں بازوؤں میں تھام کر اونچا، درباری لال کے برابر کرتے ہوئے بولی: ''یہ ہے میرا مرد، میرا کماؤ مرد.... اسے آج اس کی موسی پارلے کی چونا بھٹی لے گئی تھی۔ یہ بنیان دی جو یہ بل کٹ پہنتا ہی نہیں۔ یوں کندھے جھٹکتا ہے، جیسے پوری دھرتی کا بوجھ لاد دیا۔''

درباری سمجھا اور ہنسنے لگا۔ ابھی تک وہ ببل کو اپنے ہاتھوں میں نہیں لے رہا تھا اور ببل کرمرا وغیرہ سب بھول کر شور مچا رہا تھا۔

مصری بولی: ''ننگا رہنے کی عادت پڑ گئی تو بڑا ہو کر کیا کرے گا؟''

''یہ ایسے ہی اچھا لگتا ہے، مصری۔''

ببل جیسے ہمک ہمک کر کہہ رہا تھا: ''جھوٹ... اچھا لگتا ہوں تو پھر مجھے لیتے کیوں نہیں؟''

اور اب تو وہ بہت ہی شور مچانے لگا تھا: ''ہو، ہو، ہو،.....''

''ببل ہوتا ہے تو تم کتنا کما لیتی ہو؟'' درباری نے پوچھا۔

''یہ؟'' مصری ببل کو نیچے کرتے ہوئے بولی۔ اس کے بازو تھک گئے تھے۔ یہ ہوتا ہے تو مجھے تین بھی مل جاتے ہیں، چار بھی——

درباری نے اپنی جیب سے دس روپے کا نوٹ نکالا اور مصری کی طرف بڑھایا——

''یہ کیا بابو جی؟'' وہ بولی اور اس کا چہرہ لال ہونے لگا۔

''تم لونا'' درباری بولا اور پھر ادھر ادھر دیکھ کر کہنے لگا:

''جلدی سے لے لو نہیں کوئی دیکھ لے گا۔''

مصری نے ادھر ادھر دیکھا۔ اب تک اس کا چہرہ قرمزی ہو چکا تھا۔ اس نے جلدی سے دس کا نوٹ لیا اور ادھر ادھر دیکھ کر اپنے سینے میں اڑس لیا اور اس فقرے کا انتظار کرنے لگی جواب وہ سال میں مشکل سے تین چار بار سنتی تھی لیکن مصری کا رنگ سیاہ ہو گیا، جب اس نے درباری کی بات سنی: ''تم جانتی ہو مصری۔'' درباری بولا۔

''میں اس سے کتنا پیار کرتا ہوں، ببل سے! اگر تم اسے ایک دن کے لئے مجھے دے دو۔''

مصری کچھ نہ سمجھی.....

درباری نے کہا: ''میں اسے کلیجے سے لگا کے رکھوں گا، مصری—— ایک ماں کی طرح۔ یہ مجھے اتنا اچھا لگتا ہے، اتنا اچھا لگتا ہے کہ—— بہت ہی اچھا لگتا ہے۔'' اور درباری نے ہاتھ بڑھا کر ببل کو لے لیا۔

ببل ایکدم خوشی سے اچھل گیا۔ درباری کی گود میں آتے ہی اب وہ کرمروں کے لئے گردن کو یوں ادھر ادھر گھمانے لگا جیسے مور چلتے وقت اپنی گردن کو ہلاتا گھماتا ہے، پھر اس کے گول گول، گدرائے ہوئے بازو کسی سائیکل کی طرح چلنے لگے، درباری نے کرمرے کے کچھ دانے ببل کے منہ میں ڈالے جنہیں لیتے ہی وہ عام طور پر ماں کی طرف لپکا کرتا تھا لیکن آج وہ درباری ہی کے بازوؤں میں شیطانی حرکتیں کرتا رہا۔ کبھی کہتا چھوڑ دو، نیچے اتار دو، کبھی پکڑ لو، چھاتی سے لگا لو—— بیچ میں اس نے ماں کی طرف دیکھا، ہنسا بھی لیکن منہ درباری کی طرف کر لیا، ماں کو چڑانے لگا، جیسے درباری کو چڑایا کرتا تھا۔ مصری ابھی تک بھونچکی کھڑی تھی اور غیر یقینی انداز سے باپ بیٹے کی سی دونوں ہستیوں کو دیکھ رہی تھی۔

''کہیں آپ کے کپڑے خراب کر دیئے تو؟''

''تو کیا ہوا؟'' درباری نے کہا۔''بچوں کی ہر چیز امرت ہوتی ہے۔''

مصری کی آنکھیں نم ہوگئیں۔ پہلے اس نے سوچا تھا۔ زندگی میں بہت ہی نایاب چیز تھوڑی دیر کیلئے اسے مرد مل گیا۔ اب اس نے سوچا، میرے بچے کا باپ مل گیا اور پہلی چیز سے دوسری بہت بڑی تھی۔

''میں اسے کھلاؤں گا، پلاؤں گا، مصری!'' درباری نے وعدہ کیا۔

''تم رات دس بجے کے قریب اسے لے جانا۔''

''اچھا—'' مصری نے سر ہلا دیا۔

مصری چلی، پھر رک گی، مڑ کر بچے کی طرف دیکھا جو درباری کے بازوؤں میں کھیل رہا تھا اور اپنے اردگرد درباری کی بند مٹھی کھولنے کی کوشش کر رہا تھا اور اس کے نہ کھلنے پر جھلا رہا تھا۔ مصری نے آواز بھی دی۔ ببل نے دیکھا بھی مگر اسے آج کسی بات کی پروا نہ تھی۔ باپ کی پروا نہ تھی تو ماں کی بھی۔

مصری پھر چلی لیکن جیسے اس کا دل وہیں رہ گیا۔ رک کر پھر دیکھنے لگی اور اسے اس بات کی تسلی ہوگئی کہ ببل رہ لے گا تو وہ جلدی جلدی چلی گئی۔ کچھ دور جا کر اس نے نیفے میں سے دس کا نوٹ نکالا اور اس کی طرف یوں دیکھا جیسے کوئی اپنے شوہر کی طرف دیکھتی ہے۔

درباری ببل کو لئے اندر آیا۔ ببل کو کمرے کی بہت سی چیزوں میں دلچسپی پیدا ہوگئی۔ ہر چیز اس کے لئے نئی تھی۔ ہر شئے کو وہ منہ میں ڈال کر ایک نیا تجربہ کرنا چاہتا تھا۔ ایسا تجربہ جس کی کوئی حد نہیں۔ ایسا سواد جس کی کوئی سیما نہیں۔ جبھی ماں اندر چلی آئی اور درباری کے ہاتھ میں بچے کو دیکھ کر حیران ہو اٹھی۔ ناک پر انگلی رکھتی ہوئی بولی: ''ہائے رام! یہ کیا ہے؟''

''ببل ماں!— مصری کا بیٹا'' درباری بولا— ''مجھے بڑا پیارا لگتا ہے۔''

''اس کی ماں کہاں ہے؟''

''گئی.... میں نے تھوڑی دیر کو لے لیا ہے ادھار.... ایک بار پیدا کر دیا پھر ماں کا کیا کام؟'' درباری نے ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

''جا رے جا!'' ماں بولی۔''چھ آٹھ مہینے تک ہی ماں کی جرورت ہوتی ہے، پھر جیسے اپنے آپ تیرے ایسے لوٹھے بن جاتے ہیں۔''

''اچھا ماں۔'' درباری نے کہا۔''میں اسے پودار کالج کے سامنے والے میدان میں لے

جاؤں گا، جہاں پاس ہی مجھے جگمو ہن کی کتابیں بھی لوٹانی ہیں، تو ذرا اسے پکڑ۔"

ماں نے جھرجھری لی: "ہا — گندا۔" اور ہاتھ ہلاتے ہوئے بولی:

"میں تو اسے ہاتھ نہیں لگاتی۔"

بھابھی جو کچھ دیر کے لئے آ کھڑی ہوئی تھی، بولی:

"اتنا ہی شوق ہے تو اپنا ہی کیوں نہیں لے آتے؟ شادی کر لیتے؟"

"نہیں!" درباری نے بھابی پر چوٹ کرتے ہوئے کہا —

"مجھے دوسروں ہی کے اچھے لگتے ہیں۔"

بھابی نے ٹھنڈی سانس لی: "اب بھگوان نہ دے تو کوئی کیا کرے؟"

درباری نے ببل کو نیچے فرش پر بٹھا دیا، جہاں اس کی توجہ جرمن سلور کے ایک چمچے نے اپنی طرف کھینچ لی تھی۔ درباری خود اندر چلا گیا اور ببل چمچے کو منہ ڈالتا اور چوستا رہا۔ شاید وہ کچھ اور بھی دانت رہا تھا۔

ایکا ایکی ببل کو اپنا آپ اکیلا محسوس ہوا۔ اس نے اپنے ہاتھ پہلے ماں پھر بھابی کی طرف پھیلا دیئے۔ ماں تو چھی چھی کرتے ہوئے اندر چلی گئی۔ بھابی ایک لمحے کے لئے ٹھٹکی، پھر جیسے اندر کے کسی ابال نے اسے مجبور کر دیا اور لپک کر اس نے ببل کو اٹھا لیا اور سینے سے لگا کر ہلنے لگی، جیسے کسی اپار سکھ اور شانتی کے جھولے میں پڑی ہے۔ ببل اسے گندہ نہیں لگ رہا تھا۔ من ہی من میں اس نے ببل کو نہلا دھلا کر ایک بھکارن کے بیٹے سے کسی رانی کا بیٹا بنا لیا تھا اور اندر ہی اندر اس نے سینکڑوں ریشمی سوتی فراک بنا ڈالے تھے اور سوچ رہی تھی اتنا خوبصورت ہے، میں اسے لڑکیوں والے کپڑے بنواؤں گی۔

اندر پہنچ کر درباری نے سوٹ کیس نکالا۔ اس میں کچھ کپڑے رکھے اور پھر اس کے اوپر کچھ کتابیں۔ پھر دھپ سے سوٹ کیس بند کیا اور بیٹھک کی طرف اُمڈا۔

بیٹھک میں پہنچا تو ببل ہمیشہ کی طرح چھاتیوں میں سر دیئے ہوئے تھا۔ درباری کے پہنچتے ہی اس نے منہ نکالا اور ایک فاتح کی طرح درباری کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر اگلے ہی پل، جانے کس جذبے، کس گنتی سے اس نے اپنے پورے پر درباری کی طرف پھیلا دیئے۔ درباری نے بڑھ کر ایک ہاتھ میں ببل کو اٹھایا، دوسرے میں سوٹ کیس تھاما اور "اچھا بھابی....." کہہ کر باہر نکل گیا۔

دادر پہنچ کر ریڈی میڈ کپڑوں کی دوکان سے درباری نے ببل کے لئے ایک قمیض خریدی اور ساتھ ایک نیکر بھی۔ قمیض تو جیسے تیسے ببل نے پہن لی لیکن نیکر پہنتے وقت اس سے باقاعدہ شور مچانا، چیخنا چلانا شروع کر دیا تھا۔ جتنی دیر بھی وہ کھڑا رہا برابر اپنی ٹانگوں سے سائیکل چلاتا رہا۔ ابھی ہمکا، پھر گرا، درباری ایک ہاتھ سے پکڑتا تو وہ دوسرے ہاتھ کی طرف لڑھک جاتا اور پھر منہ اٹھا کر درباری کی طرح حیرانی سے دیکھتا جیسے کہہ رہا ہو: ''عجیب آدمی ہو ایک بچہ بھی پکڑنا نہیں آتا۔''

پھر ایکا ایکی بجلی کے ایک قمقمے نے اس کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ وہ اوپر کی طرف ہمکا۔ بجلی کے ڈر سے درباری نے ہاتھ اوپر کیا ہی تھا کہ ببل نے پاس چلتے ہوئے ٹیبل فین کی جالی میں اپنی انگلی جا ڈالی، دوکان دار نے لپک کر ہاتھ ہٹا لیا، نہیں تو جناب کی انگلی اڑ گئی تھی۔ جھٹکے سے ہاتھ پرے کرنے پر اس نے رونا شروع کر دیا اور جب درباری نے اسے گود میں اٹھایا تو وہ شکایت کے لہجے میں پہلے درباری اور پھر دوکان دار کی طرف دیکھ رہا تھا اور اس کی طرف ہاتھ اٹھا رہا تھا جیسے کہہ رہا ہو: ''اس نے مجھے مارا۔''

ٹیکسی میں بیٹھتے ہی ببل کچھ جھلا سا گیا۔ دراصل اسے نیکر کی وجہ سے تکلیف ہو رہی تھی۔ وہ زندگی بھر یوں کسا نہ گیا تھا۔ درباری نے اسے سیٹ پر بیٹھانے کی کوشش کی لیکن وہ تنکے کی طرح اکڑ گیا، جیسے کہہ رہا ہو: ''تم گاڑی پر بیٹھو، میں تم پر بیٹھوں گا۔ نہیں مجھے لے کر چلو بازار میں جہاں لوگ آ جا رہے تھے۔'' پھر اس نے زور سے اوپر نیچے ہو کر آخر نیکر نکال ہی دی اور اس پر کودتے ہوئے اسے یوں چڑمڑا کر دیا کہ کوئی استری اس کے بل نہ سیدھے کر سکتی تھی اور اب — نیکر نکال دینے کے بعد وہ خوش تھا۔ ایک عجیب قسم کی آزادی کا احساس ہو رہا تھا اسے، جب وہ کھڑکی میں کھڑا ساری دنیا کو دیکھ اور دکھا رہا تھا۔

درباری جب سیتا کے ہاں پہنچا تو وہ گھر پر نہ تھی۔ درباری نے سر پیٹ لیا۔ ماں نے بتایا وہ پربھادیوی میں کمد سے ملنے گئی ہے۔ پربھادیوی کا علاقہ کوئی دور نہ تھا لیکن کمد کے گھر کا کیسے پتہ چلے؟ پوچھتا تو ماں کہتی: ''کیوں کیا کام ہے؟ ا''س لئے خاموش ہی رہنا اچھا تھا۔

اس پر ایک اور مصیبت — ماں بتانے لگی: پہلے مالے پر رہنے والے سندھی نے ''نوسٹ'' دے دیا ہے۔ نوٹس دے دیا ہے تو وہ کیا کرے؟ اس وقت تو حالات نے اسے نوٹس دے دیا ہے۔ کچھ دیر بیٹھا وہ ماں کی بوڑھی باتیں سنتا رہا اور بتاتا رہا یہ ببل اس کا بھانجا ہے، بڑا پیارا دلارا بچہ ہے

لیکن ماں کو جیسے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس نے صرف ایک بار کہا: ''کیوں رے؟'' ببل نے جواب بھی دیا لیکن ماں نے آگے بات نہ چلائی۔ ببل کو ماں کی بولی معلوم تھی لیکن ماں ببل کی بولی بھول چکی تھی۔ وہ پھر اپنے رونے سے بیٹھی: ''کمیٹی کہتی ہے، ہر سال اتنے پیسے مرمت پر لگایا کرو۔ اب بھلا کوئی روٹی کھائے کہ مرمت کروائے۔ کیا کیا کانون پاس ہو گئے ہیں۔ کانگریس سرکار تو ڈوبنے کو آئی ہے۔ اشٹ گرہی میں کیا ہوگا؟ میں تو جگا دھری مائیکے لوٹ جاتی ہوں، تم شادی کب کرو گے؟''

کوئی ہی دیر میں ماں بور ہو گئی۔ ہاں ماں بور ہو گئی۔ بولی:

''سیتا! پتہ نہیں آتی ہے کہ نہیں آتی۔ تم ٹیکسی پر تو آئے ہی ہو۔ مجھے ذرا ماہم تک چھوڑ دو۔''

''میں ماہم کی طرف نہیں جا رہا، ماں جی——''

''کدھر جا رہے ہو؟''

''شہر کی طرف۔''

''ٹھیک ہے۔'' ماں بولی۔

''وہاں بھی پریل کے پاس مجھے کام ہے..... ہنڈولے آ رہے ہی نا مجھے مولی خریدنی ہے۔ مولی جانتے ہو، کیا ہوتی ہے؟''

درباری سٹپٹا کر رہ گیا۔ ببل تنگ کرنے لگا تھا۔ اس پر باہر ٹیکسی کا میٹر چڑھ رہا تھا۔ اسے کچھ نہ سوجھا تو دل ہی دل میں ماتھے پر ہاتھ مار کر بولا: ''چلو ماں جی، میں آپ کو پریل چھوڑ دوں راستے میں کمد کا گھر ہے نا؟''

''ہے تو۔'' ماں اٹھتے ہوئے بولی——

''پر آگ لگے——یہ بازار بمبئی کے۔ بیس بار گئی ہوں تو بیس بار ہی گھر بھول گئی——''

''چلو اکیسویں بار بھی بھول جانا۔''

''پر تم۔ سیتا کو لے کر کہاں جا رہے ہو؟''

''دیدی کے پاس..... کھانا۔''

''سنا ہے وہ مسلمان ہے۔''

''کیا بات کرتی ہیں، ماں جی؟'' درباری نے جیسے کسی گرتے ہوئے پہاڑ کو تھام لیا—— ''ستونتی نار کسی مسلمان عورت کا نام ہو سکتا ہے؟''

اس سے پہلے کہ ماں پورے طور پر درباری پر مسلط ہو جائے، سیتا چلی آئی بہار کے ایک جھونکے کی طرح، دامن میں پتے ہی پتے، پھول ہی پھول لئے۔ اس نے آئرن۔ گرے رنگ کی ایک چولی چست کی ہوئی تھی اور بیگنی چاولوں کے کلر کی سی ہینڈلوم لپیٹ رکھی تھی جو جسم کے سارے خطوں کو ایک آزاد، ایک طوفانی سے بہاؤ میں لے آئی تھی۔ خود وہ بہار کا جھونکا تھی لیکن درباری کیلئے پت جھڑ کا پیغام۔ اس کے اندر کے پھول کے پتے ایک ایک کر کے خشک ہونے، گرنے اور کچھ آندھیوں کے ساتھ اڑنے لگے..........اور جو ڈال پہ رہ گئے تھے، سوکھ کر آپس میں ٹکرانے، دل کو ہڑکانے لگے—

سیتا نے آتے ہی پہلے ببل کو دیکھا اور آنکھیں پھیلائیں: ''کس کا بچہ ہے؟''

اور پھر لپک کر بچے کے پاس پہنچی: ''ہے کتنا پیارا ہے، ببلو سا۔''

ہاں درباری نے کہا: ''ببل ہی اس کا نام ہے۔ تمہیں کیسے پتہ چلا؟''

''مجھے کیا معلوم؟'' سیتا نے تالی بجاتے ببل کو اپنی آغوش میں بلاتے ہوئے کہا:

''ہر بچے کی شکل سے اس کے نام کا پتہ چل جاتا ہے..... تمہیں نہیں چلتا؟''

ببل نے پہلے شک وشبہ کی نظر سے سیتا کی طرف دیکھا اور پھر مسکرا دیا، جیسے برسوں سے جانتا ہو اور پھر ترازو کے انداز میں بازو اٹھا دیئے۔ سیتا نے اسے اٹھایا۔ چھاتی سے لگا لیا اور سب عورتوں کی طرح تھوڑا جھول گئی۔ بس رشتہ قائم ہوتے ہی ببل نے چھوٹی الماری پر پڑی ہوئی کسی ٹوکری کی طرف اشارہ کیا اور 'او....او....' کرنے لگا جیسے کہہ رہا ہو، اس میں کچھ ہے، میرے لئے؟

درباری کی نگاہوں میں خواب تھے اور جب سیتا نے دیکھا تو اس کی نظروں میں سجیں تھیں اور بچے شاید ببل سیتا کی آنکھوں میں منعکس ہو رہا تھا۔ درباری نے کچھ اتار لے ہو کر کہا:

''گھنٹہ بھر سے میں تمہاری راہ دیکھ رہا ہوں، دیدی نے بلوایا ہے۔''

سیتا نے ماں کی طرف دیکھا: ''ماں!''

''ہاں بیٹا!'' ماں نے اجازت دیتے ہوئے کہا۔

''ٹھہر! میں اس کے لئے کچھ بسکٹ.....''

درباری نے اور بے صبری سے کہا:

''ہوتے رہیں گے، تم چلو..... میرے پاس اتنا سا بھی وقت نہیں ہے۔''

اور سیتا ببل کے گال رگڑتی ہوئی چل دی، کہتی ہوئی:

''اے، تو تو تھوتا سا موتا سا گوتا سا ببلو ہے.....''

اور سیتا دل میں اتنا سا بھی وسوسہ لئے بغیر چل دی۔ باہر ٹیکسی کو دیکھتے ہوئے بولی:

''اس میں چلیں گے؟''

درباری نے سر ہلا دیا۔ ٹیکسی ڈرائیور جو بے کیف ہو رہا تھا، خوش ہو گیا پیچھے کی طرف لپک کر اس نے ٹیکسی کا دروازہ کھولا اور ببل اور سیتا اور آخر میں درباری بیٹھ گئے۔ جبھی سیتا کی نگاہ سوٹ کیس پر پڑی.....ایک شک کی پرچھائیں اس کے چہرے پر سے گذری: ''یہ سوٹ کیس—؟''

''ہاں۔'' درباری نے کہا۔

''دیدی کے ہاں جا رہے ہو؟''

''کہیں بھی جا رہا ہوں، تمہیں اس سے کیا؟'' اور پھر خشم ناک نگاہ سیتا پر پھینکتے ہوئے بولا:

''تم نے کہا نہیں تھا، جہاں بھی لے جاؤ گے، جاؤں گی۔''

سیتا کو کچھ باتیں سمجھ میں آنے لگیں۔ درباری کے چہرے کی رنگت، سوٹ کیس، بچہ.....
اس نے ڈر کے عالم میں ببل کو سیٹ پر بیٹھا دیا اور نتھنے پھیلاتی ہوئی بولی:

''ہاں! کہا تھا—''

سیتا نے پھر ایک تیز سی نظر درباری پر پھینکی اور پھر اپنی نگاہیں چرا لیں۔ اسے اپنا آپ جیسے کچھ گندا لگا۔ ساری کے پلو سے اس نے اپنا لال ہوتا ہوا چہرہ پونچھا۔ درباری نے خمار آلودہ نگاہیں سیتا پر پھینکتے ہوئے کہا: ''سیتا! تم پھر لگی ہو، اس دن کی طرح کرنے۔''

سیتا ڈر گئی۔ ''نہیں تو۔'' وہ بولی۔

ٹیکسی حاجی علی کے پاس سے جا رہی تھی، آج سمندر کا وہی رنگ تھا جو مانسون سے پہلے ہوتا ہے۔ میلا کچیلا، گندہ اور گیلا.....شاید دور کہیں برسات، شروع ہو چکی اور بے شمار گندے نالے اور ندیاں سمندر میں پڑ رہی تھیں.....

پھر وہی سفر— تارڈیو، اوپرا ہاؤس، مہاتما گاندھی روڈ، فلورا فاؤنٹین—اور ایک ہوٹل۔
آج وہ ہوٹل نہیں تھا، جہاں وہ اس دن گئے تھے۔

سامنے ایک بیرہ کھڑا تھا۔ درباری، سیتا اور ببل کو دیکھ کر لپکا، بڑی عزت، بڑے ہی احترام کے ساتھ اس نے ٹیکسی کا دروازہ کھولا۔ درباری اترا، ٹیکسی والے کو پیسے دے اور پھر بیرے کو سوٹ

کیس اتارنے کا اشارہ کیا..... سیتا اتری، اس کی آنکھیں جھکی جھکی سی تھیں اور ببل کو اپنے بازوؤں میں لینے سے جیسے اسے کچھ تامل ہو رہا تھا—

"اٹھاؤ نا۔" درباری نے ببل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"بچہ ہمیشہ عورت اٹھاتی ہے۔"

سیتا نے کچھ بے بسی کے عالم میں ببل کی طرف دیکھا، جیسے وہ ابھی اسے اٹھانا چاہتی تھی لیکن درباری اور اس کے غصے سے ڈرتی تھی۔ مرد اور اس کی وحشت سے خائف تھی۔ اس نے ببل کو اٹھا تو لیا لیکن اسے پیار نہ کرسکتی تھی..... اسے کچے کچے، کھٹے، کھٹے، گندے گندے ڈکار سے آنے لگے تھے۔

ہوٹل اوپر تھا۔ درباری نے یہ بھی تو نہ پوچھا— کمرہ ہے؟...... اب کوئی ضرورت نہ تھی۔ وہ اپنی نگاہوں میں وہی پیشہ ورانہ بے باکی پیدا کر چکا تھا، جس کی اب ضرورت بھی نہ تھی۔

سیتا نے دیکھا— سیڑھیوں پر جیسے کسی نے تیل اور گھی کے ڈرم لڑھکا دیئے ہیں۔ مدرسہ جس کی مدد سے نہ جانے کتنے لوگ اوپر گئے تھے، ہاتھوں کے لگنے سے میلا اور گندہ ہو رہا تھا۔ پوری فضا سے کسی باسی دینی کی آواز آرہی تھی۔

رسے کو ہاتھ لگائے، بغیر ہی سیتا درباری کے پیچھے پیچھے اوپر پہنچ گئی۔

منیجر صاحب نے تینوں کو آتے دیکھا تو ان کے چہرے پر ایک عجیب مقدس سی چمک چلی آئی۔ وہ عجلت سے کونٹر کے پیچھے سے نکلا اور دونوں ہاتھ کمرے کی طرف سویپ کرتے ہوئے بولا: "ویلکم سر!" آج سب کمروں کے دروازے سیتا اور درباری پر کھلے تھے۔

درباری نے منیجر سے کہا: "ہم بلی مورا سے آئے ہیں اور اس وقت ٹرانزٹ میں ہیں۔ گیارہ بجے والی پنجاب میل سے آگرے جائیں گے، جہاں تاج محل دیکھیں گے جو شاہجہاں نے اپنی چہیتی ممتاز کے لئے بنوایا تھا۔ دراصل اسے ممتاز سے اتنی محبت نہ تھی، جتنا جرم کا احساس تھا۔ کیونکہ اس سے سولہ اٹھارہ بچے پیدا کئے تھے۔ اور اپنی اس زیادتی کا اسے صلہ دینا چاہتا تھا۔" پر ان باتوں کی ضرورت ہی نہ تھی۔ منیجر "سر، سر!" کرتا رہا۔ ضرورت پڑنے پر ہنستا بھی، ضرورت سے زیادہ بھی ہنستا..... سر بھی ہلاتا، جھک جھک کر آداب بھی بجالاتا۔

رجسٹر پر دستخط کرنے پر درباری کمرے میں پہنچا تو ببل کے ہاتھ میں بسکٹ تھے۔

یہ کس نے دیئے؟''

''بیرے نے۔'' سیتا بولی۔

''اور یہ — آئس کریم کی کون؟''

''پڑوس کا ایک مہمان دے گیا ہے۔''

اور بیرہ بچے کے لئے کٹوری میں دودھ لا رہا تھا، جیسے وہ صدیوں سے بیکار تھا اور آج اسے ایکا ایکی کوئی کام، ایسا روزگار مل گیا جو کبھی ختم ہونے والا نہ تھا جس میں کبھی چھٹی نہیں ہوتی جس کے سامنے ٹپس کی آمدنی اور بیگار کوئی معانی نہ رکھتے تھے، وہ خوش اور دودھ کی کٹوری ہاتھ میں تھامے ہوئے یوں کھڑا تھا جیسے وہ کسی کو نہیں، کوئی اسے ممنون کر رہا ہے، وہ جانا، ٹلنا نہ چاہتا تھا —

''اچھا بیرہ۔'' درباری نے بے رحمی سے بیرے کو جھٹکتے ہوئے کہا: ''ہم تھک گئے ہیں۔ دیکھو نا کب سے چلے ہیں۔ اب تھوڑا آرام کریں گے۔''

''جی؟'' بیرا بولا۔ ''میری جروت پڑے صاحب.....''

درباری نے کھٹ سے دروازہ بند کر لیا اور اندر سے چٹخنی چڑھا دیا۔ وہ سچ مچ تھک گیا تھا۔ اس نے ایک گہرا سانس لیا اور جا کر بستر پر بیٹھ گیا۔ اسے سیتا کا ببل کو دودھ پلانا بڑا الگ رہا تھا لیکن وہ کچھ نہ کہہ سکتا تھا، کہتا تو برا لگتا، بہت ہی برا —

جبھی اپنے کھلنڈرے پن میں ببل نے کٹوری کو ہاتھ مارا اور دودھ نیچے گر گیا —

''بات! گندا کہیں کا۔'' سیتا نے کہا اور رومال سے اس کا منہ پونچھنے اور پھر جھاڑن سے فرش صاف کرنے لگی، ببل کو ہاتھ لگانے کی دیر تھی کہ وہ سیتا کی بانہہ پکڑ کر کھڑا ہو گیا۔

سیتا اندر ہی اندر کانپ رہی تھی۔ درباری کچھ خجل سا نظر آنے لگا تھا۔

یہ ہوٹل اتنا اچھا نہیں۔'' وہ یونہی سی بات کرنے کے لئے بولا۔

''ٹھیک ہے۔'' سیتا بے پروائی سے بولی۔

پھر درباری ناک سکوڑ کر ادھر ادھر سونگھنا اور کہنے لگا: ''کوئی بو سی آ رہی ہے؟'' اور پھر اس نے پسینے کے قطرے اپنے ماتھے سے پونچھ ڈالے اور بولا: ''تم اب اسے چھوڑو بھی۔''

سیتا نے ببل کو بٹھانے کی کوشش کی لیکن وہ تکلا ہو گیا۔

درباری نے ایک ایش ٹرے ببل کے پاس لا رکھی اور ببل اسے کھلونا سمجھ کر لپکا۔ وہ بیٹھ گیا اور کھیلنے لگا..... وہ کیا کرتا؟

پھر آگے بڑھ کر درباری نے ایک اناڑی، بے ڈھنگے، بھونڈے انداز میں سیتا کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''بھگوان کے لئے.....'' سیتا بولی اور اس نے ببل کی طرف اشارہ کیا۔

لیکن درباری کی آنکھوں میں جیسے کوئی چربی چھائی ہوئی تھی۔ اسے کچھ نہ دے رہا تھا۔ صرف ایک ہی احساس تھا کہ وہ ہے اور ایک تر و تازہ اور شاداب لڑکی۔ وہ تیزی سے سانس لے رہا تھا۔ اس نے جب اپنے بازو سیتا کے گرد ڈالے تو وہ گوشت پوست کے نہیں، لکڑی کے معلوم ہو رہے تھے اور سیتا کے نرم اور گداز جسم میں کھبے جا رہے تھے۔ سیتا نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ درباری کی بانہوں میں کانپتی ہوئی وہ ہر لحظہ بے دم ہوتی جا رہی تھی.........آج خود بھی وہ بے سہارا ہو جانا چاہتی تھی.....

ببل نے ڈر کر دونوں کی طرف دیکھا۔

سیتا کو ابھی تک روتے دیکھ کر درباری کہہ رہا تھا: ''وہی مطلب ہوا نا۔ تم مجھ سے....''

''میں تم سے پیار نہیں کرتی؟ میں تم سے.....''

ببل نے ایش ٹرے کی راکھ منہ پر مل لی تھی اور رونے لگا تھا۔

''چپ بے۔'' درباری نے نفرت اور غصے کے ساتھ کہا۔

سیتا چونکی۔ وہ باہر بھاگ جانا چاہتی تھی لیکن اس کے ہاتھ بازو جواب دے چکے تھے.....

درباری کی ڈانٹ کے بعد ببل نے ڈر کر چلانا شروع کر دیا۔ درباری ایک دم آگ بگولا ہو کر لپکا، جیسے اس کا گلا گھونٹ دے گا۔ مرد اور عورت کے بیچ اس بے آہنگ آواز کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دے گا۔ ببل کے پاس پہنچتے ہی اس نے زور سے ایک تھپڑ ببل کو مار دیا۔ ببل لڑھک کر دور جا گرا۔

''شرم نہیں آتی؟'' کہیں سے مصری کی آواز آئی۔

درباری نے پلٹ کر دیکھا— مصری نہیں سیتا تھی جو کسی ان جانی طاقت کے آ جانے سے نیم برہنہ حالت میں اٹھ کر ببل کے پاس چلی آئی تھی اور اسے اٹھا کر اپنی چھاتی سے لگا لیا۔ ببل سیتا کی چھاتیوں میں سر دیئے رو رہا تھا، سسکیاں لے رہا تھا۔ پھر اس نے اپنا منہ اٹھایا اور بندھی ہوئی گھگھی کے باوجود درباری کی طرف اشارہ کرنے لگا، جیسے کہہ رہا ہو: ''اس نے مجھے مارا!''

درباری کو محسوس ہوا، جیسے اتنے صاف ستھرے کپڑوں میں بھی وہ گندہ ہے۔ وہ سیتا سے اتنا شرمندہ نہ تھا جتنا ببل سے... لیکن اپنے آپ کو حق بجانب سمجھنے کی اس کے پاس ابھی بہت سی دلیلیں تھیں۔

جبھی درباری نے اپنا سر جیسے کسی دلدل میں سے اٹھایا اور ببل کی طرف دیکھنے لگا اور سیتا کی طرف دیکھ بھی نہ سکتا تھا۔ کیونکہ وہ نیم برہنہ تھی اور ببل سے اپنے آپ کو چھپا رہی تھی اور درباری کو دیکھ رہی تھی، جیسے وہ دنیا کا سفلہ ترین انسان تھا جو اس کمینہ حد تک اتر آیا تھا، پھر اس کی نگاہیں خالی تھیں، وہ کچھ بھی سمجھ نہیں رہی تھی۔

شرمساری ندامت اور خجالت سے درباری نے اپنا ہاتھ ببل کی طرف بڑھایا، سیتا کا بس چلتا تو وہ کبھی ببل کو درباری کے گندے اور نجس ہاتھوں میں نہ دیتی لیکن وہ کیا کرتی۔ ببل خود ہی بے تاب ہو کر درباری کے بازوؤں میں لپک گیا اور روتے ہوئے الٹا سیتا کی طرف اشارہ کرنے لگا۔ جیسے کہہ رہا ہو، اس نے مجھے مارا..... اب درباری کے پاس کوئی دلیل نہ تھی اور نہ سیتا کے پاس کوئی دلیل نہ تھی اور نہ سیتا کے پاس——

''سیتا!'' درباری نے کہا۔

سیتا کچھ نہ بولی۔ وہ رو بھی نہ سکتی تھی۔ جلدی سے اس نے ساری کا پلو کھینچا اور اپنا جسم ڈھک لیا۔

''سیتا!'' درباری پھر بولا۔

''تم کبھی مجھے معاف کر سکو گی؟'' اور پھر شک و شبہے کے انداز میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا: ''ہم پہلے شادی کریں گے۔''

اور پھر اس نے ہمت کر کے اپنا دوسرا بازو سیتا کے گرد ڈال دیا۔ سیتا نے درباری کی آنکھوں میں دیکھا اور پھر ایک جست کے ساتھ درباری سے لپٹ گئی اور اس کے کاندھے پر سر رکھ کر بچوں کی طرح رونے لگی۔ اسکے آنسوؤں میں درباری کے آنسو بھی شامل ہو گئے۔ دونوں کے دکھ ایک ہو گئے اور سکھ بھی...

ان دونوں کو روتے دیکھ کر ببل نے رونا بند کر دیا اور حیرانی سے کبھی سیتا اور کبھی درباری کی طرف دیکھنے لگا..... جبھی ایکا ایکی وہ ہنس دیا، جیسے کچھ ہوا ہی نہیں اور اپنے کرمرے کے لئے درباری کی مٹھی کھولنی شروع کر دی..........

صرف ایک سگریٹ

راجندر سنگھ بیدی

سنت رام کی آنکھ کھلی تو اس وقت چار بجے تھے، صبح کے۔

ساتھ کے بستر پہ دھوبن سو رہی تھی۔ ایک پہلو پہ۔ دھوبن سنت رام اپنی بیوی کو کہتا تھا۔ اس کا نام اچھا بھلا دیبی تھا لیکن سنت رام اُسے اسی نام سے پکارتا تھا کیوں کہ وہ لانڈری میں کپڑوں کی دھلائی کے بہت خلاف تھی۔ گھر میں نوکر چاکر پرماتما کا دیا سب ہوتے ہوئے وہ رومال سے لے کر بھاری بھاری چادریں تک گھر ہی میں دھوتی تھی۔ جب تھک جاتی تو سب سے لڑتی اور لانڈری کے خرچ سے بہت مہنگی پڑتی۔ پھر رات کو سونے سے پہلے وہ ہمیشہ دبائے جانے کی فرمائش کچھ اس انداز سے کرتی کہ فرمائش اور حکم میں کچھ فرق ہی نہ رہتا۔ دبانے کی اس مصیبت سے سنت رام تو کیا، دھوبن کے بچوں تک کو چڑ تھی۔ کوئی پانچ نہیں تو دس منٹ دبوائے لیکن یہ کیا کہ کوئی گھنٹے بھر سے ادھر چھوڑنے کا نام ہی نہ لے۔ عجیب تماشا ہوتا تھا۔ آخر دبانے والے کو خود بے دم ہو کر لیٹ جانا پڑتا تھا۔ ایک دن بڑی بیٹی لاڈو کے ساتھ یہی معاملہ ہوا۔ ماں کو دبانے کے بعد وہ ہانپتی ہوئی

پلنگ کے ایک طرف جا گری اور بولی: ''اب تم مجھے دبا دو، ممی!''

پھر اس دبنے دبوانے کے سلسلے میں ایک اور بڑی مصیبت تھی دھوبن کو پتہ ہی نہ چلتا تھا کہ اسے درد کہاں ہو رہا ہے۔ جہاں ہاتھ رکھو، درد ہمیشہ اس سے تھوڑا پرے ہوتا تھا اور یوں جگہ ڈھنڈواتے ڈھنڈواتے وہ سارا بدن دبوا لیتی تھی۔ کوئی کہے یہ اس کی چالاکی تھی تو ایسی بات نہیں۔ اسے واقعی پتہ نہ چلتا تھا اور آخر یہ فیصلہ ہوتا کہ سارا بدن دُکھ رہا ہے۔ اچھا دھوبن کو دبوانے کا ہی نہیں، دبانے کا بھی شوق تھا۔ اشارہ تو کرو اور وہ تیار۔ البتہ یہ کام اسے کوئی کم ہی کرواتا تھا کیونکہ اس کا ہاتھ کیا تھا، مستری کی پکڑ تھی جس سے وہ اچھے بھلے آدمی کے نٹ بولٹ کستی اور اس کی ڈھبری ٹائٹ کر دیتی تھی۔ اس کے بازوؤں کی گرفت نہ صرف مردانہ بلکہ پہلوانا تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا، جیسے وہ آدمی کو نہیں دبا رہی، کوئی بیڈ کور نچوڑ رہی ہے۔ سنت رام تو اس کے دھوبی پاٹے سے بہت گھبراتا تھا۔ دھوبن، ہاں، سنت رام نے اس کا یہ نام اس لئے بھی رکھا تھا کہ بچپن میں اس کو سیر بین میں بارہ من کی دھوبن دیکھی تھی جو نیم برہنہ حالت میں، پہلو پہ لیٹی، ہاتھ میں مور کے پروں والا پنکھا لئے ایک بھرپور عورت معلوم ہوتی تھی۔ سیر بین والا اپنے دبے پہ گھنگھرو بجاتا ہوا گلی میں آتا تھا اور آواز دیتا تھا۔ پیرس کی رات دیکھو، اپنی بارات دیکھو........اور پھر ٹیون بدل کر۔ دھوبن دیکھو بارہ من کی، گوری چٹی آہا تن کی۔ آہا!.......اور سب بچے ماؤں سے ایک ایک پیسہ لا کر اس جادو کے بکس والے کے ہاتھ میں دیتے ہوئے اپنا چہرہ اور آنکھیں سیر بین میں ٹھونس دیتے تھے اور نظاروں سے پورا پورا لطف اٹھاتے تھے۔ پیرس، بارات، سفید ریچھ، سرکس کے جوکر کے بعد جب دھوبن آتی تھی تو بچوں کو کچھ پتہ نہ چلتا تھا وہ سوچتے دھوبن کیوں اس بکس میں قید کر رکھی ہے؟ مہینہ پہلے بھی وہ ایسے ہی لیٹی ہوئی تھی اور آج بھی لیٹی ہوئی ہے۔ ایک پہلو پہ لیٹے لیٹے کیا وہ تھک نہیں جاتی؟ دھوبن ایک نامحسوس طریقے سے بچوں کو اچھی لگتی تھی۔ وہ دماغ میں گھس جاتی تھی اور کہیں پندرہ بیس برس کے بعد باہر نکلتی۔

ساتھ کے کمرے میں لاڈو، سنت رام کی مشدود (اس کی لغت میں شادی شدہ) لڑکی جو ایک روز پہلے اپنی سسرال سے آئی تھی، سو رہی تھی۔ کچھ ایسی بے خبری میں، جیسے اس کا کوئی میاں ہی نہ ہو۔ اس کا منہ کھلا ہوا تھا کیونکہ رات کے پہلے پہر کمینے بابی، اس کے بچے نے اسے سونے ہی نہ دیا تھا اور جب اسے نیند آئی تو سانس لینے کے لئے زیادہ ہوا کی ضرورت پڑی۔ لاڈو جیسے شادی کے

چھ برس پہلے تھی، ویسے ہی اب بھی تھی۔ بات کرنے میں منہ سے پانی کی پھوار سننے والے کے منہ پر پڑتی تھی، جیسے وہ روٹھتی، ویسے ہی من بھی جاتی۔ سنت رام اور دھوبن کو یہی فکر تھی، یہ اتنی بھولی بیٹی ہماری بسے گی کیسے؟ اسے کوئی مشکل پسند میاں مل گیا تو مصیبت ہوگی لیکن اسے میاں جو ملا تو اس نے کوئی شرط ہی نہ پیش کی اور نہ اب پیش کرنے کا کوئی ارادہ رکھتا تھا۔ ادھر اس گھر میں ماں باپ کی ناچاقی، ادھر لاڈو کی سسرال میں والدین کی کثرتِ محبت یا ایسے ہی دنیا کے مشترک ڈرنے دونوں میاں بیوی کو ایک مضبوط رشتے میں باندھ رکھا تھا۔ بہادر دونوں اتنے تھے کہ گھر میں چوہا نکل آنے پر بھی چیختے چلاتے۔ ایک دوسرے کی پناہ ڈھونڈنے لگتے تھے۔ سنت رام ان کے چڑیا کا سا دل رکھنے پر بہت خوش تھا کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ بہت سے منفی جذبے زندگی کے لئے کتنے اچھے ہوتے ہیں۔ مثلاً ڈر، کنجوسی، شرم وغیرہ لیکن یہ ڈر تو اولادوں تک منتقل ہو رہا تھا۔ لاڈو کے ساتھ اس کا منا بابی سویا ہوا تھا— ماں کے گلے میں بانہہ ڈال کر، جب ذرا نیند کھلتی تو اس کے کان ملنے لگتا، جانے یہ کیا عادت تھی اس کی، جسے صرف اس کی ماں ہی برداشت کرسکتی تھی۔ سنت رام نے جب بھی محبت کے جذبے سے معمور ہوکر دوہتے کو ساتھ سلایا تو تھوڑی ہی دیر میں گھبرا کر اسے اُٹھاتے ہوئے پھر اس کی ماں کے ساتھ ڈال دیا۔ سوتے میں بانہہ گلے میں ڈالنے کی بات اتنی نہ تھی۔ البتہ جب وہ اپنے لجلجے ہاتھوں سے کان مسلنے لگتا تو عجیب سی گدگدی ہوتی اور کبھی یوں معلوم ہونے لگتا، جیسے کوئی کنکول کان میں گھس رہی ہے۔

چھوٹے دو بچے، لڑکا اور لڑکی اپنے ماموں کے ہاں گڑگاؤں گئے ہوئے تھے۔ ان کے بستر خالی پڑے ہوئے بیکاری کے عالم میں چھت کو تکا کرتے۔ بڑا پال یہیں تھا، جس کے خراٹے سنائی دے رہے تھے۔ کیسے دیکھتے دیکھتے وہ بڑا ہو گیا تھا اور سنت رام کے تسلط سے نکل گیا تھا۔ پہلے سنت رام اسے اس کی غلطی پر ڈانٹتا تھا تو وہ مختلف طریقوں سے احتجاج کرتا تھا۔ ماں سے لڑنے لگتا، چائے کی پیالی اٹھا کر کھڑکی سے باہر پھینک دیتا لیکن اب وہ باپ کی ڈانٹ کے بعد خاموش رہتا تھا جو بات سنت رام کو اور بھی کھل جاتی۔ سنت رام چاہتا تھا کہ وہ اس کی بات کا جواب دے اور جب وہ کہیں جواب دے دیتا تو سنت رام اور بھی آگ بگولا ہو اٹھتا۔ وہ چاہتا تھا بیٹا اس کی بات کا جواب دے اور نہیں بھی چاہتا تھا وہ نہیں جانتا تھا کہ آخر وہ چاہتا کیا تھا؟ سنت رام نے اپنے بیٹے پال کے سلسلے میں اپنی زندگی کا آخری چانٹا کوئی چھ برس پہلے مارا تھا، جواب تک گھس چکا تھا۔ اب تو وہ اس

سے ڈرنے لگا تھا۔ آج بھی پال حسب معمول رات کے دو بجے آیا تھا۔ ڈپلومیٹ کے دو چار پیگ لگا کر۔ وہسکی کی اصلی مہک تو گھر کے لوگوں نے نیند میں گزار دی تھی لیکن اب بھی اس کے الٹے سانس میں سے بو آ رہی تھی۔

پال چھبیس ستائیس برس کا ایک دبلا پتلا نوجوان تھا۔ اندر ہی اندر کڑھتے، کھولتے رہنے سے اس کے بدن پہ بوٹی نہ آتی تھی۔ اس کے باوجود چہرے کی بناوٹ، اور مونچھوں کی ہلکی سی تحریر کے ساتھ وہ مرد کے طور پر قابلِ قبول تھا۔ عورتیں اسے بہت پسند کرتی تھیں کیونکہ وہ بچوں کو بہت پسند کرتا تھا۔ کردار کے اعتبار سے پال امنگ بھرا تھا اور جاہ طلب بھی۔ اس میں انا بے انتہا تھی۔ یہ انا جس کی وجہ سے اس کی ناک کے نتھنے پھٹے جاتے تھے اور وہ بڑے زوردار طریقے سے اپنے آپ کو پال آنند کے نام سے متعارف کراتا تھا جیسے وہ کوئی روایت ہو۔ یہ روایت اس نے کہاں سے پائی تھی؟ اپنے باپ، سنت رام ہی سے نا جو ایک بہت بڑی ایڈورٹائیزنگ ایجنسی کا مالک تھا اور جس نے اپنے بیٹے کو شہزادے کی طرح پالا تھا اس کی ماں دھوبن اسے چوری چوری رقمیں دیتی تھی اور اس عمل میں اپنی بیوی سے اپنے تعلقات خراب کر لئے تھے، پھر اس نے پال کو عافیت کی چھت دی تھی — ایک ایسے مکان کی چھت جس میں تین بیڈروم تھے اور ایک شاندار ڈرائنگ روم جس میں استادوں کی پینٹنگ تھیں: پھر دن میں دو دو بار بدلنے کے لئے کپڑے۔ یہ سب اپنے باپ سے لے کر وہ کیوں اسے بھول گیا تھا؟ صرف یہی نہیں، اس سے نفرت کرنے لگا تھا اور یوں پاس سے گزر جاتا تھا جیسے وہ اس کا باپ نہیں، کوئی کرسی ہو۔ اگر حکومت نے کوئی نیا قانون پاس کر دیا جس سے کمپنی فیل ہو گئی، تو اس میں سنت رام کا کیا قصور؟ زندگی میں نفع ہوتا ہے اور نقصان بھی۔ یہ کیا مطلب کہ نفع کے وقت تو سب شریک ہو جایں اور نقصان کے وقت نہ صرف الگ ہو بیٹھیں بلکہ گالیاں بھی دیں؟ لیکن اس میں پال کا زیادہ قصور نہ تھا۔ وہ آج کل کے زمانے کا لڑکا تھا اور صرف اسی شخص کی عزت کر سکتا تھا جس کے پاس پیسہ ہو یا اس کے ڈھیر سارے پیسے بنانے، بلڈنگیں کھڑی کرنے اور امپالا کار خریدنے کا امکان ہو ایک بار سنت کے سوال پہ پال نے یہ بات کہہ بھی دی جس سے بوڑھے کو بہت ٹھیس لگی۔ اس کے اندر کیا کچھ ٹوٹ گیا، اس کا اسے خود بھی اندازہ نہ تھا۔ اس کا کتنا جی چاہا تھا کہ وہ کہیں چوری چاری کر کے، ڈاکہ ڈال کے یا بینک ہولڈاپ کر کے لاکھ روپے بنائے اور اس بیٹے کے پاؤں میں پھینک کر اس کی اور اس کی ماں کی نظروں میں اپنی کھوئی

تو قیر پھر سے حاصل کر سکے لیکن لاکھ روپیہ کھلے کھلے نہیں، شاطرانہ ڈاکے سے بنتا ہے، جس کی استعداد سنت رام میں نہ تھا۔ جب خسارہ ہوا تھا تو دھوبن یا لاڈو یا پال میں سے کسی نے اتنا بھی تو نہ کہا ــــ اے جی، یا پپا، کوئی بات نہیں، ایسا ہو جاتا ہے، آپ جی میلا کیوں کرتے ہیں؟ جیسے کھویا ہے، ایسے ہی پا بھی لیا جائے گا۔ جو پیسہ بنانے نکلتے ہیں، کھو بھی دیتے ہیں اور یہ ضروری نہیں کہ ہر نقصان اٹھانے والا بے وقوف ہوتا ہے۔ کیوں سب نے اسے بوڑھا اور سٹھیایا ہوا سمجھ لیا اور بیسیوں بار اس کی طرف دیکھے بغیر پاس سے گزر گئے تھے اور اسے یہ سمجھنے پر مجبور کر دیا تھا کہ وہ اس دنیا میں اکیلا ہے؟ اس کا تو یہی مطلب ہوا نا کہ اگر پھر سے اس کی مالی حالت اچھی ہو جائے تو وہ ان گزری ہوئی باتوں کو دل میں رکھ کر ایک ہنٹر ہاتھ میں پکڑ لے اور کسی بھی عنایت سے پہلے بیوی اور بچوں کو مار مار کر نیلا کر دے، نہیں؟ یہ شوہر اور باپ کا کرتو یہ نہیں لیکن یہ کیوں سمجھ لیا جائے کہ باپ کا کرتو یہ پیار دینا ہی ہے، لینا نہیں۔ گویا اسے پیار کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ پیار کی ضرورت کیسے نہیں ہوتی؟ ایک سال کے بچے کو ہوتی ہے تو سو سال کے بوڑھے کو بھی اور تو اور اپنے کا کرنپٹیل جمی کو بھی ہوتی ہے جو اس وقت کہیں اپنے ڈربے میں پڑا سو رہا ہے اور بیچ بیچ میں کہیں سے کوئی آواز آنے پہ بھونک اٹھتا ہے۔ کیسے پیار کی نظریں اس کی نظروں سے ملتی ہیں تو ایک پیغام اس کے دماغ سے دم تک چلا جاتا ہے جو کہ نہ صرف خود بے تحاشا ہلتی ہے بلکہ سارے بدن کو بھی ہلا ڈالتی ہے۔ جس دن اسے کوئی ایسی نظروں سے نہ دیکھے، وہ کھانا چھوڑ دیتا ہے گویا کہہ رہا ہے۔ میں بھوکا رہ سکتا ہوں لیکن پیار کے بغیر نہیں رہ سکتا اور یہاں دھوبن، لاڈو، پال نے اسے جمی کے برابر بھی نہ سمجھا تھا۔

شاید یہ سب اس لئے تھا کہ سنت رام نے زندگی میں صرف دینا ہی سیکھا تھا۔ اور اب یہ اس کی عادت ہو گئی تھی۔ وہ جب دیتا تھا تو جیتا تھا۔ لینے میں اس کی روحانی موت واقع ہو جاتی تھی۔ معلوم ہوتا تھا اسے کاروبار میں خسارے کا اتنا غم نہیں، جتنا اس بات کا ہے کہ اب وہ دے نہیں سکتا۔ اور جب گھر کے لوگ چپکے میں پاس سے گزر جاتے تھے تو وہ ان کی خاموشی کا عجیب الٹا سیدھا مطلب نکالتا تھا۔ وہ نہ جانتا تھا کہ لینے والوں کو بھی عادت پڑ سکتی ہے لینے کی، پھر دنیا بذاتِ خود ایک سامراجی عمل ہے جو لینے والوں، محکوموں کو تباہ و برباد کر ڈالتا ہے۔ اس سلسلے میں سنت رام، بہت سفاک واقع ہوا تھا۔ اس نے کئی بار ادھار لے کر بھی بیوی بچوں کو تحفے دیے جو انھوں نے لے لے کر رکھ لئے اور بے شعوری کی کھڑکیوں میں سے باہر جھانکنے لگے۔ کسی نے شکریے کا ایک لفظ

بھی تو نہ کہا اور نہ تشکر کی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ سب نے کتنے کمینے اور بزدلانہ طریقے سے اپنی محبت روک لی تھی یا شاید سنت رام کو اپنے گھاٹے کا اس قدر احساس ہو گیا تھا کہ گھر کے لوگوں کی نگاہوں میں اسے اپنے لئے تحقیر کے سوا اور کچھ دکھائی ہی نہ دیتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب وہ اپنے لئے نفرت اور تحقیر ہی کو پسند کرنے لگا ہے اور اس وقت تک خوش نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اپنی حالتِ زار پہ چند آنسو نہ بہا لے........

دھوبن کی چوبیس گھنٹے کی نیکنگ اور نصیحتوں کی سنت رام کو اتنی پرواہ نہ تھی کیونکہ وہ ان پڑھ اور بے زبان ہونے کے ساتھ محنتی بہت تھی اور اپنی صفائی پسند طبیعت سے بہت سی چیزوں کی تلافی کر دیتی تھی لیکن ایک رات بڑھے پیار کے لمحوں میں اس نے ہونٹ چرا لئے کیونکہ سنت رام کے منہ سے سگریٹ کی بو آتی تھی لیکن وہ تو بچپن ہی سے سگریٹ پیتا تھا۔ اب صدیوں کے بعد یہ بو کیسی؟ شاید وہ اسی خسارے کی بو تھی یا شاید دھوبن بوڑھی ہو گئی تھی اور ٹھنڈی اور خشک کیونکہ یہ جوانی اور اس کی گرمی ہی ہے جس میں بو اڑ جاتی ہے اور روئے زمین کی سب خوشبوؤں پہ چھا جاتی ہے لیکن اگر دھوبن ٹھنڈی اور خشک اور بوڑھی ہو گئی تھی تو وہ خود بھی تو جوان نہ رہا تھا۔ سنت رام! کیوں اسے اس عمر میں ہونٹوں کی طلب تھی؟ بوڑھے اور بے کیف ہونٹوں کی جن میں رس نام کو نہ تھا، ان پہ تو صرف جلی کٹی تھیں اور کوسنے جن کے سوا اور کچھ آ ہی نہ سکتا تھا۔ دھوبن سیدھی سادی اور نادان عورت تو یہ بھی نہ جانتی تھی کہ جب ہونٹ چرا لئے جائیں تو مرد پہ کیا بیت جاتی ہے؟ سنت رام انہی کی تلاش میں رل کر ان ہونٹوں پہ اپنے ہونٹو جا رکھتے ہیں جن پہ سوائے نجاست کے اور کچھ نہیں ہوتا۔

یا شاید دھوبن، سیر بن کی دھوبن پہ، مینو باز، چلا آیا تھا اور اس نے پہلو بدل لیا تھا اور یا اپنے سیج سے اٹھ کر، مور پنکھ کو ہاتھ سے پھینکتی ہوئی، دیکھنے والوں کی طرف سے منہ موڑ کر بیٹھ گئی تھی۔ نہ وہ جادو کے ڈبے والا رہا تھا اور نہ وہ معصوم دیکھنے والے۔ یا خود سنت رام پہ وہ وقت چلا آیا تھا جبکہ جوانی ایک بار پھر عود کر آتی ہے اور آدمی کئی بار بدنامی سے بال بال بچتا ہے۔ پہلے کی سی طاقت کے ساتھ شعور اور تجربہ بھی شامل ہو جاتے ہیں اور ایک پختگی اور رسیدگی پا جانے سے انسان خود ہی اپنے آپ میں تعفن پیدا کر لیتا ہے اور تھوڑے پانی والے پوکھر کی کیچ میں بھینس کی طرح لوٹنے لگتا ہے یا غالباً اس کی وجہ بھی وہی گھاٹا تھی، جو سنت رام نے اپنے کاروبار میں کھایا تھا اور مالی طور پر اپنے آپ کو غیر محفوظ پانے کا احساس محبت میں غیر محفوظ ہونے کے احساس میں بدل کر رہ گیا تھا۔

لاڈو کی تو خیر کوئی بات ہی نہ تھی۔ وہ تو بیاہی بس گئی اور اپنے گھر جا بسی۔ وہ تو اب بابل کے آنگن کی چڑیا تھی جو کہیں بھولے ہوئے دانوں کو چنتی ہوئی اڑ جاتی تھی لیکن پال تو یہیں تھا اور اسے یہیں رہنا تھا— اسی گھر میں، اسی چھت کے تلے، جہاں اسے بہو کو لانا اور اسے بسانا تھا۔ کہیں اور گھر لے لینے سے تو باپ کے گھر کی چھت نہیں بدلتی۔ وہ کیوں چند باتوں کو نہیں سمجھتا اور یا سمجھنا ہی نہیں چاہتا؟ کیوں اس کے پاس اپنے بہن بھائیوں، اپنے ماں باپ کے لئے چند منٹ بھی نہ تھے؟ امریکن فرم میں اگز کٹو ہو جانے سے کیا وہ کوئی خدا ہو گیا تھا؟ کیوں وہ اس فرم کے ذریعے سے پرائیوٹ کنٹریکٹ لینے اور یوں پیسہ پیدا کرنے میں کوئی عار نہ سمجھتا تھا۔ وہ کبھی تو باپ سے بات کرتا۔ وہ اس سے پیسے تو نہ مانگتا تھا۔ وہ تو فقط یہی چاہتا تھا کہ اس کا بیٹا اس کے پاس بیٹھے۔ دو تین جسم اکٹھے ہوں، جو ایک دوسرے سے نکلے ہیں۔ بدن، صرف بدن کا لمس ہو۔ یہ نہ بھی ہو تو آنکھیں ملیں جو باپ ہی پہ نہیں، آبا و اجداد پہ گئی ہیں۔ پاس بیٹھ کر وہ آج کی نئی تعلیم کی باتیں کرے، جس سے پرانے بہت پڑھے لکھے آدمی بھی پیچھے رہ گئے ہیں۔ کچھ ان کی دنیا کا پتہ چلے، کچھ اپنی دنیا انھیں دکھائی جا سکے۔ اس سے سیکھیں اور اسے بتا بھی سکیں کہ صرف تعلیم ہی بس نہیں۔ تجربہ بھی ضروری ہے اور چند حالات میں جیمز بانڈ کے علم سے بہت اوپر ہوتا ہے۔ وہ کبھی، کچھ تو مانگے اور کچھ نہیں تو مشورہ ہی سہی۔ کیوں وہ ایکا ایکی اس قدر خود مختار اور بے نیاز ہو گیا تھا؟ یہ دلیل کافی نہیں کہ وہ بڑا ہو کر، اب ماں باپ پہ کسی قسم کا بوجھ نہیں بننا چاہتا۔ بوجھ ہی کی بات ہے تو وہ اب بھی بوجھ ہے۔ کیسے کپڑے اتار کر دھوبن کے سامنے پھینک جاتا ہے اور چونکہ گھر میں کچھ پیسے دیتا ہے، اس لئے ماں ماں ہی نہیں رہی، سچ مچ دھوبن ہو گئی؟ گھر میں بیسیوں مہمان آتے جاتے ہیں۔ انھیں ایئرپورٹ سے لینا یا گاڑی پر چھوڑنے جانا صرف ماں باپ ہی کا فرض ہے اور کچھ نہیں تو لاڈو ہی کو لینے ملنے چلا جائے۔ وہ اپنی بیٹی ہے تو اس کی بھی بہن ہے۔ اگر پال یہ سب حرکتیں ناسمجھی کے عالم میں کرتا تو کوئی بات نہ تھی لیکن وہ تو بلا کا ذہین تھا اور ایک پل میں ہر معاملے کی تہہ تک پہنچ جاتا تھا۔ پارسال جب ایک نہایت امیر باپ کی اکلوتی بیٹی سے اس کا رشتہ ہونے کی بات چلی تو کھٹ سے اس نے انکار کر دیا اور بولا— دس سال مجھے آپ کے چکر سے نکلنے میں لگے ہیں، پپا! آپ چاہتے ہیں میں اور دس سال ایک امیر کی اکلوتی بیٹی کے چکر سے نکلنے میں گزار دوں؟

کتنے پتے کی بات تھی، سنت رام تو اسے سن کر چکت ہو گیا تھا اسے اس بات کا گورو بھی ہوا

کہ وہ میرا بیٹا ہونے کے ناطے بہت خوددار بھی واقع ہوا ہے اور افسوس بھی۔ افسوس اس لئے کہ باپ کے چکر سے نکلنے کا مطلب؟ کیا بیٹا باپ کے چکر سے نکل سکتا ہے یا باپ بیٹے کے چکر سے؟ کیا وہ ایک دوسرے سے کبھی الگ نہ ہو سکنے والا حصہ نہیں؟ کیا براعظموں کا فاصلہ ہونے پہ بھی وہ ایک دوسرے سے دور ہوتے ہیں؟ آخر وہ کون اندھا ہے، جسے وہ دوڑ دکھائی نہیں دیتی جو باپ بیٹے سے وقتی طور پر یا ہمیشہ کے لئے جدا ہوتے ہوئے اپنے پیچھے چھوڑتا اور چھوڑتا ہی چلا جاتا ہے؟ بیٹا چاہے باپ کے جانے کے بعد یہی کہے کہ میرا باپ نالائق آدمی تھا، ہزاروں کا قرض مجھ پہ چھوڑ کے چلتا بنا۔ اس پہ بھی تعلق تو رہتا ہی ہے نا؟ نالائق باپ اور لائق بیٹے کا تعلق۔ میں تو مر ہی نہیں سکتا، جب تک اپنی اولاد کے لئے کچھ چھوڑ کر نہ جاؤں۔ ایسا ہوا تو ان کی ماں دھوبن تو مجھے وہاں خدا کے گھر تک نہ چھوڑے گی اور میری روح کا تولیہ تک نچوڑ ڈالے گی لیکن میرے ماں باپ نے میرے لئے کیا چھوڑا تھا؟ اس پہ بھی ان کی عزت میرے دل میں کبھی کم نہ ہوئی کیا پیسہ اور جائداد چھوڑنے ہی سے کوئی باپ کہلانے کا مستحق ہوتا ہے۔ یہ بات تو اعداد و شمار ہی سے غلط ہے۔ ایک باپ مقروض مرتا ہے، جب ہی دوسرا جائداد بنا سکتا ہے نا؟ خیر، میرا تو ابھی تغلق رود پر ایک بنگلہ ہے۔ کیا ہوا گھاٹے کے بعد اس پہ تھوڑا پیسہ لے لیا؟ کیا میں اتنا ہی گیا گزرا ہوں کہ مرنے سے پہلے اس کا رہن بھی نہ چھڑا سکوں؟ پھر گاؤں جگ دل میں زمین ہے، دو سو بیگھہ جس میں سے کچھ بڑوں کی ہے اور کچھ میں نے اپنے پیسے سے بنائی ہے۔ کیا یہ میری ہمت نہیں کہ اتنی مصیبت آپڑنے پہ بھی میں نے اس کا ایک انچ نہیں بیچا؟ میں نے اس لئے نہیں بیچا نا کہ میرے پرکھوں کی روح کو تکلیف نہ ہو اور میرے بیٹے مجھے کوسنے نہ دیں۔ پھر بیمہ ہے۔ بہت ٹوٹ آئی تو خودکشی کر کے بیوی بچوں کو پیسہ دلوا سکتا ہوں، جبھی سنت رام کو اپنا باپ یاد آیا اور اس کی موت کا وقت، جس میں صدمے کی انتہا تھی اور اس کے بیچ ایک عجیب سی پراسرار خوشی بھی کہ اب و بھی اچھا برا کریں گے، اپنا کریں گے اور پال کے سلسلے میں اس بات نے سنت رام کو ایک عجیب طریقے سے مکت کر دیا۔ آخر کون بیٹا ہے، جو اپنے دماغ کے کسی کونے میں اپنے باپ کی موت کی خواہش لئے نہ بیٹھا ہو؟

سنت رام کو ایک عجیب سے سکون کا احساس ہوا۔ ساتھ کے کمرے میں آ کر اس زیرو پاور والا بلب جلایا اور اس کی مدھم سی روشنی میں لاڈو، اس کے بچے بابی اور پھر پال کا چہرہ دیکھا اور کچھ دیر کھڑا دیکھتا رہا وہ اپنے بیٹے میں جی رہا تھا اور پھر اپنے پوتے، پرپوتے میں.........

جبھی سنت رام کو ایک سگریٹ کی طلب ہوئی۔

ارے یار اسگریٹ بھی کیا چیز ہے جس نے بھی اسے ایجاد کیا، حد کر دی۔ کیا ایک ننھا سا رفیق زندگی کا جو آپ کے تنہا لمحوں میں کسی دوسرے کے موجود ہونے کا احساس دلاتا رہتا ہے اور اس کے نام سے آپ کبھی اکیلا نہیں محسوس کرتے بلکہ وہ خود زندگی ہے، جس کا ایک کنارہ خود زندگی ہی کی طرح دھیرے دھیرے سلگتا اور دوسرا موت کے منھ یا منھ کی موت میں پڑا ہوتا ہے۔ وہ آپ کی ہر سانس کے ساتھ جیتا اور مرتا ہوا خود راکھ ہو جاتا ہے لیکن آپ کے بکھرے ہوئے خیالوں کو ایک نقطے پہ سمیٹ لاتا ہے۔ آپ چند ایسے راز سمجھ چکے ہوتے ہیں، جن کے بعد اور کچھ سمجھنے کی ضرورت ہی نہیں رہ جاتی۔ لوگ کہتے ہیں، اس سے کینسر ہو جاتا ہے — ہوا کرے...... جو لوگ سگریٹ نہیں پیتے، وہ کون سی خضر کی حیات جیتے ہیں۔ دنیا کے ہر بشر کو آخر کوئی نہ کوئی بہانہ تو موت کو دینا ہے۔ سگریٹ کا بہانہ کیوں نہ ہو۔

رات جب سنت رام گھر لوٹا تو سگریٹ لانا بھول گیا تھا اور اس وقت ساڑھے چار بجے دکانیں بند تھیں اور سنت رام کی طلب کھلی جو کھلتی ہی جارہی تھی۔ سامنے بیٹے پال کے سگریٹوں کا پیکٹ پڑا تھا جس کے اوپر ماچس رکھی تھی۔ پال شہزادہ ہونے کے کارن اسٹیٹ ایکسپریس سے اِدھر سگریٹ ہی نہ پیتا تھا۔ حالانکہ اس کے باپ، سنت رام کو چار مینار سے لے کر قینچی اور گولڈ فلیک تک سب چلتے تھے۔ اسٹیٹ ایکسپریس پی لوں؟ کیا ضرورت ہے؟ کیا میں چھ سات چھ بجے تک انتظار نہیں کر سکتا جب کہ پان بیڑی کی دکانیں کھلنے لگتی ہیں؟ لیکن اگر انتظار کرنے دے تو پھر وہ سگریٹ نہیں، دودھ کا گلاس ہوا سنت رام کا ہاتھ پیکٹ کی طرف لپک گیا۔ زیرو پاور کے بلب کی روشنی میں اس نے دیکھا، پیکٹ میں صرف دو ہی سگریٹ تھے۔ ایک تو باتھ روم کے لئے چاہئے ہی تھا اور دوسرا؟ کیا پتا ایک سگریٹ سے اس کا کام نہ چلتا ہوا اور دوسرے کی بھی ضرورت محسوس ہو۔ اس وقت نہیں تو شیو کے بعد سہی۔ یا ناشتے کے بعد۔ اس علاقے میں اسٹیٹ ایکسپریس کہاں ملتے ہیں جو اڑا لینے کے بعد نو دس بجے سے پہلے چوری چھپکے رکھ دیئے جائیں جب کہ پال اٹھتا تھا۔ رکھ بھی کیسے دیئے جائیں کیوں کہ ان سگریٹوں کے لئے کناٹ پلیس جانا اور آنا پڑتا تھا جس کا مطلب تھا آدھا گیلن پٹرول پھونک دینا — ایک سگریٹ کے لئے! اس سے اچھا ہے کہ چھ ساڑھے چھ بجے تک انتظار کر لیا جائے۔

لیکن صاحب، سگریٹ جب بلاتا ہے تو اتنی زور کی آواز دیتا ہے کہ کانوں کے پردے پھٹ جاتے ہیں۔ وہ آواز نہ پینے والوں کو سنائی نہیں دیتی۔ ان کے کان سر میں نہیں ہوتے نا۔ کیوں نہ بھیکو، اپنے نوکر سے سگریٹ لے لیا جائے؟ وہ تو بیڑی پیتا ہے، بیڑی ہی سہی۔ لیکن بھیکو کو اس کی کمبھ کرن کی نیند سے جگانے کا مطلب تو یہ ہوا کہ پورا پہاڑ کھودوا اور پھر اس سے ایک کنکری کی فرمائش کرو کیوں کہ بھیکو ہمیشہ ہڑ بڑا کر، کیا ہوا کیا ہوا کہتا ہوا اٹھتا تھا جس سے گھر کے سب لوگ جگ جاتے تھے۔ اس کمینے کی نیند بدعنوانیوں کی وجہ سے کبھی ن پکتی تھی۔ ارے ہاں باہر چوکیدار بھی تو ہے۔ سنت رام نے دروازہ کھول کر جھانکا اور بتیوں کی روشنی مین ادھر ادھر دیکھا۔ چوکیدار کا کہیں تخم بھی نظر نہ آتا تھا۔ پونے پانچ بجے تھے اور وہ اپنی سمجھ میں پانچ بجا کر، اپنی ڈیوٹی پوری کرتے ہوئے کسی چور کے ساتھ جا سو یا تھا۔ بیکار ہی ہم لوگ اسے پیسے دیتے تھے۔ کون سا ڈاکہ پڑنے والا تھا جبکہ سامنے پولیس کی چوکی تھی؟ بھیکو، چوکیدار یا چوکی کے کسی سنتری سے بیڑی مانگنے سے تو یہی اچھا ہے کہ اپنے بیٹے کا اسٹیٹ ایکسپریس پیا جائے۔ اسے برا تو لگے گا مگر جو ہو گا دیکھا جائے گا.....

چنانچہ سنت رام نے پیکٹ اٹھایا اور ایک سگریٹ نکال کر سلگایا، ایک ہی کش سے سنت رام کا اضطرار آدھا رہ گیا تھا، دوسرے کش سے ایک چوتھائی۔ اس حساب سے تو تیسرے چوتھے کش سے پوری تسلی ہو جانی چاہئے تھی۔ لیکن سگریٹ کا بھی عجیب صاحب کتاب ہوتا ہے، جیسے اضطرار کا اپنا لا جک۔ چوتھے کش کے بعد اضطرار کے کم ہونے کی رفتار گھٹ جاتی ہے اور سگریٹ کے جلنے کی زیادہ۔ بہرحال بہت مزہ آیا۔ اسٹیٹ ایکسپریس اتنا اسٹرانگ سگریٹ تو نہیں جتنا چار مینار مگر اچھا ہے۔

پورا سگریٹ پی چکنے کے بعد سنت رام کو محسوس ہوا کہ اس نے برا کیا وہ تھوڑی دیر کے لئے ایک سگریٹ کے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔ نہیں۔ جوانی میں آدمی اپنے حواس پہ قابو رکھ سکتا ہے، بڑھاپے میں نہیں۔ آخر بیٹے کا سگریٹ پیا ہے نا؟ مجھے خوشی ہونی چاہئے اور اگر وہ میرا بیٹا ہے تو اسے بھی کیسا مزا آیا۔ چھوٹی چوری میں بہت مزہ ہوتا ہے۔ جبھی بابی کے بڑبڑانے کی آواز آئی۔ ماروں گا، میں تم کو ماروں گا۔ وہ خواب میں کسی سے لڑ رہا تھا۔ لاڈو نے آدھے سوئے آدھے جاگے عالم میں اسے تھپکنا شروع کیا۔ سو جا بابی، سو جا۔ بابی سو گیا اور وہ بھی سو گئی۔ پال کو کچھ پتہ نہ تھا۔ اس کے خراٹے تو جا چکے تھے۔ البتہ ناک میں کوئی چیز اڑے ہونے کے کارن سیٹی سی بج رہی تھی۔ جبھی اندر سے دھوبن کی آواز آئی۔

''سگریٹ پی رہے ہو؟''

''ہاں۔'' سنت رام نے وہیں سے کہا۔

جس کے جواب میں وہ بولی: ''صبح صبح شروع ہو جاتے ہو۔ دن تو چڑھنے دو..... یوں کلیجہ جلانے سے بیمار ہو گے کہ نہیں ہو گے؟''

سنت رام نے دل ہی دل میں کہا — میری بیماری کی جیسے بہت پروا ہے۔ یہ گھر کے لوگ۔ جب پروا کرنی ہوتی ہے تو نہیں کرتے اور جب نہیں کرنی ہوتی تو کرنے لگتے ہیں۔ اس نے اندر کے کمرے کی طرف منہ کر کے صرف اتنا کہا: ''تم سو جاؤ، ابھی سوا پانچ ہوئے ہیں۔''

دھوبن کی آواز اس انگڑائی میں سے چھن کر آئی: ''نہیں، مجھے ہیٹر لگانا ہے۔ پانی گرم کرنا ہے۔ بہت کپڑوں کا ڈھیر ہے........''

جبھی دھوبن کے اٹھنے کی آواز آئی۔ ہاں صاحب، جب عورتیں اٹھتی ہیں تو وہ اس بات کا رکھ رکھاؤ نہیں کرتیں کہ کھٹ پٹ سے کوئی ڈسٹرب ہوگا۔ وہ بستر کی چادر کو چھانٹ رہی تھی، جیسے اس پہ کہیں ریت آپڑی ہو۔ پھر الماری کی کیں سنائی دی اور اس میں سے دودھ کے لئے پیسے نکلے۔ پھر سینڈل کی کھٹ کھٹ جو برسوں پہلے اچھی لگتی اور دماغ میں فتور پیدا کرتی تھی، اب یوں معلوم ہوتا تھا، جیسے ہتھوڑے پڑ رہے ہیں۔

چادر چھانٹتے ہوئے دھوبن کی آواز آئی:

''اوف، اوف........ دماغ جل گیا ہے، سگریٹ کی بو سے۔''

''اچھا اچھا!'' سنت رام نے کہا۔ ''تمھیں بو آتی رہتی ہے۔''

دھوبن کو واقعی بہت بو آتی تھی، جو غالباً عمر کا تقاضا تھا۔ چوتھے کمرے میں کوئی سگریٹ پئے۔ اسے وہیں سے پتہ چل جاتا تھا۔ ایسے ہی وہسکی شراب کا چاہے کسی نے صرف چکھا ہی ہوا ہو، اس کی کنجوسی، اس کے اخلاقی طور پر اچھا ہونے سے گھر کے سب لوگوں کو چور بنا دیا تھا، سب بے حال ہو کر علتیں کرتے اور پھر انھیں چھپانے کی کوشش کرتے تھے لیکن دھوبن سے کوئی چھپا نہ سکتا تھا۔ کئی بار ایسا ہی ہوا کہ آپ نے باہر نکل کر، بالکنی پر جا کر سگریٹ سلگایا لیکن جب مڑ کر دیکھا تو دھوبن موجود، جس سے سگریٹ کا مزہ ہی جاتا رہا۔ اس کی اس روک ٹوک نے پال میں بغاوت کا جذبہ پیدا کر دیا تھا۔ اب وہ کھلے بندوں سگریٹ پیتا تھا بلکہ اس نے اسکاچ کی ایک بوتل گھر ہی میں

لا رکھی تھی۔ باہر سے آنے پر جب اسے محسوس ہوتا، شراب کم پڑی ہے تو ایک آدھ پیگ گھر ہی میں لگا لیتا۔ ماں سے اس کی کئی بار لڑائی ہوئی تھی۔ دھوبن آخر اس سے ہار گئی تھی۔ اس نے کہا بھی تو اتنا:

''میرا کیا ہے؟ جو آئے گی، اپنی قسمت کو روئے گی۔''

سگریٹ!.......دراصل مرد اور عورت کے مرد کی بو کو ایک ہونا چاہئے، ورنہ سب تباہ ہو جاتا ہے۔ اس تباہی کے کارن سنت رام نے اپنی ٹائپسٹ ڈولی کو پہلے سگریٹ پلا لیا تھا!

پال اٹھے گا تو کیا کہے گا؟ یوں ایک سگریٹ پی لینے میں تو کوئی بات نہیں لیکن کسی عمل، کسی ذائقے کا تکمیل نہ پانا برا ہوتا ہے۔ یہ ایسے ہی ہے، جیسے دو محبت کرنے والوں میں کوئی تیسرا آجائے۔ پھر پال کئی باتوں میں کس قدر کمینہ ہے۔ ایک بار اس کا جوتا پہن لیا تو وہ کتنا جز بز ہوا تھا۔ اس نے جوتے کو یکسر پھینک ہی دیا اور کہنے لگا میرے اور پپا کے پیر ایک ہیں کیا؟ اب یہ کھل گیا ہے اور میرے کام کا نہیں۔ سنت رام کو بہت دکھ ہوا۔ اور ایک بار بیٹے کا جوتا پہن لیا تو کیا ہو گیا؟ بیسیوں بار اس نے میرا چپل پہنا ہے، میں نے تو کچھ نہیں کہا ہے۔ الٹا مجھے خوشی ہوئی، اس احساس کے ساتھ۔ میرے بیٹے نے میرا جوتا پہنا ہے اور بڑوں کا یہ کہا بھی دماغ میں آیا کہ جب باپ کا جوتا بیٹے کو برابر آجائے تو پھر اسے کچھ نہیں کہتے۔ چنانچہ جب سے میں نے سب کہنا سننا چھوڑ دیا۔ نہیں ایک بار اس نے کسی اسمگلر سے امریکی جرکن خریدی تھی جو مجھے بہت اچھی لگی۔ پال کو بھی بہت اچھی لگی تھی، جبھی تو اس نے خریدی لیکن میں ہمیشہ کی طرح اپنے بڑھاپے کے کارن، اپنے پہننے کے جذبے کو روک نہ سکا۔ چنانچہ میں نے پہن لی۔ اس کے رنگ بڑے شوخ وشنگ تھے اور مجھے اسے پہننے میں بہت مزا آیا لیکن پہلے تو دھوبن نے میرے مزے کو کرکرا کیا۔ وہ مجھے دیکھ کر ہنس دی۔

''کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

وہ اندر ہی اندر اپنی ہنسی دبائے ہوئے بولی: ''کچھ نہیں.........'' در پھر وہ رہ بھی نہ سکی اور کہنے لگی: ''کیسے گھوم رہے ہو، جیسے دیسی مرغا مرغی کے گرد گھومتا ہے!''

یہ جذبات کا دھوبی پٹرہ تھا۔ خیر —

لیکن رہی سہی کسر پال نے ہی پوری کردی۔ میں نے اپنا شوق پورا کرنے کے بعد اس جرکن کو بڑی احتیاط سے وارڈروب میں ٹانگ دیا لیکن صبح ہی تو پال جرکن کو میرے پاس لے آیا اور بولا: ''پپا! آپ ہی اسے پہن لیجئے۔''

میں نے مجرمانہ انداز سے کہا: ''کیوں — تم کیوں نہیں پہنتے؟''

''یہ میرے کام کا نہیں رہا۔'' وہ بولا۔ ''دیکھتے نہیں آپ کا پیٹ بڑا ہے۔ آپ کے پہننے سے الاسٹک چلا گیا ہے، اس کا۔''

مجھے بے حد غصہ آیا اور میں اس پہ برس پڑا۔ میں نے کہا: ''میں تمہارا باپ ہوں، جرکن پہن لی اور تمہارا نقصان کر دیا؟ تم نے سیکڑوں نہیں ہزاروں بار میرا نقصان کیا ہے۔ میں نے کبھی تمہیں کچھ کہا ہے؟ الٹا میں خوش ہوا ہوں۔ چلو یوں کہہ لو کہ باہر سے ناراضی کا ثبوت دیا ہے لیکن اندر سے میں کتنا خوش تھا! تم سیکڑوں بار میری قمیض میرا جوتا پہن گئے ہو۔'' میں نے یہی کہا — ''میرا بیٹا، میرے کپڑے پہنتا ہے اور تم نے اسی طرح اس دن تین گھوڑے والی بوسکی قمیض میرے منہ پہ دے ماری۔ تم نہایت کیسے، نہایت بے شرم آدمی ہو۔''

بجائے اس کے کہ پال کو افسوس ہو، وہ میرے ساتھ دلیل بازی پر اتر آیا۔ ''آپ پان کھاتے ہیں۔'' وہ کہنے لگے۔ ''اور اس کا کوئی نہ کوئی چھینٹا اس پہ پڑ جاتا ہے، کیا وہ قمیض پھر میرے پہننے کے لائق رہتی ہے۔''

ان دنوں بھی لاڈو یہاں، اپنے مائیکے آئی ہوئی تھی۔ اس جھگڑے میں وہ بھی پاس آ کھڑی ہوئی اور بول اٹھی: ''پپا بالکل میری طرح ہیں......''

ان دنوں چھوٹے دونوں بھی جو اس وقت اپنے ماموں کے ہاں گڑگاؤں گئے ہوئے تھے، یہیں تھے چھٹکی بھیکو کی مدد سے بستر کی سلوٹیں نکالتی ہوئی بولی: ''ہاں! بات کرتے ہیں تو لاڈو دیدی کی طرح منہ کہ ساری پھوار سامنے والے پہ چھوڑ دیتے ہیں۔ تماشا اس وقت ہوتا ہے جب کہیں پپا اور لاڈو آپس میں بات کر رہے ہوں، تو۔''

لاڈو ہنس رہی تھی، دوسرے سب سن رہے تھے۔ نہ چاہنے کے باوجود میرے چہرے پہ بھی مسکراہٹ چلی آئی تھی۔ بات سنجیدہ رہی تھی اور نہ مضحک۔ میں نے ٹالتے ہوئے کہا بھی تو اتنا: ''ہاں آخر لاڈو کا باپ ہوں نا، اس پہ گیا ہوں۔''

اور تو اور، چھوٹا دمن بھی ہنس رہا تھا، نجلیوں کی طرح۔ پھیپھڑے پیدائشی طور پر کمزور ہونے کے کارن وہ کبھی کھل کے نہ ہنسا: ''ہی ہی، پان کھاتے ہیں نا پپا۔'' اس نے کہا: ''تو قمیض پہ سامنے تو لگتا ہی ہے لیکن پیٹھ پہ نہ جانے کیسے لگتا ہے؟'' یہ سمجھتے تھے۔ میں پان منہ سے تو کھاتا ہی نہیں،

قمیض سے کھاتا ہوں۔اس پہ طرفہ دھوبن نظر پہ چلی آئی۔میرا خیال تھا ماں ہونے کے ناتے وہ باپ کا پکش لے گی۔لیکن صاحب، اس نے الٹا بیٹے بیٹیوں کی تائید شروع کر دی: ''کیا پوچھتے ہو ان کا؟'' وہ بولی: ''بالکل بابی ہیں دوسرے، کھانا کھائیں گے تو سالن کرتے پہ گرا ہوگا، لکھنے بیٹھیں گے تو سیاہی۔میں ان کا کروں کیا؟ پتا تو مجھے چلتا ہے، نا دھوتے دھوتے جس کے ہاتھ رہ جاتے ہیں، پر میری قسمت۔عمر گزر گئی میری، ان کے دماغ نکالتے نکالتے.........''

صرف ایک بابی رہ گیا تھا۔اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا بانس تھا، جس سے وہ ''بڈھا بابا'' کو بھگا رہا تھا: ''ماروں گا۔'' وہ خلا میں خیالی دشمن کو خطاب کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا، جیسے اس کا بڈھا بابا، اس کا خیالی دشمن میں ہوں، پھر جمی کے بھونکنے کی آواز آئی، جسے آپ اتفاقیہ بات کہہ لیجئے۔بھیکو بجلی کا بل چکانے چلا گیا تھا، ورنہ وہ اپنی مکھی بولی میں کہتا: ''ہم میاں بی بی کا جھگڑا میں ناہیں پر یو۔'' اور یہ بات اور بھی میرے خلاف ہو جاتی۔گھر بھر میرا دشمن ہو گیا تھا۔ایسا پہلے تو نہ تھا، چند برس پہلے۔جب سے مجھے کاروبار میں گھاٹا پڑا ہے، دنیا ہی بدل گئی ہے۔کسی کو میری بات ہی پسند نہیں۔یا شاید میں بوڑھا ہو گیا ہوں، اس لئے سب کو برا لگتا ہوں، مجھے ان کے سامنے سے ٹل جانا چاہیئے، اس دنیا سے ٹل جانا چاہئے لیکن میں جاؤں تو کہاں جاؤں؟ میں نے اس گھر ان لوگوں پہ اپنی جان بھی وار دی۔نہ کسی کلب کو ممبر ہوا، نہ ریس کورس پہ گیا۔یہ تو یہ، کوئی پکچر بھی ڈھب سے نہ دیکھی۔کام کام اور کام تفریح کے لئے ایک لحہ نہیں۔اسی لئے میں ذہنی طور پر بیمار ہو گیا ہوں۔شاید پاگل، پاگل نہیں تو سنکی ضروری ہوں۔کبھی پاگل یا سنکی کو پتا چلا ہے کہ وہ کیا ہے؟ اسے تو صرف دوسرے جانتے ہیں، کبھی کبھی ان کی شکلوں سے اپنی شکل کا پتا چلتا ہے۔نہیں، یہ بات نہیں۔خدا، کسی کو خسارہ نہ ہو۔جوانی میں جو ہونا ہے ہو جائے، لیکن اس ڈھلتی عمر میں نہیں، جب کہ مدافعت کی ساری قوتیں ختم ہو جاتی ہیں۔بچوں کا فادر امیج گڑبڑ ہو جاتا ہے، اور بیوی کا بھی.....

پال آٹھ بجے اٹھ گیا تھا۔اسے اٹھتے دیکھ کر سنت رام سنسنا گیا ڈرنے کی ایک نشانی یہ ہے کہ آدمی سامنے یا دل میں کہنے لگے۔میں کسی سے ڈرتا ہوں؟ سنت رام پہ اچھی طرح واضح ہو چکا تھا کہ وہ اپنے بیٹے سے ڈرتا ہے وہ نہیں چاہتا تھا معاملے کو اس سطح پر لے آئے، جس سے بیٹا یہ کہے کہ میں اس گھر میں نہیں رہوں گا۔پال تو چاہتا تھا ایسا موقع پیدا ہو..........کوئی سنے تو ہنسے۔بیٹے کا

ایک صرف ایک سگریٹ پی لینے سے اتنا ڈر اور اتنی ذہنی بک بک؟

چائے سے پہلے پال نے باپ کی طرف دیکھا اور معمول کی نمسکار کی جس کے جواب میں سنت رام نے سر ہلا دیا اور اپنی نگاہیں نیچی کرلیں۔ وہ چاہتا تھا کہ پال دوسری طرف دیکھے تو وہ اس کی طرف تکے۔ لیکن پال نے برابر اپنا منہ باپ کی طرف کر رکھا تھا جس سے گھبرا کر سنت رام نے اپنا چہرہ ''ہندوستان ٹائمز'' کے پیچھے چھپالیا۔ پھر اسے تھوڑا ہٹا کر دیکھا تو پال سڑک سڑک چائے پی رہا تھا جس کے بعد اس نے کھٹ سے پیالی پرچ میں رکھی۔ پھر وہ سگریٹ کا پیکٹ تھامے باتھ روم کی طرف نکل گیا۔

اب تک تو سب ٹھیک تھا۔ پال نے پیکٹ کھول کر نہیں دیکھا تھا نا۔ جب وہ باتھ روم جائے گا، تب اسے پتا چلے گا اور سنت رام بیٹے کے باہر آنے اور اس کا چہرہ دیکھنے کے لئے یوں ہی ادھر ادھر ہوتا رہا۔ دھوبن نے کہا— نہاؤ گے نہیں؟ تو جواب میں جھلاتے ہوئے سنت رام نے جواب دیا...... تمہیں نہانے کی پڑی ہے۔ ایک ہی بار نہاؤں گا۔

دھوبن حیرانی سے سنت رام کے چہرے کی طرف دیکھنے لگی، پھر اس کی ہنکار کو معمول کی لایعنی سمجھ کر ناشتے کے دھندے میں مشغول ہوگئی۔

تھوڑی دیر میں پال باتھ روم سے آیا تو اس کے ہونٹ بھینچے ہوئے تھے۔ ماتھا کچھ اور پیچھے ہٹ گیا تھا۔ وہ واش بین میں جلدی جلدی اپنے ہاتھ صابن سے دھو رہا تھا۔ اتنی جلدی کیا تھی؟ کیوں وہ جلدی بھاگ جانا چاہتا تھا؟ سامنے اس نے آئینے میں اپنے چہرے کی طرف دیکھا۔ منہ سے جھاگ لپٹ رہے تھے۔ نہیں، ہاتھ دھوتے ہوئے جھاگ اڑ کر چہرے پہ چلے آئے تھے۔ چونکہ ابھی صابن سے اٹے تھے، اس لئے اس نے کرتے کے بازو سے جھاگ کو پونچھ دیا اور پھر اپنا چہرہ دیکھنے لگا، اس کے نتھنے پھول رہے تھے۔ دوسروں کو دیکھ کر نتھنے پھلانا تو سمجھ میں آتا تھا لیکن اپنے آپ کو دیکھ کر نہیں۔ ہاتھ دھوتے ہوئے پال لوٹا تو دھوبن نے آواز دی: ''رات تم پھر پی کر آئے تھے؟''

پال نے کوئی جواب نہ دیا۔ صرف اتنا کہا: ''ہاں، آج پھر پینے والا ہوں۔''

دھوبن تن گئی۔ وہ ایسی دبنے والی تھوڑی تھی؟ اس نے صاف کہہ دیا: ''آج پی کر آئے تو میں دروازے میں قدم نہ رکھنے دوں گی۔'' جس کے جواب میں پال نے کہا: ''آنا کون چاہتا ہے، اس جیل خانے میں؟ میں نے پہلے ہی گولف لنکس میں ایک کمرہ دیکھا ہے۔'' پھر دھوبن کی پائیدار

آواز آئی: ''نکل جاؤ، ابھی نکل جاؤ۔'' جس سے سنت رام کی جان نکل گئی۔

''دیبی'' سنت رام نے کڑک کر کہا: ''کیا کہتی ہو، یہ گھر تمہارا ہے؟''

اسی پنچم میں دھوبن نے جواب دیا: ''ہاں میرا ہے، جانا ہے تو جائے۔ تم بھی جانا چاہتے ہو تو جاؤ، بھلا ہو تم باپ بیٹوں کا، جنھوں نے جینا سکھا دیا۔'' اور پھر وہ رونے لگی........

سنت رام اسی بات سے تو ڈرتا آیا تھا کہ ایسا موقع نہ آئے۔ بیٹے کی بدعنوانیوں کو دیکھ دیکھ کر وہ اندر سے کڑھتا رہتا تھا لیکن باہر سے کچھ نہ کہتا تھا۔ یہ کہنا تو بہت آسان ہوتا ہے۔ چلے جاؤ، مگر پھر واپس آجاؤ کہنا مشکل۔ پال کے باقی کام کی رفتار اور بھی تیز ہوگئی۔ وہ جلدی جلدی شیو بنا رہا تھا اور اپنی تھوڑی پر بیشمار رقط لگا رہا تھا اور خون پونچھ رہا تھا۔ اس نے ماں کو ایسا جواب کیوں دیا؟ وہ ماں کو الٹی سیدھی کہتا تھا، تو سنت رام کو تکلیف ہوتی تھی اور ماں اسے کچھ کہتی تو اذیت۔ لیکن ماں بیٹے کا رشتہ زیادہ قدرتی تھا، جس سے وہ ایک دوسرے کو سن سنا کر پھر ایک ہو جاتے تھے مگر آج پال کا انداز یہی تھا کہ وہ جائے گا تو پھر نہیں آئے گا.........

''آنا کون چاہتا ہے، اس جیل خانے میں؟'' اس کا کیا مطلب۔ پال کچھ نہیں کہہ رہا تھا۔ لیکن اندر سے محسوس کر رہا تھا کہ اس گھر میں آنے کا کیا فائدہ، جہاں کوئی چیز اپنی نہ رہ سکے۔ جوتا، نہ جرکن اور نہ سگریٹ۔ پھر پال جلدی جلدی نہایا اور کپڑے پہنتے ہوئے بات کے پاس سے گزر گیا۔ سنت رام نے اسے بلانے کی کوشش کی لیکن اس نے آنا کانی کر دی۔ اخبار بھی اٹھا کر نہ دیکھا اس نے اور اسٹیٹ ایکسپریس کا سگریٹ پوری نفرت سے کھڑکی کے باہر پھینکتا ہوا وہ نکلنے لگا۔ دھوبن تو اس سے لڑ بیٹھی تھی، اس لئے اس نے بیٹے کو ناشتے کے لئے بھی نہ پوچھا۔ سنت رام نے اسے روکنے کی کوشش کی اور آواز دی: ''بیٹا ناشتہ تو کر لو۔''

''نہیں۔'' پال نے مصمم جواب دیا اور باہر نکل گیا جس انداز سے اس نے پیچھے زور سے دروازہ بند کیا تھا، اس سے روح تک میں تشنج پیدا ہو گیا۔

پال کے جاتے ہی دھوبن اور سنت رام میں ٹھن گئی۔ وہ تو اسے صرف اس فضیحت کے سلسلے میں مطعون کر رہا تھا لیکن دھوبن ایک طرف روئے جا رہی تھی اور دوسری طرف کوسنے دے رہی تھی۔ اسی سلسلے میں وہ نئے پرانے سب دفتر کھول بیٹھی۔ اس کی باتوں سے تو ایسا پتا چلتا تھا کہ اس گھر میں آ کر اس نے کبھی کوئی سکھ ہی نہیں دیکھا۔ وہ بہت پھوٹی قسمت والی تھی حالانکہ سنت رام

سمجھتا تھا کہ اس دنیا کا کوئی سکھ نہیں جو اس نے بیوی کو نہ دیا ہو اور اگر دکھ ہی دیکھا ہے تو ساتھ اس نے بھی تو دیکھا ہے لیکن بیوی نہ صرف اپنے بلکہ پوری اولاد کو تباہ و برباد کرنے کا ذمہ دار سنت رام کو ٹھہرا رہی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی: ''پہلے یتیم بھائی بہنوں کے سلسلے میں مجھے ڈانٹتے، لڑتے جھگڑتے رہے میرے ساتھ، پھر دوست مجھ پر لاد دیئے۔ ایک ہاتھ سے بچہ کھلا رہی ہوں اور دوسرے سے روٹیاں پکا رہی ہوں، ان بڑکٹوں کے لئے۔ اب قصائی اولاد کے حوالے کر دیا۔ اتنی چھوٹ دے دی۔ پیسے کپڑے کی جس سے وہ نالائق نکل آئے۔ سب کے سب اور اب بیٹے کی یہ ہمت کہ وہ تمہارے ہوتے سوتے مجھے آنکھیں دکھائے۔''

سنت رام حملے کے بجائے مدافعت پہ اتر آیا۔ واقعی وہ کیا تھا جو بیوی کو بچوں سے نہ بچا سکتا تھا اور نہ بچوں کو بیوی سے۔ جب تک لاڈو بھی جگ گئی اور آنکھیں پونچھتے ہوئے منظر کو دیکھنے لگی۔ کاش وہ تھوڑی دیر پہلے اٹھ جاتی اور اپنے بھائی کو جانے سے روک لیتی۔ وہ میرا بیٹا ہے تو اس کا بھی تو بھائی ہے لیکن ماں کو روتے دیکھ کر وہ اس کی طرف ہو گئی۔ بظاہر اس نے ماں ہی کو چپ کرنے کے لئے کہا اور سنت رام کی طرف دیکھ صرف لیکن اس کے دیکھنے ہی میں کیا کچھ نہ تھا، جس نے سنت رام کے اور بھی اوسان خطا ہو گئے اور اس کے بعد وہ بچے کو سنبھالنے لگی اور گھر میں اپنے میاں کو ٹیلیفون کرے تا کہ وہ آئے اور اسے لے جائے۔ اس کے بعد ایک خاموشی سی چھا گئی، جس میں دھوبن کے سسکنے کی آواز سنائی دے جاتی تھی۔ یہ خاموشی........لاڈو اور دوسرے بچوں نے بھی تو یہ سمجھ لیا تھا کہ روز کا معاملہ ہے کون اس پہ سر دھنے؟ یہ کیا میرا ہی معاملہ تھا؟ سنت رام نے سوچا۔ گھر کے کسی اور بشر کا نہیں؟ پال تو پہلے ہی سے بھرا بیٹھا تھا۔ ماں کے بات کرنے سے پہلے۔ دھوبن کی بات تو صرف ایک بہانہ ہو گئی۔ وہ چاہتا تھا پال کو کوئی سا بھی بہانہ دے لیکن اس نے نہیں تو اس کی ماں نے اسے دے دیا کیونکہ وہ جل بھن گیا تھا۔ پیکٹ میں صرف ایک ہی سگریٹ پا کر........

سنت رام دفتر میں داخل ہوا تو اس نے کسی کے علیک سلیک کا جواب نہ دیا لیکن ان لوگوں کو کیا پروا تھی؟ آج صاحب کا موڈ اچھا نہیں، کسی نے کہا۔ پھر، دوسری طرف سے آواز آئی: ''اچھا کب ہوتا ہے؟''

کیبن میں داخل ہوتے ہی چپراسی چندو سے سنت رام نے سگریٹ کا پیکٹ منگوایا۔ چندو ہمیشہ پہلے ہی سگریٹ خرید کر رکھتا تھا۔ وہ اپنی جیب سے دام خرچ کر دیتا اور جب مالک سے مل

جاتے تو جیب میں ڈال لیتا۔ سنت رام نے اپنا کوٹ مانگا۔ پیکٹ پر سے کاغذ پھاڑا سگریٹ نکالا، سلگایا اور کام کرنے بیٹھ گیا۔ لیکن آج سنت رام کا جی کام میں نہ تھا۔ ایک شدید ڈر نے اس کے جسم وذہن کو ماؤف کر دیا تھا۔ ایک شدید ڈر نے اس کے جسم وذہن کو ماؤف کر دیا تھا۔ اس نے گھونے والی کرسی پیچھے ہٹتے ہوئے اپنی ٹانگیں میز پر رکھیں اور سگریٹ کے دو چار لمبے لمبے کش لگاتے ہوئے سوچنے لگا۔ میں نے کیسے تباہ کر دیا ہے، گھر کے لوگوں کو؟ بیوی اور بچوں کو! میں معمر ہونے کے باوجود پڑھتے رہنے کی وجہ سے آج کل کے زمانے کا ہوں۔ میں نے شوہر اور باپ بننے کی بجائے ان سے دوستی رکھنے کی کوشش کی۔ شاید یہی قصور تو نہیں میرا؟ میں نے ایسی باتیں کیں جو پرانے خیال کے باپ نہیں کرتے۔ جب وہ کالج جا رہی تھی تو میں نے کہا تھا — وہاں مخلوط تعلیم ہے لاڈو۔ وہاں لڑکیاں بھی ہوں گی اور لڑکے بھی اور لڑکے قریب ہونے کی کوشش کریں گے۔ آج کل ہماری معاشرت میں ایک نئی چیز آ گئی ہے، جسے گڈ ٹائیم کہتے ہیں۔ گڈ ٹائیم، گڈ ٹائیم ہے لیکن مرد اور عورت میں جو بنیادی فرق ہے، اسے تم مت بھولنا۔ مرد پہ کوئی ذمہ داری نہیں۔ بشرطیکہ وہ اپنے اخلاق، اپنی تہذیب سے اسے قبول نہ کرے لیکن عورت پہ بہت ہے کیونکہ بچہ اسے اٹھانا پڑتا ہے، اسی لئے دنیا بھر میں عورتیں نہ صرف قدامت پرست ہیں بلکہ ان سے تقاضا کیا جاتا ہے، قدامت پرستی کا اور یہ ٹھیک ہے انھیں کبھی اپنے آپ کو ایسے مرد کے حوالے نہیں کرنا چاہئے، جو اس کی اور اس کے بچوں کی ذمے داری قبول نہ کرے۔

دھوئیں کے مرغولے میں سنت رام کو اس وقت کا بیٹی کا چہرہ یاد آیا۔ وہ بڑبڑ باپ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ کچھ سمجھ رہی تھی اور کچھ بھی نہیں۔ شاید وہ سوچتی تھی — پاپا یہ آج کیا لے بیٹھے ہیں؟ اس بات کو آج کل کے زمانے کی ہر عورت، ہر لڑکی سمجھتی ہے۔ پپا کتنے پرانے خیالات کے ہیں؟ اگر میں پرانے خیالات کا ہوں تو روز یہ قصے کا سنتا ہوں؟ یہ تو ایک ایسی بات ہے جو بدھ کے زمانے میں بھی کہی جانی چاہئے تھی اور آج کے زمانے میں بھی۔ کیا انسان مشق اور غلطی ہی سے سیکھتا ہے؟ لیکن اس کا نتیجہ اچھا ہی نکلا۔ جہاں اس محلے کے دوسرے بچوں نے بدعنوانیاں کیں، وہاں میرے بچوں نے نہیں۔ کم از کم لڑکیوں نے نہیں۔ یہ اسی تعلیم کا نتیجہ تھا جو میں نے انھیں دی۔ تو پھر یہ تباہی کیسی؟ پال پچیس برس کا ہو گیا تھا، جب میں نے براہ راست اس سے پوچھا کہ اسے عورت کے سلسلے میں کوئی تجربہ ہوا ہے؟ چونکہ وہ بیٹا ہونے کے علاوہ میرا دوست تھا، اس نے سب کچھ کہہ دیا۔ اب مجھے

اس بات کی فکر پڑ گئی کہ وہ تجربہ کامیاب ہوا یا نہیں کیونکہ جنسی فعل ایک بہت بڑی ذمے داری کی چیز ہے۔اس میں کوئی سی بھی غلطی پوری زندگی پر چھا سکتی ہے، اسی لئے تو مرد عورت کے بیچ محبت اور شادی کی چار دیواری کا تحفظ لازمی ہے لیکن پال بھی میری طرف بڑبڑ دیکھ رہا تھا اور شاید جی ہی جی میں ہنس رہا تھا اور کہہ رہا تھا— ہونہہ! ذمے داری!...... پپا! انیسویں صدی میں سانس لے رہے ہیں لیکن یہ طے تھا کہ بہت سی باتیں وہ نہ جانتا تھا اور میں نے اس کے دماغ جالے اور پھپھوندی اتاری اور اسے اس قابل بنایا کہ وہ دنیا اور اس کے حالات کا مقابلہ کر سکے اور آج اس بیٹے نے اس کا ایک سگریٹ پی جانے سے منہ موڑ لیا مجھ سے!

نہیں، ہوسکتا ہے معمول کی طرح وہ کسی اپنی ہی دھن میں ہو اور جلدی گھر سے باہر نکل گیا ہو۔فرق یہی ہے نا کہ پہلے وہ دس کے قریب جاتا تھا اور آج ساڑھے نو بجے نکل گیا تھا— کل میری ایک فرم سے لاکھ روپے کی ڈیل ہونے والی ہے۔سب ٹھیک ہو جائے گا۔اگر پال خفا بھی ہو گیا ہے تو راضی ہو جائے گا، پھر سب مل کر کلو کے پہاڑ پر جانے کا پروگرام بنائیں گے۔

لیکن، ایک سگریٹ...... صرف ایک سگریٹ......

سنت رام کا خون بار بار کھول اٹھتا تھا، جیسے اس نے بیٹے کو معاف نہ کیا ہو۔خود کو معاف نہ کیا ہو مگر جو باپ بیٹے سے نفرت کرتا ہے، اپنے آپ سے نفرت کرتا ہے تو اس کا الٹ بھی درست ہے کہ جو بیٹا باپ سے نفرت کرتا ہے وہ اپنے آپ سے نفرت کرتا ہے۔ پال دراصل باپ سے نفرت نہیں کرتا تھا۔خود سے نفرت کرتا تھا کیونکہ مقابلے کی اس دنیا میں جب تک وہ باپ سے آگے نہیں نکل جائے گا۔خود کو معاف نہیں کرے گا وہ باپ سے محبت اس وقت کر سکے گا جب وہ اسے نالائق اور بے وقوف ثابت کر دے۔

سنت رام نے گھنٹی پہ ہاتھ مارا اور چندو سے کہا: ''مس ڈولی کو بلاؤ۔''

ڈولی اندر آئی۔اآج اس نے بالوں کے پرم بنوار کھے تھے اور چست بلاؤز کے ساتھ ایک سفید رنگ کی ساری لپیٹ رکھی تھی کیونکہ سنت رام کو سفید رنگ بہت پسند تھا۔لیکن سنت رام نے ڈھب سے اس کی طرف نہ دیکھا۔ڈولی جانتی تھی آج کل بوس کٹا کٹا سا رہتا ہے۔اس نے بھی دنوں سے بزنس کا انداز اختیار کر رکھا تھا۔ یہ تو اس کا کرم تھا کہ ایک بڈھے آدمی سے باتیں کرتی تھی۔وہ کام کرتی تو پیسے لیتی تھی۔بیچ میں وافر باتیں کیسی؟

اندر آنے کے بعد جب ڈولی نے، یس سر کہا تو سنت رام نے چھچھلتی ہوئی نظر اس پہ ڈالی اور اپنے آپ کو کہنے سے روک لیا کہ تم بہت خوبصورت لگتی ہو، ڈولی!

لیکن ایک لمحے کے لئے اس کا دل جو کہیں بھی چھٹکارا پانے کے لئے تڑپ رہا تھا، ڈولی کے خوبصورت بالوں میں اٹک گیا۔ یہ عورتیں بھی خوب ہیں۔ اگر مرد کا دل سیدھے بہاؤ میں نہ بہے تو اسے لہروں اور اس کے ہچکولوں میں ڈبو دو مگر سنت رام نے جلد ہی اپنی آنکھیں اس طوفانی بہاؤ اور پیچھے کے بھنور سے ہٹا لیں اور دائیں طرف درکشا سو کے کیلنڈر کو دیکھنے، لگا جیسے اسے کوئی تاریخ دیکھنا ہو۔ ایسی حرکتوں کو عورت خوب سمجھتی ہے اور اپنی نظریں اپنے شکار پہ گاڑے رہتی ہے۔ مرد جانتا ہے کہ اس نے عورت کی آنکھوں میں دیکھا تو گیا، اس لئے وہ پرے سے اور پرے سے پرے دیکھنے اور بچنے کی کوشش کرتا ہے لیکن کب تک؟ آخر منٹ کے سودیں حصے کے لئے وہ مجبوری اور بے اختیاری کے عالم میں پھر اس کی طرف دیکھ لیتا ہے اور یہ وہ لمحہ ہوتا ہے جس میں اس کی آخری پھڑ پھڑاہٹ ٹھنڈی ہو جاتی ہے۔

سنت رام نے ڈولی سے پوچھا: ''پرکنز کہاں ہے آج کل؟'' پرکنز ڈولی کا بھائی تھا، جاہن پرکنز۔

''یہیں ہے۔'' ڈولی نے جواب دیا اور تھوڑا مسکرانے کی کوشش کی۔ وہ سنت رام کے اس سوال کو ادھر ادھر کی باتوں میں سے سمجھتی تھی جو مطلب پہ آنے سے پہلے مرد ہمیشہ کرتا ہے لیکن وہ تو سخت بزنس کا عمل جاری رکھنا چاہتی تھی۔ آخر کوئی مذاق ہے، جب چاہے بلا لو۔ جب چاہے جھٹک دو۔ اتنے دنوں تک بات بھی نہ کی۔ دیکھا تک نہیں اور گزر گئے اور آج ایکا ایکی پرکنز یاد آیا ہے! لیکن ڈولی بھی کب تک بزنس کا انداز رکھ سکتی تھی۔

سنت رام نے ڈولی کو نادانی کے عالم میں سگریٹ پیش کر دیا۔ ایک لہر سی ڈولی کے بدن میں دوڑ گئی جو اس کے بالوں کے پرم سے زیادہ مضطرب تھی۔ اس نے اپنے بڑھتے ہوئے ہاتھ روک دیئے اور بولی: ''نو تھینکس!'' اور پھر غصے اور شکایت سے اس کی چھاتیاں اوپر نیچے ہونے لگیں۔ سنت رام نے اس کی نظروں میں اپنی نظریں گاڑتے ہوئے ایک رونے سے انداز میں کہا— ''ڈولی.......''

ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے سنت رام کہنے جا رہا ہے— دنیا نے میرے ساتھ یہ سب کیا ہے۔ گھر کے لوگوں نے کیا ہے۔ ایک تم تھیں جو ایک معمولی سے ریز کے لئے مجھے التفات کا دھوکا دے

سکتی تھیں اور تم نے دھوکا دیا اور وہ مجھے ایسی محبت لگی جو سچی محبت سے کہیں اوپر ہوتی ہے۔ اس میں وہی فرق تھا جو اصلی بوسے اور چوری کے بوس سے میں فرق ہوتا ہے جس میں پچھلا لاکھ روپے کا گھاٹا اور آنے والا لاکھ روپے کا نفع بڑے خوبصورت طریقے سے ایک دوسرے میں حل ہو جاتے ہیں......ڈولی نے سنت رام کی طرف دیکھا، ورنہ وہ اور بھی بوڑھا ہو جاتا اور اسے ایک کی جگہ کئی اور گھاتے پڑ جاتے، جن سے وہ خود بھی بے کار ہو جاتی۔ اس نے اپنے رحم کی تہوں سے سوچا، جو اس کی ماں تھا اور دنیا بھر کے مردوں کی ماں، چاہے وہ جوان ہوں یا بوڑھے پھر 'آل رائٹ' کہتے ہوئے اس نے اپنا ہاتھ سگریٹ کی طرف بڑھایا۔ سنت رام نے لائیٹر جلا کر ڈولی کا سگریٹ سلگایا۔ ڈولی نے کش لگا کر، دھواں چھوڑتے ہوئے ایسی ہی سگریٹ کی طرف دیکھتی ہوئی سنت رام کی طرف بڑھی........جبھی سنت رام نے کہا: ''پرکنز شہر میں ہے تو اسے کہو........''

ڈولی وہیں رک گئی اور اس کی طرف دیکھنے لگی تا کہ وہ اپنا فقرہ مکمل کر لے—سنت رام نے کہا: ''مجھے اسٹیٹ ایکسپریس کا ایک کارٹن لا دے، پیسے پھر دو دوں گا۔''

''آل رائٹ!'' ڈولی نے کہا اور پیچھے ہٹتی ہوئی وہ کیبن سے باہر نکل گئی۔

سنت رام گھر پہنچا تو کارٹن کی قلعہ بندی کے باوجود وہ دوڑ رہا تھا۔ ایک نہیں، بیسیوں داہمے دامن گیر تھے، اس کے، جن کے بارے میں وہ دھوبن یا لاڈو سے نہ کہہ سکتا تھا۔ اس کے پہنچنے کے تھوڑی دیر بعد ہی پال چلا آیا۔ سنت رام کے بدن میں جو کپکپی پیدا ہو رہی تھی، بند ہو گئی بلکہ ایک عجیب طرح کے سکون، نرمی اور گرمی کا احساس ہوا۔ اسے جیسے سردیوں میں کوئی کمرے کے اندر بخاری جلا دے لیکن پھر وہی ڈر اس کے جسم و ذہن کا احاطہ کرنے لگا۔ کہیں اپنے کپڑے لتے اٹھانے اور گولف لنکس کے کمرے میں منتقل ہو جانے کے لئے تو نہیں آیا، پال؟ مگر اس بات کے تو کوئی آثار نظر نہ آتے تھے، پھر وہ آج جلدی کیوں چلا آیا تھا؟ وہ تو کبھی نہ لوٹا تھا رات کے ایک دو بجے سے پہلے!

کیا وہ اچھا بیٹا ہو گیا تھا؟ لیکن اچھا بیٹا ہونے کے باوجود وہ چپ کیوں تھا؟ وہ لاڈو کے ساتھ بات کر سکتا تھا اور نہیں تو بالی کے ساتھ کھیل سکتا تھا۔ کمینہ کس قدر بغض سے بھرا ہوا تھا اس کا سینہ لیکن پال نے کوئی کپڑے وپڑے اکٹھے نہ کئے۔ وہ ایک منٹ کے لئے اپنے کمرے کی طرف گیا اور پھر باپ کی طرف آیا اور جیب میں سے ایک پیکٹ نکال کر پپا کو پیش کر دیا۔ سنت رام نے

دیکھا اور پوچھا: ''یہ کیا ہے؟''

''رشین سوبرائین۔''

رشین سوبرائین سگریٹ.......اور پورا پیکٹ؟ خون سنت رام کے کانوں اور آنکھوں تک آنے لگا— ایک سگریٹ تو کیا پی لیا ہے اس کا۔ اس کے عوض پیکٹ لا کے دے رہا ہے۔ جوتا مار رہا ہے ایک طریقے سے سنت رام نے پیکٹ اٹھایا اور پورے زور سے پال ے منہ پر کھینچ مارا۔

''لچے، شہدے، حرامی۔'' سنت رام کہہ رہا تھا۔ ''تو کیا سمجھتا ہے، میں اپنے سگریٹ بھی خرید نہیں سکتا؟ تجھے خرید کر نہیں دے سکتا؟ اتنا تو نہیں مرا ہوں، جتنا تو سمجھتا ہے۔ ابھی تو تیرے ایسے سو کمینوں کو خرید کے رکھ لوں اور جیب میں ڈال کے چل دوں.......باسٹرڈ!''

پال کی کچھ سمجھ میں نہ آ رہا تھا۔ اس نے اپنا ہاتھ ہونٹ پہ رکھ لیا۔ جس پہ پیکٹ کے لگنے سے ایک کٹ سا چلا آیا تھا اور خون کا ایک نقطہ سا دکھائی دے رہا تھا۔ اسنے کہا بھی تو صرف اتنا— پپا''

لاڈو بیڈروم سے دوڑی ہوئی آئی اور اس نے بھی اتنا سا کہا: ''پپا!'' پھر دھوبن مڑتی ہوئی بولی: ''کیا ہوا جی؟''

''کچھ نہیں!'' سنت رام نے سب کو پیچھے دھکیلتے ہوئے کہا: ''مجھے اس بلّے سے اپنا حساب برابر کر لینے دو۔ بہت دیر ہوگئی اسے مٹکے ہوئے.......'' پھر اپنے بیٹے کے چہرے پہ خون کا قطرہ دیکھ کر سنت رام اور ڈر گیا اور بھی وحشت ناک ہوگیا کیوں کہ بیٹے کا خون دیکھنا کوئی آسان بات نہیں۔ دیکھنے والے کو بظاہر وہ بیٹے کا خون معلوم ہوتا ہے لیکن خون اس کا ہوتا ہے، جس کا وہ خون ہے.......

اور بھی آگے لپکتے ہوئے منہ پہ کف لاتے ہوئے سنت رام کہہ رہا تھا: ''میں تجھے جان سے مار دوں گا، آج، چھوڑ دو، چھوڑ دو مجھے— یہ بھی ایک مثال ہو جانے دو۔ بیٹے باپ کا خون کرتے آئے ہیں۔ آج باپ کو بیٹے کا خون کرنے دو۔ مادر.....میں نے تجھے کیا نہیں دیا؟ تو باہر پنجاب پڑھنے کے لئے گیا تو چار سو روپے مہینہ بھیجتا رہا، پھر تو وہاں سے بھاگ آیا اور میرے دوست نے دو برس تجھے اپنے ہاں رکھا اور تجھے تعلیم دی۔ میری وجہ سے اس نے تجھے اپنے ہاں رکھا، ورنہ تجھے کون پوچھتا ہے— چیچھڑے کو؟ اور پھر بھی پیسے بھیجتا رہا۔ میرے بیٹے کو تکلیف نہ ہو اور تو اس سے ہوٹلوں اور ریستورانوں میں جاتا، ہر قسم کی بدمعاشیاں کرتا رہا۔ تیرے اپنے بکنے کے مطابق تیرے دوست تجھے شہزادہ کہتے تھے کیوں کہ تو باپ کے مال پہ عیش کرتا تھا، پھر تو نے بی۔ اے میں

کمپارٹمنٹ کی اور امتحان کو پورا نہ کیا کیوں کہ تو ہندی میں فیل ہو گیا تھا۔ ہندی بھی کوئی بات تھی بھلا؟ میں نے کتنی بار تجھ سے منتیں کیں کہ ایک مضمون ہے، پاس کر لے لیکن تجھے اس سے چڑ ہو گئی۔ پھر بھی میں نے تجھے گھر رکھا اور روٹیاں کھلاتا رہا۔ ہوتا کسی باہر کے ملک میں تو اٹھارواں پھاندتے ہی بات تیرے چوتڑ پر لات مارتا اور باہر نکال دیتا۔ یہ اپنا ہی ملک ہے جس میں اس قسم کی چوتیاں پنپتی چلتی ہے...... جب تیری جیب میں پیسے نہیں ہوتے تھے تو میں تیری ماں کی چوری سے دس بیس بچاس ڈال دیتا تھا اور آج یہ اسی کے کارن ہے کہ وہ مجھے آنکھیں دکھاتی ہے اور کہتی ہے میں نے اپنی اولاد کو تباہ و برباد کر دیا۔ تیری وجہ سے میں نے اپنی زندگی تباہ و برباد کر لی۔ یہ تیرا ہی فقرہ ہے نا کہ میری ماں جس قسم کی عورت ہے، اس سے اچھا تو میرا باپ کوئی داشتہ رکھ لے...... بول، کہا نہیں تو نے؟ جو بیٹا ماں کے بارے میں یہ کہہ سکتا ہے، وہ باپ کی بابت کیا کہے گا؟ روز تو ماں کو گالی دیتا ہوا نکل جاتا ہے اور جانتا ہے۔ وہ گالی کسے پڑتی ہے؟ وہ تجھے گالی دیتی ہے تو گالی کسے پڑتی ہے؟ کیا اس گھر میں کوئی مالک نہیں، کوئی باپ نہیں؟ کیا ہوا جو ایک بار، زندگی میں صرف ایک بار گھاٹا پڑ گیا میں نے لاکھ روپیہ گنوایا ہے تو آج ہی لاکھ روپے کا کانٹریکٹ کیا ہے جس میں سے کچھ نہیں تو تیس پینتیس ہزار بچ جائیں گے۔ جب تو تیری ماں بھی خوش ہو گی اور یہ لاڈو بھی، جو اس دن باپ کی بجائے مجھے انکل کہہ گئی اور تو بھی خوش ہوگا اور فخر سے میرا نام لے گا۔ میرے پاس ہو ہو کر بیٹھے گا اور باتیں کرنے کی کوشش کرے گا لیکن میں...... میں تم سب کو سمجھ گیا ہوں۔ منھ تک نہ لگاؤں گا کسی کو۔''

پال کے ہونٹ پھڑکنے لگے تھے۔ اس نے ڈرتے ڈرتے کہا بھی تو صرف اتنا: ''پر پپا، میں نے کیا کیا ہے؟''

''تم نے؟'' سنت رام اور بھی بلند آواز سے چیخا: ''تم نے مجھے گالی دی ہے، جو کسی نے نہیں دی۔ کسی کی ہمت ہی نہیں پڑی۔ سب جانتے ہیں نا، میں خالی ہاتھوں سے ان کی بوٹیاں اڑا دوں گا۔ تیری یہ ہمت کہ ایک سگریٹ تیرا پی جانے سے تو پورا پیکٹ میرے منھ پر دے مارے؟''

''ایک سگریٹ!'' پال نے کہا۔

''ہاں!'' سنت رام نے کہا: ''تجھے پتا چل گیا نا، میں نے تیرا ایک اسٹیٹ ایکسپریس صبح پی لیا تھا......''

''نہیں...... مجھے تو کچھ نہیں معلوم۔''

اس سے پہلے کہ سنت رام جو کانپ رہا تھا، نیچے گر جاتا، بیٹے نے بڑھ کر تھام لیا اور اس کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور کہنے لگا...... ''معاف کردو، مجھے معاف کردو، پپا!''

اگلے روز سنت رام حسب معمول صبح کے چار بجے اٹھ گیا تھا۔ اسے پھر سگریٹ کی طلب ہوئی۔ دھوبن کو ڈسٹرب کیے بغیر وہ ساتھ کے کمرے میں چلا آیا جہاں پال، لاڈو اور اس کا بچہ بابی سوئے ہوئے تھے۔ سنت رام نے زیرو پاور کا بلب جلایا اور ان کی طرف دیکھنے لگا۔ ہلکی سی مدھم روشنی میں وہ سب فرشتے معلوم ہو رہے تھے۔ ایک سے ایک حسین اور خوبصورت اور خوشبودار۔ آج بابی کی بانہہ ماں کے گلے میں نہ تھی۔ وہ آزاد اور بےفکر سو رہا تھا۔

سنت رام نے سوچا— کالج بھیجنے سے پہلے میں نے اس بچی کو لیکچر دیا تھا لیکن اگر یہ کوئی بے راہروی کرتی تو کیا میں اسے سڑک پہ پھینک دیتا؟ پال کا تجربہ ناکام ہوتا تو میں اسے زندگی کا کھیل نہ سکھاتا؟ یہ اخلاق...... یہ تہذیب، سب باتیں ہیں اور یہاں سے باہر کے سب بچے ہیں جو کھیلتے ہیں، گرتے ہیں، پھر اٹھ کر کھیلنے لگتے ہیں...... دھوبن؟...... دھوبن بیوقوف ہے۔ وہ نہیں جانتی کچھ— سوائے کپڑے دھونے کے......

سنت رام نے اسٹیٹ ایکسپریس کا کارٹن نکالا اور اسے اپنے بیٹے کے سرہانے رکھ دیا۔ رات اس جھگڑے کی وجہ سے وہ اپنے بیٹے کو دے ہی نہ سکا تھا۔ چلو یہ اور بھی اچھا ہوا۔ جاگے گا تو ایک دم پورا کارٹن پاکر کتنا خوش ہوگا...... پھر سنت رام نے بیٹے کے دیئے ہوئے ریشن سوبرائن کے پیکٹ میں سے ایک سگریٹ نکالا، اسے جلایا اور دھوئیں کے بڑے بڑے کش چھوڑے زیرو پاور کے بلب کی روشنی پہلے ہی کچھ نہیں ہوتی، اس پہ دھوئیں نے اور بھی منظر کو دھندلا دیا تھا اور بچے فرشتوں سے بھی زیادہ حسین لگنے لگے تھے۔ سنت رام کا جی چاہا کہ وہ آگے بڑھ کر پال کا چہرہ چوم لے۔ لیکن کہتے ہیں، سوتے میں بچے کا چہرہ نہیں چومتے۔ جانے کیوں؟ اس وقت تو سنت رام نے یہی سوچا کہ اگر اس نے ایسی حرکت کی تو وہ جگ جائیں گے..........

سوبرائن کے چوتھے کش میں کوئی نشہ تھا یا شاید سنت رام کی آنکھیں بیٹے کی شراب سے چڑھ گئی تھیں۔ اس نے دھواں صاف کرتے ہوئے ایک بار پھر سب کی طرف دیکھا اور پھر پرارتھنا کے لئے پوجا کے کمرے کی طرف چل دیا۔

ٹوبہ ٹیک سنگھ

سعادت حسن منٹو
(۱۹۱۲ء - ۱۹۵۵ء)

بٹوارے کے دو تین سال بعد پاکستانیوں اور ہندوستانیوں کو خیال آیا کہ اخلاقی قیدیوں کی طرح پاگلوں کا بھی تبادلہ ہونا چاہیے۔ یعنی جو مسلمان پاگل، ہندوستان کے پاگل خانوں میں ہیں انھیں پاکستان پہنچا دیا جائے اور جو ہندو اور سکھ پاکستان کے پاگل خانوں میں ہیں انھیں ہندوستان کے حوالے کر دیا جائے۔

معلوم نہیں یہ بات معقول تھی یا غیر معقول، بہر حال دانشمندوں کے فیصلے کے مطابق ادھر ادھر اونچی سطح کی کانفرنسیں ہوئیں اور بالآخر ایک دن پاگلوں کے تبادلے کے لئے مقرر ہو گیا۔ اچھی طرح چھان بین کی گئی۔ وہ مسلمان پاگل جن کے لواحقین ہندوستان ہی میں تھے، وہیں رہنے دیئے گئے تھے۔ جو باقی تھے ان کو سرحد پر روانہ کر دیا گیا۔ یہاں پاکستان میں چونکہ قریب قریب تمام ہندو سکھ جا چکے تھے اس لئے کسی کو رکھنے رکھانے کا سوال ہی نہ پیدا ہوا۔ جتنے ہندو سکھ پاگل تھے سب کے سب پولیس کی حفاظت میں بورڈر پر پہنچا دیئے گئے تھے۔

ادھر کا حال معلوم نہیں لیکن ادھر لاہور کے پاگل خانے میں جب اس تبادلے کی خبر پہنچی تو بڑی دلچسپ چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ ایک مسلمان جو بارہ برس سے ہر روز باقاعدگی کے ساتھ 'زمیندار' پڑھتا تھا۔ اس سے جب اس کے دوست نے پوچھا: ''مولبی ساب، یہ پاکستان کیا ہوتا ہے؟'' تو اس نے بڑے غور وفکر کے ساتھ جواب دیا: ''ہندوستان میں ایک ایسی جگہ ہے، جہاں استرے بنتے ہیں۔''

یہ جواب سن کر اس کا دوست مطمئن ہو گیا۔

اسی طرح ایک سکھ پاگل نے ایک دوسرے پاگل سے پوچھا: ''سردار جی! ہندوستان کیوں بھیجا جا رہا ہے؟ ہمیں تو وہاں کی بولی نہیں آتی۔''

دوسرا مسکرایا: ''مجھے تو ہندووستوڑوں کی بولی آتی ہے۔ ہندوستانی بڑے شیطانی اکڑ اکڑ پھرتے ہیں۔''

ایک دن نہاتے نہاتے ایک مسلمان پاگل نے ''پاکستان زندہ باد'' کا نعرہ اس زور سے بلند کیا کہ فرش پر پھسل کر گرا اور بے ہوش ہو گیا۔

بعض پاگل ایسے بھی تھے جو پاگل نہیں تھے۔ ان میں اکثریت ایسے قاتلوں کی تھی جن کے رشتہ داروں نے افسروں کو دے دلا کر پاگل خانے بھجوا دیا تھا تا کہ پھانسی کے پھندے سے بچ جائیں۔ یہ کچھ کچھ سمجھتے تھے کہ ہندوستان کیوں تقسیم ہوا ہے اور یہ پاکستان کیا ہے لیکن صحیح واقعات سے وہ بھی بے خبر تھے۔ اخباروں سے کچھ پتہ نہیں چلتا تھا اور پہرہ دار سپاہی ان پڑھ اور جاہل تھے۔ ان کی گفتگو سے بھی وہ کوئی نتیجہ برآمد نہیں کر سکتے تھے۔ ان کو صرف اتنا معلوم تھا کہ ایک آدمی محمد علی جناح ہے جس کو قائداعظم کہتے ہیں۔ اس نے مسلمانوں کے لئے ایک علیحدہ ملک بنایا ہے جس کا نام پاکستان ہے۔ یہ کہاں ہے۔ اس کا محل وقوع کیا ہے اس کے متعلق وہ کچھ نہیں جانتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ پاگل خانے میں وہ سب پاگل جن کا دماغ پوری طرح ماؤف نہیں ہوا تھا — اس مخمصے میں گرفتار تھے کہ وہ پاکستان میں ہیں یا ہندوستان میں۔ اگر ہندوستان میں ہیں تو پاکستان کہاں ہے۔ اگر وہ پاکستان میں ہیں تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ کچھ عرصے پہلے یہیں رہتے ہوئے بھی ہندوستان میں تھے۔

ایک پاگل تو ہندوستان اور پاکستان اور ہندوستان کے چکر میں کچھ ایسا گرفتار ہوا کہ اور زیادہ پاگل ہوگیا۔ جھاڑو دیتے دیتے ایک دن درخت پر چڑھ گیا اور ٹہنے پر بیٹھ کر دو گھنٹے مسلسل تقریر کرتا رہا جو پاکستان اور ہندوستان کے نازک مسئلے پر تھی۔ سپاہیوں نے اسے نیچے اترنے کو کہا تو وہ اور اوپر چڑھ گیا۔ ڈرایا دھمکایا گیا تو اس نے کہا: ''میں ہندوستان میں رہنا چاہتا ہوں، نہ پاکستان میں۔ اس درخت پر ہی رہوں گا۔''

بڑی مشکلوں کے بعد جب اس کا دورہ سرد پڑا تو وہ نیچے اترا اور اپنے ہندو سکھ دوستوں سے گلے مل مل کر رونے لگا۔ اس خیال سے اس کا دل بھر آیا تھا کہ وہ اسے چھوڑ کر ہندوستان چلے جائیں گے۔

ایک ایم. ایس سی پاس ریڈیو انجینئر، جو مسلمان تھا اور دوسرے پاگلوں سے بالکل الگ تھلگ باغ کی ایک خاص روش پر سارا دن خاموش ٹہلتا رہتا تھا، یہ تبدیلی نمودار ہوئی کہ اس نے تمام کپڑے اتار کر دفعدار کے حوالے کر دیئے اور ننگ دھڑنگ سارے باغ میں چلنا پھرنا شروع کر دیا۔

چنیوٹ کے ایک موٹے مسلمان پاگل نے جو مسلم لیگ کا سرگرم کارکن رہ چکا تھا اور دن میں پندرہ سولہ مرتبہ نہایا کرتا تھا۔ یک لخت یہ عادت ترک کر دی۔ اس کا نام محمد علی تھا۔ چنانچہ ایک دن اس نے اپنے جنگلے میں اعلان کر دیا کہ وہ قائداعظم محمد علی جناح ہے۔ اس کی دیکھا دیکھی ایک سکھ پاگل ماسٹر تارا سنگھ بن گیا۔ قریب تھا کہ اس جنگلے میں خون خرابہ ہو جائے مگر دونوں کو خطرناک پاگل قرار دے کر علیحدہ علیحدہ بند کر دیا گیا۔

لاہور کا ایک نوجوان ہندو وکیل تھا جو محبت میں ناکام ہو کر پاگل ہو گیا تھا۔ جب اس نے سنا کہ امرت سر ہندوستان میں چلا گیا ہے تو اسے بہت دکھ ہوا۔ اسی شہر کی ایک ہندو لڑکی سے اسے محبت ہو گئی تھی۔ گو اس نے اس وکیل کو ٹھکرا دیا تھا مگر دیوانگی کی حالت میں بھی وہ اس کو نہیں بھولا تھا۔ چنانچہ وہ ان تمام ہندو اور مسلم لیڈروں کو گالیاں دیتا تھا، جنھوں نے مل ملا کر ہندوستان کے دو ٹکڑے کر دیئے — اس کی محبوبہ ہندوستانی بن گئی اور وہ پاکستانی۔

جب تبادلے کی بات شروع ہوئی تو وکیل کو کئی پاگلوں نے سمجھایا کہ وہ دل برا نہ کرے۔ اس کو ہندوستان بھیج دیا جائے گا۔ اس ہندوستان میں اس کی محبوبہ رہتی ہے مگر وہ لاہور چھوڑنا نہیں

چاہتا تھا اس لئے اس کا خیال تھا کہ امرت سر میں اس کی پریکٹس نہیں چلے گی۔

یورپین وارڈ میں دو اینگلو انڈین پاگل تھے۔ ان کو جب معلوم ہوا کہ ہندوستان کو آزاد کر کے انگریز چلے گئے ہیں تو ان کو بہت صدمہ ہوا۔ وہ چھپ چھپ کر گھنٹوں آپس میں اس اہم مسئلے پر گفتگو کرتے رہتے کہ پاگل خانے میں اب ان کی حیثیت کس قسم کی ہوگی۔ یہ یورپین وارڈ رہے گا یا اڑا دیا جائے گا۔ بریک فاسٹ ملا کرے گا یا نہیں۔ کیا انھیں ڈبل روٹی کے بجائے بلڈی انڈین چپاتی تو زہر مار نہیں کرنا پڑے گی۔

ایک سکھ تھا جس کو پاگل خانے میں داخل ہوئے پندرہ برس ہو چکے تھے، ہر وقت اس کی زبان سے یہ عجیب و غریب الفاظ سننے میں آتے تھے: ''اوپڑدی گڑگڑ دی اینکس دی بے دھیانا دی منگ دی وال آف دی لالٹین۔'' دن کو سوتا تھا نہ رات کو۔ پہرہ داروں کا یہ کہنا تھا کہ پندرہ برس کے طویل عرصے میں وہ ایک لحظے کے لئے نہیں سویا۔ لیٹتا بھی نہیں تھا۔ البتہ کبھی کبھی کسی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا لیتا تھا۔

ہر وقت کھڑا رہنے سے اس کے پاؤں سوج گئے تھے۔ پنڈلیاں بھی پھول گئی تھیں مگر جسمانی تکلیف کے باوجود لیٹ کر آرام نہیں کرتا تھا— ہندوستان، پاکستان اور پاگلوں کے تبادلے کے متعلق جب کبھی پاگل خانے میں گفتگو ہوتی تھی تو وہ غور سے سنتا تھا۔ کوئی اس سے پوچھتا کہ اس کا کیا خیال ہے تو وہ بڑی سنجیدگی سے جواب دیتا:

''اوپڑدی گڑگڑ دی بے دھیانا دی منگ دی آف دی پاکستان گورنمنٹ۔''

لیکن بعد میں آف دی پاکستان گورنمنٹ کی جگہ آف دی ٹوبہ ٹیک گورنمنٹ نے لے لی اور اس نے دوسرے پاگلوں سے پوچھنا شروع کیا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے جہاں کا وہ رہنے والا ہے لیکن کسی کو بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ پاکستان میں ہے یا ہندوستان میں۔ جو بتانے کی کوشش کرتے تھے وہ خود اس الجھاؤ میں گرفتار ہو جاتے تھے کہ سیالکوٹ پہلے ہندوستان میں ہوتا تھا پر اب سنا ہے پاکستان میں ہے۔ کیا پتا ہے کہ لاہور جو اب پاکستان میں ہے کل ہندوستان میں چلا جائے یا سارا ہندوستان ہی پاکستان بن جائے اور یہ بھی کون سینہ پر ہاتھ رکھ کر کہہ سکتا تھا کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں کسی دن سرے سے غائب ہی ہو جائیں۔

اس سکھ پاگل کے کیس چھدرے ہو کر بہت مختصر رہ گئے تھے۔ چونکہ بہت کم نہاتا تھا، اس لئے سر اور داڑھی کے بال آپس میں جم گئے تھے جس کے باعث اس کی شکل بڑی بھیانک ہوگئی تھی مگر آدمی بے ضرر تھا۔ پندرہ برسوں میں اس نے کبھی کسی سے جھگڑا فساد نہیں کیا تھا۔ پاگل خانے کے جو پرانے ملازم تھے، وہ اس کے متعلق اتنا جانتے تھے کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ میں اس کی کئی زمینیں تھیں۔ اچھا کھاتا پیتا زمین دار تھا کہ اچانک دماغ الٹ گیا۔ اس کے رشتہ دار لوہے کی موٹی موٹی زنجیروں میں اسے باندھ کر لائے اور پاگل خانے میں داخل کرا گئے۔

مہینے میں ایک بار ملاقات کے لئے یہ لوگ آتے تھے اور اس کی خیر خیریت دریافت کر کے چلے جاتے تھے۔ ایک مدت تک یہ سلسلہ جاری رہا، پر جب پاکستان ہندوستان کی گڑبڑ شروع ہوئی تو ان کا آنا بند ہو گیا۔

اس کا نام بشن سنگھ تھا مگر سب اسے ٹوبہ ٹیک سنگھ کہتے تھے۔ اس کو یہ قطعاً معلوم نہیں تھا کہ وہ دن کون سا ہے، مہینہ کون سا ہے یا کتنے سال بیت چکے ہیں لیکن ہر مہینے جب اس کے عزیز و اقارب اس سے ملنے کے لئے آتے تھے تو اسے اپنے آپ پتہ چل جاتا تھا۔ چنانچہ وہ دفعدار سے کہتا کہ اس کی ملاقات آ رہی ہے۔ اس دن وہ اچھی طرح نہاتا، بدن پر خوب صابن گھستا اور سر میں تیل لگا کر کنگھا کرتا، اپنے کپڑے جو وہ کبھی استعمال نہیں کرتا تھا نکلوا کے پہنتا، اور یوں سج بن کر ملنے والوں کے پاس جاتا۔ وہ اس سے کچھ پوچھتے تو وہ خاموش رہتا یا کبھی کبھار "اوپر دی گڑ گڑ دی اینکس دی بے دھیانا منگ دی وال آف دی لالٹین" کہہ دیتا۔

اس کی ایک لڑکی تھی جو ہر مہینہ ایک انگلی بڑھتی بڑھتی پندرہ برسوں میں جوان ہو گئی تھی۔ بشن سنگھ اس کو پہچانتا ہی نہیں تھا۔ وہ بچی تھی جب بھی وہ اپنے باپ کو دیکھ کر روتی تھی، جوان ہوئی تب بھی اس کی آنکھوں سے آنسو بہتے تھے۔

پاکستان اور ہندوستان کا قصہ شروع ہوا تو اس نے دوسرے پاگلوں سے پوچھنا شروع کیا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے۔ جب اطمینان بخش جواب نہ ملا تو اس کی کرید دن بدن بڑھتی گئی۔ اب ملاقات بھی نہیں آتی تھی۔ پہلے تو اسے اپنے آپ پتہ چل جاتا تھا کہ ملنے والے آ رہے ہیں پر اب جیسے اس کے دل کی آواز بھی بند ہو گئی تھی جو اسے ان کی آمد کی خبر دے دیا کرتی تھی۔

اس کی بڑی خواہش تھی کہ وہ لوگ آئیں جو اس سے ہمدردی کا اظہار کرتے تھے اور اس کے لئے پھل، مٹھائیاں اور کپڑے لاتے تھے۔ وہ اگر ان سے پوچھتا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے تو وہ یقیناً اسے بتا دیتے کہ پاکستان میں ہے یا ہندوستان میں کیونکہ اس کا خیال تھا کہ وہ ٹوبہ ٹیک سنگھ ہی سے آتے ہیں جہاں اس کی زمینیں ہیں۔

پاگل خانے میں ایک پاگل ایسا بھی تھا جو خود کو خدا کہتا تھا۔ اس سے جب ایک روز بشن سنگھ نے پوچھا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ پاکستان میں ہے، یا ہندوستان میں، تو اس نے حسب عادت قہقہہ لگایا اور کہا: ''وہ پاکستان میں ہے، نہ ہندوستان میں، اس لئے کہ ہم نے ابھی تک حکم نہیں دیا۔''

بشن سنگھ نے اس خدا سے کئی مرتبہ بڑی منت سماجت سے کہا کہ وہ حکم دے دے تا کہ جھنجھٹ ختم ہو مگر وہ بہت مصروف تھا، اس لئے کہ اسے اور بے شمار حکم دینے تھے۔ ایک دن تنگ آ کر اس پر برس پڑا: ''اوپڑ دی گڑ گڑ دی اینکس دی بے دھیانا دی منگ دی وال آف واہے گورجی داخالصہ اینڈ واہے گورجی کی فتح ــــ جو بولے سو نہال، ست سری اکال۔''

اس کا شاید یہ مطلب تھا کہ تم مسلمانوں کے خدا ہو۔ سکھوں کے خدا ہوتے تو ضرور میری سنتے۔ تبادلہ سے کچھ دن پہلے ٹوبہ ٹیک سنگھ سے ایک مسلمان جو اس کا دوست تھا، ملاقات کے لئے آیا، پہلے وہ کبھی نہیں آیا تھا۔ جب بشن سنگھ نے اسے دیکھا تو ایک طرف ہٹ گیا اور واپس جانے لگا مگر سپاہیوں نے اسے روکا: ''یہ تم سے ملنے آیا ہے، تمہارا دوست فضل دین ہے۔''

بشن سنگھ فضل دین کو ایک نظر دیکھا اور بڑبڑانے لگا۔ فضل دین نے آگے بڑھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا: ''میں بہت دنوں سے سوچ رہا تھا کہ تم سے ملوں لیکن فرصت ہی نہ ملی ــــ تمہارے سب آدمی خیریت سے ہندوستان چلے گئے تھے ــــ مجھ سے جتنی مدد ہو سکی میں نے کی ــــ تمہاری بیٹی روپ کور.....''

وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ بشن سنگھ کچھ یاد کرنے لگا: ''بیٹی روپ کور۔''

فضل دین نے رک رک کر کہا: ''ہاں......وہ......وہ بھی ٹھیک ٹھاک ہے، ان کے ساتھ ہی چلی گئی تھی۔''

بشن سنگھ خاموش رہا۔ فضل دین نے کہنا شروع کیا: ''انھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ تمہاری

خیر خیریت پوچھتا رہوں۔ اب میں نے سنا ہے کہ تم ہندوستان جا رہے ہو—بھائی بلبیر سنگھ اور بھائی ودھاوا سنگھ سے میرا اسلام کہنا اور بہن امرت کور سے بھی۔ بھائی بلبیر سنگھ سے کہنا کہ فضل دین راضی خوشی ہے۔ دو بھوری بھینس، جو وہ چھوڑ گئے ہیں، ان میں سے ایک نے کٹا دیا ہے۔ دوسری کے کٹی ہوئی تھی پر وہ چھ دن کی ہو کے مر گئی اور میرے لائق جو خدمت ہو کہنا۔ میں ہر وقت تیار ہوں اور یہ تمہارے لئے تھوڑے سے مرونڈے لایا ہوں۔''

بشن سنگھ نے مرونڈوں کی پوٹلی لے کر پاس کھڑے سپاہی کے حوالے کر دی اور فضل دین سے پوچھا: ''ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے؟''

فضل دین نے قدرے حیرت سے کہا: ''کہاں ہے۔ وہیں ہے، جہاں تھا۔''

بشن سنگھ نے پھر پوچھا: ''پاکستان میں یا ہندوستان میں؟''

''ہندوستان میں......نہیں نہیں پاکستان میں۔'' فضل دین بوکھلا سا گیا۔

بشن سنگھ بڑبڑاتا ہوا چلا گیا: ''اوپڑ دی گڑ گڑ دی اینکس دی بے دھیانا دی منگ دی وال آف دی پاکستان اینڈ ہندوستان آف دی در فٹے منہ۔''

تبادلے کی تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ ادھر سے ادھر اور ادھر سے آنے والے پاگلوں کی فہرستیں پہنچ گئی تھیں اور تبادلے کا دن بھی مقرر ہو چکا تھا۔

سخت سردیاں تھیں۔ جب لاہور کے پاگل خانے سے ہندو سکھ سے بھری ہوئی لاریاں پولیس کے محافظ دستے کے ساتھ روانہ ہوئیں۔ متعلقہ افسر بھی ہمراہ تھے۔ واگہہ کے بورڈ پر طرفین کے سپرنٹنڈنٹ ایک دوسرے سے ملے اور ابتدائی کارروائی ختم ہونے کے بعد تبادلہ شروع ہو گیا جو رات بھر جاری رہا۔

پاگلوں کو لاریوں سے نکالنا اور ان کے دوسرے افسروں کے حوالے کرنا بڑا کٹھن کام تھا۔ بعض تو باہر نکلتے ہی نہیں تھے۔ جو نکلنے پر رضامند ہوتے تھے ان کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا تھا کیونکہ وہ ادھر ادھر بھاگ اٹھتے تھے، جو ننگے تھے ان کو کپڑے پہنائے جاتے، تو وہ پھاڑ کر اپنے تن سے جدا کر دیتے۔ کوئی گالیاں بک رہا ہے، کوئی گا رہا ہے، آپس میں لڑ جھگڑ رہے ہیں، رو رہے ہیں، بلک رہے ہیں۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ پاگل عورتوں کا شوروغوغا الگ تھا اور سردی اتنی

کڑا کے کی تھی کہ دانت سے دانت بج رہے تھے۔

پاگلوں کی اکثریت اس تبادلے کے حق میں نہیں تھی، اس لئے ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ انھیں اپنی جگہ سے اکھاڑ کر کہاں پھینکا جا رہا ہے۔ وہ چند جو کچھ سمجھ سکتے تھے۔ ''پاکستان زندہ باد'' اور ''پاکستان مردہ باد'' کے نعرے لگا رہے تھے۔ دو تین مرتبہ فساد ہوتے ہوتے بچا کیوں کہ بعض مسلمانوں اور سکھوں کو یہ نعرے سن کر طیش آ گیا تھا۔

جب بشن سنگھ کی باری آئی اور واہگہ کے اس پار متعلقہ افسر اس کا نام رجسٹر میں درج کرنے لگا تو اس نے پوچھا: ''ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے؟ پاکستان میں یا ہندوستان میں؟''

متعلقہ افسر ہنسا: ''پاکستان میں۔''

یہ سن کر بشن سنگھ اچھل کر ایک طرف ہٹا اور دوڑ کر باقی ماندہ ساتھیوں کے پاس پہنچ گیا۔ پاکستانی سپاہیوں نے اسے پکڑ لیا اور دوسری طرف لے جانے لگے مگر اس نے چلنے سے انکار کر دیا: ''ٹوبہ ٹیک سنگھ یہاں ہے۔'' اور زور سے چلّانے لگا: ''اوپڑدی گڑگڑدی اینکس دی بے دھیانا دی آف ٹوبہ ٹیک سنگھ اینڈ پاکستان!''

اسے بہت سمجھایا گیا کہ دیکھو کہ اب ٹوبہ ٹیک سنگھ ہندوستان میں چلا گیا ہے۔ اگر نہیں گیا تو فوراً اسے وہاں بھیج دیا جائے گا مگر وہ نہ مانا جب اس کو زبردستی دوسری طرف لے جانے کی کوشش کی گئی تو وہ درمیان میں ایک جگہ اس انداز میں اپنی سوجی ہوئی ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا، جیسے اب اسے کوئی طاقت وہاں سے نہیں ہلا سکے گی۔

آدمی چونکہ بے ضرر تھا، اس لئے اس سے مزید زبردستی نہ کی گئی۔ اس کو وہیں کھڑا رہنے دیا گیا اور تبادلے کا باقی کام ہوتا رہا۔

سورج نکلنے سے پہلے ساکت و صامت بشن سنگھ کے حلق سے ایک فلک شگاف چیخ نکلی۔ اِدھر اُدھر سے کئی افسر دوڑے آئے اور دیکھا کہ وہ آدمی جو پندرہ برس تک دن رات اپنی ٹانگوں پر کھڑا رہا تھا، اوندھے منہ لیٹا ہوا ہے۔ ادھر خاردار تاروں کے پیچھے ہندوستان تھا۔ ادھر ویسے ہی تاروں کے پیچھے پاکستان درمیان میں زمین کے اس ٹکڑے پر جس کا کوئی نام نہیں تھا، ٹوبہ ٹیک سنگھ پڑا تھا۔

آنندی

غلام عباس

بلدیہ کا یہ اجلاس زوروں پر تھا۔ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور خلاف معمول ایک ممبر بھی غیر حاضر نہ تھا۔ بلدیہ کے زیر بحث مسئلہ یہ تھا کہ زنان بازاری کو شہر بدر کر دیا جائے کیوں کہ ان کا وجود انسانیت، شرافت اور تہذیب کے دامن پر بدنما داغ ہے۔

بلدیہ کے ایک بھاری بھر کم رکن جو ملک وقوم کے سچے خیر خواہ سمجھے جاتے تھے، نہایت فصاحت سے تقریر کر رہے تھے۔

.......اور پھر حضرات! آپ یہ بھی خیال فرمائیے کہ ان کا قیام شہر کے ایک حصے میں ہے جو نہ صرف شہر کے بیچوں بیچ عام گزرگاہ ہے بلکہ شہر کا سب سے بڑا تجارتی مرکز بھی ہے۔ چنانچہ ہر شریف آدمی کو چاروناچار اس بازار سے گزرنا پڑتا ہے۔ علاوہ ازیں شرفا کی پاک دامن بہو بیٹیاں اور بازار کے تجارتی اہمیت کی وجہ سے یہاں آنے اور خرید فروخت کرنے پر مجبور ہیں۔ صاحبان! جب شریف زادیاں ان آبرو باختہ اور نیم عریاں بیسواؤں کے بناؤ سنگار کو دیکھتی ہیں تو قدرتی طور پر ان کے دل میں بھی آرائش و دل ربائی کی نئی نئی امنگیں اور ولولے پیدا ہوتے ہیں اور اپنے غریب

شوہروں سے طرح طرح کے غازوں، لونڈروں، زرق برق ساریوں اور قیمتی زیوروں کی فرمائشیں کرنے لگتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کا پر مسرت گھر، ان کا راحت کدہ ہمیشہ کے لئے جہنم کا نمونہ بن جاتا ہے۔

......اور صاحبان! پھر آپ یہ بھی تو خیال فرمایئے کہ نونہالانِ قوم جو درس گاہوں میں تعلیم پا رہے ہیں اور جن کی آئندہ ترقیوں سے قوم کی امیدیں وابستہ ہیں اور قیاس کہتا ہے کہ ایک نہ ایک دن قوم کی کشتی کو بھنور سے نکالنے کا سہرا پھر ان ہی کے سر بندھے گا۔ انھیں بھی صبح وشام اسی بازار سے ہو کر آنا جانا پڑتا ہے۔ یہ قحبائیں ہر وقت بارہ ابھرن سولہ سنگھار کیے ہر راہ پر بے حجابانہ نگاہ ومژہ کے تیر وسنان برساتی اور اسے دعوتِ حسن پرستی دیتی ہیں۔ کیا انھیں دیکھ کر ہمارے بھولے بھالے، ناتجربہ کار، جوانی کے نشہ میں سرشار، سود وزیاں سے بے پروا، نونہالانِ قوم اپنے جذبات وخیالات اور اپنی اعلیٰ سیرت کو معصیت کے مسموم اثرات سے محفوظ رکھ سکتے ہیں؟ صاحبان! کیا ان کا حسنِ زاہد فریب ہمارے نونہالانِ قوم کو جادۂ مستقیم سے بھٹکا کر ان کے دل میں گناہ کی پراسرار لذتوں کی تشنگی پیدا کر کے ایک بے کلی، ایک اضطراب ایک ہیجان برپا نہ کر دیتا ہوگا......؟

اسی موقع پر ایک رُکن بلدیہ جو کسی زمانہ میں مدرّس رہ چکے تھے اور اعداد وشمار سے شغف رکھتے تھے بول اٹھے: ''صاحبان! واضح رہے کہ امتحانوں میں ناکام رہنے والے طلبا کا تناسب پچھلے پانچ سال کی نسبت ڈیوڑھا ہو گیا ہے۔''

ایک رکن نے جو چشمہ لگائے ہوئے تھے اور ایک ہفتہ وار اخبار کے مدیر اعزازی تھے، تقریر کرتے ہوئے کہا: ''حضرات! ہمارے شہر سے روز بروز غیرت، شرافت، مردانگی، نکوکاری و پرہیز گاری، اٹھتی جارہی ہے اور اس کے بجائے بے غیرتی، نامردی، بزدلی، بدمعاشی، چوری اور جعل سازی کا دور دورہ ہوتا جارہا ہے۔ منشیات کا استعمال بہت بڑھ گیا ہے۔ قتل وغارت، خودکشی اور دیوالہ نکلنے کی وارداتیں بڑھتی جارہی ہے۔ اس کا سبب محض ان زنان بازاری کا ناپاک وجود ہے کیوں کہ ہمارے بھولے بھالے شہری ان کی زلف گرہ گیر کے اسیر ہو کر ہوش وخرد کھو بیٹھتے ہیں اور ان کے بارگاہ تک رسائی کی زیادہ سے زیادہ قیمت ادا کرنے کے لئے ہر جائز وناجائز طریق سے زر حاصل کرتے ہیں۔ بعض اوقات وہ اس سعی وکوشش میں جامۂ انسانیت سے باہر ہو جاتے ہیں اور نہایت قبیح افعال کا ارتکاب کر بیٹھتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یا تو وہ جان عزیز ہی سے ہاتھ دھو بیٹھتے

ہیں۔اور یا جیل خانوں میں پڑے سڑتے ہیں۔"

ایک پنشن یافتہ معمر رکن جو ایک وسیع خاندان کے سر پرست تھے اور دنیا کا سرد و گرم دیکھ چکے تھے اور اب کشمکشِ حیات سے تھک کر باقی ماندہ عمر ستانے اور اپنے اہل و عیال کو اپنے سایے میں پنپتا ہوا دیکھنے کے متمنی تھے، تقریر کرنے اٹھے۔ ان کی آواز لرزتی ہوئی اور لہجہ فریاد کا انداز لئے ہوئے تھا۔ بولے:

"صاحبان! رات بھر ان لوگوں کے طبلے کی تھاپ، ان کے گلے بازیاں، ان کے عشاق کی دھینگا مشتی، گالی گلوچ، شور و غل، ہاہاہا، ہوہوہو سن کر آس پاس کے رہنے والے شرفاء کے کان پک گئے ہیں۔ ضیق میں جان آگئی ہے۔ رات کی نیند حرام ہے تو دن کا چین مفقود، علاوہ ازیں ان کے قریب سے ہماری بہو بیٹیوں کے اخلاق پر جو بُرا اثر پڑتا ہے، اس کا اندازہ ہر صاحبِ اولاد خود کرسکتا ہے........"

آخری فقرہ کہتے کہتے ان کی آواز بھرا آگئی اور وہ اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکے۔ سب اراکین بلدیہ کو ان سے ہمدردی تھی کیونکہ بدقسمتی سے ان کا قدیمی مکان اس بازارِ حسن کے عین وسط میں واقع تھا۔

ان کے بعد ایک رکن بلدیہ نے جو پرانی تہذیب کے علم بردار تھے اور آثار قدیمہ کو اولاد سے زیادہ عزیز رکھتے تھے، تقریر کرتے ہوئے کہا: "حضرات! باہر سے جو سیاح اور ہمارے احباب اس مشہور اور تاریخی شہر کو دیکھنے آتے ہیں۔ جب وہ اس بازار سے گزرتے اور اس کے متعلق استفسار کرتے ہیں تو یقین کیجئے کہ ہم پر گھڑوں پانی پڑ جاتا ہے۔"

اب صدر بلدیہ تقریر کرنے اٹھے۔ گو قد ٹھگنا اور ہاتھ چھوٹے چھوٹے تھے مگر سر بڑا تھا جس کی وجہ سے بردبار آدمی معلوم ہوتے تھے۔ لہجہ میں حد درجہ متانت تھی۔ بولے:

"حضرات! میں اس امر میں قطعی طور پر آپ سے متفق ہوں کہ اس طبقہ کا وجود ہمارے شہر اور ہمارے تہذیب و تمدن کیلئے باعثِ صد عار ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ اس کا تدارک کس طرح کیا جائے۔ اگر ان لوگوں کو مجبور کیا جائے کہ یہ اپنا ذلیل پیشہ چھوڑ دیں تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ لوگ کھائینگے کہاں سے؟"

ایک صاحب بول اٹھے: "یہ عورتیں شادی کیوں نہیں کرلیتیں۔"

اس پر ایک طویل قہقہہ پڑا اور ہال کی ماتمی فضا میں یک بارگی شگفتگی کے آثار پیدا ہو گئے۔ جب اجلاس میں خاموشی ہوئی تو صاحب صدر بولے:

''حضرات! یہ تجویز بارہا ان لوگوں کے سامنے پیش کی جا چکی ہے، اس لئے ان کی طرف سے یہ جواب دیا جاتا ہے کہ آسودہ اور عزت دار لوگ خاندانی حرمت و ناموس کے خیال سے انھیں اپنے گھروں میں نہ گھسنے دیں گے اور مفلس اور ادنیٰ طبقہ کے لوگوں کو جو محض ان کی دولت کے لئے ان سے شادی کرنے پر آمادہ ہوں گے، یہ عورتیں خود منہ نہیں لگائیں گی۔''

اس پر ایک صاحب بولے: ''بلدیہ کو ان کے نجی معاملوں میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ بلدیہ کے سامنے تو یہ مسئلہ ہے کہ یہ لوگ چاہے، جہنم میں جائیں مگر اس شہر کو خالی کر دیں۔''

صدر نے کہا: ''صاحبان! یہ بھی آسان کام نہیں ہے۔ ان کی تعداد دس بیس نہیں سیکڑوں پر پہنچتی ہے اور پھر ان میں سے بہت سی عورتوں کے ذاتی مکانات بھی ہیں۔''

یہ مسئلہ کوئی مہینہ بھر تک بلدیہ کے زیر بحث رہا اور بالآخر تمام اراکین کی اتفاق رائے سے یہ امر قرار پایا کہ زنانِ بازاری کے مملوکہ مکانوں کو خرید لینا چاہئے اور ان کو رہنے کے لئے شہر سے کافی دور کوئی الگ تھلگ علاقہ دے دینا چاہئے۔ ان عورتوں نے بلدیہ کے اسی فیصلہ کے خلاف سخت احتجاج کیا۔ بعض نے نافرمانی کر کے بھاری جرمانے اور قیدیں تک بھگتیں مگر بلدیہ کی مرضی کے آگے کوئی پیش نہ چل سکی اور وہ ناچار صبر کر کے رہ گئیں۔

اس کے بعد ایک عرصہ تک ان زنانِ بازاری کے مملوکہ مکانوں کی فہرستیں اور نقشے تیار ہوتے اور مکانوں کے گاہک پیدا کئے جاتے رہے۔ بیشتر مکانوں کو بذریعہ نیلام فروخت کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ ان عورتوں کو چھ مہینے تک شہر میں اپنے پرانے مکانوں میں ہی رہنے کی اجازت دے دی گئی۔ تاکہ اس عرصہ میں وہ نئے علاقہ میں مکان بنوا سکیں۔

ان عورتوں کے لئے جو علاقہ منتخب کیا گیا وہ شہر سے چھ کوس دور تھا۔ پانچ کوس تک پکی سڑک جاتی تھی اور اس کے آگے کوس بھر کا کچا راستہ تھا۔ کسی زمانے میں وہاں کوئی بستی ہو گی مگر اب تو کھنڈروں کے سوا کچھ نہ رہا تھا جن میں سانپوں اور چمگادڑوں کے مسکن تھے اور دن دھاڑے اُلّو بولتے تھے۔ اس علاقے کے نواح میں کچے گھروندوں والے کئی چھوٹے چھوٹے گاؤں تھے مگر کسی کا فاصلہ بھی یہاں سے دو ڈھائی میل سے کم نہ تھا۔ ان گاؤں کے بسنے والے کسان دن کے وقت کھیتی

باڑی کرتے، یا یوں ہی پھرتے پھراتے ادھر نکل آتے تو نکل آتے، ورنہ عام طور پر اس شہرِ خموشاں میں آدم زاد کی صورت نظر نہ آتی تھی۔ بعض اوقات روزِ روشن ہی میں گیدڑ اس علاقے میں پھرتے دیکھے گئے تھے۔

پانسو سے کچھ اوپر بیسواؤں میں سے صرف ۱۴ ایسی تھیں، جو اپنے عشاق کی وابستگی یا خود اپنی دل بستگی یا کسی اور وجہ سے شہر کے قریب آزادانہ رہنے پر مجبور تھیں اور اپنے دولتمند چاہنے والوں کی مستقل مالی سرپرستی کے بھروسے بادلِ ناخواستہ اس علاقے میں رہنے پر آمادہ ہوگئی تھیں، ورنہ باقی عورتوں نے سوچ رکھا تھا کہ وہ یا تو اسی شہر کے ہوٹلوں کو اپنا مسکن بنائیں گی یا بظاہر پارسائی کا جامہ پہن کر شہر کے شریف محلوں کے کونوں کھدروں میں جا چھپیں گی یا پھر اس شہر ہی کو چھوڑ دیں گی۔

یہ چودہ بیسوائیں اچھی خاصی مالدار تھیں۔ اس شہر میں ان کے جو مملوکہ مکان تھے، ان کے دام انھیں اچھے مل گئے تھے اور اس علاقے میں زمین کی قیمت برائے نام تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کے ملنے والے دل و جان سے ان کی مالی امداد کرنے کے لئے تیار تھے۔ چنانچہ انھوں نے اس علاقے میں جی کھول کر بڑے عالیشان مکان بنوانے کی ٹھان لی۔ ایک اونچی اور ہموار جگہ جو ٹوٹی پھوٹی قبروں سے ہٹ کر تھی منتخب کی گئی۔ زمین کے قطعے صاف کرائے اور چابکدست نقشہ نویسوں سے مکانوں کے نقشے بنوائے گئے اور چند ہی روز میں تعمیر کا کام شروع ہوگیا۔

دن بھر اینٹ، مٹی، چونا، شہتیر، گارڈر اور دوسرا عمارتی سامان لاریوں، چھکڑوں، خچروں، گدھوں اور انسانوں پر لد کر اس بستی میں آتا اور منشی حساب کتاب کی کاپیاں بغلوں میں دبائے انھیں گنواتے اور کاپیوں میں درج کرتے۔ میر عمارت معماروں کو کام کے متعلق ہدایات دیتے۔ معمار مزدوروں کو ڈانٹتے، مزدور اِدھر اُدھر دوڑتے پھرتے۔ مزدور رنیوں کو چلا چلا کر پکارتے اور اپنے ساتھ کام کرنے کیلئے بلاتے۔ غرض سارا دن ایک شور، ایک ہنگامہ رہتا اور سارا دن آس پاس کے گاؤں کے دیہاتی اپنے کھیتوں میں اور دیہاتنیں اپنے گھروں میں ہوا کے جھونکوں کے ساتھ دور سے آتی ہوئی کھٹ کھٹ کی آوازیں سنتی رہتیں۔

اس بستی کے کھنڈروں میں ایک جگہ مسجد کے آثار تھے اور اس کے پاس ہی ایک کنواں تھا جو بند پڑا تھا۔ راج مزدوروں نے کچھ تو پانی حاصل کرنے اور بیٹھ کر سستانے کی غرض سے کچھ ثواب کمانے اور اپنے نمازی بھائیوں کی عبادت گزاری کے خیال سے سب سے پہلے اسی کی مرمت کی۔

چونکہ یہ فائدہ بخش اور ثواب کا کام تھا، اس لئے کسی نے کچھ اعتراض نہ کیا۔ چنانچہ دو تین روز میں مسجد تیار ہوگئی۔

دن کو بارہ بجے جیسے ہی کھانا کھانے کی چھٹی ہوتی، دو ڈھائی سو راج مزدور، میر عمارت، منشی اور ان بیسواؤں کے رشتہ دار یا کارندے جو تعمیر کی نگرانی پر مامور تھے، اس مسجد کے آس پاس جمع ہو جاتے اور اچھا خاصا میلہ سا لگ جاتا۔

ایک دن ایک دیہاتی بڑھیا جو پاس کے کسی گاؤں میں رہتی تھی، اس بستی کی خبر سن کر آ گئی۔ اس کے ساتھ ایک خوردسال لڑکا تھا۔ دونوں نے مسجد کے قریب ایک درخت کے نیچے گھٹیا سگریٹ، بیڑی چنے اور گڑ کی بنی ہوئی مٹھائیوں کا خوانچہ لگا دیا۔ بڑھیا کو آئے ابھی دو دن بھی نہ گزرے تھے کہ ایک بوڑھا کسان کہیں سے ایک مٹکا اٹھا لایا اور کنوئیں کے پاس اینٹوں کا ایک چھوٹا سا چبوترہ بنا، پیسے کے دو دو شکر کے شربت کے گلاس بیچنے لگا۔ ایک کنجڑے کو جو خبر ہوئی وہ ایک ٹوکرے میں خربوزے بھر کے لے آیا اور خوانچہ والی بڑھیا کے پاس بیٹھ کر: ''لے لو! خربوزے، شہد سے میٹھے خربوزے۔'' کی صدا لگانے لگا۔ اس شخص نے کیا کیا گھر سے سری پائے پکا، دیگچی میں رکھ، خوانچہ میں لگا، تھوڑی سی روٹیاں مٹی کے دو تین پیالے اور ٹین کا ایک گلاس لے کر آ موجود ہوا اور اس بستی کے کارکنوں کو جنگل میں ہنڈیا کا مزا چکھانے لگا۔

ظہر اور عصر کے وقت میرِ عمارت، معمار اور دوسرے لوگ مزدوروں سے کنویں سے پانی نکلوا نکلوا کر وضو کرتے نظر آتے۔ ایک شخص مسجد میں جا کر اذان دیتا، پھر ایک کو امام بنایا جاتا اور دوسرے لوگ اس کے پیچھے کھڑے ہو کر نماز پڑھتے۔ کسی گاؤں کے ایک ملاّ کے مکان میں جو یہ بھنک پڑی کہ فلاں مسجد میں امام کی ضرورت ہے۔ وہ دوسرے ہی دن علی الصباح ایک سبز جزدان میں قرآن شریف، پنج سورہ، رحل اور مسئلے مسائل کے چند چھوٹے چھوٹے رسالے رکھ کر آ موجود ہوا اور اس مسجد کی امامت باقاعدہ طور پر اسے سونپ دی گئی۔

ہر روز تیسرے پہر گاؤں کا ایک کبابی سر پر اپنے سامان کا ٹوکرا اٹھائے آ جاتا اور خوانچہ بڑھیا کے پاس زمین پر چولھا بنا، کباب، کلیجی، دل اور گردے سیخوں پر چڑھا، بستی والوں کے ہاتھ بیچتا۔ ایک بھٹیاری نے جو یہ حال دیکھا تو اپنے میاں کو ساتھ لے کر مسجد کے سامنے میدان میں دھوپ سے بچنے کے لئے پھوس کا ایک چھپر ڈال تنور گرم کرنے لگی۔ کبھی کبھی ایک نوجوان دیہاتی

نائی پھٹی پرانی کسبت گلے میں ڈالے جوتی کی ٹھوکروں سے راستے کے روڑوں کو لڑھکاتا ادھرادھر گشت کرتا دیکھنے میں آجاتا۔

ان بیسواؤں کے مکانوں کی تعمیر کی نگرانی ان کے رشتہ داریا کارندے تو کرتے ہی تھے۔ کسی کسی دن وہ دوپہر کے کھانے سے فارغ ہوکر اپنے عشاق کے ہمراہ خود بھی اپنے اپنے مکانوں کو بنتا دیکھنے آجاتیں اور غروب آفتاب سے پہلے یہاں سے نہ جاتیں۔ اس موقع پر فقیروں اور فقیرنیوں کی ٹولیوں کی ٹولیاں نہ جانے کہاں سے آجاتیں اور جب تک خیرات نہ لے لیتیں اپنی صداؤں سے برابر شور مچاتی رہتیں اور انھیں بات نہ کرنے دیتیں۔ کبھی کبھی شہر کے لفنگے، اوباش بیکار مباش کچھ کیا کر کے مصداق شہر سے پیدل چل کر بیسواؤں کی اس نئی بستی کی سن گن لینے آجاتے اور اگر اس دن بیسوائیں بھی آئی ہوتیں تو ان کی عید ہوجاتی۔ وہ ان سے ذرا ہٹ کر ان کے اردگرد چکر لگاتے رہتے۔ فقرے کستے، بے تکے قہقہے لگاتے، عجیب عجیب شکلیں بناتے اور مجنونانہ حرکتیں کرتے۔ اس روز کبابی کی خوب بکری ہوتی۔

اس علاقے میں جہاں تھوڑے ہی دن پہلے، ہو کا عالم تھا، اب ہر طرف گہما گہمی اور چہل پہل نظر آنے لگی۔ شروع شروع میں اس علاقے کی ویرانی سے ان بیسواؤں کو یہاں آکر رہنے کے خیال سے جو وحشت ہوتی تھی وہ بڑی حد تک جاتی رہی تھی اور اب وہ ہر مرتبہ خوش خوش اپنے مکانوں کی آرائش اور اپنے مرغوب رنگوں کے متعلق معماروں کو تاکیدیں کر جاتی تھیں۔

بستی میں ایک جگہ ایک ٹوٹا پھوٹا مزار تھا جو قرائن سے کسی بزرگ کا معلوم ہوتا تھا۔ جب یہ مکان نصف سے زیادہ تعمیر ہو چکے تو ایک دن بستی کے راج مزدوروں نے کیا دیکھا کہ مزار کے پاس سے دھواں اٹھ رہا ہے اور سرخ سرخ آنکھوں والا لمبا، تڑنگا مست فقیر لنگوٹ باندھے چارابرو کا صفایا کرائے اس مزار کے اردگرد پھر رہا اور کنکر پتھر اٹھا کر پرے پھینک رہا ہے۔ دوپہر کو وہ فقیر ایک گھڑا لے کر کنوئیں پر آیا اور پانی بھر بھر کر مزار پر لے جانے لگا اور اسے دھونے لگا۔ ایک دفعہ جو آیا تو کنوئیں پر دو تین راج مزدور کھڑے تھے۔ وہ نیم دیوانگی اور نیم فرزانگی کے عالم میں ان سے کہنے لگا: ''جانتے ہو یہ کس کا مزار ہے؟ کڑک شاہ پیر بادشاہ کا۔ میرے باپ دادا ان کے مجاور تھے۔'' اس کے بعد اس نے ہنس ہنس کر اور آنکھوں میں آنسو بھر بھر کے پیر کڑک شاہ کی کچھ جلالی کرامات بھی ان راج مزدوروں سے بیان کیں۔

شام کو یہ فقیر کہیں سے مانگ تانگ کر مٹی کے دو دیئے اور سرسوں کا تیل لے آیا اور پیر کڑک شاہ کی قبر کے سرہانے اور پائتی چراغ روشن کر دیے۔ رات کو پچھلے پہر کبھی کبھی اس مزار سے، اللہ ہو، کا مست نعرہ سنائی دے جاتا۔

چھ مہینے گزرنے نہ پائے تھے کہ یہ چودہ مکان بن کر تیار ہو گئے۔ یہ سب کے سب دو منزلہ اور قریب قریب ایک ہی وضع کے تھے۔ سات ایک طرف اور سات دوسری طرف بیچ میں چوڑی سڑک تھی اور ہر ایک مکان کے نیچے چار چار دو کانیں تھیں۔ مکان کی بالائی منزل میں سڑک کے رخ وسیع برآمدہ تھا۔ اس کے آگے بیٹھنے کے لئے کشتی نما شہ نشین بنائی گئی تھیں جس کے دونوں سروں پر یا تو سنگ مرمر کے مور رقص کرتے ہوئے دکھائے گئے تھے اور یا جل پریوں کے مجسمے تراشے گئے تھے جن کا آدھا دھڑ مچھلی کا اور آدھا انسان کا تھا۔ برآمدے کے پیچھے جو بڑا کمرہ بیٹھنے کے لئے تھا اس میں سنگ مرمر کے نازک نازک ستون بنائے گئے تھے۔ دیواروں پر خوش نما پچی کاری کی گئی تھی۔ فرش سبز چمک دار اور پتھر کا بنایا گیا تھا۔ جب سنگ مرمر کے ستونوں کے عکس اس فرش، زمردیں پر پڑتے تو ایسا معلوم ہوتا گویا سفید سفید براق پروں والے راج ہنسوں نے اپنی لمبی لمبی گردنیں جھیل میں ڈبو دی ہیں۔

بدھ کا شبھ دن اس بستی میں آنے کے لئے مقرر کیا گیا۔ اس روز اس بستی کی سب بیسواؤں نے مل کر بہت بھاری نیاز دلوائی۔ بستی کے کھلے میدان میں زمین کو صاف کر کے شامیانے نصب کر دیئے گئے۔ دیگیں کھڑکنے کی آواز اور گوشت اور گھی کی خوشبو بیس بیس کوس سے فقیروں اور کتوں کو کھینچ لائی۔ دو پہر ہوتے ہوتے پیر کڑک شاہ کے مزار کے پاس جہاں لنگر تقسیم کیا جانا تھا، اس قدر فقیر جمع ہو گئے کہ عید کے روز کسی بڑے شہر کی جامع مسجد کے پاس بھی نہ ہوئے ہوں گے۔ پیر کڑک شاہ کے مزار کو خوب صاف کروایا اور دھلوایا گیا اور اس پر پھولوں کی چادر چڑھائی گئی اور اس مست فقیر کو نیا جوڑا سلوا کر پہنایا گیا جسے اس نے پہنتے ہی پھاڑ ڈالا۔

شام کو شامیانے کے نیچے دودھ سی اجلی چاندنی کا فرش کر دیا گیا تھا۔ گاؤ تکئے لگا دیئے گئے۔ پان دان پیک پیچوان اور گلاب پاش رکھ دیئے گئے۔ اور راگ رنگ کی محفل سجائی گئی۔ دور دور سے بہت سی بیسواؤں کو بلوایا گیا، جو ان کی سہیلیاں یا برادری کی تھیں، ان کے ساتھ ان کے بہت سے ملنے والے بھی آئے، جن کے لئے ایک الگ شامیانے میں کرسیوں کا انتظام کیا گیا اور

ان کے سامنے روغن چقیں ڈال دیں گئیں۔ بے شمار گیسوں کی روشنی سے یہ جگہ بقعۂ نور بنی ہوئی تھی۔ ان بیسواؤں کے توندل سیاہ فام سازندے، زربفت اور کمخواب کی شیروانیاں پہنے عطر میں بسے ہوئے پھوئے کانوں میں رکھے ادھر ادھر مونچھوں کو تاؤ دیتے پھرتے اور زرق برق لباسوں اور تتلی کے پر سے بھی باریک ساریوں میں ملبوس، غازوں اور خوشبوؤں سے بسی ہوئی نازنینیں اٹکھیلیوں سے چلتیں، رات بھر رقص و سرور کا ہنگامہ برپا رہا اور جنگل میں منگل ہو گیا۔

دو تین دن کے بعد جب اس جشن کی تھکاوٹ اتر گئی تو یہ بیسوائیں ساز و سامان کی فراہمی اور مکانوں کی آرائش میں مصروف ہو گئیں۔ جھاڑ، فانوس، ظروف، بلوری، قد آدم آئینے، نواڑی پلنگ، تصویریں اور قطعات، سنہری چوکھٹوں میں جڑے ہوئے لائے گئے اور قرینے سے کمروں میں لگائے گئے اور کوئی آٹھ روز میں جا کر یہ مکان کیل کانٹے سے لیس ہوئے۔ یہ عورتیں دن کا بیشتر حصہ تو استادوں سے رقص و سرور کی تعلیم لینے غزلیں یاد کرنے، دھنیں بٹھانے، سبق پڑھنے، تختی لکھنے سینے پرونے، کاڑھنے، گراموفون سننے، استادوں سے تاش اور کیرم کھیلنے، ضلع جگت، نوک جھونک سے جی بہلانے یا سونے میں گذارتیں اور تیسرے پہر غسل خانوں میں نہانے جاتیں۔ جہاں ان کے ملازموں نے دستی پمپوں سے پانی نکال نکال کر ٹب بھر رکھے ہوتے۔ اس کے بعد وہ بناؤ سنگھار میں مصروف ہو جاتیں۔

جیسے ہی رات کا اندھیرا پھیلتا، یہ مکان گیسوں کی روشنی سے جگمگا اٹھتے جو جا بجا سنگِ مرمر کے آدھے کھلے ہوئے کنولوں میں نہایت صفائی سے چھپائے گئے تھے اور ان مکانوں کی کھڑکیوں اور دروازوں کے کواڑوں کے شیشے جو پھول پتیوں کی وضع کے کاٹ کر جڑے گئے تھے۔ ان کی قوسِ قزح کے رنگوں کی سی روشنیاں دور سے جھل مل جھل مل کرتی ہوئی نہایت بھلی معلوم ہوتیں۔ یہ بیسوائیں بناؤ سنگھار کئے برآمدوں میں ٹہلتیں آس پاس والیوں سے باتیں کرتیں، ہنستی کھلکھلاتیں۔ جب کھڑے کھڑے تھک جاتیں تو اندر کمرے میں چاندنی کے فرش پر گاؤ تکیوں سے لگ کر بیٹھ جاتیں۔ ان کے سازندے ساز ملاتے رہتے اور یہ چھالیا کترتی رہتیں۔ جب رات ذرا بھیگ جاتی تو ان کے ملنے والے ٹوکروں میں شراب کی بوتلیں اور پھل پھلاری لئے اپنے دوستوں کے ساتھ موٹروں یا تانگوں میں بیٹھ کر آتے۔ اس بستی میں ان کے قدم رکھتے ہی ایک خاص گہما گہمی اور چہل پہل ہونے لگی۔ نغمہ و سرور، ساز کے سر رقص کرتی ہوئی نازنینوں کے گھنگھروؤں کی

آواز قلقل مینا میں مل کر ایک عجیب سرور کی سی کیفیت پیدا کر دیتی۔ عیش و مستی کے ان ہنگاموں میں معلوم بھی نہ ہوتا اور رات بیت جاتی۔

ان بیسواؤں کو اس بستی میں آئے چند ہی روز ہوئے تھے کہ دوکانوں کے کرایہ دار پیدا ہونے شروع ہو گئے، جن کا کرایہ اس بستی کو آباد کرنے کے خیال سے بہت ہی کم رکھا گیا تھا۔ سب سے پہلے جو دکان دار آیا وہی بڑھیا تھی جس نے سب سے پہلے مسجد کے سامنے درخت کے نیچے خوانچہ لگایا تھا۔ دکان کو پر کرنے کے لئے بڑھیا اور اس کا لڑکا سگرٹوں کے بہت سے خالی ڈبے اٹھالائے اور انھیں منبر کے طاقوں میں سجا کر رکھ دیا گیا۔ بوتلوں میں رنگ دار پانی بھر دیا گیا تا کہ معلوم ہو شربت کی بوتلیں ہیں۔ بڑھیا نے اپنی بساط کے مطابق کاغذی پھولوں اور سگریٹ کی خالی ڈبیوں سے بنائی ہوئی بیلوں سے دکان کچھ آرائش بھی کی۔ بعض ایکٹروں اور ایکٹریسوں کی تصویریں بھی پرانے فلمی رسالوں سے نکال کر لئی سے دیواروں پر چپکا دیں۔ دکان کا اصل مال دو تین قسم کے سگریٹ تین تین چار چار پیکٹوں، بیڑی کے آٹھ دس بنڈلوں، دیاسلائی کے نصف درجن ڈبیوں، پانوں کی ایک ڈھولی، پینے کے تمباکو کی تین چار ٹکیوں اور موم بتی کے نصف بنڈل سے زیادہ نہ تھا۔

دوسری دکان میں ایک بنیا، تیسری میں حلوائی اور شیر فروش، چوتھی میں قصائی پانچویں میں کبابی اور چھٹی میں کنجڑے آبسے۔ کنجڑا آس پاس کے دیہات سے سستے داموں میں چار پانچ قسم کی سبزیاں لے آتا اور یہاں خاصے منافع پر بیچ دیتا۔ ایک آدھ ٹوکرا پھلوں کا بھی رکھ لیتا۔ چونکہ دکان خاصی کھلی تھی، ایک پھول والا اس کا ساجھی بن گیا۔ وہ دن بھر پھولوں کے ہار، گجرے اور طرح طرح کے گہنے بناتا رہتا اور شام کو انھیں چنگیر میں ڈال کر ایک ایک مکان پر لے جاتا اور نہ صرف پھول ہی بیچ آتا بلکہ ہر جگہ ایک ایک دو دو گھڑی بیٹھ کے سازندوں سے گپ شپ بھی ہانک لیتا۔ اور حقے کے دم بھی لگاتا جس دن تماش بینوں کی کوئی ٹولی اس کی موجودگی ہی میں کوٹھے پر چڑھ آتی اور گانا بجانا شروع ہو جاتا تو وہ سازندوں کے ناک بھوں چڑھانے کے باوجود گھنٹوں اٹھنے کا نام نہ لیتا، مزے سے گانے پر سر دھنتا اور بیوقوفوں کی طرح ایک ایک کی صورت تکتا رہتا، جس دن رات زیادہ گزر جاتی اور کوئی ہار بچ رہتا تو اسے اپنے گلے میں ڈال لیتا اور بستی کے باہر گلا پھاڑ پھاڑ کر گاتا پھرتا۔

ایک دکان میں ایک بیسوا کا باپ اور بھائی جو درزیوں کا کام جانتے تھے۔ سینے کی ایک

مشین رکھ کر بیٹھ گئے۔ ہوتے ہوتے ایک حجام بھی آ گیا اور اپنے ساتھ ایک رنگریز کو بھی لیتا آیا۔ اسی کی دوکان کے باہر الگنی پر لٹکے ہوئے طرح طرح کے رنگوں کے لہریا دوپٹے ہوا میں لہراتے ہوئے آنکھوں کو بہت بھلے معلوم ہونے لگے۔

چند ہی روز گزرے تھے کہ ایک ٹٹ پونجیے بساطی جس کی دوکان شہر میں چلتی نہ تھی بلکہ اسے دوکان کا کرایہ نکالنا بھی مشکل ہو جاتا تھا۔ شہر کو خیر باد کہہ کر اس بستی کا رخ کیا۔ یہاں اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور اس کے طرح طرح کے لونڈر، قسم قسم کے پاوڈر، صابن، کنگھیاں، بٹن، سوئی، دھاگا، لیس، فیتے، خوشبودار تیل رومال منجن وغیرہ کی خوب بکری ہونے لگی۔

اس بستی کے رہنے والوں کو سرپرستی اور ان کے مربیانہ سلوک کی وجہ سے اسی طرح دوسرے تیسرے کوئی نہ کوئی ٹٹ پونجیا دکان دار، کوئی بزاز، کوئی پنساری، کوئی نیچہ بند، کوئی نانبائی مندے کی وجہ سے یا شہر کے بڑھتے ہوئے کرایوں سے گھبرا کر اس بستی میں آپناہ لیتا۔

ایک بڑے میاں عطار جو حکمت میں بھی کسی قدر دخل رکھتے تھے ان کا جی شہر کی گنجان آبادی اور حکیموں اور دواخانوں کی افراط سے جو گھبرایا تو وہ اپنے شاگردوں کو ساتھ لے شہر سے اٹھ آئے اور اس بستی میں ایک دکان کرائے پر لی لے۔ سارا دن بڑے میاں اور ان کے شاگرد دواؤں کے ڈبوں، شربت کی بوتلوں اور مربے چٹنی اچار کے مرتبانوں کو الماریوں اور طاقوں میں اپنے ٹھکانے پر رکھتے رہے۔ ایک طاق میں طب اکبر قرابادین قادری اور دوسری طبی کتابیں جما کر رکھ دیں۔ کواڑوں کی اندرونی جانب اور دیواروں میں جو جگہ خالی بچی، وہاں انھوں نے اپنے خاص الخاص مجربات کے اشتہار سیاہ روشنائی سے جلی لکھ کر اور دفتیوں پر چپکا کر آویزاں کر دیئے۔ ہر روز صبح کو بیسواؤں کے ملازم گلاس لے لے کر آموجود ہوتے اور شربت بزوری، شربت بنفشہ، شربت انار اور ایسے ہی نزہت بخش، روح افزا شربت و عرق، خمیرہ گاؤزبان اور تقویت پہنچانے والے مربے مع ورق ہائے نقرہ لے جاتے۔

جو دکانیں بچ رہیں، ان میں بیسواؤں کے بھائی بندوں اور سازندوں نے اپنی چارپائیاں ڈال دیں۔ دن بھر یہ لوگ ان دوکانوں میں تاش، چوسر اور شطرنج کھیلتے، بدن پر تیل ملواتے، سبزی گھوٹتے، بٹیروں کی پالیاں کراتے، تیتروں سے سبحان تیری قدرت کی رٹ لگواتے اور گھڑا بجا بجا کر گاتے۔

ایک بیسوا کے سازندے نے ایک دکان خالی دیکھ کر اپنے بھائی کو جو ساز بنانا جانتا تھا، اس

میں لا بیٹھایا۔ دکان کی دیوار کے ساتھ ساتھ کیلیں ٹھونک کر ٹوٹی پھوٹی مرمت طلب سارنگیاں، ستار، طنبورے، دلربا وغیرہ ٹانگ دیئے گئے، یہ شخص ستار بجانے میں بھی کمال رکھتا تھا۔ شام کو وہ اپنی دکان میں ستار بجاتا جس کی میٹھی آواز سن کر آس پاس کے دکان دار آ جاتے اور دیر تک بت بنے ستار سنتے رہتے۔ اس ستار نواز کا ایک شاگرد تھا جو ریلوے کے دفتر میں کلرک تھا، اسے ستار سیکھنے کا بہت شوق تھا۔ جیسے ہی دفتر سے چھٹی ہوتی، سیدھا سائیکل اڑاتا ہوا اس بستی کا رخ کرتا اور گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ دکان ہی میں بیٹھ کر مشق کیا کرتا۔ غرض اس ستار نواز کے دم سے بستی میں خاصی رونق رہنے لگی۔

مسجد کے ملاجی جب تک یہ بستی زیر تعمیر رہی رات کو دیہات میں اپنے گھر چلے جاتے رہے مگر اب جبکہ انھیں دونوں وقت مرغن کھانا بافراط پہنچنے لگا تو وہ رات کو بھی یہیں رہنے لگے۔ رفتہ رفتہ بعض بیسواؤں کے گھروں سے بچے بھی مسجد میں آنے لگے جس سے ملاجی کو روپے پیسے کی آمدنی بھی ہونے لگی۔

ایک شہر شہر گھومنے والی گھٹیا درجہ کی تھیٹریکل کمپنی کو جب زمین کے چڑھے ہوئے کرائے اور اپنی بے مائگی کے باعث شہر میں کہیں جگہ نہ ملی تو اس نے اسی بستی کا رخ کیا اور بیسواؤں کے مکانوں سے کچھ فاصلے پر میدان میں تنبو کھڑے کر کے ڈیرے ڈال دیئے۔ اس کے ایکٹر اداکاری کے فن سے محض نابلد تھے، ان کے ڈریس پھٹے پرانے تھے جن کے بہت سے ستارے جھڑ چکے تھے اور یہ لوگ تماشے بھی بہت پرانے اور دقیانوسی دکھاتے تھے مگر اس کے باوجود یہ کمپنی چل نکلی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ٹکٹ کے دام بہت کم تھے، شہر کے مزدوری پیشہ لوگ کارخانوں میں کام کرنے والے اور غریب غرباء جو دن بھر کی کڑی محنت و مشقت کی کسر شور و غل، خرمستیوں اور ادنیٰ عیاشیوں سے نکالنا چاہتے تھے۔ پانچ پانچ چھ چھ کی ٹولیاں بنا کر گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے، ہنستے بولتے، بانسریاں اور الغوزے بجاتے، راہ چلتوں پر آوازیں کستے، گالی گلوچ کرتے۔ شہر سے پیدل چل کر تھیٹر دیکھنے آتے اور لگے ہاتھوں بازار حسن کی سیر بھی کر جاتے۔ جب تک ناٹک شروع نہ ہوتا، تھیٹر کا ایک مسخرہ تنبور کے باہر ایک اسٹول پر کھڑا کبھی کولھا ہلاتا، کبھی منہ پھلاتا، کبھی آنکھیں مٹکاتا، عجیب عجیب حیا سوز حرکتیں کرتا جنھیں دیکھ کر یہ لوگ زور زور سے قہقہے لگاتے اور گالیوں کی صورت میں داد دیتے۔

رفتہ رفتہ دوسرے لوگ بھی اس بستی میں آنے شروع ہوگئے۔ چنانچہ شہر کے بڑے بڑے چوکوں میں تانگے والے صدائیں لگانے لگے: ''آؤ کوئی نئی بستی کو!'' شہر سے پانچ کوس تک جو پکی سڑک جاتی تھی، اس پر پہنچ کر تانگے والے سواریوں سے انعام حاصل کرنے کی لالچ میں یا ان کی فرمائش پر تانگوں کی دوڑیں کراتے، منہ سے ہارن بجاتے اور جب کوئی تانگہ آگے نکل جاتا تو اس کی سواریاں نعروں سے آسمان سر پر اٹھالیتیں۔ اس دوڑ میں غریب گھوڑوں کا برا حال ہوجاتا اور ان کے گلے میں پڑے ہوئے پھولوں کے ہاروں سے بجائے خوشبو کے پسینے کی بدبو آنے لگتی۔

رکشا والے تانگے والوں سے کیوں پیچھے رہتے۔ وہ ان سے کم داموں پر سواریاں بٹھا طرارے بھرتے اور گھنگھرو بجاتے اس بستی کو جانے لگے۔ علاوہ ازیں ہر ہفتے کی شام کو اسکولوں اور کالجوں کے طلبا ایک ایک سائیکل پر دو دو لدے، جوق در جوق اس پراسرار بازار کی سیر کرنے آتے جس سے ان کے خیال کے مطابق ان کے بڑوں نے خواہ مخواہ انھیں محروم کردیا تھا۔

رفتہ رفتہ اس بستی کی شہرت چاروں طرف پھیلنے اور مکانوں اور دکانوں کی مانگ ہونے لگی۔ وہ بیسوائیں جو پہلے اس بستی میں آنے کو تیار نہ ہوتی تھیں، اب اس کی یہ دن دوگنی رات چوگنی ترقی دیکھ کر اپنی بیوقوفی پر افسوس کرنے لگیں۔ کئی عورتوں نے تو جھٹ زمین خرید کر ان بیسواؤں کے ساتھ ساتھ اس وضع قطع کے مکان بنوانے شروع کردیئے۔ علاوہ ازیں شہر کے بعض مہاجنوں نے بھی اس بستی کے آس پاس سستے داموں زمینیں خرید خرید کر کرایہ پر اٹھانے کے لئے چھوٹے چھوٹے کئی مکان بنوا ڈالے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ فاحشہ عورتیں جو ہوٹلوں اور شریف محلوں میں روپوش تھیں، مور و ملخ کی طرح اپنے نہاں خانوں سے باہر نکل آئیں اور ان مکانوں میں آباد ہوگئیں۔ بعض چھوٹے چھوٹے مکانوں میں اس بستی کے وہ دکاندار آبسے جو عیال دار تھے اور رات کو دکانوں میں سو نہ سکتے تھے۔

اس بستی میں آبادی تو خاصی ہوگئی تھی مگر ابھی تک بجلی کی روشنی کا انتظام نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ ان بیسواؤں اور بستی کے تمام رہنے والوں کی طرف سے سرکار کے پاس بجلی کیلئے درخواست بھیجی گئی تھی۔ جو تھوڑے دنوں بعد منظور کرلی گئی۔ اسکے ساتھ ہی ایک ڈاک خانہ بھی کھول دیا گیا۔ ایک بڑے میاں ڈاک خانے کے باہر ایک صندوقچے میں لفافے، کارڈ اور قلم دوات رکھ، بستی کے لوگوں کے خط پتر لکھنے لگے۔

ایک دفعہ بستی میں شرابیوں کی دو ٹولیوں میں فساد ہو گیا، جس میں سوڈا واٹر کی بوتلیں، چاقوؤں اور اینٹوں کا آزادانہ استعمال کیا گیا اور کئی لوگ سخت مجروح ہوئے۔ اس پر سرکار کو خیال آیا کہ اس بستی میں ایک تھانہ بھی کھول دینا چاہیے۔

تھیٹریکل کمپنی دو مہینے تک رہی اور اپنی بساط کے مطابق خاصا کما لے گئی۔ اس پر شہر کے ایک سینما کے مالک نے سوچا کہ کیوں نہ اس بستی میں بھی سینما کھول دیا جائے۔ یہ خیال آنے کی دیر تھی کہ اس نے جھٹ ایک موقع کی جگہ چن کر خرید لی اور جلد جلد تعمیر کا کام شروع کرا دیا۔ چند ہی مہینوں میں سینما ہال تیار ہو گیا۔ اس کے باہر ایک چھوٹا سا باغیچہ بھی لگوایا گیا تاکہ تماشائی اگر بائی اسکوپ شروع ہونے سے پہلے آجائیں تو آرام سے باغیچے میں بیٹھ سکیں۔ ان کے ساتھ بستی کے لوگ یوں ہی ستانے یا سیر دیکھنے کی غرض سے آ کے بیٹھنے لگے۔ یہ باغیچہ خاصا سیر گاہ بن گیا۔ رفتہ رفتہ سقے کٹورا بجاتے اس باغیچے میں آنے اور پیاسوں کی پیاس بجھانے لگے۔ سر کے تیل کی مالش والے نہایت گھٹیا قسم کے تیز خوشبو والے تیل کی شیشیاں واسکٹ کی جیبوں میں ٹھونسے کاندھے پر میلا کچیلا تولیہ ڈالے، دل پسند، دل بہار مالش کی صدا لگاتے درد سر کے مریضوں کو اپنی خدمات پیش کرنے لگے۔

سینما کے مالک نے سینما ہال کی عمارت کی بیرونی جانب دو ایک مکان اور کئی دوکانیں بھی بنوائیں۔ مکان میں تو ہوٹل کھل گیا جس میں رات کو قیام کرنے کے لئے کمرے بھی مل سکتے تھے۔ اور دکانوں میں ایک سوڈا واٹر کی فیکٹری والا، ایک فوٹو گرافر، ایک سائیکل مرمت والا، ایک لانڈری والا، دو پنواری، ایک بوٹ شاپ والا اور ایک ڈاکٹر مع اپنے دوا خانہ کے آ رہے۔ ہوتے ہوتے پاس ہی ایک دکان میں کلال خانہ کھلنے کی اجازت مل گئی۔ فوٹو گرافر کی دکان کے باہر ایک کونے میں ایک گھڑی ساز نے ڈیرا جمایا اور ہر وقت محدب شیشہ آنکھ پر چڑھائے گھڑیوں کے کل پرزوں میں غلطاں و پیچاں رہنے لگا۔

اس کے کچھ ہی دن بعد بستی میں نل، روشنی اور صفائی کا باقاعدہ انتظام کی طرف توجہ کی جانے لگی۔ سرکاری کارندے، سرخ جھنڈیاں، جریبیں اور اونچ نیچ دیکھنے والے لے لے کر آ پہنچے اور ناپ ناپ کر سڑکوں اور گلی کوچوں کی داغ بیل ڈالنے لگے اور بستی کی کچی سڑکوں پر سڑک کوٹنے والا انجن چلنے لگا۔

اس واقعہ کو بیس برس گذر چکے ہیں۔ یہ بستی اب ایک بھرا ہوا شہر بن گئی ہے جس کا اپنا ریلوے اسٹیشن ہے اور ٹاؤن ہال بھی۔ کچہری بھی اور جیل خانہ بھی، آبادی ڈھائی کے لگ بھگ ہے۔ شہر میں ایک کالج، دو ہائی اسکول، ایک لڑکوں کے لئے ایک لڑکیوں کے لئے اور آٹھ پرائمری اسکول ہیں جن میں میونسپلٹی کی طرف سے مفت تعلیم دی جاتی ہے۔ چھ سنیما ہیں اور چار بینک جن میں سے دو دنیا کے بڑے بڑے بینکوں کی شاخیں ہیں۔

شہر سے دو روزانہ، تین ہفتہ وار اور دس ماہانہ رسائل و جرائد شائع ہوتے ہیں۔ ان میں چار ادبی، دو اخلاقی و معاشرتی و مذہبی، ایک صنعتی، ایک طبی، ایک زنانہ اور ایک بچوں کا رسالہ ہے۔ شہر کے مختلف حصوں میں دو مسجدیں، پندرہ مندر اور دھرم شالے، چھ یتیم خانے پانچ اناتھ آشرم اور تین بڑے سرکاری ہسپتال ہیں جن میں ایک صرف عورتوں کے لئے مخصوص ہے۔

شروع شروع میں کئی سال تک یہ شہر اپنے رہنے والوں کی مناسبت سے حسن آباد کے نام سے موسوم کیا جاتا رہا مگر بعد میں اسے نامناسب سمجھ کر اس میں تھوڑی سی ترمیم کردی گئی۔ یعنی بجائے حسن آباد کے، حسن آباد کہلانے لگا مگر یہ نام چل نہ سکا کیونکہ عوام حسن اور حسن میں کچھ امتیاز نہ کرتے۔ آخر بڑی بڑی بوسیدہ کتابوں کی ورق گردانی اور پرانے نوشتوں کی چھان بین کے بعد اس کا اصلی نام دریافت کیا گیا جس سے یہ بستی آج سے سینکڑوں برس قبل اجڑنے سے پہلے موسوم تھی اور وہ نام ہے: ''آنندی!''

یوں تو سارا شہر بھرا پرا، صاف ستھرا اور خوش نما ہے مگر سب سے خوبصورت، سب سے بارونق اور تجارت کا سب سے بڑا مرکز وہی بازار ہے جس میں زنانِ بازاری رہتی ہیں۔

آنندی کے بلدیہ کا اجلاس زوروں پر ہے۔ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا ہے اور خلافِ معمول ایک ممبر بھی غیر حاضر نہیں۔ بلدیہ کے زیرِ بحث مسئلہ یہ ہے کہ زنانِ بازاری کو شہر بدر کردیا جائے کیوں کہ ان کا وجود انسانیت، شرافت اور تہذیب کے دامن پر بدنما داغ ہے۔

ایک فصیح البیان مقرر تقریر کر رہے ہیں: ''معلوم نہیں وہ کیا مصلحت تھی جس کے زیر اثر اس ناپاک طبقے کو ہمارے اس قدیمی اور تاریخی شہر کے عین بیچوں بیچ رہنے کی اجازت دے دی گئی۔''

اس مرتبہ عورتوں کے رہنے کیلئے جو علاقہ منتخب کیا گیا ہے، وہ شہر سے بارہ کوس دور تھا۔

چوتھی کا جوڑا

عصمت چغتائی

(۱۹۱۵ء - ۱۹۹۱ء)

سہ دری کے چوکے پر آج پھر صاف ستھری جازم بچھی تھی۔ ٹوٹی پھوٹی کھپریل کی جھریوں میں سے دھوپ کے آڑے ترچھے قتلے پورے دالان میں بکھرے ہوئے تھے۔ محلّے ٹولے کی عورتیں خاموش اور سہمی ہوئی سی بیٹھی تھیں، جیسے کوئی بڑی واردات ہونے والی ہو۔ ماؤں نے بچے چھاتیوں سے لگا لئے تھے۔ کبھی کبھی کوئی مخنتی سا چڑچڑا بچہ رسد کی کمی کی دہائی دے کر چلا اُٹھتا۔

"نائیں نائیں میرے لال!" دبلی پتلی ماں اسے اپنے گھٹنے پر لٹا کر یوں ہلاتی، جیسے دھان ملے چاول دھوپ میں پھٹک رہی ہو اور پھر ہنکارے بھر کر خاموش ہو جاتا۔

آج کتنی آس بھری نگاہیں کبریٰ کی ماں کے متفکر چہرے کو تک رہی تھیں، چھوٹے عرض کی ٹول کے دو پاٹ تو جوڑ لئے گئے تھے مگر ابھی سفید گزی کا نشان بیونتنے کی کسی کو ہمت نہ پڑی تھی۔ کاٹ چھانٹ کے معاملہ میں کبریٰ کی ماں کا مرتبہ بہت اونچا تھا۔ ان کے سوکھے سوکھے ہاتھوں نے نہ جانے کتنے جہیز سنوارے تھے، کتنے چھٹی چھوچھک تیار کئے تھے اور کتنے ہی کفن بیونتے تھے۔

جہاں کہیں محلہ میں کپڑا کم پڑ جاتا اور لاکھ جتن پر بھی بیونت نہ بیٹھتی، کبریٰ کی ماں کے پاس کیس لایا جاتا۔ کبریٰ کی ماں کپڑے کی کان نکالتیں، کلف توڑتیں، کبھی تکون بناتیں، کبھی چوکھنٹا کرتیں اور دل ہی دل میں قینچی چلا کر آنکھوں سے ناپ تول کر مسکرا پڑتیں۔

''آستین کے لئے گھیر تو نکل آئے گا، گریبان کے لئے کترن میری بقچی سے لے لو۔'' اور مشکل آسان ہو جاتی۔ کپڑا تراش کردہ کترنوں کی پنڈی بنا کر پکڑا دیتیں۔

پر آج تو سفید گزی کا ٹکڑا بہت ہی چھوٹا تھا اور سب کو یقین تھا کہ آج تو کبریٰ کی ماں بھی ناپ تول ہار جائے گی، جب ہی تو سب دم سادھے ان کا منہ تک رہی تھیں۔ کبریٰ کی ماں کے پُر استقلال چہرے پر فکر کی کوئی شکل نہ تھی، چارہ گرہ گزی کے ٹکڑے کو وہ نگاہوں سے بیونت رہی تھیں۔ لال ٹول کا عکس ان کے نیلگوں زرد چہرے پر شفق کی طرح پھوٹ رہا تھا۔ وہ اُداس اُداس گہری جھریاں اندھیری گھٹاؤں کی طرح ایک دم اُجاگر ہو گئیں، جیسے گھنے جنگل میں آگ بھڑک اُٹھی ہو اور انھوں نے مسکرا کر قینچی اُٹھالی۔

محلہ والیوں کے جمگھٹے سے ایک لمبی اطمینان کی سانس اُبھری۔ گود کے بچے بھی ٹھسک دیئے گئے۔ چیل جیسی نگاہوں والی کنواریوں نے چھپا چھپ سوئی کے ناکوں میں ڈورے پروئے، نئی بیاہی دلہنوں نے انگشتانے پہن لئے۔ کبریٰ کی ماں کی قینچی چل پڑی تھی۔

سہ دری کے آخری کونے میں پلنگڑی پر حمیدہ پیر لٹکائے ہتھیلی پر ٹھوڑی رکھے دور کچھ سوچ رہی تھی۔

دوپہر کا کھانا نمٹا کر اسی طرح بی اماں سہ دری کی چوکی پر جا بیٹھتی ہیں اور بقچی کھول کر رنگ برنگے کپڑوں کا جال بکھیر دیا کرتی ہیں۔ کونڈی کے پاس بیٹھی مانجھتی ہوئی کبریٰ کن انکھیوں سے ان لال کپڑوں کو دیکھتی تو ایک سرخ جھپکی اس کے زردی مائل مٹیالے رنگ میں لپک اُٹھتی۔ روپہلی کٹوریوں کے جال جب پولے پولے ہاتھوں سے کھول کر اپنے زانوؤں پر پھیلاتیں تو ان کا مرجھایا ہوا چہرہ ایک عجیب ارمان بھری روشنی سے جگمگا اُٹھتا۔ گہری صندوقوں جیسی شکنوں پر کٹوریوں کا عکس ننھی ننھی مشعلوں کی طرح جگمگانے لگتا۔ ہر ٹانکے پر زری کا کام ہلتا اور مشعلیں کپکپا اُٹھتیں۔

یاد نہیں کب اس کے شبنمی دوپٹے بنے، ٹکے تیار ہوئے اور گاڑی کے بھاری قبر جیسے صندوق کی تہہ میں ڈوب گئے۔ کٹوریوں کے جال دھندلا گئے۔ گنگا جمنی کرنیں ماند پڑ گئیں۔ طولی

کے لچھے اداس ہوگئے مگر کبریٰ کی برأت نہ آئی۔ جب ایک جوڑا پرانا ہوجاتا تو اسے چالے کا جوڑا کہہ کر سینت دیا جاتا اور پھر ایک نئے جوڑے کے ساتھ نئی امیدوں کا افتتاح ہوجاتا۔ بڑی چھان بین کے بعد نئی دلہن چھانٹی جاتی۔ سہ دری کے چوکے پر صاف ستھری چادر بچھتی۔ محلہ کی عورتیں ہاتھ میں پاندان اور بغلوں میں بچے دبائے جھانجھیں بجاتی آن پہنچتیں۔

''چھوٹے کپڑوں کی گونٹ تو اتر آئے گی، پر بچیوں کا کپڑا نہ نکلے گا۔''

''بوبوا! لو اور سنو، تو کیا نگوڑی ماری ٹول کی چولیں پڑیں گی؟'' اور پھر سب کے چہرے فکر مند ہوجاتے۔ کبریٰ کی ماں خاموش کیمیاگر کی طرح آنکھوں کے فیتے سے طول وعرض ناپتی اور بیویاں آپس میں چھوٹے کپڑے کے متعلق کھسر پھسر کرکے قہقہہ لگاتیں۔ ایسے میں کوئی من چلی کوئی سہاگ یا بنا چھیڑ دیتی۔ کوئی اور چار ہاتھ آگے والی سمدھنوں کو گالیاں سنانے لگتی، بیہودہ گندے مذاق اور چہلیں شروع ہوجاتیں۔ ایسے موقعوں پر کنواری بالیوں کو سہ دری سے دور سر ڈھانک کر کھپریل میں بیٹھنے کا حکم دے دیا جاتا اور جب کوئی نیا قہقہہ سہ دری سے اُبھرتا تو بے چاریاں ایک ٹھنڈی سانس بھر کر رہ جاتیں: ''اللہ! یہ قہقہے انھیں خود کب نصیب ہوں گے؟''

اس چہل پہل سے دور کبریٰ شرم کی ماری مچھروں والی کوٹھری میں سر جھکائے بیٹھی رہتی۔ اتنے میں کتر بیونت نہایت نازک مرحلے پر پہنچ جاتی۔ کوئی کلی الٹی کٹ جاتی اور اس کے ساتھ بیویوں کی مت بھی کٹ جاتی۔ کبریٰ سہم کر دروازے کی آڑ سے جھانکتی۔

یہی تو مشکل تھی۔ کوئی جوڑا اللہ مارا چین سے نہ سلنے پایا۔ جو کلی الٹی کٹ جائے تو جان لو نائن کی لگائی ہوئی بات میں ضرور کوئی اڑنگا لگے گا۔ یا تو دولہا کی کوئی داشتہ نکل آئے گی یا اس کی ماں ٹھوس کڑوں کا اڑنگا باندھے گی۔ جو گوٹ میں کان آجائے تو سمجھ لو یا تو مہر پر بات ٹوٹے گی یا بھرت کے پایوں کے پلنگ پر جھگڑا ہوگا۔ چوتھی کے جوڑے کا شگون بڑا نازک ہوتا ہے۔ بی اماں کی ساری مشاقی اور سگھڑاپا دھرا رہ جاتا۔ نہ جانے عین وقت پر کیا ہوجاتا کہ دھنیا برابر بات طول پکڑ جاتی۔ بسم اللہ کے زور سے سگھڑ ماں نے جہیز جوڑنا شروع کردیا تھا۔ ذرا سی کترن بھی بچتی تو تیلے دانی یا شیشی کا غلاف سی کر دھنک گوکھرو سے سنوار کر رکھ دیتیں۔ لڑکی کا کیا ہے کھیرے ککڑی کی طرح بڑھتی ہے۔ جو برأت آ گئی تو یہی سلیقہ کام آئے گا۔

اور جب سے ابا گزرے، سلیقہ کا بھی دم پھول گیا۔ حمیدہ کو ایک دم ابا یاد آگئے۔ ابا کتنے

دبلے پتلے لمبے جیسے محرم کا علم۔ ایک بار جھک جاتے تو سیدھے کھڑا ہونا دشوار تھا۔ صبح ہی صبح اٹھ کر نیم کی مسواک توڑ لیتے اور حمیدہ کو گھٹنے پر بٹھا کر نہ جانے کیا سوچا کرتے، پھر سوچتے سوچتے نیم کی مسواک کا کوئی پھونسڑا حلق میں چلا جاتا اور وہ کھانستے ہی چلے جاتے۔ حمیدہ بگڑ کر ان کی گود سے اُتر آتی۔ کھانسی کے دھکوں سے یوں ہل ہل جانا اسے قطعی پسند نہ تھا۔ اس کے ننھے سے غصے پر وہ ہنستے اور کھانسی سینے میں بے طرح الجھتی، جیسے گردن کٹے کبوتر پھڑ پھڑا رہے ہوں، پھر بی اماں آ کر انہیں سہلا دیتیں۔ پیٹھ پر دھپ دھپ ہاتھ مارتیں۔

''توبہ ہے، ایسی بھی کیا ہنسی؟''

اچھو کے دباؤ سے سرخ آنکھیں اوپر اٹھا کر ابا بے کسی سے مسکراتے۔ کھانسی تو رک جاتی مگر وہ دیر تک بیٹھے ہانپا کرتے۔

''کچھ دوا دارو کیوں نہیں کرتے؟ کتنی بار کہا تم سے۔''

''بڑے شفا خانے کا ڈاکٹر کہتا ہے سوئیاں لگواؤ اور روز تین پاؤ دودھ اور آدھی چھٹانک مکھن کھاؤ۔''

''اے خاک پڑے ان ڈاکٹروں کی صورت پر۔ بھلا ایک تو کھانسی ہے، اوپر سے چکنائی، بلغم نہ پیدا کر دے گی۔ حکیم کو دکھاؤ کسی کو۔''

''دکھاؤں گا۔'' ابا حقہ گڑگڑاتے اور پھر اچھو لگتا۔

''آگ لگے اس موئے حقے کو۔ اسی نے تو یہ کھانسی لگائی ہے۔ جوان بیٹی کی طرف بھی دیکھتے ہو آنکھ اُٹھا کر۔''

اور ابا کبریٰ کی جوانی کی طرف رحم طلب نگاہوں سے دیکھتے۔ کبریٰ جوان تھی۔ کون کہتا تھا کہ جوان تھی۔ وہ تو جیسے بسم اللہ کے دن سے ہی اپنی جوانی کی آمد کی سناؤنی سن کر ٹھٹھک کر رہ گئی تھی۔ نہ جانے کیسی جوانی آئی تھی کہ نہ تو اس کی آنکھوں میں کرنیں ناچیں، نہ اس کے رخساروں پر زلفیں پریشان ہوئیں، نہ اس کے سینے پر طوفان اُٹھے اور نہ کبھی ساون بھادوں کی گھٹاؤں سے مچل مچل کر پریتم یا ساجن مانگے۔ وہ جھکی جھکی، سہمی سہمی جوانی جو نہ جانے کب دبے پاؤں اس پر رینگ آئی، ویسے ہی چپ چاپ نہ جانے کدھر چل دی۔ میٹھا برس نمکین ہوا اور پھر کڑوا ہو گیا۔

ابا ایک دن چوکھٹ پر اوندھے منہ گرے اور انھیں اُٹھانے کے لئے کسی حکیم یا ڈاکٹر کا نسخہ

نہ آسکا۔ اور حمیدہ نے میٹھی روٹی کے لئے ضد کرنی چھوڑ دی اور کبریٰ کے پیغام نہ جانے کدھر راستہ بھول گئے۔ جانو کسی کو معلوم ہی نہیں کہ اس ٹاٹ کے پردے کے پیچھے کسی کی جوانی آخری سسکیاں لے رہی ہے اور ایک نئی جوانی سانپ کے پھن کی طرح اُٹھ رہی ہے۔

مگر بی اماں کا دستور نہ ٹوٹا، وہ اسی طرح روز دوپہر کو سہ دری میں رنگ برنگے کپڑے پھیلا کر گڑیوں کا کھیل کھیلا کرتی ہیں۔ کہیں نہ کہیں سے جوڑ جمع کر کے شبرات کے مہینے میں کریب کا ڈوپٹہ ساڑھے سات روپے میں خرید ہی ڈالا۔ بات ہی ایسی تھی کہ بغیر خریدے گزارہ نہ تھا۔ منجھلے ماموں کا تار آیا کہ ان کا بڑا لڑکا راحت پولس کی ٹریننگ کے سلسلے میں آرہا ہے۔ بی اماں کو تو بس جیسے ایک دم گھبراہٹ کا دورہ پڑ گیا۔ جانو چوکھٹ پر برأت آن کھڑی ہوئی۔ اور انہوں نے ابھی دلہن کی مانگ کی فشاں بھی نہیں کتری۔ ہول سے تو ان کے چھکّے چھوٹ گئے۔ جھٹ اپنی منہ بولی بہن بندو کی ماں کو بلا بھیجا کہ: ''بہن! میرا مری کا منہ دیکھو جو اسی گھڑی نہ آؤ۔''

اور پھر دونوں میں کھسر پھسر ہوئی۔ بیچ میں ایک نظر دونوں کبریٰ پر بھی ڈال لیتیں، جو دالان میں بیٹھی چاول پھٹک رہی تھی۔ وہ اس کانا پھوسی کی زبان کو اچھی طرح سمجھتی تھی۔

اسی وقت بی اماں نے کانوں کی چار ماشہ کی لونگیں اُتار کر منہ بولی بہن کے حوالے کیں کہ جیسے تیسے کر کے شام تک تولہ بھر گوکھرو چھ ماشہ سلمہ ستارا اور پاؤ گز نیفے کے لئے ٹول لا دیں۔ باہر کی طرف والا کمرہ جھاڑ پونچھ کر تیار کیا۔ تھوڑا سا چونا منگا کر کبریٰ نے اپنے ہاتھوں سے کمرہ پوت ڈالا۔ کمرہ تو چٹا ہو گیا مگر اس کی ہتھیلیوں کی کھال اُڑ گئی اور جب وہ شام کو مسالہ پیسنے بیٹھی تو چکّر کھا کر دوہری ہو گئی۔ ساری رات کروٹیں بدلتی گزری۔ ایک تو ہتھیلیوں کی وجہ سے، دوسرے صبح کی گاڑی سے راحت آرہے تھے۔

''اللہ، میرے اللہ میاں! اب تو میری آپا کا نصیبہ کھل جائے۔ میرے اللہ میں سو رکعت نفل نماز تیری درگاہ میں پڑھوں گی۔'' حمیدہ نے فجر کی نماز پڑھ کر دعا مانگی۔

صبح راحت بھائی آئے تو کبریٰ پہلے ہی سے مچھروں والی کوٹھری میں جا چھپی تھی۔ جب سیویوں اور پراٹھوں کا ناشتہ کر کے بیٹھک میں چلے گئے تو دھیرے دھیرے نئی دلہن کی طرح پیر رکھتی کبریٰ کوٹھری سے نکلی اور جوٹھے برتن اُٹھا لئے۔

''لاؤ میں دھوؤں بی آپا!'' حمیدہ نے شرارت سے کہا۔

''نہیں۔'' وہ شرم سے جھک گئی۔

حمیدہ چھیڑتی رہی، بی اماں مسکراتی رہیں اور کریب کے ڈوپٹہ میں لپاٹانکتی رہیں۔

جس راستہ کان کی لونگیں گئی تھیں، اسی راستے پھول پتہ اور چاندی کی پازیب بھی چل دی اور پھر ہاتھوں کی دو دو چوڑیاں بھی جو منجھلے ماموں نے رنڈاپا اُتارنے پر دی تھیں، روکھی سوکھی خود کھا کر آئے دن راحت کے لئے پراٹھے تلے جاتے، کوفتے، بھنا پلاؤ مہکتے۔ خود سوکھا سا نوالہ پانی سے اُتار کر وہ ہونے والے داماد کو گوشت کے لچھے کھلاتیں۔

''زمانہ بڑا خراب ہے بیٹی!'' وہ حمیدہ کو منہ پھیلاتے دیکھ کر کہا کرتیں اور وہ سوچا کرتی:

''ہم بھوکے رہ کر داماد کو کھلا رہے ہیں۔ بی آپا صبح سویرے اُٹھ کر جادو کی مشین کی طرح جٹ جاتی ہے۔ نہار منہ پانی کا گھونٹ پی کر راحت کے لئے پراٹھے تلتی ہے۔ دودھ اونٹاتی ہے تا کہ موٹی سی ملائی پڑے۔ اس کا بس نہیں تھا کہ وہ اپنی چربی نکال کر ان پراٹھوں میں بھر دے اور کیوں نہ بھرے۔ آخر کو وہ ایک دن اس کا اپنا ہو جائے گا۔ جو کچھ کمائے گا، اُس کی ہتھیلی پر رکھ دے گا۔ پھل دینے والے پودے کو کون نہیں سینچتا؟ پھر جب ایک دن پھول کھلیں گے اور پھلوں سے لدی ہوئی ڈالی جھکے گی تو یہ طعنہ دینے والیوں کے منہ پر کیسا جوتا پڑے گا اور اس خیال ہی سے میری بی آپا کے چہرے پر سہاگ کھل اُٹھا۔ کانوں میں شہنائیاں بجنے لگتیں اور وہ راحت بھائی کے کمرے کو پلکوں سے جھاڑتیں۔ ان کے کپڑوں کو پیار سے تہ کرتیں، جیسے وہ کچھ ان سے کہتے ہوں۔ وہ ان کے بدبودار چوہوں جیسے سڑے ہوئے موزے دھوتیں۔ بساندی بنیان اور ناک سے لتھڑے ہوئے رومال صاف کرتیں۔ ان کے تیل میں چیچہاتے ہوئے تکیئے کے غلاف پر سوئٹ ڈریم کاڑھتیں، پر معاملہ چاروں کونے چوکس نہیں بیٹھ رہا تھا۔'' راحت صبح انڈے پراٹھے ڈٹ کر کھاتا اور شام کو آ کر کوفتے کھا کر سو جاتا، اور بی اماں کی منہ بولی بہن چکمانہ انداز میں کھسر پھسر کرتیں۔

''بڑا شرمیلا ہے بے چارہ۔'' بی اماں تاویلیں پیش کرتیں۔

''ہاں، یہ تو ٹھیک ہے، پر بھئی کچھ تو پتا چلے، رنگ ڈھنگ سے، کچھ آنکھوں سے۔''

''اے نوج، خدا نہ کرے میری لونڈیا آنکھیں لڑائے۔ اس کا آنچل بھی نہیں دیکھا ہے کسی نے۔'' بی اماں فخر سے کہتیں۔

''اے تو پردا توڑوانے کو کون کہے ہے۔'' بی آپا کے پکے مہاسوں کو دیکھ کر انہیں بی اماں کی

دوراندیشی کی داد دینی پڑی۔

''اے بہن! تم تو سچ میں بہت بھولی ہو۔ یہ میں کب کہوں ہوں۔ یہ چھوٹی نگوڑی کون سی بکرید کو کام آئے گی؟'' وہ میری طرف دیکھ کر ہنستی۔

''اری او نک چڑھی! بہنوئی سے کوئی بات چیت، کوئی ہنسی مذاق، اونہہ واری چل دیوانی۔''

''اے تو میں کیا کروں خالہ؟''

''راحت میاں سے بات چیت کیوں نہیں کرتی؟''

''بھئی ہمیں تو شرم آتی ہے۔''

''اے ہے، وہ تجھے پھاڑ ہی تو کھائے گا۔'' بی اماں چڑ کر بولیں۔

''نہیں تو۔ مگر.....'' میں لاجواب ہو گئی اور پھر مسکوٹ ہوئی۔ بڑی سوچ بچار کے بعد کھلی کے کباب بنائے گئے۔ آج بی اماں بھی کئی بار مسکرا پڑیں۔ چپکے سے بولیں۔

''دیکھو ہنسنا نہیں، نہیں تو سارا کھیل بگڑ جائے گا۔''

''نہیں ہنسوں گی۔'' میں نے وعدہ کیا۔

''کھانا کھا لیجیے۔'' میں نے چوکی پر کھانے کی سینی رکھتے ہوئے کہا، پھر جو پٹی کے نیچے رکھے ہوئے لوٹے سے ہاتھ دھوتے وقت میری طرف سر سے پاؤں تک دیکھا تو میں بھاگی وہاں سے۔ میرا دل دھک دھک کرنے لگا: ''اللہ توبہ، کیا خناس آنکھیں ہیں۔ جا نگوڑی ماری اری دیکھ تو سہی، وہ کیسا منہ بناتا ہے۔ اے ہے سارا مزا کرکرا ہو جائے گا۔''

آپا بی نے ایک بار میری طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں التجا تھی۔ لوٹی ہوئی براتوں کا غبار تھا اور چوتھی کے پرانے جوڑوں کی مانند اُداسی۔ میں سر جھکائے، پھر کھمبے سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔

راحت خاموش کھاتے رہے، میری طرف نہ دیکھا۔ کھلی کے کباب کھاتے دیکھ کر مجھے چاہیے تھا کہ مذاق اُڑاؤں۔ قہقہہ لگاؤں کہ: ''واہ جی! واہ دولہا بھائی۔ کھلی کے کباب کھا رہے ہو۔'' مگر جانو کسی نے میرا نرخرہ دبوچ لیا ہو۔

بی اماں نے جل کر مجھے واپس بلا لیا اور منہ ہی منہ میں مجھے کوسنے لگیں۔ اب میں ان سے کیا کہتی کہ وہ مزے سے کھا رہا ہے کم بخت!

''راحت بھائی! کوفتے پسند آئے؟'' بی اماں کے سکھانے پر میں نے پوچھا۔

جواب ندارد۔

''بتایئے نا۔''

''اری ٹھیک سے جا کر پوچھ۔'' بی اماں نے ٹھوکا دیا۔

''آپ نے لا کر دیئے اور ہم نے کھائے۔ مزے دار ہی ہوں گے۔''

''ارے واہ رے جنگلی۔'' بی اماں سے نہ رہا گیا۔

''تمھیں پتہ بھی نہ چلا، کیا مزے سے کھلی کے کباب کھا گئے۔''

''کھلی کے؟ ارے تو روز کا ہے کے ہوتے ہیں......؟ میں تو عادی ہو چکا ہوں کھلی اور بھوسا کھانے کا۔''

بی اماں کا منہ اُتر گیا۔ بی آپا کی جھکی ہوئی پلکیں اوپر نہ اُٹھ سکیں۔ دوسرے روز بی آپا نے روزانہ سے دوگنی سلائی کی اور پھر شام کو جب میں کھانا لے کر گئی تو بولے:

''کہیے! آج کیا لائی ہیں؟ آج تو لکڑے کے برادے کی باری ہے۔''

''کیا ہمارے یہاں کا کھانا آپ کو پسند نہیں آتا؟'' میں نے جل کر کہا۔

''یہ بات نہیں، کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔ کبھی کھلی کے کباب تو کبھی بھوسے کی ترکاری۔''

میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ ہم سوکھی روٹی کھا کے اسے ہاتھی کی خوراک دیں۔ گھی ٹپکتے پراٹھے ٹھنسائیں۔ میری بی آپا کو جوشاندہ نصیب نہیں اور اسے دودھ ملائی نگلوائیں۔ میں بھنا کر چلی آئی۔

بی اماں کی منہ بولی بہن کا نسخہ کام آ گیا اور راحت نے دن کا زیادہ حصہ گھر ہی میں گزارنا شروع کر دیا۔ بی آپا تو چولہے میں پھنسی رہتیں۔ بی اماں چوتھی کے جوڑے سیا کرتیں اور راحت کی غلیظ آنکھیں تیر بن کر میرے دل میں چبھا کرتیں۔ بات بے بات چھیڑنا، کھانا کھلاتے وقت کبھی پانی تو کبھی نمک کے بہانے سے اور ساتھ ساتھ جملہ بازی میں کھسیا کر بی آپا کے پاس جا بیٹھتی۔ جی چاہتا کہ کسی دن صاف کہہ دوں کہ کس کی بکری اور کون ڈالے دانہ گھاس۔ اے بی! مجھ سے تمہارا یہ بیل نہ نتھا جائے گا مگر بی آپا کے الجھے ہوئے بالوں پر چولہے کی اُڑتی ہوئی راکھ...نہیں....میرا کلیجہ

دھک سے ہو گیا۔ میں نے ان کے سفید بال لٹ کے نیچے چھپا دیئے۔ ناس جائے اس کمبخت نزلہ کا بچاری کے بال پکنے شروع ہو گئے۔

راحت نے پھر کسی بہانے سے مجھے پکارا۔ ''اونہہ!'' میں جل گئی، پر بی آپا نے کٹی ہوئی مرغی کی طرح جو پلٹ کر دیکھا تو مجھے جانا ہی پڑا۔

''آپ ہم سے خفا ہو گئیں؟'' راحت نے پانی کا کٹورا لے کر میری کلائی پکڑ لی۔ میرا دم نکل گیا اور بھاگی تو ہاتھ جھٹک کر۔

''کیا کہہ رہے تھے؟'' بی آپا نے شرم وحیا سے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ میں چپ چاپ ان کا منہ تکنے لگی۔

''کہہ رہے تھے کس نے پکایا ہے کھانا۔ واہ واہ! جی چاہتا ہے کہ کھاتا ہی چلاؤں۔ پکانے والی کے ہاتھ کھا جاؤں........ اوہ نہیں........ کھانہیں بلکہ چوم لوں۔''

میں نے جلدی جلدی کہنا شروع کیا اور بی آپا کا کھردرا ہلدی دھنیا کی بساند میں سڑا ہوا ہاتھ اپنے ہاتھ سے لگا لیا۔ میرے آنسو نکل آئے۔ ''یہ ہاتھ!'' میں نے سوچا جو صبح سے شام تک مسالہ پیستے ہیں، پانی بھرتے ہیں، پیاز کاٹتے ہیں، بستر بچھاتے ہیں، جوتے صاف کرتے ہیں۔ یہ بے کس غلام صبح سے شام تک جٹے ہی رہتے ہیں۔ ان کی بیگار کب ختم ہو گی؟ کیا ان کا کوئی خریدار نہ آئے گا؟ کیا انھیں کبھی کوئی پیار سے نہ چومے گا؟ کیا ان میں کبھی مہندی نہ رَچے گی؟ کیا ان میں کبھی سہاگ کا عطر نہ بسے گا؟ جی چاہا زور سے چیخ پڑوں۔

''اور کیا کہہ رہے تھے؟'' بی آپا کے ہاتھ تو اتنے کھردرے تھے، پر آواز اتنی رسیلی اور میٹھی تھی کہ اگر راحت کے کان ہوتے تو.... مگر راحت کے نہ کان تھے، نہ ناک بس دوزخ جیسا پیٹ تھا۔

''اور کہہ رہے تھے کہ اپنی بی آپا سے کہنا کہ اتنا کام نہ کیا کریں اور جوشاندہ پیا کریں۔''

''چل جھوٹی!''

''ارے واہ جھوٹے ہوں گے آپ کے وہ.......''

''اری چپ مردار!'' انھوں نے میرا منہ بند کر دیا۔

''دیکھ تو، سوئٹر بُن گیا ہے، انھیں دے آ۔ پر دیکھ تجھے میری قسم میرا نام نہ لیجیو۔''

''نہیں بی آپا! انھیں نہ دو وہ سوئٹر۔ تمہاری ان مٹھی بھر ہڈیوں کو سوئٹر کی کتنی ضرورت ہے۔''

میں نے کہنا چاہا، پر نہ کہہ سکی۔

''آپا بی! تم خود کیا پہنو گی؟''

''ارے مجھے کیا ضرورت ہے؟ چولہے کے پاس تو ویسے ہی جھلس رہتی ہے۔''

سوئٹر دیکھ کر راحت نے اپنی ایک ابرو شرارت سے تان کر کہا:

''کیا یہ سوئٹر آپ نے بُنا ہے؟''

''نہیں تو!''

''تو بھئی ہم نہیں پہنیں گے۔''

میرا جی چاہا کہ اس کا منہ نوچ لوں۔ کمینے! مٹی کے تودے۔ یہ سوئٹر ان ہاتھوں نے بُنا ہے جو جیتے جاگتے غلام ہیں۔ اس کے ایک ایک پھندے میں کسی نصیبوں جلی کے ارمانوں کی گردنیں پھنسی ہوئی ہیں، یہ ان ہاتھوں کا بنا ہوا ہے جو ننھے پنگورے جھلانے کے لئے بنائے گئے ہیں۔ ان کو تھام لو گدھے کہیں گے۔ اور یہ دو پتوار بڑے سے بڑے طوفان کے تھپیڑوں سے تمہاری زندگی کی ناؤ کو بچا کر پار لگا دیں گے۔ یہ ستار کے گت نہ بجا سکیں گے۔ منی پوری اور بھارت ناٹیم کے مدرانہ دکھا سکیں گے۔ انہیں پیانو پر رقص کرنا نہیں سکھایا گیا۔ انھیں پھولوں سے کھیلنا نہیں نصیب ہوا مگر یہ ہاتھ تمہارے جسم پر چربی چڑھانے کے لئے صبح سے شام تک سلائی کرتے ہیں۔ صابن اور سوڈے میں ڈبکیاں لگاتے ہیں۔ چولہے کی آنچ سہتے ہیں۔ تمہاری غلاظتیں سہتے ہیں۔ تمہاری غلاظتیں دھوتے ہیں تاکہ تم اُجلے چٹے بگلا بھگتی کا ڈھونگ رچائے رہو۔ محنت نے ان میں زخم ڈال دیئے ہیں۔ ان میں کبھی چوڑیاں نہیں کھنکتی ہیں۔ انہیں کبھی کسی نے پیار سے نہیں تھاما۔

مگر میں چپ رہی۔ بی اماں کہتی ہیں کہ میرا دماغ تو میری نئی نئی سہیلیوں نے خراب کر دیا ہے۔ وہ مجھے کیسی نئی نئی باتیں بتایا کرتی ہیں۔ کیسی ڈراؤنی موت کی باتیں، بھوک اور کال کی باتیں۔ دھڑکتے ہوئے دل کے ایک دم چپ چاپ ہو جانے کی باتیں۔

''یہ سوئٹر تو آپ ہی پہن لیجیے۔ دیکھئے نا، آپ کا کرتا کتنا باریک ہے۔''

جنگلی بلی کی طرح میں نے اس کا منہ، ناک، گریبان اور بال نوچ ڈالے۔ اور اپنی پلنگڑی پر جا گری۔ بی آپا نے آخری روٹی ڈال کر جلدی جلدی تسلے میں ہاتھ دھوئے اور آنچل سے پونچھتی میرے پاس آ بیٹھی۔

''وہ بولے....'' ان سے رہا نہ گیا، تو دھڑکتے ہوئے دل سے پوچھا:

''بی آپا! یہ راحت بھائی بڑے خراب آدمی ہیں۔''

میں نے سوچا کہ میں آج سب کچھ بتادوں گی۔

''کیوں؟'' وہ مسکرائیں۔

''مجھے اچھے نہیں لگتے...... دیکھئے میری ساری چوڑیاں چورہ ہوگئیں۔''

میں نے کانپتے ہوئے کہا۔

''بڑے شریر ہیں۔'' انھوں نے رومانٹک آواز میں شرما کے کہا۔

''بی آپا.... سنو بی آپا! یہ راحت اچھے آدمی نہیں۔'' میں نے سلگ کر کہا۔

''آج میں اماں سے کہہ دوں گی۔''

''کیا ہوا؟'' بی اماں نے جانماز بچھاتے ہوئے کہا۔

''دیکھو، میری چوڑیاں بی اماں!''

''راحت نے توڑ ڈالیں۔'' بی اماں مسرت سے بولیں۔

''ہاں!''

''خوب کیا۔ تو اسے ستاتی بھی تو بہت ہے۔ اے ہے تو دم کاہے کو نکل گیا۔ بڑی موم کی بنی ہوئی کہ ہاتھ لگایا اور پگھل گئیں۔'' پھر چمکار کر بولیں: ''خیر تو بھی چوتھی میں بدلہ لے لیجیو۔ وہ کسر نکالیو کہ یاد ہی کریں میاں جی۔'' یہ کہہ کر انہوں نے نیت باندھ لی۔

منہ بولی بہن سے پھر کانفرنس ہوئی اور معاملات کو امید افزا راستے پر گامزن دیکھ کر از حد خوشنودی سے مسکرایا گیا۔

''اے ہے تو بڑی ہی ٹھس ہے — اے ہم تو اپنے بہنوئیوں کا خدا کی قسم، ناک میں دم کر دیا کرتے تھے۔''

اور وہ مجھے بہنوئیوں کے چھیڑ چھاڑ کے ہتھ کنڈے بتانے لگیں کہ کس طرح انہوں نے صرف چھیڑ چھاڑ کے تیر بہدف نسخے سے ان دو نمبری بہنوں کی شادی کرائی جن کی ناؤ پار لگنے کے سارے موقعے ہاتھ سے نکل چکے تھے۔ ایک تو ان میں سے حکیم جی تھے۔ جہاں بیچارے کو لڑکیاں بالیاں چھیڑتیں، شرمانے لگتے اور شرماتے شرماتے اختلاج کے دورے پڑنے لگتے اور ایک دن

ماموں صاحب سے کہہ دیا کہ مجھے غلامی میں لے لیجیے۔

دوسرے وائسرا کے دفتر میں کلرک تھے۔ جہاں سنا کہ باہر آئی ہیں لڑکیاں، چھیڑنا شروع کر دیتے تھے۔ کبھی گلوریوں میں مرچیں بھر کے بھیج دیں، کبھی سوئیوں میں نمک ڈال کر کھلا دیا۔

اے لو، وہ تو روز آنے لگے۔ آندھی آئے، پانی آئے، کیا مجال جو وہ نہ آئیں۔ آخر ایک دن کہلوا ہی دیا۔ اپنے ایک جان پہچان والے سے کہا کہ ان کے یہاں شادی کرا دو۔ پوچھا کہ: ''بھئی! کس سے؟'' تو کہا: ''کسی سے بھی کرا دو۔'' اور خدا جھوٹ نہ بلائے تو بڑی بہن کی صورت تھی کہ دیکھو تو جیسے بیچا چلا آتا ہے۔ چھوٹی تو بس سبحان اللہ! ایک آنکھ پورب تو دوسری پچھم۔ پندرہ تولے سونا دیا ہے باپ نے اور بڑے صاحب کے دفتر میں نوکری الگ دلوائی۔''

''ہاں بھئی! جس کے پاس پندرہ تولے سونا ہو اور بڑے صاحب کے دفتر کی نوکری، اسے لڑکا ملتے کیا دیر لگتی ہے؟'' بی اماں نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

''یہ بات نہیں ہے بہن! آج کل کے لڑکوں کا دل بس تھالی کا بینگن ہوتا ہے۔ جدھر جھکا دو ادھر ہی لڑھک جائے گا۔''

مگر راحت تو بینگن نہیں، اچھا خاصا پہاڑ ہے۔ جھکاؤ دینے پر کہیں میں ہی نہیں پس جاؤں۔ میں نے سوچا، پھر میں نے آپا کی طرف دیکھا۔ وہ خاموش دہلیز پر آ بیٹھی، آٹا گوندھ رہی تھیں اور سب کچھ سنتی جا رہی تھیں۔ ان کا بس چلتا تو زمین کی چھاتی پھاڑ کر اپنے کنوار پنے کی لعنت سمیت اس میں سما جاتیں۔

''کیا میری آپا مرد کی بھوکی ہے؟ نہیں وہ بھوک کے احساس سے پہلے ہی سہم چکی ہے۔ مرد کا تصور اس کے ذہن میں ایک اُمنگ بن کر نہیں اُبھرا بلکہ روٹی کپڑے کا سوال بن کر اُبھرا ہے۔ وہ ایک بیوہ کی چھاتی کا بوجھ ہے۔ اس بوجھ کو ڈھکیلنا ہی ہوگا۔

مگر اشاروں کنایوں کے باوجود راحت میاں نہ تو خود منہ سے پھوٹے اور نہ ہی ان کے گھر ہی سے پیغام آیا۔ تھک ہار کر بی اماں نے پیروں کے توڑے گروی رکھ کر پیر مشکل کشا کی نیاز دلا ڈالی۔ دوپہر بھر محلے ٹولے کی لڑکیاں صحن میں اودھم مچاتی رہیں۔ بی آپا شرمائی لجائی مچھروں والی کوٹھری میں اپنے خون کی آخری بوندیں چسانے کو جا بیٹھی۔ بی اماں کمزوری میں اپنی چوکی پر بیٹھی چوتھی کے جوڑے میں آخری ٹانکے لگاتی رہیں۔ آج ان کے چہرے پر منزلوں کے نشان تھے۔ آج

مشکل کشائی ہوگی۔ بس آنکھوں کی سوئیاں رہ گئی ہیں۔ وہ کبھی نکل جائیں گی۔ آج ان کی جھریوں میں پھر مشعلیں تھرتھرا رہی تھیں۔ بی آپا کی سہلیاں ان کو چھیڑ رہی تھیں اور وہ خون کی بچی کچھی بوندوں کو تاؤ میں لا رہی تھیں۔ آج کئی روز سے ان کا غبار نہیں اُترا تھا۔ تھکے ہارے دئے کی طرح ان کا چہرہ ایک بار ٹمٹماتا اور پھر بجھ جاتا۔ اشارے سے انھوں نے مجھے اپنے پاس بلایا۔ اپنا آنچل ہٹا کر نیاز کے ملیدے کی طشتری مجھے تھمادی۔

''اس پر مولوی صاحب نے دم کیا ہے؟'' ان کی بخار سے دہکتی ہوئی گرم گرم سانس میرے کان میں لگی۔

طشتری لیکر میں سوچنے لگی۔ مولوی صاحب نے دم کیا ہے۔ یہ مقدس ملیدہ اب راحت کے تندور میں جھونکا جائے گا۔ وہ تندور جو چھ مہینے سے ہمارے خون کے چھینٹوں سے گرم رکھا گیا۔ یہ دم کیا ہوا ملیدہ مراد بر لائے گا۔ میرے کانوں میں شادیانے بجنے لگے۔ میں بھاگی بھاگی کوٹھے سے برأت دیکھنے جارہی ہوں۔ دولہا کے منہ پر لمبا سا سہرا پڑا ہے، جو گھوڑے کی ایالوں کو چوم رہا ہے۔

چوتھی کا شہابی جوڑا پہنے پھولوں سے لدی شرم سے نڈھال، آہستہ آہستہ قدم تولتی بی آپا چلی آرہی ہے ...... چوتھی کا زرتار جوڑا جھلمل جھلمل کر رہا ہے۔ بی اماں کا چہرہ پھول کی طرح کھلا ہوا ہے.... بی آپا کی حیا سے بوجھل آنکھیں ایک بار اوپر اُٹھتی ہیں۔ شکریہ کا ایک آنسو ڈھلک کر افشاں کے ذرّوں میں قمقمے کی طرح الجھ جاتا ہے۔

''یہ سب تیری ہی محنت کا پھل ہے۔'' بی آپا کی خاموشی کہہ رہی ہے۔

حمیدہ کا گلا بھر آیا.....

''جاؤ نہ میری بہنو!'' بی آپا نے اسے جگا دیا اور وہ چونک کر اوڑھنی کے آنچل سے آنسو پونچھتی ڈیوڑھی کی طرف بڑھی۔

''یہ...... یہ ملیدہ۔'' اس نے اُچھلتے ہوئے دل کو قابو میں رکھتے ہوئے کہا۔ اس کے پیر لرز رہے، جیسے وہ سانپ کی بانبی میں گھس آئی ہو اور پھر پہاڑ کھسکا......! اور منہ کھول دیا۔ وہ ایک دم پیچھے ہٹ گئی مگر دور کہیں بارات کی شہنائیوں نے چیخ لگائی، جیسے کوئی ان کا گلا گھونٹ رہا ہو۔ کانپتے ہاتھوں سے مقدس ملیدے کا نوالہ بنا کر اس نے راحت کے منہ کی طرف بڑھا دیا۔

ایک جھٹکے سے اس کا ہاتھ پہاڑ کی کھوہ میں ڈوبتا چلا گیا۔ نیچے تعفن اور تاریکی کے اتھاہ غار

کی گہرائیوں میں اور ایک بڑی سی چٹان نے اس کی چیخ کو گھونٹ دیا۔

نیاز کے ملیدے کی رکابی ہاتھ سے چھوٹ کر لالٹین کے اوپر گری اور لالٹین نے زمین پر گرد کر دو چار سسکیاں بھریں اور گل ہوگئی۔ باہر آنگن میں محلے کی بہو بیٹیاں مشکل کشا کی شان میں گیت گا رہی تھیں۔

صبح کی گاڑی سے راحت مہمان نوازی کا شکریہ ادا کرتا ہوا روانہ ہوگیا۔ اس کی شادی کی تاریخ طے ہو چکی تھی اور اسے جلدی تھی۔

اس کے بعد اس گھر میں کبھی انڈے نہ تلے گئے۔ پراٹھے نہ سکے اور سوئٹر نہ بنے گئے۔ دق نے جو ایک عرصے سے بی آپا کی تاک میں بھاگی پیچھے پیچھے آرہی تھی، ایک ہی جست میں انھیں دبوچ لیا اور انھوں نے چپ چاپ اپنا نامراد وجود اس کی آغوش میں سونپ دیا۔

اور پھر اس سہ دری میں چوکی پر صاف ستھری جازم بچھائی گئی۔ محلّے کی بہو بیٹیاں جڑیں۔ کفن کا سفید سفید لٹھا۔ موت کے آنچل کی طرح بی اماں کے سامنے پھیل گیا۔ تحمل کے بوجھ سے ان کا چہرہ لرز رہا تھا۔ بائیں ابرو پھڑک رہی تھی۔ گالوں کی سنسان جھریاں بھائیں بھائیں کر رہی تھیں، جیسے ان میں لاکھوں اژدہے پھنکار رہے ہوں۔

لٹھے کی کان نکال کر انہوں نے چو پرتہ کیا اور ان کے دل میں ان گنت قینچیاں چل گئیں۔ آج ان کے چہرے پر بھیانک سکون اور ہرا بھرا اطمینان تھا، جیسے انھیں پکا یقین ہو کہ دوسرے جوڑوں کی طرح چوتھی کا یہ جوڑا سینتا نہ جائے۔

ایک دم سہ دری میں بیٹھی لڑکیاں، بالیاں میناؤں کی طرح چہکنے لگیں۔ حمیدہ ماضی کو دور جھٹک کر ان کے ساتھ جا ملی۔ لال ٹول پر... سفید گزی کا نشان! اس کی سرخی میں نہ جانے کتنی معصوم دلہنوں کا سہاگ رچا ہے اور سفیدی میں کتنی نامراد کنواریوں کے کفن کی سفید ڈوب کر اُبھری ہے اور پھر سب ایک دم خاموش ہوگئے۔ بی اماں نے آخری ٹانکا، بھر کے ڈورہ توڑ لیا۔ دو موٹے موٹے آنسو ان کے روئی جیسے نرم گالوں پر دھیرے دھیرے رینگنے لگے۔ ان کے چہرے کی شکنوں میں سے روشنی کی کرنیں پھوٹ نکلیں اور وہ مسکرا دیں، جیسے آج انہیں اطمینان ہوگیا کہ ان کی کبریٰ کا سوہا جوڑا بن کر تیار ہوگیا ہو اور کوئی دم میں شہنائیاں بج اُٹھیں گی۔

پرندہ پکڑنے والی گاڑی

غیاث احمد گدی

صبح ہوتی، دن چڑھتا اور جب ٹھیک نصف النہار پہنچتا، شہر میں ایک ایسی گاڑی آتی جو شہر کے پرندوں کو پکڑ کر لے جاتی، ٹھیک ویسے ہی جیسے میونسپلٹی کی گاڑی کتے پکڑنے کے لئے نکلتی ہے۔ یہ گاڑی جو چاروں طرف سے رنگین شیشوں سے بند بے حد خوبصورت ہوتی کہ نگاہ اُٹھ کے داد دیتی، اس کے چاروں طرف ننھی ننھی گھنٹیاں بندھی ہوتیں جو چلتے وقت دھیرے دھیرے بج رہی ہوتیں۔ گھنٹیوں کی آواز عجیب ہوتی، کچھ ایسی جیسے کوئی سحر پھونک رہا ہو! ایک لمبا، خمیدہ کمر، زرد رو آدمی گاڑی کو کھینچ رہا ہوتا، بالکل اسی طرح دوسرا آدمی گاڑی کے پیچھے چل رہا ہوتا، جس کے ہاتھ میں پتلا سا بہت لمبا بانس ہوتا۔ بانس کے سرے پر برش جیسا گچھا سا ہوتا جس پر گوند یا اسی طرح کی چپک جانے والی لس دار رطوبت لگی ہوتی جس سے وہ پرندوں کو پکڑتا تھا۔

دیوار پر چھتوں کی منڈیروں پر، ٹیلی فون کے کھمبوں، پیڑوں یا فرش پر دانہ دنکا چنتے ہوئے پرندے جہاں نظر آتے، وہ آدمی بانس کو آگے بڑھا دیتا اور عین پرندوں کے پروں پر لس دار رطوبت لگا ہوا گچھا چھوا دیتا۔ پہلے تو پرندہ تڑپتا چھٹ پٹاتا، اڑنے کی کوشش کرتا، پھر تھک ہار کر لس دار

رطوبت سے چپڑ چپڑ کرتے ہوئے پروں کی قوت پرواز کے الجھ جانے کے باعث ایک طرف اوندھا ہو کر لڑھک جاتا۔ تب وہ آدمی جلدی سے بڑھتا اور دونوں ہاتھوں سے جھپٹ کر پرندے کو پکڑتا، دھیرے سے گاڑی کے چھوٹے سے دروازے کو کھولتا، اس میں پرندے کو ڈھکیل دیتا۔ دروازہ بند کرتا، پھر غور سے شیشے کے اندر دیکھتا، جہاں پرندہ پھڑ پھڑا کر تھک جاتا، اس وقت اس آدمی کے چہرے پر عجیب سی ہنسی بکھر جاتی اور آنکھیں اندھیرے میں بلّی کی آنکھوں کی طرح چمک اُٹھتیں۔

ہر روز جیسے سورج سروں پر آتا، تیز کرنیں سروں میں گڑتیں، پچھی دروازے کی جانب سے چھوٹی چھوٹی گھنٹیوں کی صدا سنائی دیتی۔ ذرا دیر بعد بڑی سبک خرامی سے ایک آدمی، جس کا چہرہ بے حد زرد ہوتا اور اس کی آنکھیں نیم وا ہوتیں، اس کے کمر سے پتلی سی رسی لپٹی ہوتی جو گاڑی کے سرے سے بندھی ہوتی اور وہ نیم غنودگی کے عالم میں چلتا بڑھا آتا، پھر جہاں کوئی چڑیا، کوئی پرندہ نظر آتا، آدمی آپ ہی آپ رک جاتا اور اپنے پیچھے چلنے والے آدمی کو پرندے کی طرف اشارہ کرتا۔

یہ روزمرّہ کا دستور ہوتا۔ دکان دار دکانوں میں ہوتے، راہ گیر راہ چلتے رہتے، موٹر کاریں تیزی سے پوں پاں کرتی گزرتی ہوتیں، جوتا گانٹھنے والا گانٹھتا رہتا، خرید وفروخت جاری رہتی، شور وغل سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی، لین دین کا بازار اتنا جواں ہوتا کہ اول تو گاڑی کی طرف کسی کی نظر ہی نہ اُٹھتی لیکن ان میں سے کسی کی نظر اُٹھ بھی جاتی تو وہ سحر زدہ سا اس عجیب وغریب گاڑی اور اسکے حسن کو دیکھنے میں کھو جاتا۔

کبھی ایسا بھی ہوتا کہ کوئی آدمی چونکتا اور ذرا حوصلہ سے اُٹھتا، گاڑی والے جب اس آدمی کو قریب آتے دیکھتے تو جھٹ اپنی لمبی جیب میں ہاتھ ڈالتے اور چند سکّے نکال کر اس کی طرف اُچھال دیتے، پھر وہ آدمی سکّے چننے میں ایسا محو ہو جاتا کہ اسے کسی چیز کا ہوش ہی نہ رہتا۔ لوگ یہ منظر دیکھتے اور آنکھوں اور چہروں سے حیرت کا اظہار کرتے۔ اس وقت ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جاتیں، یہ عمل کچھ زیادہ دیر نہیں رہتا، فقط چند منٹ، دس یا بیس منٹ تک، پھر حیرت کا یہ وقفہ کم ہوتا گیا اور ہوتے ہوتے محض چند سکنڈ رہ گیا تو اب اس کے بعد وہ منزل آنے والی تھی کہ لوگ باگ اپنے کاموں میں مصروف ہیں اور پرندے پکڑنے والی گاڑی آ گئی ہے اور پرندہ پکڑتی چلی جارہی ہے اور آدمی ہے کہ اس کی جانب نظر اُٹھا کر دیکھتا بھی نہیں۔

ایسی ہی کیفیت والا ایک دن تھا، جب میں نے ایک دکان دار کو جلیبیوں کی تھالی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ: ''یہاں دیکھو جلیبیوں پر کتنی مکھیاں بیٹھی ہوئی ہیں؟.....ابھی جب شہر میں بیماری پھیلی ہوئی ہے، یہ مکھیاں کتنی خطرناک.....!''

''مکھیاں.....؟'' حلوائی نے کاہلی سے ہاتھ ہلا کر مکھیوں کو اُڑانے کی کوشش کی، مکھیاں ذرا دیر کو اُڑیں، پھر جلیبیوں کی تھالی پر ٹوٹ پڑیں۔ ''ہاں، مکھیاں تو سالی اُڑتی ہی نہیں۔''

حلوائی نے میری جانب غور سے دیکھتے ہوئے کہا: ''مگر تم کو کیا صاحب! تم کو تو نہیں خریدنا.....''

میں نے جواب میں انکار کیا تو حلوائی نے آنکھ ماری اور سرگوشیوں سے ذرا قریب کے لہجے میں کہا: ''اور مجھ کو کیا صاحب! مجھ کو بھی تو کھانا نہیں.....!''

بس یہیں سے میں چونک گیا کہ اصل بات کیا ہے۔ پرندہ پکڑنے والی گاڑی آتی ہے اور شہر کے پرندوں کو پکڑ کر لے جاتی ہے اور کوئی پوچھنے والا تو کیا ملے گا، کوئی خدا کا بندہ پلٹ کر دیکھتا بھی نہیں ہے۔ میری سمجھ میں بات آ گئی، میری پیشانی پر جو بہت دیر سے بلکہ کئی دنوں سے ایک تیوری کسی سنتری کی طرح کھڑی دِکھ رہی تھی، سٹ گئی۔ پھر میں ہنسا اور میں نے بھی گفتگو کے ذرا دور کے لہجے میں کہا: ''تو بھائی حلوائی ایک کام کرونا، ان گاڑی والوں کی توجہ مکھیوں کی جانب مبذول کرادو......''

حلوائی چونک گیا اور اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا لیکن پل بھر میں سنجیدہ ہو گیا۔

''ارے ہاں.....مگر کیوں صاحب، مجھے اس جھنجھٹ سے کیا فائدہ؟''

''یہ جو مکھیاں جلیبی کا سارا رس.....''

''ہاں یہ تو ٹھیک کہا سارا رس چوسے چلی جاتی ہیں کم بخت.....مگر صاحب مجھے اس سے کیا نقصان، مجھے تو فائدہ ہے۔''

''وہ کیا—؟'' میں نے حلوائی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا: ''فائدہ کیسے ہے؟''

حلوائی پہلے ہنسا، پھر اس نے اپنے بنا سپتی میں چپڑے ہوئے توند پر ہاتھ پھیرا اور بے حد سنجیدہ ہو کر میری طرف جھک گیا:

''بابو! تم کیا جانو دنیا داری! یہ راز کی بات ہے، دنیا ایسے نہیں چلتی.....''

پھر حلوائی خاموش ہو گیا اور ذرا گہرا ہو کر پھر گویا ہوا: ''پر تو اپنا ہمدرد لگتا ہے اس لئے بتاتا ہوں، کسی سے کہنا نہیں۔ تو بابو جلیبیوں کا یہ رس جو مکھیاں چوستی ہیں، تو رس اور پھر مکھیاں کہاں جاتی ہیں، ذرا اتنا تو بتاؤ۔''

''کہاں جاتی ہیں.....؟ مجھے تو پتہ نہیں حلوائی! یہاں تم ہی بتاؤ۔''

''کہیں نہیں جاتی ہیں.....'' حلوائی فیصلہ کن لہجے میں بولا۔ ''رس مکھیوں کے پیٹ میں اور مکھیاں جلیبیوں کے ساتھ پلڑے پر..... سمجھے بابو! ایسے فائدہ ہوا۔''

لیکن میں بہت دیر تک نہ سمجھ سکا اور بے وقوفوں کی طرح حلوائی کے چہرے کو تکتا رہا۔ حلوائی پھر ہنسا، پھر مونچھوں پر تاؤ دیا: ''نہیں سمجھے اب بھی.....؟''

ابھی ہماری یہ گفتگو یہیں تک پہنچی تھی کہ پچھمی دروازے کی جانب سے گھنٹیوں کی آواز سنائی پڑی اور میری توجہ اس کی طرف مبذول ہو گئی۔ ذرا دیر بعد وہ زرد و خمیدہ کمر آدمی دکھائی پڑتا ہے۔ حسب دستور اس کی کمر سے پتلی سی رسی بندھی ہوئی تھی جس کے پچھلے سرے پر وہ گاڑی پھنسی ہوئی تھی۔ آدمی اسی کاہلی سے سڑک پر آہستہ آہستہ چلتا ہوا آگے بڑھا، پھر گاڑی سامنے آئی جس کے رنگین شیشوں کے اندر دو کبوتر اور ایک گوریا بند تھے۔ کبوتر تو سر نہوڑے ایک طرف کھڑے تھے یا پھر دھیرے دھیرے کاہلی سے سہ قدمی کر رہے تھے لیکن گوریا تیزی سے اِدھر اُدھر پھدکتی پھر رہی تھی اور قدرے اضطراب کے عالم میں تھی۔

اب گاڑی بیچ چوراہے پر آ گئی تھی۔ دھوپ آج زور کی بہ نسبت قدرے سخت تھی اور گاڑی گھسیٹنے والا ہاتھ کو آنکھوں کے اوپر چھجے کی شکل میں کئے آس پاس متجسس نظروں سے جھانکتا پھر رہا تھا، پھر وہ ٹھہر گیا۔ سامنے نالی کے کنارے ایک پرندہ پیاس سے بے حال جھک جھک کر نالی سے پانی پی رہا تھا اور گردن اُٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھ بھی رہا تھا۔ اسے کسی بات کا خدشہ بھی لگا ہوا تھا، جبھی گاڑی کھینچنے والے آدمی نے بانس والے ساتھی کو اشارہ کیا۔ بانس والے نے چپکے سے لپک کر پرندے کو جا لیا۔

ذرا دیر بعد جب اس نے رنگین شیشوں والی گاڑی کے دروازے کا پٹ کھولا اور دھیرے سے پرندے کو اندر ڈھکیل دیا۔ پرندہ ایک طرف کو لڑھک گیا تو پھدکتی ہوئی گوریا ایک بار زور سے گاڑی کے اندر شیشوں پر پھڑ پھڑانے لگی۔ گویا بند شیشوں کو توڑ کر نکل بھاگے گی۔ بانس والے آدمی

نے مسکرا کر شیشوں کے اندر جھانک کر دیکھا، اس کے چہرے اور آنکھوں میں چمک آ گئی، پھر اس نے شیشے پر ہلکے ہلکے تھپکیاں دیں، یوں گوریا سہم کر ایک طرف ہو گئی۔

اس کے بعد ویسے ہی ہلکی چال سے گاڑی آگے بڑھی۔ گھنٹیوں کی آواز خاموش فضا میں سنائی دی، ٹن ٹن ٹن..... ٹن ٹن ٹن..... ذرا دیر بعد گاڑی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

''گئی..... چلی گئی.....''

''ہاں، چلی گئی۔ اس پرندے کو بھی لے گئی۔'' جب فضا کا سحر ٹوٹا تو گاڑی اُتری علاقے کے سخت ڈھلان میں اُتر چکی تھی اور اب دکھائی بھی نہیں دے رہی تھی، فقط اس کے پہیوں سے اُڑتی ہوئی دھول تھی، جو دھیرے دھیرے فضا سے ہاتھ چھڑا کر بیٹھ رہی تھی، پھر چند منٹ بعد تماش بینوں کے چہروں پر جو حیرت کے اثرات تھے، وہ زائل ہو گئے اور وہ اپنے اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔

''اچھا بھائی جان! یہ پرندے والی گاڑی.....''

سوال کرنے والا رک گیا اور خاصی دیر تک رُکا رہا، تب میں نے پلٹ کر دیکھا۔ ٹھیک میری پشت پر ایک دس گیارہ سالہ لڑکا کھڑا میری طرف مجسم سوال بنا تک رہا تھا۔

''یہ پرندے والی گاڑی!'' وہ لڑکا اتنا کہہ کر پھر رُک گیا، جیسے اسے خود پتہ نہیں کہ پوچھا کیا ہے؟

''ہاں ہاں..... میاں کیا پوچھنا چاہتے ہو پرندے والی گاڑی کے متعلق.....؟''

''جی بھائی جان! اتنا کہ..... یہ گاڑی ہے پرندے پکڑنے والی.....؟''

''ہاں میاں! ہم بھی یہی سوچ رہے ہیں کہ کیا گاڑی ہے، ہر روز دوپہر میں آتی ہے اور شہر کے جتنے پرندے ہاتھ آتے ہیں، سمیٹ کر چل دیتی ہے۔''

''اچھا بھائی جان.....'' ذرا دیر بعد اس لڑکے نے یوں چونک کر سوال کیا، گویا اچانک کوئی بات آ گئی ہو۔ ''اچھا بھائی جان! کیا یہ لوگ باجی کے لقا کو بھی لے جائیں گے؟''

''ہاں، ضرور لے جائیں گے، فقط دیکھنے کی دیر ہے.....''

''پھر باجی اچھی کیسے ہوں گی؟ انھیں لقوہ ہو گیا ہے نا۔ حکیم جی نے کہا تھا دواؤں کے ساتھ لقا کبوتر کے پروں کی ہوا بھی چاہیے۔''

لڑکے نے بڑی حسرت سے کہا، یوں کہ میں اس کے افسردہ چہرے کی طرف ایک ٹک

دیکھنے لگا۔

''ہاں ہاں، بات تو ہے سوچنے کی، لقّا کبوتر کو نہیں جانا چاہیے.....''

''پھر میں کیا کروں، آپ ہی بتایئے بھائی جان! میں تو بہت چھوٹا ہوں نا، میری تو سمجھ میں نہیں آتا؟''

''میری سمجھ میں بھی نہیں آتا میاں! اور سچی پوچھو تو میں بھی بہت چھوٹا ہوں۔''

''آپ چھوٹے ہیں.....'' وہ لڑکا کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ ''آپ اتنے بڑے ہیں، واہ.....'' وہ لڑکا پھر قہقہے لگانے لگا۔

میں خاموشی سے بدستور اسے دیکھتا رہا اور دل ہی دل میں کہا: ''میاں! تم ہنس رہے ہو؟''

''بھائی جان! ایک اور بات پوچھوں؟'' اس نے ذرا ٹھہر کر دوسرا سوال کیا۔

''پوچھو میاں، وہ بھی پوچھ ڈالو.....''

''آپ اتنے اُداس..... بھائی جان آپ کبھی ہنستے کیوں نہیں؟''

میرا جی چاہا سچ کہہ دوں۔ کیسے ہنسوں میاں، اس کارگہِ شیشہ گری میں ہنسنا کوئی کھیل ہے مگر اس معصوم بچے کو جو ذرا دیر پہلے لقّا کبوتر کے چلے جانے کی فکر میں اُداس تھا اور اب ذرا دیر پہلے قہقہے لگا رہا تھا، کچھ نہیں بتا سکا۔ فقط پیار سے اسے دیکھتا رہا۔

''بھائی جان! میں آپ کو ہنسا دوں.....؟'' وہ لڑکا بڑی محبت سے میری طرف بڑھا اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا: ''آپ کہیے تو میں آپ کو ہنسا دوں؟''

پہلے تو میں چونکا۔ دفعتاً مجھے عجیب سا لگا، ناسمجھی میں اس لڑکے نے ذرا اپنے قد سے بڑی بات کہہ دی تھی۔ پھر میں نے ذرا محبت سے تاکید کی:

''میاں! آہستہ بولو، دھر لیے جاؤ گے، کسی نے سن لیا تو پولس والوں کو خبر کر دے گا کہ یہ کیسا لڑکا ہے کہ اسکی بہن بیمار پڑی ہے اور اس کا لقّا کبوتر بھی چلا جانے والا ہے اور یہ ہے کہ خود ہنستا بھی ہے اور دوسروں کو بھی ہنسانے کی سوچتا ہے۔ ہوش کے ناخن لو میاں، مفت میں پکڑے جاؤ گے۔''

''بلا سے پکڑ لیا جاؤں گا۔'' لڑکے نے حوصلے سے کہا۔ ''آپ کہیے تو ہنسا دوں آپ کو؟''

''ہنسا دو میاں! بڑا کرم ہوگا، بڑی مہربانی ہوگی تمہاری.....''

''تو پھر دوستی کیجیے.....'' اس نے دوستی کے لئے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔

''تم سے دوستی؟ ارے چھٹنکی، تمہارے اتنے اتنے تو میرے بیٹے ہیں، میں تو تمہارے باپ کے برابر ہوں۔''

''تو کیا ہوا؟ باپ بھی تو دوست ہوتے ہیں۔ میرے مولوی جی کہتے ہیں اچھے باپ اپنے بچوں کے دوست بھی ہوا کرتے ہیں۔''

''یہ بات ہے.....تو ہوا دوست تمہارا آج سے۔'' میں نے اس کے ننھے سے خوبصورت ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دیا۔ ''پھر چلئے میرے ساتھ ندی کی طرف۔ وہاں آپ اور ہم، دو ہی ہوں گے۔ وہاں میں آپ کو ایک چیز دکھاؤں گا۔''

اور وہ لڑکا مجھے گھسیٹتا ہوا ندی کی طرف لے چلا۔ میں پیچھے پیچھے اور وہ آگے آگے۔ راہگیر پلٹ پلٹ کر ہماری دوستی کو دیکھتے رہے اور ہم پلٹ پلٹ کر راہ گیروں کو تک رہے تھے۔ جن کے کوئی دوست تھے بھی یا نہیں، جن کے کوئی ایسے پیارے بیٹے تھے بھی یا نہیں اور پھر جب ہم ندی کے قریب پہنچے تو اس نے پہلے تو چالاک نگاہوں سے دائیں بائیں دیکھا، ہر طرف سے اطمینان ہو گیا تو اس نے اپنے نیکر کی جیب سے ماچس کی ایک ڈبیا نکالی، مسکرایا، میری طرف پلٹا اور گہری سرگوشی میں بولا: ''اس میں ہے.....''

جواب میں، میں نے بھی اتنی ہی ہوشیاری سے پہلے بائیں طرف دیکھا، دائیں طرف دیکھا، جب ہر طرف سے اطمینان ہو گیا تو اتنی ہی سرگوشی میں پوچھا: ''کیا ہے اس میں؟''

''یہ ہے، یہ ہے اس میں۔''

لڑکے نے کہا اور جھٹ سے ماچس کے اندرونی حصے کو باہر ڈھکیل دیا۔

ماچس کی ڈبیا میں میری آنکھوں کے سامنے ایک بے حد خوش رنگ تتلی نیم جان سی پڑی تھی جو باہر کی ہوا اور دھوپ لگتے ہی پھڑ پھڑانے لگی۔ اس کے ننھے ننھے پروں کے اردگرد زعفرانی رنگ بکھرا ہوا تھا اور پروں کے عین درمیان زیرہ کے برابر سرخی تھی اور اس سرخی کے چاروں طرف گلابی رنگ سا چھلکا ہوا تھا اور پروں کے کناروں پر افشاں چمک رہی تھی — ڈوبتے سورج کی روشنی میں وہ بے حد حسین دکھ رہی تھی۔

میں تتلی کو غور سے دیکھتا رہا تھا اور ذرا دیر رنگوں کی دنیا میں کھو رہا..... جب تک میں ڈوبتا اُبھرتا رہا، وہ لڑکا اتنے ہی انہماک سے میرے چہرے کے خط و خال پر کچھ ڈھونڈا کیا — میں نے

تتلی کی طرف سے نظر اُٹھائی، اس لڑکے کی طرف دیکھا تو وہ قدرے افسردگی سے میری طرف پلٹا..... ''آپ تو عجیب ہیں بھائی جان! آپ تو تتلی کو دیکھ کر بھی خوش نہیں ہوئے۔''

''ہاں میاں!'' مگر میں چونک اُٹھا۔ اس دس برس کے بچے نے تو مجھے بہت دور پہنچ کر پکڑ لیا— ''یہ تم نے کیا کہہ دیا میاں کہ میں.....''

''ہاں، بھائی جان.....'' اس نے قطعہ کلام کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ تو تتلی سے بھی خوش نہیں ہوئے۔ کیسے ہماری دوستی نبھے گی.....؟''

میں یہ کہہ کر آگے بڑھ گیا مگر ساتھ ساتھ تیزی سے چلتے ہوئے وہ لڑکا بھی ہمراہ رہا.....

''لیکن بھائی جان! وہ میر القا کبوتر، وہ گاڑی.....''

دوسرے دن میں بازار کے سارے لوگوں سے کہتا پھرا، جوتے گانٹھنے والے موچی سے کپڑے بیچنے والے بزاز سے، بھیڑوں میں گھرے رہنے والے ڈاکٹر سے، روٹی اور دال بیچنے والے سے، راہ گیروں سے، سفید پتلون والے سے، تیز رفتار بابو سے، بوجھ ڈھونے والے قلی سے، رنگین دوپٹے والی خاتون سے جو سڑک پر ہولے ہولے یوں چلتی ہے، گویا سارے زمانے کو روند کر گذر جانے کا فیصلہ کر چکی ہے، دونوں سیاست دانوں سے جو آپس میں سازشی انداز کی گفتگو میں مصروف لپکے چلے جا رہے تھے۔ ایک ایک آدمی سے پوچھتا پھرا، تیز رفتار گاڑیوں کو روکنے کی ناکامیاب کوشش کی کہ دس سالہ بچے کی جوان بہن لقوہ کی مریض ہے اور حکیم جی نے دواؤں کے ساتھ لقا کبوتر کے پروں کی ہوا کے لئے کہا ہے۔ اگر یہ گاڑی والے بچے کے کبوتر کو بھی لے گئے تو پھر کیا ہوگا——؟

مجھے کسی نے جواب نہیں دیا، سب اپنی اپنی دنیا میں مصروف رہے، اس لئے میں دس سالہ بچے کے سوال کو پی گیا اور کوئی جواب نہیں دے سکا۔ مجھے افسوس تھا، اُداس سر جھکائے چلا جا رہا تھا۔ میرے پاؤں تھک گئے تھے۔

دوپہر سے شام ہونے کو آ گئی تھی۔ سرمئی اندھیرے کا جنم ہونے والا تھا کہ میری نظر چوک کے ایک کوٹھے پر گئی، جہاں شہر کی مشہور رنڈی منی بائی بالکونی میں کھڑی بال سنوار رہی تھی۔ منی بائی کے سارے اڈے پر اس کا طوطا دائیں بائیں گردن گھما گھما کر جھوم رہا تھا اور وہ اپنے بالوں میں کنگھی کرتی جا رہی تھی اور طوطے کو پڑھاتی بھی جا رہی تھی۔

میں چپکے سے کوٹھے پر چڑھ گیا۔ اس کے کمرے کو عبور کر کے بالکونی میں عین منی بائی کی پشت پر کھڑا ہو گیا۔ منی بائی میری آمد سے مطلق بے خبر طوطے کو پڑھانے میں محو تھی:

''بول میاں مٹھو! نبی جی روزی بھیجو.....''

میاں مٹھو نے اڈے میں دائیں اور بائیں جانب رکھی ہوئی دونوں پیالیوں کو گردن گھما کر دیکھا، پھر ایک پیالی پر جھک کر ہری مرچ کو کتر کر، منی بائی کی طرف مخاطب ہو کر بولا:

''نبی جی روزی بھیجو.....''

''نبی جی روزی بھیجو.....''

''نبی جی روزی بھیجو۔'' طوطے نے اسی طرح اکڑ کر کہا۔

''سو میں آگیا'' اس کے پیچھے کھڑا، میں نے آہستہ سے کہا۔ منی بائی سن کر چونک اُٹھی۔ اس نے پلٹ کر مجھے گھورا، ذرا دیر کو سہم گئی، پھر ذرا ڈپٹ کر بولی: ''تم کیسے چلے آئے جی! کون ہو؟''

''سیڑھیوں سے جی، مجھے نہیں پہچانا، منی بائی، مجھے نبی جی نے تمہارے پاس بھیجا ہے۔''

منی بائی یہ سن کر ہنس پڑی: ''اچھا اچھا جی چلو اُدھر بیٹھو تخت پر۔'' اس نے کنگھی کے دانتوں سے سنہرے بالوں کا گچھا نکالا۔ اسے گولی بنا کر اس پر تھوکا پھر نیچے سڑک پر پھینک دیا۔

''بڑی طوطا چشم ہو منی بائی۔ ذرا سے میں طوطے کی طرح رنگ بدلتی ہو؟'' جواب میں منی بائی نے ایک اور رنگ بدلا اور مسکرا پڑی۔

تخت پر بیٹھتے ہوئے میں نے اس کے قدموں پر چودہ روپے کے ایک ایک کے نوٹ رکھ دیئے۔ ''میرے پاس اتنے ہی ہیں جی! تمہارے نبی جی نے آج بڑے غریب آدمی کو ادھر بھیجا۔''

''نہیں جی! یہ بھی کیا کم ہیں ـــــ ہم تو اپنے آقاؤں کی خدمت کرنا جانتے ہیں۔''

لیکن بہت دیر ہو گئی اور میں نے منی بائی سے کوئی خدمت نہیں لی تو وہ جھلا گئی: ''یہاں کاہے کو آئے ہو جی.....اور یہ روپے کیوں دیئے.....؟''

''منی بائی برا نہ مانو، میں تو صرف اس لئے آیا ہوں کہ تم سے بھی پوچھ دیکھوں، تم کیا کہتی ہو؟''

''کاہے کے بارے میں؟''

''یہ جو کل ہر روز دوپہر میں پرندہ پکڑنے والی گاڑی آتی ہے، اس کو دیکھتی ہو؟''

''ہاں دیکھتی ہوں کبھی کبھی۔''

''تو تمھیں کیسا لگتا ہے؟''

''اچھا جی..... اچھا لگتا ہے..... پیلے پیلے لال لال خوب صورت شیشوں میں سے پرندے چہکتے ہوئے بہت بھلے دِکھتے ہیں۔''

''بہت دور سے دیکھتی ہونا..... جتنی دور سے تمھیں تمہارے چاہنے والے دیکھتے ہیں۔''

''ہاں جی، اس بالکونی سے.....''

''منی بائی، کسی دن نیچے جا کر قریب سے دیکھو.....''

''وہ کیوں؟ مجھے اتنی فرصت نہیں جی۔'' منی بائی نے ناگواری سے میری اُور دیکھا، پھر غالباً اسے میرے چودہ روپے کے نوٹ یاد آ گئے تو وہ مسکرا پڑی:

''تم مجھے ذرا قریب سے دیکھو نا جی.....''

''سو تو دیکھ ہی رہا ہوں منی بائی! اور تم بھی دیکھ لو گی جس دن گاڑی والے تمہارے طوطے کو پکڑ لے جائیں گے.....''

''میرے طوطے کو کیوں لے جانے لگے جی؟'' منی بائی نے کڑک کر برجستہ کہا۔

''یہ کوئی سڑکوں پر پھرنے والا آوارہ پرندہ ہے، یہ تو پالتو ہے میرا ہیرا من۔''

''ہاں منی بائی! پہلے تو سڑکوں پر پھرنے والے پرندے کو پکڑیں گے پھر..... کچھ دنوں بعد..... لال لال، پیلے پیلے خوبصورت شیشوں کے پیچھے سے اور پرندوں کے درمیان یہ تمہارا ہیرا من طوطا دیکھنے میں کتنا اچھے لگے گا۔ تم دیکھو نہ دیکھو، سڑک پر چلنے پھرنے والے لوگ باگ اور دکان میں سودا سلف بیچنے والے بنئے ضرور دیکھیں گے اور سڑک پر، جو پرندے والی گاڑی والے دونوں آدمی سکے پھینک دیتے ہیں، ان سکوں کو اور لوگوں کے ساتھ تم بھی چننے لگو گی اور یہ بھول جاؤ گی کہ.....''

''کیا بھول جاؤں گی جی.....؟ بہت سے سکے مل جائیں تو ہیرا من کو کون روتا ہے، گاڑی والے اگر ڈھیر سارے سکے پھینک دیں گے تو میں سب چن لوں گی..... اور بازار سے نیا طوطا لے آؤں گی!''

''اے ہے منی بائی! ہوش کے ناخن لو، یہ دنیا ہے اور دنیا سالی بڑی مطلبی ہوتی ہے، مان

لو..... بازار میں طوطا نہ ملا اور ملا تو ایسا پڑھنے والا نہ ملا اور پڑھنے والا بھی مل گیا تو اس کی زبان میں یہ تاثیر.....''

منی بائی کھلکھلا کر ہنس پڑی اور کچھ دیر تک ہنستے رہنے کے بعد بولی:

''واہ، بہت اچھا بولتے ہو جی، کہاں رہتے ہو؟.....کیا کام کرتے ہو؟''

''کہانیاں لکھتا ہوں منی بائی! رہنا وہنا کیا، جہاں پایا، رہ لیا، جہاں چاہا، سو لیا۔''

''اے کہانیاں لکھنا بھی کوئی کام ہوا؟ لگتا ہے تم تو ہم سے بھی گئے گذرے ہو، تمہارا دھندہ تو ہمارے دھندے سے بھی گیا گذرا لگتا ہے جی.....کیوں جی!''

''ہاں منی بائی! تم تو ذرا سے میں اکٹھے چودہ روپے رکھوا لیتی ہو اور مجھے چودہ روپے حاصل کرنے کیلئے آٹھ کہانیاں لکھنا پڑتی ہیں۔ دو روپے فی کہانی کے حساب سے جریدے والے دیتے ہیں۔''

''دو روپے فی کہانی.....یہ تو بہت کم ہوتے ہیں۔'' منی بائی نے مایوسی سے کہا۔ اچانک اسے کوئی بات یاد آگئی۔ ''دو روپے فی کہانی کے حساب سے آٹھ کہانیوں کے سولہ روپے بنتے ہیں..... باقی دو روپے بھی نکالو جی.....جلدی کرو۔''

''ہاں جی، بنتے تو سولہ ہی روپے ہیں مگر ایک کہانی تو ناپ تول میں چلی گئی۔''

''ناپ تول میں؟ ارے واہ!'' منی بائی پھر ہنسی: ''ناپ تول میں کیسے چلی گئی؟''

''وہ ایسے کہ جب جریدے والے کے پاس پہنچا اور اسے آٹھوں کہانیاں پڑھائیں تو وہ جھٹ اندر سے ترازو لے آیا۔''

''ترازو؟ کہانیاں کیا تول کر بکتی ہیں؟''

''خدا کا شکر ہے منی بائی ابھی تک تو تول کر بکتی ہیں، کچھ دنوں بعد دیکھنا بے تولے بیچنا پڑیں گی۔''

''اچھا اچھا، پھر وہ ترازو لے آیا۔'' منی بائی نے دلچسپی سے کہا۔

''ہاں ترازو لے آیا، ڈنڈی ملائی تو ایک طرف پاسنگ تھا۔ اس نے جھٹ آدھی کہانی نوچ لی اور دوسری طرف والے پلڑے پر رکھ دی، جب پاسنگ برابر ہو گیا، ایک طرف وزن کے سات پتھر رکھے اور دوسری طرف ساڑھے سات کہانیاں۔''

میں نے کہا: ''وزن کے سات ہی پتھر رکھے گئے ہیں، دیکھو تو کہانی والا پلڑا کتنا جھک آیا ہے — آدھی کہانی تو تم نے پہلے لے لی.....''

''پہلے لے کر آدھی کہانی کیا میں کھا گیا، پاسنگ نہ ملا ترازو کا؟'' جریدے والے نے چڑھ کر کہا۔

''بات سچ تھی۔'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''اچھا ٹھیک ہے، تم سچ کہتے ہو، پھر دوسری طرف کا پلڑا جو اتنا جھک آیا ہے، منی بائی! یہ سن کر جریدے والا بگڑ گیا، ترشی سے کہا: اتنا جھک گیا تو دم نکل گیا تمہارا، کیا سونا تول رہے ہو، کہانیاں ہی تو ہیں؟''

''سچ ہی جریدے والے نے.....''

منی بائی نے میری طرف ہمدردی سے دیکھتے ہوئے کہا، پھر مجھے دل برداشتہ دیکھ کر منی بائی نے دکھ سے کہا: ''واقعی ہمارا دھندہ تمہارے دھندے سے بہت اچھا ہے۔''

''ہاں منی بائی! بہت اچھا ہے۔ اسی لئے کبھی کبھی جی چاہتا ہے کہ کاغذ قلم پھینک تمہارا والا دھندہ ہی شروع کر دوں۔''

یہ سن کر منی بائی بے ساختہ ہنس پڑی اور جلدی سے دونوں ہاتھوں سے چہرے کو ڈھک لیا۔

''اللہ! ایسا نہ کر بیٹھنا، مفت میں ہماری روٹی ماری جائے گی.....''

بہت دیر تک ہنستے رہنے کے بعد جب منی بائی تھک گئی تو اسے کچھ یاد آیا۔

''اچھا جی! ایک کہانی ہم پر لکھو.....''

''نہیں منی بائی! تم پر تو بہتوں نے کہانیاں لکھی ہیں، میں تو تمہارے طوطے پر ایک اچھی سی کہانی لکھنا چاہتا ہوں۔''

''لکھو جی! ضرور لکھو — میرے طوطے پر ہی لکھو.....'' منی بائی نے مسرت سے کہا۔

''مگر کیا لکھو گے؟''

''یہ لکھوں گا کہ..... پرندہ پکڑنے والی گاڑی آ گئی ہے اور اب جب بازار کے سارے پرندے ختم ہو چکے ہیں، رنگین شیشوں سے گھری ہوئی گاڑی والے دونوں زہریلی آنکھوں والے آدمی چاروں اُور گھوم گھوم کر ڈھونڈتے پھر رہے ہیں کہ کہیں سے کوئی پرندہ ہاتھ آ جائے، کہیں سے کوئی گوریا، قمری، بلبل، کہیں سے کوئی کرک، نیل کنٹھ، کوئی مینا، کوئی طوطا دکھائی پڑے، اتنے میں

ان کی چاروں زہریلی نگاہیں تمہارے طوطے پر پڑتی ہیں اور وہ دونوں کھل اُٹھتے ہیں، پھر لمبے بانس والا آگے بڑھتا ہے اور چپکے سے طوطے کے بائیں بازو پر لس دار رطوبت والے گچھے کو چھوا دیتا ہے، طوطا پھڑ پھڑاتا ہے، تھر تھراتا ہے، اُڑنے کی کوشش کرتا ہے اور برسوں کے اڈے کو غیر محفوظ جان کر بالکونی کی ریلنگ کا سہارا لینا چاہتا ہے مگر نہیں لے پاتا اور تڑپتا ہوا نیچے آ رہتا ہے۔ جہاں وہ آدمی کھڑا ہوتا ہے، وہ لپک کر طوطے کو اُٹھاتا کہ طوطا.....چیں.....ں ں.....کی آواز سے زور سے چیختا ہے، پھڑ پھڑاتا ہے، پھر پتہ نہیں اس کی ساتھ چھوڑتی ہوئی قوت پرواز کہاں سے لوٹ آتی ہے، وہ ذرا اور اوپر اُڑتا ہے لیکن پھر گر پڑتا ہے۔

وہ آدمی جس کی کمر سے گاڑی والی رسی بندھی ہوتی ہے، اپنے دوسرے ساتھی کو دیکھتا ہے اور اطمینان سے مسکرا دیتا ہے جس کے جواب میں اس کا رفیق پہلے اپنے ساتھی کو دیکھتا ہے، پھر فرش پر ہانپتے ہوئے طوطے کو دیکھتا ہے۔ اس کے بعد پھر اپنے ساتھی کو دیکھ کر اطمینان سے مسکرا دیتا ہے اور آہستہ سے آگے بڑھ کر طوطے کو اُٹھانے کے لئے جھکتا ہے.....

لیکن دفعتاً طوطا اس کی گرفت میں آنے کی بجائے تڑپ کر اُچھلتا ہے اور اس کی کنپٹیوں پر جھپٹتا ہے اور گردن کا گوشت نوچ لیتا ہے۔

اس آدمی کے منہ سے چیخ نکلتی ہے، جسے سن کر اس کا دوسرا ساتھی لپکتا ہے اور طوطے کی گردن پر ہاتھ ڈالنا ہی چاہتا ہے کہ طوطا گھور کر دوسرے آدمی کو دیکھتا ہے، اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں پھیل جاتی ہیں اور ان میں لہو اُتر آتا ہے۔ وہ اپنی پوری طاقت کو سمیٹتا ہے اور دہل کر دوسرے آدمی پر بھی حملہ کرتا ہے اور اس کے سارے چہرے کو نوچ کر لہولہان کر دیتا ہے۔ وہ آدمی بھی جھلا اُٹھتا ہے اور جلدی سے اپنے دونوں ہاتھوں کی مدد سے طوطے کو اپنے سے الگ کرتا ہے اور اس زور سے زمین پر پھینک دیتا ہے۔

اب دونوں طوطے کے اطراف کھڑے اسے حیرت سے دیکھ رہے ہوتے ہیں اور طوطا آہستہ آہستہ ٹہلتا ہوا کبھی پہلے آدمی کی طرف جاتا ہے، پھر اسی اطمینان خاطر سے ٹہلتا ہوا دوسرے آدمی کی طرف لوٹ جاتا ہے اور دونوں کو اپنی خوں آشام نظروں سے گھور رہا ہوتا ہے.....

".....اور اتنے میں۔" منی بائی جلدی سے کہہ اُٹھتی ہے: "میں لپک کر جاتی ہوں اور اپنی چادر اس پر ڈال دیتی ہوں اور پرندے کو پکڑ کر گاڑی والے کے حوالے کر دیتی ہوں اور اس سے

بہت سے.....''

''.....جب بہت سے پیسے ملنے والے ہوں تو کیا میں طوطے کو یہ سب کرنے دوں گی.....''
منی بائی حقارت سے میری طرف دیکھتی ہے اور تھوک دیتی ہے: ''ایسی ہی کہانی لکھی جاتی ہے.....
جی ــــ؟''

جواب میں، میں منی بائی کے چہرے کو دیکھتا ہوں۔ اڈے پر اِدھر سے اُدھر ہوتے ہوئے طوطے کو دیکھتا ہوں اور پھر ایک بار پلٹ کر طوطے کو دیکھتا ہوں.....

پھر گاڑی والے منی بائی کے نبی جی سے ''روزی بھیجو'' کی منت کرنے والے طوطے کو بھی لے جاتے ہیں، پھر رفتہ رفتہ شہر سُونا ہوتا جاتا ہے، کہیں کوئی پرندہ، کوئی گوریا، کوئی بلبل، مینا، طوطا، کوئی مرغ، کوئی فاختہ نظر نہیں آتی۔

شام ڈھلے درختوں پر بسیرا لینے والی چڑیوں کی چہکار سنائی نہیں دیتی، لاجوردی آسمان پر سفید بگلے، توازن سے اُڑنے والے بگلے بھی دکھائی نہیں دیتے، بھری دوپہر کی خاموش فضا میں چیلوں کی دردبھری چیخ بھی سنائی نہیں دیتی، کبوتر کی غٹرغوں، پپیہے کی پی پی کہاں، مینا کی ٹوئیں ٹوئیں کی آواز سے کان محروم ہو جاتے ہیں، حتیٰ کہ مولوی صاحب کے مرغ کی اذان بھی کہیں کھو گئی ہے۔

لیکن بازار اور رونقِ بازار میں کوئی فرق نہیں آتا۔ خرید و فروخت جاری ہے، شور شرابہ، یکہ والوں کی کھٹ کھٹ، ٹم ٹم والوں کے گھوڑوں کی گھنٹیاں بجتی رہتی ہیں، لمبی اور خوب صورت کاریں زوں زوں کر کے گذر جاتی ہیں، آمد و رفت جاری ہے، کاروبار بدستور ہے، خریدنے والے اسی طرح بازار کی دکانوں پر جمے رہتے ہیں اور بیچنے والے اسی انہماک سے سودا سلف بیچ رہے ہیں۔ ایک ہنگامہ ہے کہ جاری ہے، ایک دوڑ ہے کہ رکنے کا نام نہیں لیتی۔

پھر دن ڈھلتا پھر رات آتی ہے اور اپنے تمام چھوٹے بڑے، کھرے کھوٹے، سچے جھوٹے بچوں پر آرام کی، سکون کی چادر تان دیتی ہے، پھر رات بھی چلی جاتی ہے، پھر صبح نمودار ہوتی ہے اور خلقت بیدار ہوتی ہے۔

اب پرندہ پکڑنے والی گاڑی کم آتی ہے۔ دو چار دنوں میں، آٹھ دس دنوں میں، پندرہ بیس دنوں میں ایک بار آتی ہے۔ رنگین شیشوں میں سے ایک آدھ پرندہ، حیرت سے بازار والوں کو دیکھ رہا ہوتا ہے۔ گاڑی والے اِدھر اُدھر تیز نگاہوں کا جال پھینکتے، پھر سمیٹتے اور چاروں اور متجسس نظروں

سے دیکھتے، ڈھونڈتے ڈھانڈتے آہستہ آہستہ چھوٹے چھوٹے قدم رکھتے چلے جاتے ہیں، کبھی کچھ ملتا ہے، کبھی کچھ نہیں ملتا، کوئی پلٹ کر نہیں دیکھتا۔

ایک ایسا ہی دن تھا، دھوپ بہت سخت تھی، ہوا گرم تھی، فضا میں دھول اُڑ رہی تھی، جھکڑ چل رہے تھے، جسموں سے پسینہ بہہ رہا تھا اور سانس دھونکنی کی طرح گرم گرم ہوا پھینک رہی تھی کہ گاڑی آ گئی۔

گاڑی آ گئی، پرندہ پکڑنے والی گاڑی آ گئی.....

گاڑی عین چوک پر کھڑی ہو گئی، رنگین شیشوں کے اندر ایک ہی پرندہ تھا جو اِدھر اُدھر سہمے سہمے قدم ٹہل رہا تھا، سفید سا، اسکی دم مور کی طرح کھلی تھی اور آنکھوں میں افسردگی جھلک رہی تھی، ابھی گاڑی ٹھہری ہی تھی کہ دوڑتا ہاوہ دس سالہ بچہ آ پہنچا۔ اس نے پہلے گاڑی والوں کو دیکھا، پھر شیشے کے اندر جھانک کر دیکھا، ذرا دیر تک دیکھتے رہنے کے بعد دفعتاً اس نے لپک کر شیشے کے چھوٹے سے دروازے کو کھول دیا۔

اتنی ہی پھرتی سے بانس والے آدمی نے اس کے ہاتھ کو جھٹکا دیا، پھر دروازے کو بند کر دیا اور جیب سے بہت سارے سکے نکال کر سامنے اُچھال دیئے۔ لڑکے نے سکوں کی طرف دھیان نہیں دیا۔ بانس والے آدمی نے اس کے ہاتھ کو پکڑ کر اسے ایک طرف دھکا دے دیا اور پھر سکے اُچھال دیئے۔ لڑکے نے سکوں کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ گاڑی تیزی سے چلنے لگی۔ اس کے پیچھے پیچھے بانس والا آدمی تیز تیز قدموں سے چلنے لگا، پھر گاڑی اور تیز ہو گئی۔ آدمی کے قدم بھی تیز ہو گئے۔ اب وہ دوڑنے لگے۔

لڑکا کچھ دیر خاموش، حیرت اور افسردگی سے تکتا رہا، پھر جانے کہاں سے اس کے قدموں میں بجلی کی سی جھپٹ آ گئی۔ اس نے دہل کر بھاگتی ہوئی گاڑی کو دیکھا، پھر دوڑتا ہوا اسے جالیا اور شیشوں پر زور سے گھونسہ مارنے والا ہی تھا کہ بانس والے آدمی نے اس کے وار کو اپنے ہاتھ پر روک لیا اور بچے کو زور سے..... بہت زور سے دھکا دیا۔

لڑکا گیند کی طرح سڑک پر لڑھک گیا۔ اسکے سر اور گھٹنوں پر سخت چوٹ آئی، اس کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا اور دیر تک وہ سڑک کو تکتا رہا، پھر جب اس کی بینائی پر چھایا ہوا اندھیرا ہٹا اور اس نے غور سے دیکھا تو گاڑی دور ڈھلان پر تیزی سے بھاگی جا رہی تھی اور اس کے پیچھے صرف

دھول ہی دھول تھی۔

لڑکے نے اُٹھنے کی کوشش کی لیکن اس سے اُٹھا نہیں گیا۔ اس کے گھٹنوں کے درد نے اُٹھنے نہیں دیا اور وہ پھر تلملا کر سڑک پر گر گیا۔

گاڑی آنکھوں سے اوجھل ہوگئی، گاڑی میں لگی چھوٹی چھوٹی گھنٹیوں کی سحر زدہ آواز کانوں سے اوجھل ہوگئی اور بہت دیر ہوگئی..... بہت..... بہت دیر.....

جب بہت دیر ہوگئی، تب وہ لڑکا سڑک پر سے اُٹھا، پہلے اس نے اپنے لہولہان گھٹنوں کو دیکھا، پھر اپنے کپڑوں کی دھول جھاڑی، اس کے بعد اپنی آستین سے آنکھیں پونچھتے ہوئے تھکے تھکے قدموں سے چل کر میرے پاس آ کھڑا ہوا۔

''بھائی جان! للقا کبوتر بھی چلا گیا.....'' اس نے گویا اپنے آپ کو اطلاع دی۔

''ہاں میاں! للقا بھی چلا گیا۔'' میں نے مایوسی سے جواب دیا۔

ذرا دیر تک وہ سڑک کی اُدھر دیکھتا رہا، اس کی نظریں ڈھلان کی طرف دوڑ گئیں، جہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ اس نے دھیرے سے نیکر کی اس اُبھری ہوئی جیب پر ہاتھ پھیرا، جہاں ماچس کی ڈبیہ تھی۔

''بھائی جان! اس، اس تتلی کو بھی لے جائیں گے نا؟''

''...............''

''جب تتلیاں چلی گئیں تو کیا بچے گا شہر میں؟''

جواب میں، میں خاموشی سے اس کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا، جہاں آنسوؤں اور سڑک کی دھول کے ملے جلے نشان تا حال مایوسیوں کو نمایاں کیے ہوئے تھے۔ وہ لڑکا چونکا اور اس نے سامنے والی بڑی سی عمارت کی طرف اشارہ کیا۔

''بھائی جان، بھائی جان! وہ دیکھیے.....''

عمارت کے دروازے کے اوپر پتھر کا ایک پرندہ سر نہواڑے بیٹھا تھا..... میری اور اس دس سالہ معصوم بچے کی نگاہیں دیر تک پتھر کے اس پرندے پر لگی رہیں۔

بجوکا

سریندر پرکاش

پریم چند کی کہانی کا ہوری اتنا بوڑھا ہو چکا تھا کہ اس کی پلکوں اور بھوؤں تک کے بال سفید ہو گئے تھے، کمر میں خم پڑ گیا تھا اور ہاتھوں کی نسیں سانولے کھردرے گوشت میں سے ابھر آتی تھیں۔

اس اثنا میں اس کے ہاں دو بیٹے ہوئے تھے، جواب نہیں رہے۔ ایک گنگا میں نہا رہا تھا کہ ڈوب گیا اور دوسرا پولیس مقابلہ میں مارا گیا، پولیس کے ساتھ اس کا مقابلہ کیوں ہوا، اس میں کچھ ایسی بتانے کی بات نہیں،۔ جب بھی کوئی آدمی اور اپنے وجود سے واقف ہوتا ہے اور اپنے اردگرد پھیلی ہوئی بے چینی محسوس کرنے لگتا ہے تو اس کا پولیس کے ساتھ مقابلہ ہو جانا قدرتی ہو جاتا ہے، بس ایسا ہی کچھ اس کے ساتھ بھی ہوا تھا—اور بوڑھے ہوری کی ہاتھ ہل کے ہتھے کو تھامے ہوئے ایک بار ڈھیلے پڑے، ذرا کانپے اور پھر ان کی گرفت اپنے آپ مضبوط ہو گئی۔ اس نے بیلوں کو ہانک لگائی اور ہل کا پھل زمین کا سینہ چیرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

ان دونوں بیٹوں کی بیویاں تھیں اور آگے ان کے پانچ بچے، تین گنگا میں ڈوبنے والے کے اور دو پولیس مقابلہ میں مارے جانے والے کے اب ان سب کی پرورش کا بار ہوری پر آن پڑا

تھا، اوراس کے بوڑھے جسم میں خون زور سے گردش کرنے لگا تھا۔

اس دن آسمان سورج نکلنے سے پہلے کچھ زیادہ ہی سرخ تھا اور ہوری کے آنگن کے کنویں کے گرد پانچویں بچے ننگ دھڑنگ بیٹھے نہار رہے تھے، اس کی بڑی بہو کنویں سے پانی نکال نکال کر ان پر باری باری انڈیلتی جارہی تھی اور وہ اچھلتے ہوئے اپنا پنڈا ملتے پانی اچھال رہے تھے — چھوٹی بہو بڑی بڑی روٹیاں بنا کر چنگیری میں ڈال رہی تھی اور ہوری اندر کپڑے بدل کر پگڑی باندھ رہا تھا۔ پگڑی باندھ کر اس نے طاقچے میں رکھے آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھا۔ سارت چہرے پر لکریں پھیل گئی تھیں۔ اس نے قریب ہی لٹکی ہوئی ہنومان جی کی چھوٹی سی تصویر کے سامنے آنکھیں بند کرکے دونوں ہاتھ جوڑ کر سر جھکایا اور پھر دروازے میں سے گزر کر باہر آنگن میں آ گیا۔

''سب تیار ہیں؟'' اس نے قدرے اونچی آواز میں پوچھا۔

ہاں باپو'' سب بچے ایک ساتھ بول اٹھے، بہوؤں نے اپنے سروں پر پلو درست کئے اور ان کے ہاتھ تیزی سے چلنے لگے۔ ہوری نے دیکھا ابھی کوئی بھی تیار نہیں تھا۔ سب جھوٹ بول رہے تھے۔ اس نے سوچا یہ جھوٹ ہماری زندگی کیلئے کتنا ضروری ہے، اگر بھگوان نے ہمیں جھوٹ جیسی نعمت نہ دی ہوتی تو لوگ دھڑا دھڑ مرنے لگ جاتے۔ ان کے پاس جینے کا کوئی بہانہ نہ رہ جاتا۔ ہم پہلے جھوٹ بولتے ہیں اور پھر اسے سچ ثابت کرنے کی کوشش میں دیر تک زندہ رہتے ہیں۔

ہوری کے پوتے، پوتیاں اور بہوئیں — ابھی ابھی بولے ہوئے جھوٹ کو سچ ثابت کرنے میں پوری تندہی سے جٹ گئیں۔ جب تک ہوری نے ایک کونے میں پڑے کٹائی کے اوزار نکالے — اوراب وہ سچ مچ تیار ہو چکے تھے۔

ان کا کھیت لہلہا اٹھا تھا۔ فصل پک گئی تھی اور آج کٹائی کا دن تھا، ایسے لگ رہا تھا جیسے کوئی تہوار ہو۔ سب بڑے چاؤ سے جلد از جلد کھیت پر پہنچنے کی کوشش میں تھے کہ انھوں نے دیکھا سورج کی سنہری کرنوں سے سارے گھر کو اپنے جادو میں جکڑ لیا ہے۔

ہوری نے انگوچھا کندھے پر رکھتے ہوئے سوچا۔ کتنا اچھا سمے آ پہنچا ہے، نہ اہلمند کی دھونس نہ بنئے کا کھٹکا نہ انگریز کی زور زبردستی اور نہ زمیندار کا حصہ — اس کی نظروں کے سامنے ہرے ہرے خوشے جھوم اٹھے۔

''چلو باپو!'' اس کے بڑے پوتے نے اس کی انگلی پکڑ لی۔ باقی بچے اس کی ٹانگوں کے ساتھ لپٹ گئے۔ بڑی بہو نے کوٹھری کا دروازہ بند کیا اور چھوٹی بہو نے روٹیوں کی پوٹلی سر پر رکھی۔

بیز بجرنگی کا نام لے کر سب باہر کی چار دیواری والے دروازے میں سے نکل کر گلی میں آ گئے اور پھر دائیں طرف مڑ کر اپنے کھیت کی طرف بڑھنے لگے۔

گاؤں کی گلیوں، گلیاروں میں چہل پہل شروع ہو چکی تھی۔ لوگ کھیتوں کو آ جا رہے تھے، سب کے دلوں میں مسرت کے انار پھوٹتے محسوس ہو رہے تھے۔ سب کی آنکھیں پکی فصلیں دیکھ کر چمک رہی تھیں۔ ہوری کو لگا جیسے زندگی کل سے آج ذرا مختلف ہے۔ اس نے پلٹ کر اپنے پیچھے آتے ہوئے بچوں کی طرف دیکھا۔ وہ بالکل ویسے ہی لگ رہے تھے، جیسے کسان کے بچے ہوتے ہیں۔ سانولے مریل سے — جو جیپ گاڑی کی پہیوں کی آواز اور موسم کی آہٹ سے ڈر جاتے ہیں۔ بہوئیں ویسی ہی تھیں، جیسی کہ غریب کسان کی بیوہ عورتیں ہوتی ہیں۔ چہرے گھونگھٹوں میں چھپے ہوئے اور لباس کی ایک ایک سلوٹ میں غریبی جوؤں کی طرح چھپی بیٹھی۔

وہ سر جھکا کر پھر آگے بڑھنے لگا۔ گاؤں کے آخری مکان سے گزر کر آگے کھلے کھیت تھے، قریب ہی رہٹ خاموش کھڑا تھا، نیم کے درخت کے نیچے ایک کتا بے فکری سے سویا ہوا تھا۔ دور طویلے میں کچھ گائیں، بھینسیں اور بیل چارہ کھا کر پھنکار رہے تھے۔ سامنے دور دور تک لہلہاتے ہوئے سنہری کھیت تھے — ان سب کھیتوں کے بعد ذرا دور، جب یہ سب کھیت ختم ہو جائیں گے اور پھر، چھوٹا سا نالہ پار کر کے الگ تھلگ ہوری کا کھیت تھا جس میں جھونا پک کر انگڑائیاں لے رہا تھا۔ وہ سب پگڈنڈیوں پر چلتے ہوئے دور سے ایسے لگ رہے تھے، جیسے رنگ برنگے کپڑے گھاس پر رینگ رہے ہوں۔ وہ سب کھیت کی طرف جا رہے تھے۔ جس کے آگے تھل تھا۔ دور دور تک پھیلا ہوا، جس میں کہیں ہریالی نظر نہ آتی تھی بس تھوڑی بے جان مٹی تھ جس میں پاؤں رکھتے ہی دھنس جاتا تھا۔ اور مٹی یوں بھر بھری ہو گئی تھی جیسے اس کے دونوں بیٹوں کی ہڈیاں چتا میں جل کر پھول بن گئی تھیں اور پھر ہاتھ لگاتے ہی ریت کی طرح بکھر جاتی تھیں۔ وہ تھل دھیرے دھیرے بڑھ رہا تھا۔ ہوری کو یاد آیا پچھلے پچاس برسوں میں وہ دو ہاتھ آگے بڑھ آیا تھا۔ ہوری چاہتا تھا، جب تک بچے جوان ہوں وہ تھل اس کے کھیت تک نہ پہنچے۔ اور تب تک وہ خود کسی تھل کا حصہ بن چکا ہوگا۔

پگڈنڈیوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ اور اس پر ہوری اور اس کے خاندان کے لوگوں کے حرکت کرتے ہوئے ننگے پاؤں.........

سورج آسمان کی مشرقی کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھ رہا تھا۔

چلتے چلتے ان کے پاؤں مٹی سے اٹ گئے تھے۔ کئی ارد گرد کے کھیتوں میں لوگ کٹائی کرنے میں معروف تھے وہ آتے جاتے کو رام رام کہتے اور پھر کسی انجانے جوش اور ولولے کے ساتھ ٹہنیوں کو درانتی سے کاٹ کر ایک طرف رکھ دیتے۔

انھوں نے باری باری نالہ پار کیا۔ نالے میں پانی نام کو بھی نہ تھا بہنے کو—اندر کی ریت ملی مٹی بالکل خشک ہو چکی تھی اور اس پر عجیب وغریب نقش ونگار بنے تھے۔ وہ پانی کے پاؤں کے نشان تھے اور سامنے لہلہاتا ہوا کھیت نظر آرہا تھا۔ سب کا دل بلیوں اچھلنے لگا— فصل کٹے گی تو ان کا آنگن پھوس سے بھر جائے گا اور کوٹھری اناج سے پھر کٹیا پر بیٹھ کر بھات کھانے کا مزہ آئے گا۔ کیا ڈکاریں آئیں گی پیٹ بھر جانے کے بعد۔ ان سب نے ایک بار سوچا۔

اچانک ہوری کے قدم رک گئے۔ وہ سب بھی رک گئے۔ ہوری کھیت کی طرف حیرانی سے دیکھ رہا تھا۔ وہ سب کبھی ہوری اور کبھی کھیت کو دیکھ رہے تھے۔ کہ اچانک ہوری کے جسم میں جیسے بجلی کی سی پھرتی پیدا ہوئی۔ اس نے چند قدم آگے بڑھ کر بڑے جوش سے آواز لگائی۔

''ابے کون ہے.........رے.........رے؟''

اور پھر سب نے دیکھا ان کے کھیت میں پکی ہوئی فصل میں کچھ بے چینی کے آثار تھے۔

اب سب ہوری کے پیچھے تیز تیز قدم بڑھانے لگے۔ ہوری پھر چلایا۔

''ابے کون ہے رہے—بولتا کیوں نہیں— کون فصل کاٹ رہا ہے میری—؟''

مگر کھیت میں سے کوئی جواب نہ ملا۔ اب وہ قریب آچکے تھے اور کھیت کے دوسرے کونے پر درانتی چلنے کی سڑاپ سڑاپ کی آواز بالکل صاف سنائی دے رہی تھی۔ سب قدرے سہم گئے۔ پھر ہوری نے ہمت سے للکارا۔

''کون ہے حرام کا جنا— بولتا کیوں نہیں؟'' اور اپنے ہاتھ میں پکڑی درانتی سونت لی اچانک کھیت کے پرلے حصے میں سے ایک ڈھانچہ سا ابھرا اور جیسے مسکرا کر انھیں دیکھنے لگا ہو۔

''میں ہوں ہوری کا کا — بجوکا!'' اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑی درانتی فضا میں ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

سب کی مارے خوف کے گھٹی گھٹیسی چیخ نکل گئی۔ انکے رنگ زرد پڑ گئے اور ہوری کے ہونٹوں پر گویا سفید پپڑی سی جم گئی — کچھ دیر کے لئے وہ سب سکتے میں آگئے اور بالکل خاموش کھڑے رہے — وہ کچھ دیر کتنی تھی؟ ایک پل، ایک صدی یا ھر ایک یگ — اس کا ان میں سے کسی کو اندازہ نہ ہوا۔ جب تک کہ انھوں نے ہوری کی غصہ سے کانپتی ہوئی آواز نہ سنی انھیں اپنی زندگی کا احساس نہ ہوا —

''تم......بجوکا.......تم.......ارے تم کو تو میں نے کھیت کی نگرانی کے لئے بنایا تھا — بانس کی پھانکوں سے اور تم کو اس انگریز شکاری کے کپڑے پہنائے تھے جس کے شکار میں میرا باپ ہانکا لگاتا تھا اور وہ جاتے ہوئے خوش ہو کر اپنے پھٹے ہوئے خاکی کپڑے میرے باپ کو دے گیا تھا۔ تیرا چہرہ میرے گھر کی بے کار ہانڈی سے بنا تھا اور اس پر اسی انگریز شکاری کا ٹوپا رکھ دیا تھا۔ ارے تو بے جان پتلا میری فصل کاٹ رہا ہے؟''

ہوری کہتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا اور بجوکا بدستور ان کی طرف دیکھتا ہوا مسکرا رہا تھا جیسے اس پر ہوری کی کسی بات کا کوئی اثر نہ ہوا ہو۔ جیسے ہی وہ قریب پہنچے انھوں نے دیکھا — فصل ایک چوتھائی کے قریب کٹ چکی ہے اور بجوکا اس کے قریب درانتی ہاتھ میں لئے کھڑا مسکرا رہا ہے۔ وہ سب حیران ہوئے کہ اس کے پاس درانتی کہاں سے آگئی — وہ کئی مہینوں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ بے جان بجوکا دونوں ہاتھوں سے خالی کھڑا رہتا تھا — مگر آج.........وہ آدمی لگ رہا تھا — گوشت پوست کا ان جیسا آدمی — یہ منظر دیکھ کر ہوری تو جیسے پاگل ہو اٹھا۔ اس نے آگے بڑھ کر اسے ایک زوردار دھکا دیا مگر بجوکا تو اپنی جگہ سے بالکل نہ ہلا البتہ ہوری اپنے ہی زور کی مار کھا کر دور جا گرا — سب لوگ چیختے ہوئے ہوری کی طرف بڑھے۔ وہ اپنی کمر پر ہاتھ رکھے اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا — سب نے اسے سہارا دیا۔ اور اس نے خوفزدہ ہو کر بجوکا کی طرف دیکھتے ہوئے: کہا ''تو.....تو مجھ سے بھی طاقتور ہو چکا ہے بجوکا! مجھ سے.........؟'' جس نے تمھیں اپنے ہاتھوں سے بنایا — اپنی فصل کی حفاظت کے واسطے۔''

بجوکا حسبِ معمول مسکرا رہا تھا، پھر بولا: ''تم خواہ مخواہ خفا ہو رہے ہو ہوری کاکا میں نے تو صرف اپنے حصے کی فصل کاٹی ہے۔ایک چوتھائی—''

''لیکن تم کو کیا حق ہے میرے بچوں کا حصہ لینے کا۔تم کون ہوتے ہو۔''

''میرا حق ہے ہوری کاکا— کیونکہ میں ہوں اور میں نے اس کھیت کی حفاظت کی ہے۔''

''لیکن میں نے تمہیں بے جان سمجھ کر یہاں کھڑا کیا تھا۔اور بے جان چیز کا کوئی حق نہیں ہوتا۔یہ تمہارے ہاتھ میں درانتی کہاں سے آگئی؟''

بجوکا نے ایک زوردار قہقہہ لگایا: ''تم بڑے بھولے ہو ہوری کاکا۔خود ہی مجھ سے باتیں کر رہے ہو—اور پھر مجھ کو بے جان سمجھتے ہو—؟''

''لیکن تم کو یہ درانتی اور زندگی کس نے دی—؟ میں نے تو نہیں دی تھی!''

''یہ مجھے آپ سے آپ مل گئی—جس دم تم نے مجھے بنانے کے لئے بانس کی پھانکیں چیریں تھیں، انگریز شکاری کے پھٹے پرانے کپڑے لائے تھے، گھر کی بے کار ہانڈی پر میری آنکھیں، ناک، کان اور منھ بنایا تھا—اسی دن ان سب چیزوں میں زندگی کلبلا رہی تھی اور یہ سب مل کر میں بنا اور میں فصل پکنے تک یہاں کھڑا رہا اور ایک درانتی میرے سارے وجود میں سے آہستہ آہستہ نکلتی رہی—اور جب فصل پک گئی وہ درانتی میرے ہاتھ میں تھی۔لیکن میں نے تمہاری امانت میں خیانت نہیں کی—میں آج کے دن کا انتظار کرتا رہا۔اور آج جب تم اپنی فصل کاٹنے آئے ہو—میں نے اپنا حصہ کاٹ لیا، اس میں بگڑنے کی کیا بات—'' بجوکا نے آہستہ آہستہ سب کہا تاکہ ان سب کو اس کی بات اچھی طرح سمجھ میں آجائے۔

''نہیں ایسا نہیں ہوسکتا۔یہ سب سازش ہے۔میں تمہیں زندہ نہیں مانتا۔یہ سب چھلاوا ہے۔میں پنچایت سے اس کا فیصلہ کراؤں گا۔تم درانتی پھینک دو۔میں تمہیں ایک تنکا بھی لے جانے نہیں دوں گا۔'' ہوری چیخا اور بجوکا نے مسکراتے ہوئے درانتی پھینک دی۔

گاؤں کی چوپال پر پنچایت لگی—پنچ اور سرپنچ سب موجود تھے۔ہوری اپنے پوتے پوتیوں کے ساتھ بیچ میں بیٹھا تھا۔اس کا چہرہ مارے غم کے مرجھایا ہوا تھا۔اس کی دونوں بہوئیں دوسری عورتوں کے ساتھ کھڑی تھیں اور بجوکا کا انتظار تھا۔آج پنچایت نے اپنا فیصلہ سنانا تھا۔مقدمہ

کے دونوں فریق اپنا اپنا بیان دے چکے تھے۔

آخر دور سے بجوکا خراماں خراماں آتا ہوا دکھائی دیا—سب کی نظریں اس کی طرف اٹھ گئیں۔ وہ ویسے ہی مسکراتا ہوا آ رہا تھا، جیسے ہی وہ چوپال میں داخل ہوا، سب غیر ارادی طور پر اٹھ کھڑے ہوئے اور ان کے سر تعظیماً جھک گئے۔ ہوری یہ تماشہ دیکھ کر تڑپ اٹھا۔ اسے لگا، جیسے بجوکا نے سارے گاؤں کے لوگوں کا ضمیر خرید لیا ہے۔ پنچایت کا انصاف خرید لیا ہے۔ وہ اپنے آپ کو تیز پانی میں بے بس آدمی کی طرح ہاتھ پاؤں مارتا ہوا محسوس کرنے لگا۔

آخر سرپنچ نے اپنا فیصلہ سنایا۔ ہوری کا سارا وجود کانپنے لگا۔ اس نے پنچایت کے فیصلہ کو قبول کرتے ہوئے فصل کا چوتھائی حصہ بجوکا کو دینا منظور کر لیا اور پھر کھڑا ہو کر اپنے ہوتوں سے کہنے لگا۔

''سنو—یہ شاید ہماری زندگی کی آخری فصل ہے۔ ابھی تھل کھیت سے کچھ دوری پر ہے۔ میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں، اپنی فصل کی حفاظت کے لئے پھر کبھی بجوکا نہ بنانا—اگلے برس جب ہل چلیں گے—بیج بویا جائے گا اور بارش کا امرت کھیت میں سے کونپلوں کو جنم دے گا—تو مجھے ایک بانس پر باندھ کر کھیت میں کھڑا کر دینا، بجوکا کی جگہ پر۔ میں تب تک تمہاری فصلوں کی حفاظت کروں گا، جب تک تھل آگے بڑھ کر کھیت کی مٹی کو نگل نہیں لے گا اور تمہارے کھیتوں کی مٹی بھربھری نہیں ہو جائے گی۔ مجھے وہاں سے ہٹانا نہیں—وہیں رہنے دینا تاکہ جب لوگ دیکھیں تو انھیں یاد آئے کہ بجوکا نہیں بنانا۔ کہ بجوکا بے جان نہیں ہوتا—آپ سے آپ اسے زندگی مل جاتی ہے اور اس کا وجود اسے درانتی تھما دیتا ہے۔ اور اس کا فصل کی ایک چوتھائی پر حق ہو جاتا ہے۔

ہوری نے کہا اور پھر آہستہ آہستہ اپنے کھیت کی طرف بڑھا۔ اس کے پوتے پوتیاں اس کے پیچھے تھے اور پھر اس کی بہوئیں اور ان کے پیچھے گاؤں کے دوسرے لوگ سر جھکائے ہوئے چل رہے تھے۔

کھیت کے قریب پہنچ کر ہوری گرا اور ختم ہو گیا۔ اس کے پوتے پوتیوں نے اسے ایک بانس سے باندھنا شروع کیا—اور باقی کے سب لوگ یہ تماشہ دیکھتے رہے—بجوکا نے اپنے سر پر رکھا شکاری ٹوپا اتار کر سینے کے ساتھ لگا لیا اور اپنا سر جھکا دیا۔

ڈار سے بچھڑے

سید محمد اشرف

شروع جنوری کے آسمان میں ٹکے ستاروں کی جگمگاہٹ کہرے کی موٹی تہہ میں کہیں کہیں جھلک رہی تھی۔ جیپ کی ہیڈ لائٹس کی دو موٹی موٹی متوازی لکیریں آگے بڑھ رہی تھیں۔ سڑک بالکل سنسان تھی۔ چاروں طرف سناٹا تھا۔ سناٹے کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا پھر جیپ کے انجن کی آواز اور سڑک کے درختوں کی ٹھنڈی ٹھنڈی سرگوشیاں— یکا یک بھیگی ہوئی ہوا کے کئی جھونکے بند جیپ کے اندر گھس آئے۔ میں نے بندوق ٹانگوں پر رکھ شکاری کوٹ کی بیلٹ کو مزید کسا اور گردن کو مفلر سے اچھی طرح لپیٹ لیا۔ جیسے جیسے رات گزر رہی تھی، جاڑا تیز ہوتا جا رہا تھا۔ ہوائیں کچھ دیر کو تھمیں تو میں نے جیب سے سگریٹ نکال کر سلگائی۔

گاڑی لاہور کی حدوں سے بہت آگے نکل آئی تھی۔

''غلام علی!'' میں ڈرائیور سے مخاطب ہوا۔

''جی حضور!''

''اور کتنی دور ہے شاہ گنج؟''

''بس صاحب تیس بتیس میل اور چلنا ہے۔''

''کہیں ایسا نہ ہو کہ ہمارے پہنچنے سے پہلے چڑیا اٹھ جائے۔''

''کیا وقت ہوا ہوگا صاحب؟''—اس نے جیپ کی رفتار تیز کرتے ہوئے پوچھا۔

میں نے سگریٹ کا ایک طویل کش لیا اور چنگاری کی روشنی میں گھڑی دیکھ لی۔

''ساڑے چار ہو چکے۔''

''تب تو آپ بے فکر رہیئے۔ ساڑھے پانچ چھ تک پہنچ جائیں گے—سات بجے کے قریب جا کر کہیں پو پھٹتی ہے—چڑیا اس کے بعد ہی اٹھتی ہے۔ پھر وہی سناٹا۔

''شاہ گنج سے تمہارا گھر کتنی دور ہے؟''

''شاہ گنج سے پہلے مغل بادشاہ کی بنوائی ایک مسجد سڑک کے کنارے پڑتی ہے۔ اس کے پیچھے سے ایک کچا راستہ جاتا ہے۔ ناک کی سیدھ دو میل چلیں تو ہمارا گاؤں نظر آ جاتا ہے۔''

'کیا نام ہے تمہارے گاؤں کا؟'' میں گفتگو کا سلسلہ جاری رکھنا چاہتا تھا۔

''خیراں والا۔''

کیا بات کروں اس پنجابی ڈرائیور سے—پھر وہی خاموشی چھا گئی۔

سردیوں کی اندھیری رات کے پس منظر میں سڑک کے کنارے درختوں کے دھندلے خطوط آپس میں مخلوط ہو گئے تھے اور کہرے کے غبار میں مل کر سناٹا اتنا گاڑھا ہو گیا تھا کہ میں جیپ سے باہر ہاتھ نکال کر اسے چھو سکتا تھا— سگریٹ کا آخری کش لیکر میں نے سگریٹ باہر اچھال دیا چنگاری زمین پر کر کئی ٹکڑوں میں بکھر گئی اور چھوٹی چھوٹی بہت سی چنگاریاں ملگجے اندھیرے میں ادھر ادھر کھو گئیں۔

''صاحب! آپ کو شکار کا شوق کب سے ہے!''

''بچپن سے غلام علی۔''

''کیا ہندوستان میں شکار کھیلنے دیتے ہیں؟''

گردن موڑے بغیر اس نے مجھ سے سوال کیا۔

''ہاں بھئی، سینتالیس سے پہلے تو کھیلا جاتا تھا۔ اب نہیں معلوم اور اب تو یہ بھی خبر نہیں کہ جن دیواروں کے بیچ ہم پلے تھے وہ ڈھے گئے کہ سلامت ہیں۔''

''آپ تو یو-پی- کے تھے صاحب۔''

''ہوں۔'' میں نے اسے دھیرے سے جواب دیا۔ میں نے چاہا کہ غلام علی کو منع کر دوں کہ ایسی کوئی بات نہ کرے کہ مجھے وہ سب کچھ یاد آجائے۔ لیکن میں چپ رہا میں نہیں چاہتا تھا کہ کوئی میری اس کمزوری کو جان سکے۔ ورنہ اے غلام علی یہ جو تم نے ابھی پوچھا تھا کہ آپ یو۔پی کے تھے تو اس لفظ ''تھے'' پر میں تم سے گھنٹوں بحث کر سکتا ہوں۔ کیا پاکستان آنے کے بعد میرا اس خطۂ زمین سے کوئی ناطہ نہیں رہا جہاں میرے بچپن نے ممتا کی لوریاں سنی تھیں، جہاں میرے لڑکپن نے چھوٹے چھوٹے جذبوں سے محبت کرنا سیکھا تھا جہاں میرے عقل و ہوش کے بال و پر نکلے تھے۔

لیکن یہ سب کیسے ہوا ــــ یہ غلام علی کیا سمجھتا ان باتوں کو ــــ اور غلام علی ہی کیا اب تو میں خود بھی نہیں سمجھ پاتا اور سمجھتا بھی کیسے؟ تقسیم کی موٹی موٹی لکیروں کے نیچے ان سارے جذبوں کے نقوش چھپ گئے تھے۔ وہ جذبے جو صرف وہیں کا خاصہ ہوتے ہیں جہاں انسان پہلی بار آنکھ کھول کر آسمان دیکھتا ہے۔

ہوائیں مزید تیز ہو گئیں اور کہرے کی چادر ویسی کی ویسی دبیز تھی۔

''تو صاحب آپ پھر کبھی ہندوستان نہیں گئے؟ غلام علی نے پوچھا تھا ــــ سڑک کے سناٹوں نے درختوں کی سرگوشیوں سے خاموشی کی بھیک مانگی۔ لیکن جب جاندار بے حس ہو جائیں تو درخت تو بے جان ہی ہوتے ہیں۔

''سرکاری افسر اتنی آسانی سے نہیں جا پاتے اور سرکار پوچھتی ہے کس سے ملنے جا رہے ہو؟''

''کیا کوئی رشتہ دار وہاں نہیں ہے؟''

''سب بزدل تھے یہاں آبسے۔ میں بھی بزدل تھا لیکن چھوٹا بزدل میری عمر اس وقت ۱۸ رسال تھی شاید۔ ہاں ۱۸ رسال کا تھا میں۔''

''بزدلی کی کیا بات ہے صاحب وہاں نہیں رہے یہاں آگئے۔'' غلام علی نے جیسے مجھے دلاسہ دیا لیکن میں بھلا دلاسوں سے بہلتا۔

''بہت لمبا چوڑا فلسفہ ہے غلام علی۔ تم نہیں سمجھو گے۔''

وہ تھوڑی دیر خاموش رہا، جیسے میں نے اس کی بے عزتی کر دی ہو۔ ''میری بیوی کے ماں باپ بھی بھارت ہی کے تھے صاحب۔ مجھ سے بہت ضد کرتی ہے کہ ایک بار ہندوستان دکھا دوں۔ میں نے درخواست دی تو پوچھا گیا کہ وہاں اپنے رشتہ داروں کے نام لکھواؤ ــــ وہاں کوئی رشتہ دار ہی نہیں ہے صاحب۔ بس اسے اپنے گاؤں اور ضلع کا نام یاد ہے ــــ''

سناٹا ہم دونوں پر خاموشی سے گزرتا رہا۔

''غلام علی!'' میں اس سے مخاطب ہوا۔

''جی!'' اس نے مڑ کر میری طرف دیکھا۔

''تمہاری بیوی کہاں کی رہنے والی تھی؟'' میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر سوال کیا۔

''ہردوئی ضلع کی صاحب۔''

''ہوں ـــــ یو۔پی کی ہے تمہاری بیوی۔''

''جی حضور۔'' میں نے اندھیرے میں بھی محسوس کر لیا کہ وہ مسکرا رہا ہے۔

''میں نے جان لیا، تم اس وقت کیوں مسکرائے غلام علی؟''

''صاحب! ایک بات کہوں آپ سے۔ میری بیوی کو معلوم ہے کہ آپ یو۔پی کے ہیں۔ مجھ سے کہہ رہی تھی کہ تمہارا صاحب یو۔پی کا ہے، میرے وطن کا۔ مجھے اس کے پاس لے چلو۔ وہ میرا پرمٹ بنوا دے گا ـــ تو حضور اسے معلوم ہے کہ آج آپ شکار کھیلنے آ رہے ہیں، تو گھر پہ بھی تھوڑا اسرار کیں گے۔ وہ آپ سے کہے تو ذرا سختی سے منع کر دیجئے گا کہ اس کا پرمٹ نہیں بن سکتا۔''

''کیوں غلام علی؟ ایسا کیوں کہوں میں؟ پاسپورٹ تو میں اس کا کسی نہ کسی طرح بنوا ہی سکتا ہوں۔''

''پاسپورٹ کی بات نہیں صاحب۔ آدمی کی زندگی میں ایک ہی جھنجھٹ تھوڑی ہوتا ہے۔ اسے تو بے کار کا شوق ہے بھارت جانے کا۔ اس کا شوق پورا کرنے میں میرے چار پان سو اٹھ جائیں گے۔''

''ہوں۔'' میری سمجھ میں نہ آیا اسے کیا جواب دوں ـــ غلام علی نے میری خاموشی سے فائدہ اٹھایا۔

''صاحب میرا ایک دوست ہے۔ وزیرالدین۔ اس کی بیوی بھی بھارت ہی میں پیدا ہوئی تھی۔ اس نے چوری چھپے پرمٹ منوا لیا اور پھر کانوں کا زیور بیچ کر وزیرالدین سے اجازت مانگی۔ وزیرالدین کو معلوم ہوا تو اسے بڑا اچنبھا ہوا اور غصہ بھی آیا ـــ اس نے اوپری دل سے اجازت دے دی اور رات کو اس کے بکسے سے پرمٹ نکال کر جلا دیا۔ صبح اٹھی تو پرمٹ غائب۔ اس نے بڑا فیل مچایا اور وزیرالدین سے کہا کہ یہ اسی کا کام ہے۔ وزیر نے پہلے تو بہانے ملائے ـــ اور پھر صاحب ڈنڈا لے کر جٹ پڑا کہ حرامزادی تین چار مہینے تک کیا تیری اماں مجھے روٹی پکا کر کھلائے گی ـــ''

غلام علی نے سڑک سے نظریں موڑ کر میری طرف ایسے دیکھا، جیسے اپنے دوست کی بہادری اور دانش مندی کی داد چاہتا ہو۔

میں خاموش رہا ـــــ اندھیرے میں وہ مجھے صاف صاف نہیں دیکھ سکا، سمجھا کہ میں بیٹھے بیٹھے سو گیا ہوں ـــــ

اس نے میری طرف سے گردن موڑ کر سڑک کو دیکھا اور جیپ کی رفتار کچھ اور بڑھا دی ـــــ رفتار بڑھی تو ہوا کچھ اور تیز محسوس ہونے لگی۔

مجھے ابھی ابھی یہ بھی محسوس ہوا کہ جیپ کے باہر سڑک پر اور درختوں پر ہوائیں بہت تیز ہوگئی ہیں ـــــ اور درخت کے پتوں سے کچھ ایسی آوازیں پھوٹ رہی ہیں جو ماحول کو بے حد پر اسرار بنا دیتی ہیں۔ باہر کے اس پر شور ماحول میں، مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیپ میں بے پناہ خاموشی ہے، جیسے بپھری ہوئی موجوں کے سمندر میں کوئی اکیلا جہاز چلا جا رہا ہو جس کے عملے کو بحری قزاقوں نے قتل کر دیا ہو۔ میں نے بدن کچھ اور سکوڑ لیا اور سوچا۔

غلام علی ـــــ تم بہت کمینے ہو اور بہت بھولے ہو ـــــ تم اور تمہارا دوست نہیں جانتے کہ اس جگہ سے بچھڑ کر انسان کی کیا حالت ہو جاتی ہے۔ جہاں اس نے پیدا ہو کر ماں کی چھاتیوں سے دودھ پیا ہو اور باپ کی شفیق انگلیوں کا لمس اپنے سر پر محسوس کیا ہو ـــــ تمہیں نہیں معلوم کہ انسان کو وہ جگہ کتنی پیاری لگتی ہے، جہاں اس کا بچپن لڑکپن سے گلے ملا ہو۔ تمہیں اس کا علم ہی نہیں غلام علی کہ انسان ان لمحوں کو کتنا عزیز رکھتا ہے، جن لمحوں میں اس کا بھولا بھالا ذہن، معصوم، سر پھرے اور خود سر جذبوں کو خون پلا پلا کر پالتا ہے۔ تم کچھ نہیں جانتے، کچھ بھی نہیں۔ اسٹیرنگ کا گول پہیہ گھماتے گھماتے تمہارا دماغ بھی گھوم گیا ہے۔

مجھے محسوس ہوا کہ اتنا سوچنے کے بعد مجھے ایکا ایکی غلام علی سے نفرت ہوگئی۔

میرے اندر سے کوئی بولا۔ تم غلام علی سے نفرت نہیں کر رہے ہو۔ تم وہی کر رہے ہو جو پچھلے تیس سال سے کرتے چلے آ رہے ہو۔ تمہیں اپنی محرومیاں نظر آ گئیں نا! تم غلام علی جیسے ہر اس فرد سے فوراً نفرت کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہو جو تمہاری محرومیوں کی عمارت میں ایک چھوٹی سی اینٹ رکھنے کا بھی خطاوار ہو ـــــ اس بیچارے نے کیا کیا؟ صرف اپنی بیوی اور اپنے دوست کی بیوی کے متعلق بتایا تھا۔ بس تھوڑی دیر کو ان جانے میں یہ احساس دلا دیا یا یوں کہو کہ تمہیں یاد دلا دیا کہ تم ہندوستان کبھی نہیں جا سکتے، اس لئے تم اس سے نفرت کرنے لگے۔ اپنی محرومیوں کو آڑ لے کر اس

بیچارے پہ کیوں بگڑ رہے ہو!

میرا اندر والا بہت خود سر ہو گیا ہے کچھ عرصے سے ۶۵ء اور اےء کی لڑائیوں کے بعد تو یہ کچھ اور بھی بے باک ہو گیا ہے۔ ایسے ایسے سوال پوچھ بیٹھتا ہے کہ جواب نہیں بن پڑتے، جیسے موت کی سزا کا فیصلہ سننے کے بعد مجرم من مانی حرکتیں کرنے لگتا ہے۔ جانتا ہے کہ اس سے بڑی سزا ممکن نہیں۔ ویسے ہی یہ بھی ہر خوف ہر خطرے سے آزاد ہو گیا ہے۔ بلا سوچے سمجھے ہر بات کر گزرتا ہے۔

اب کیا جواب دوں اسے؟

مجھے محسوس ہوا کہ اب دماغ میں سوچنے کے لئے کچھ نہیں رہا —— جیسے ذہن کے تالاب سے سوچ کی ساری مرغابیاں اڑ گئی ہوں۔ میں نے پیچھے سر لٹکا لیا۔

''صاحب۔'' غلام علی نے دبی دبی آواز میں مجھے پکارا — اتنے دھیمے کہ اگر میں ذرا بھی نیند میں غافل ہوتا تو نہیں سن پاتا۔ شاید اس کا بھی یہی مقصد ہو۔

''ہوں۔'' میں نے محسوس کیا کہ میری آواز کچھ اجنبی ہو گئی ہے۔

''صاحب آپ سو گئے تھے کیا؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں —— کیوں کوئی خاص بات؟''

''نہیں حضور —— ویسے آپ نے دیکھا کہ جب سے لڑائی کے بعد راستے کھلے لوگ کتنے خوش خوش بھارت جا رہے ہیں اور وہاں والے کتنے ہنستے بولتے پاکستان آ رہے ہیں۔ راستے کھلے کتنے ہی دن ہو گئے مگر اب تک تانتا سا لگا ہے۔''

خاموشی —— میں خاموش رہا جیسے ایک لفظ بھی بولا تو پھٹ پڑوں گا۔

''صاحب او صاحب آپ نے سنا میں کیا کہا؟''

میں نے چپکے سے گردن موڑ کر سڑک کو دیکھا جو پیچھے بھاگتی چلی جا رہی تھی —— بالکل تاریک اور سنسان ——

میں نے اندھیرے میں آنکھیں جما دیں اور سوچا ——

تم نے پھر اپنی کمینگی کا ثبوت دیا غلام علی۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ ان راستوں کے کھلنے کا مجھ پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ میں اب بھی وہاں نہیں جا سکتا۔ تم کیوں جان بوجھ کر میرے زخموں کو کرید رہے ہو۔

غلام علی مجھ سے مایوس ہو کر ڈرائیو کرتا رہا ——

مجھے ابھی یہ خیال آیا کہ میں تو خیر ایسے عہدے پر فائز ہوں کہ ہندوستان جا ہی نہیں سکتا —— لیکن غلام علی اور وزیرالدین کی بیویوں پر کیوں اتنی مجبوریاں لاددی گئی ہیں۔ انہیں اس سرزمین کو دیکھنے کی اجازت کیوں نہیں دی جاتی جس کے تصور کے بغیر انکی زندگی کی تاریخ ادھوری ہے ——

غلام علی یہ جو تم خاموشی سے بیٹھے ڈرائیو کررہے ہو تو اتنے بھولے تو نہیں ہو —— تم سال میں مجھ سے تین مرتبہ چھٹیاں لیکر اپنے والدین سے ملنے کراچی تو جاسکتے ہو، ہردوئی نہیں جاسکتے۔ ہر دوئی بھی تو لاہور سے اتنا ہی دور جتنا کراچی —— کیا کراچی جانے میں تمہارے پیسے نہیں خرچ ہوتے —— کیا کراچی کا ٹکٹ مفت ملتا ہے —— لیکن میں تم سے یہ سوال کیوں پوچھوں۔ مجھے کیا حق اور مجھے تو یہ پوچھنے کا بھی حق نہیں ہے کہ تمہارا دوست وزیرالدین کیا تین چار مہینے ہوٹل کی روٹی نہیں کھاسکتا کہ ان تین چار مہینوں میں اس کی بیوی تین برسوں کی محرومی کے بعد اس آب وہوا میں جاکر سانسیں لے سکتی ہے جہاں اس نے بچپن کو تھپکیاں دے کر سلایا تھا اور جوانی کو آگے بڑھ کر خوش آمدید کہا تھا —— مجھے ان سوالوں کے پوچھنے کا حق اس لئے بھی نہیں ہے غلام علی کہ سوال وہ پوچھتے ہیں جن کو جواب نہیں معلوم ہوتے۔ میں تیس سال سے سوالات تخلیق کر کے جوابات گڑھ رہا ہوں۔ میں اس معاملے کی نزاکت سے واقف ہوگیا ہوں —— لیکن ہر جواب ادھورا ہے غلام علی۔ کیونکہ جس دن میں نے خود کو صحیح جواب دے دیا اس دن یہ سوال کرنے کا مشغلہ بھی ہاتھ سے جاتا رہے گا۔ غلام علی کبھی کبھی مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک بھیانک جواب میرے سامنے آکر کھڑا ہوگیا ہے۔ میں فوراً کوئی ٹیڑھا سال سوال کردیتا ہوں اور تب تک سوالات کرتا رہتا ہوں جب تک وہ خوف ناک جواب مبہم ہوکر میری نظروں سے اوجھل نہ ہوجائے۔ مجھے بہت خوف محسوس ہوتا ہے صحیح جوابوں سے ——

"صاحب مسجد آرہی ہے۔" غلام علی نے مجھے بتایا —— "ابھی پو پھٹنے میں بہت دیر ہے۔ میرے گھر چلنا پڑے گا آپ کو۔ نہیں تو جمیلہ غم کرے گی ——"

"ٹھیک ہے وقت ہو تو ضرور چلو۔ ایسا بھی تو ہوسکتا ہے کہ ہم پہلے تالاب پر جائیں پھر تمہارے گھر جائیں ——"

جیپ ایک جھٹکے کے ساتھ رک گئی —— ہوائیں جو چلتی ہوئی گاڑی میں بہت پرشور اور ٹھنڈی تھیں ایکا ایکی مدھم پڑگئیں۔

سڑک کے بائیں طرف وسیع اندھیروں کے پس منظر میں۔ کہرے میں لپٹے ہوئے مجھے ایک مسجد کے دھندلے خطوط نظر آئے۔ مسجد سے ذرا ہٹ کر ایک الاؤ جل رہا تھا اور اس کے گرد تین آدمی کھڑے تھے۔ اتنے حصے کے اندھیرے کو الاؤ نے نگل لیا تھا اور ان آدمیوں کے گرد ایک روشن حلقہ کھینچ گیا تھا—— میں نے غور سے دیکھا۔ دو آدمیوں کے کندھوں پر بندوقیں لٹکی ہوئیں تھیں—— جیپ رکنے پر وہ ہماری طرف متوجہ ہو گئے تھے——

غلام علی بڑبڑاتا ہوا نیچے اتر آیا——

میں سمجھ گیا غلام علی کیوں بڑبڑایا۔ دوسرے شکاریوں کو دیکھ کر وہ ہمیشہ ایسے ہی ناراض ہو جاتا ہے——

بندوق ہاتھ میں سنبھالے میں نیچے اتر آیا—— ٹھنڈی ہوائیں میرے کپڑوں میں گھس گئیں اور کہرے کی نمی کو میں نے اپنے چہرے پر محسوس کیا ان آدمیوں نے ایک طرف سمٹ کر الاؤ کے قریب جگہ بنائی، جیسے مجھے خاموش دعوت دے رہے ہوں—— غلام علی کو پیچھے آنے کا اشارہ کر کے میں الاؤ کی طرف بڑھ گیا——

ان کی جیپ بھی قریب ہی اندھیرے میں کھڑی ہوئی تھی۔ ان میں ایک ڈرائیور کی وردی پہنے ہوئے تھا اور دو شکاری کوٹ لادے ہوئے تھے—— الاؤ کے قریب دیر سے کھڑے رہنے کے باعث ان کے چہروں پر پسینہ پھوٹ آیا تھا—— ان میں ایک صورت مجھے جانی پہچانی سی لگی—— حافظے کی غیر مرئی لہروں پر ایک چہرہ تھرتھرا رہا تھا۔ لیکن وہ صورت اتنی مبہم اور غیر واضح تھی جیسے پرائمری اسکول کے زمانے کی لکھی ہوئی کلاس کی کاپیاں جو بڑے ہونے کے بعد پہچانی بھی نہ جاسکیں اور بھلائی بھی نہ جاسکیں—— الاؤ کی سرخ آنچ میں وہ چہرہ دہک رہا تھا—— وہ صورت مجھے پھر جانی پہچانی لگی—— وہ شخص بھی مجھے بہت غور سے دیکھ رہا تھا—— میں نے اس کے چہرے پر آنکھیں گاڑ دیں۔ اس نے اپنے ہاتھ الاؤ کے سامنے گرم کئے اور انھیں گالوں پر رکھ لیا—— یادوں کی آنچ سے حافظے پر جمی ہوئی برف پگھلی اور میرے ذہن میں ماضی کے آئینہ خانے سج گئے۔ میں نے اس ایک لمحے میں تیس برس کا سفر طے کر لیا اور اتنی خاموشی سے یہ سفر کیا کہ مجھے محسوس ہی نہیں ہوا کہ کب میں یہاں سے وہاں پہنچ گیا—— میرے ذہن میں ایک ساتھ بہت سی بجلیاں چمکیں اور بہت سے خاکے بن گئے اور ان خاکوں میں میرے حافظے نے بڑی سبک دستی سے بچپن کی امنگوں، لڑکپن کی جستجو اور شروع جوانی کے ولولوں کے بے حد خوشنما رنگ بھر دیے۔

میں نے یو۔پی کے گنگا جمنا کے دوآبے میں بسے اس قصبے کو بالکل واضح شکل وصورت میں اپنے ذہن کے پردے پر چمکتا ہوا دیکھا —— وہاں کی مسجدیں دیکھیں وہاں کے مندر دیکھے —— وہاں کے سارے محلے ساری گلیاں دیکھ ڈالیں۔قصبے کے سارے کچے پکے گھر دیکھ ڈالے۔ اپنا مکتب دیکھا، پھر اسکول دیکھا۔سارے بزرگ اور تمام ماسٹر شفیق چہرے لئے اپنے سامنے کھڑے دیکھے —— میلوں کی دھوم دھام دیکھی اور دیہات کی جوان اور خوبصورت عورتوں کو نیلے پیلے اور سرخ گھا گھروں میں ہنستے بولتے میلے کی طرف بڑھتے دیکھا —— گیہوں کے کھیتوں کے طویل سلسلے دیکھے اور دور دور تک آم کے باغ بور میں لدے ہوئے نظر آئے۔

اس ایک لمحے میں بچپن کی ساری شرارتیں نظر آ گئیں۔مئی جون کے تپتے ہوئے موسم میں سڑکوں پر آوارہ گردی کرتے اپنے آپ کو دیکھ لیا —— گرم لے سے اپنا بدن جھلستے ہوئے دیکھ لیا۔اپنے سارے عزیز قطار اندر قطار کھڑے نظر آئے —— کچھ ان میں وہیں سو گئے اور جو باقی رہ گئے تھے وہ اب صرف رشتہ دار رہ گئے تھے عزیز نہیں۔

آئینہ خانے میں ایک عکس اور چمکا —— دو لڑکے ہاتھوں میں ایر رائفل لئے چلے جا رہے ہیں۔سورج جھک آیا ہے اور دن بھر کی حدت اب صرف زرد روشنی بن کر رہ گئی ہے۔بیر کے باغوں میں تیتر بول رہے ہیں۔ان لڑکوں میں سے ایک بیر کے باغ میں گھس گیا ہے اور دس منٹ بعد جب باہر آیا تو فاتحانہ انداز میں ہاتھ میں لٹکے بھورے تیتر کو دکھا رہا ہے۔دوسرا لڑکا جو ہاتھ پیچھے کئے کھڑا تھا، ہاتھ آگے کر دیتا ہے جس میں ایک ذبح کیا ہوا خرگوش الٹا لٹکا ہوا تھا —— دونوں ہنس پڑتے ہیں، دونوں نے اپنے اپنے حصے کا شکار کر لیا تھا —— پھر ایک عکس اور سامنے آیا —— اب یہ لڑکے کچھ اور بڑے ہو گئے ہیں۔ان کے ہاتھوں میں ایر رائفل کی جگہ بندوقیں آ گئی ہیں —— رمضان میں سحری کا ناشتہ کرنے کے بعد یہ اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ آبی چڑیوں کے شکار کو جا رہے ہیں۔دوپہر کو روزہ توڑنے کے لئے ماؤں نے تھیلوں میں افطار کا سامان بھر دیا ہے۔پوس کی چاندنی رات میں برفیلی ہواؤں سے بدن بچاتا ہوا یہ قافلہ بڑھتا چلا جا رہا ہے —— فضا میں سائیں سائیں کی آوازیں مسلط ہیں —— سب دل ہی دل میں تمنا کر رہے ہیں کہ سب سے زیادہ چڑیا میرے ہاتھ سے شکار ہوں —— اس بات پر سب بیحد خوش ہیں کہ گھر والوں کو بیوقوف بنا کر روزہ گول کر دیا ہے —— اب یہ قافلہ نہر کی پٹری سے اتر کر تالاب کی طرف بڑھ رہا ہے —— تالاب سے دو فرلانگ دور بیٹھ کر اسکیم بنائی جا رہی ہے کہ کہاں سے کیسے فائر کرنا ہے —— یہ

اندازہ لگایا جا رہا ہے کہ چڑیاں تالاب کے کس حصے میں ہوں گی ـــــ اندھیرا چھٹا، پو پھٹی، سورج نے کہرے کا مفلر اتار کر چہرہ دکھایا تو معلوم ہوا کہ تالاب بالکل چاندی جیسا پڑا ہے۔ سب ایک دوسرے پر ملامت کر رہے ہیں اور یہ تو جیہہ پیش کر رہے ہیں کہ میں نے پہلے ہی کیا تھا کہ چڑیا نہیں صرف سارس بول رہے ہیں۔ پھر فاختائیں اور بگلوں جیسے بہترین پرندوں کو چن چن کر مارا جا رہا ہے۔ سہ پہر کو لوٹتے وقت مٹی کے ڈھیلوں سے رگڑ رگڑ کر ہونٹوں کو خشک کیا جا رہا ہے تا کہ گھر والے جان نہ پائیں، روزہ بھی ذبح کر دیا ہے۔ راستے میں تھکن کی وجہ سے گفتگو کرنا تک محال ہو رہا ہے۔ لڑکپن کی کچی ہڈیوں پر جسم کا بوجھ سنبھالے گھر کی طرف قدم بڑھا رہے ہیں۔ سامنے بستی کے آثار نظر آنے لگے ہیں اور دور سے قصبے کی دھندلی سرحدوں پر مسجدوں کے سیاہ کائی زدہ گنبد اور مینار خاموش کھڑے ہیں۔ کسی کو اچانک یاد آ گیا اور فاختاؤں اور بگلوں کے پر ادھیڑ دیے گئے تا کہ جب یہ گھر میں داخل ہوں تو ہریل اور بڑے چھوں کی حیثیت سے ان کا استقبال کیا جائے۔

ایک کے بعد ایک ایسے ہی بہت سے عکس نظروں کے سامنے جھماکے مارتے ہوئے گزر گئے، جن میں بچپن سے لے کر شروع جوانی تک سارے منظر تھے اور ہر منظر میں دونوں لڑکے ساتھ ساتھ ہیں ـــــ

''صاحب ـــ اب چلئے گاؤں کی طرف۔'' آئینہ خانوں میں غلام علی کی آواز نے پتھر مارا اور سارے آئینے چھن کے ٹوٹ گئے۔ سارے مناظر آپس میں گڈمڈ ہو گئے۔

میں نے غلام علی کی بات کا جواب نہیں دیا۔ میں نے حساب لگایا کہ یادوں کی کتنی چڑیاں ابھی میرے ذہن کے پنجرے میں بند ہیں اور سامنے کھڑا یہ شکاری میری کتنی یادوں کا حاصل جمع ہے۔

اس نے پھر ہاتھوں کو گرم کر کے چہرے پر رکھا۔ نواب بھی تو ایسا ہی کرتا تھا ـــ اور اب مجھے یقین کامل تھا کہ آئینہ خانے کا وہ لڑکا اپنی عمر میں ایک دم تیس برس جوڑ کر میرے سامنے کھڑا ہے۔

یکا یک ہوا بالکل خاموش ہو گئی ـــ الاؤ میں جلتی ہوئی درختوں کی ٹہنیاں چٹاچٹ بولیں، چنگاریاں فضا میں اڑنے لگیں۔ دور کسی سوئے ہوئے تالاب میں کوئی سارس زور سے چیخا ـــ

میں نے آہستگی سے الاؤ کی طرف ایک قدم بڑھایا اور اس شخص کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا ـــــ

''آپ.........تم.........تم نواب ہو.........''

اس کی پھیلی ہوئی آنکھیں ایک ثانیے کو سکڑ گئیں۔ اس کا سر نفی میں ہلا ـــ اس کی آنکھوں

سے اتنے آنسو بہے کہ چہرے کے پسینے کو بہالے گئے ـــــ جذبوں کی شدت اور آنچ کی حدت سے اس کا چہرہ انگارہ ہوگیا ـــــ اس نے بندوق کندھے سے اتار کر اپنے ساتھی کو تھمائی اور لاؤ کا پورا چکر کاٹ کر میرے قریب آیا اور میرے گلے سے لپٹ کر خاموش ہوگیا ـــــ

''اب تم ہرگز مت بتانا کہ تم کون ہو؟'' تیس سال کے بعد میں نے وہ آواز سنی جو لگاتار ۱۶-۱۷ سال تک سنی تھی۔

''نہیں، میں نہیں بتاؤں گا کہ میں کون ہوں۔'' میں نے اسے مضبوطی سے تھام لیا۔ خدا جانے ہم کب تک ہم یوں ہی کھڑے رہے ـــــ الاؤ کی آگ مدھم پڑنے لگی اور پتوں کی راکھ ہوا میں بکھر گئی۔ کہرا آہستہ آہستہ چھٹ رہا تھا۔ غلام علی اور اس کے دونوں ساتھی بت بنے حیرتی کھڑے ہمیں تکتے رہے۔ محبت کا ایک عالم ہم پر گزر رہا تھا۔ جب ایک عرصہ بیت گیا تو میں نے اس کا سر ہاتھوں میں تھام کر پینتالیس چھیالیس برس کے اس پندرہ سالہ لڑکے کی پیشانی کو چوم لیا۔

''غلام علی! اب اتنا وقت نہیں ہے کہ تمہارے گھر جایا جاسکے۔ ایک بار تالاب پر ہولیں، پھر چلیں گے تمہارے گھر۔''

میں نے نواب کو بتایا کہ یہ میرا ڈرائیور غلام علی ہے۔ غلام علی نے اسے جھک کر بندگی کی۔

نواب نے بتایا کہ ایک اس کا ڈرائیور ہے اور دوسرا اس کی فیکٹری کا منیجر سلیم اللہ۔ میں نے آگے بڑھ کر اس سے ہاتھ ملایا۔ وہ تیس بتیس برس کا ایک خوش رو نوجوان تھا۔ جیپیں شاہ گنج کے تالاب کی طرف موڑ دی گئیں۔

نواب مجھے بتا رہا تھا کہ ہندوستان سے آکر اس نے کیسے کیسے پاپڑ بیلے اور کس طرح پلاسٹک کی چپلوں کی یہ فیکٹری لگاسکا۔ اس نے مجھے یہ بھی بتایا کہ ابھی اسے پچھلے دنوں یہ معلوم ہوا تھا کہ میں سپرنٹنڈنٹ پولیس ہوگیا ہوں اور میرا تبادلہ لاہور میں ہوا ہے۔

''تم مجھ سے ملنے کیوں نہیں آئے پھر؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

وہ مجھے یقین نہیں تھا کہ واقعی تم ہی ہوگے۔ بس نام سنا تھا۔''

وہ مجھے بتا رہا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ شخصیتیں کتنی بے نشان ہوگئی ہیں کہ نام موجود ہونے کے باوجود نہیں پہچانی جاتیں لیکن اس میں اکیلے نواب کا دوش نہیں ہے۔ میں بھی تو اخباروں میں 'نواب اینڈ سنس' کا اشتہار دیکھ کر چونکا تھا لیکن پھر یہ سوچ کر چپ ہو رہا تھا کہ کیا خبر یہ کوئی اور نواب ہو۔ ہم سب ایک سے گنہگار ہیں۔ ہمیں ہرگز یہ حق نہیں پہنچتا کہ ہم ایک دوسرے پر الزام لگائیں۔

''تم کراچی سے کیا شکار کھیلنے آئے ہو صرف؟'' میں نے اسے پوچھا۔
''نہیں بھئی، فیکٹری کے کام سے لاہور آیا تھا۔ پلین کا ٹکٹ کل کا ہے۔ سوچا ایک دن ملا ہے شکار کھیل ہوں۔''

جیپ کے باہر گیہوں کے سلسلے دور دور تک چلے گئے تھے اور ان کھیتوں کے پرے غیر واضح درختوں کی آڑ میں صبح کا ذب دم توڑ رہی تھی اور صبح صادق کی دھندلی دھندلی چمک درختوں کے پس منظر میں آہستہ آہستہ بکھر رہی تھی۔ آسمان پر بہت سی بھیڑیں چر رہی تھیں۔ قائیں قائیں کی گھٹی گھٹی آوازوں سے اس بات کا اندازہ ہو رہا تھا کہ ہم کسی تالاب کے قریب ہیں۔ میں نے سامنے دیکھا۔ اکھ کے کھیتوں کے ادھر ٹمیالے اجالے میں دور دور تک پانی چمک رہا تھا لیکن یہ اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ چڑیا تالاب کے کس حصے میں ہے۔ تھوڑا اجالا اور ہو تو چڑیا کی موجودگی کا اندازہ کیا جا سکے۔

غلام علی نے جیپ روک دی۔

''حضور! اس سے آگے گاڑی گئی تو چڑیا انجن کی آواز سے بھڑک جائے گی۔''

''ظاہر ہے۔'' کہتا ہوا نواب نیچے کود گیا۔ میں بھی اتر آیا۔

ابھی ابھی اترتے وقت میں نے سوچا کہ آج تیس سال کے بعد نواب میرے ساتھ ہے۔ آج بھی کہیں ایسا نہ ہو کہ سورج نکلے تو معلوم ہو کہ چڑیا تالاب میں ہے ہی نہیں۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ سوچتے وقت میں بے ساختہ مسکرا اٹھا ہوں۔

''سنو'' نواب نے مجھے مخاطب کیا۔ ''تمہیں یاد ہے کہ ایک بار جب ہم تالاب پر گئے تھے تو تالاب پر گئے تھے تو تالاب نے کیسا دھوکا دیا تھا۔ اجالا ہونے پر معلوم ہوا تھا کہ جن آوازوں کو ہم چڑیا کی آواز سمجھ رہے ہیں وہ چڑیا نہیں بلکہ۔'' وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ اس نے میری طرف غور سے دیکھا۔ بہت غور سے شاید اسے علم ہو گیا تھا کہ میں بھی وہی سوچ رہا ہوں جو وہ سوچ رہا تھا۔

اس نے مفلر سے اپنی گردن کو اچھی طرح ڈھکا اور بندوق میں کارتوس لگا کر میرے بہت قریب آ کر پراسرار انداز سے سرگوشیوں میں پوچھا۔

''کیا تمہیں بھی وہی یاد آ رہا تھا اس وقت؟''

میں نے آہستہ سے گردن ہلا دی۔ مجھے ہوا کہ ہم دونوں کو اچانک اپنی محرومیوں کا احساس ہوا ہے۔ بے محابا، ڈھیٹ اور وحشی یادیں پھر میرے دماغ میں چاند ماری کرنے لگیں۔

دوسری جیپ پیچھے آ کر رکی۔ سلیم اللہ بندوق لے کر نیچے اتر آیا۔

''چڑیا تو کافی بول رہی ہے۔'' اس نے دھندلے تالاب پر نظریں جما کر کہا۔
غلام علی ایکھ کے کونے پر گیا اور تھوڑی دیر تک چڑیا کی آواز سے اندازہ کرتا رہا کہ کس جگہ بول رہی ہے اور پھر واپس آ گیا۔

''ویسے صاحب یہ بڑا تالاب ہے۔ دن بھر چڑیا پڑی رہتی ہے لیکن صبح کی ہون میں زیادہ ہوتی ہے اور غافل بھی ہوتی ہے، اسی وقت تو یہ چارا کھاتی ہے۔'' غلام علی نے اپنی معلومات سے ہمیں مستفیض کیا۔

میں نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ تالاب کے اس کنارے پر سیاہی مائل گدلے آسمان میں روشن پھلکیاں پڑنے لگی تھیں۔ اب کسی بھی وقت فائر ہوسکتا۔ ہم لوگوں نے فوراً اپنی اپنی جگہ منتخب کرلی۔ میں اور نواب جوتوں سمیت کیچڑ میں گھس گئے اور گھٹنوں گھٹنوں پانی میں پہنچ کر ایک اونچی منڈیر پر بیٹھ گئے تو تین طرف سے ایکھ سے گھری ہوئی تھی۔ سلیم اللہ بندوق لے کر آگے بڑھ لیا اور غلام علی اپنی ایک نالی سنبھالے ہوئے تالاب کے دوسرے سرے پر چلا گیا۔

ہم دونوں اس منڈیر پر خاموش بیٹھے رہے۔ جب تک کہرا چھٹ نہ جائے کسی قسم کی نقل وحرکت سے کوئی فائدہ نہیں تھا۔ سورج نکلنے کے بعد فائر ہوسکتا تھا۔ آسمان کے مشرقی گوشے میں لمبے لمبے گلابی لہریے پڑنے لگے تھے۔ سورج نکلنے ہی والا تھا۔

''یہ سلیم اللہ بندوق کیسی چلاتا ہے؟'' میں سگریٹ سلگا کر پوچھا۔

''بہت عمدہ، اچھا خاصا شکاری ہے۔''

نواب نے میرے ہاتھ سے پیکٹ لیتے ہوئے بتایا۔

یکا یک تالاب کے دوسرے کنارے پر سارس زور زور سے بولے اور چڑیا کی تیز تیز سرگوشیاں بن ہوگئیں۔ شاید چڑیا کو شبہ ہوگیا تھا۔

میں نے بندوق میں کارتوس لگائے۔

''نواب۔'' میں نے اسے دھیرے سے پکارا۔

''ہاں۔'' اس نے میری طرف دیکھا۔

میں خاموش رہا۔

''کیا بات ہے کچھ کہہ رہے تھے تم؟''

''ہاں..... میں کہہ رہا تھا کہ کیا پاکستان آنے کے بعد کبھی دل نہیں چاہا کہ گھر واپس جاؤ؟''

بڑا بھیانک سناٹا تھا جو ہم دونوں کے درمیان منھ پھاڑے بیٹھا تھا۔ وہ بالکل خاموش رہا۔ مجھے یہ محسوس ہوا کہ سارس کی آوازیں سینکڑوں میل دور سے آرہی ہیں، تالاب کا پانی ساکت ہو گیا ہے اور صبح کی تیز ہوائیں بالکل چپ ہو گئی ہیں۔

میں نے سوچا نواب! تم گھبرا گئے۔ واقعی بڑا تلخ سوال پوچھ لیا میں نے۔ لیکن مجھے اس کا بھی احساس ہے کہ اس کا جواب ان تلخیوں کو اور بوجھل کر دے گا لیکن مجھے اس کا جواب چاہئے۔ میں تو خیر مجبور ہوں۔ تمہارے آگے کون سی رکاوٹ تھی۔ وہاں کی گلیاں، محلے، میلے ٹھیلے، کھیت، کھلیان، گھر، اسکول سب بھول گئے کیا؟ کچھ بھی یاد نہیں۔ وہاں کے تالاب کیا تمہارے ذہن میں سوکھ گئے۔ وہاں کے درخت کیا تمہارے حافظے نے جلا دیئے؟ میری آنکھیں اس کے چہرے پر جمی رہیں اور وہ نظریں بچاتا رہا۔

پھر بڑی مشکل سے بولا ''میں کراچی سے اگر ایک دن باہر رہوں تو دو ہزار کا نقصان ہو جاتا ہے۔ ہندوستان جاؤں تو کم از کم چالیس پچاس ہزار کی چوٹ پڑے گی۔''

یہ جواب دے کر وہ ایک دم بے خوف ہو گیا۔ مجھے اس کی آنکھوں سے اندازہ ہوا جیسے وہ پوچھ رہا ہے۔

''کیوں دوست! تم بھی تو یہ نوکری چھوڑ کر ہندوستان جا کر سب کچھ دیکھ سکتے تھے۔ تم کیوں نہیں گئے۔ بولو اب میری باری ہے۔''

مجھے اس کی آنکھوں سے بڑا خوف محسوس ہوا، جیسے وہ میری ذات کی گہرائیوں میں اندر گھس کر کوئی ایسی چیز تلاش کر رہی ہوں جو میں سامنے لانا نہیں چاہتا۔

لیکن نواب نے مجھ سے کچھ نہیں پوچھا۔ میں نے اس پر ترس نہیں کھایا تھا مگر اس نے مجھ پر رحم کیا۔

ہم دونوں نے ایک لمحے کے بعد صرف ایک ہی بات سوچی کہ ہم لوگ بہت بے اختیار ہیں اور بہت لاچار ہیں اور بہت مجبور ہیں اور بہت بے بس ہیں۔ میں اگر ایک بار ہندوستان جانے کے لئے اس ملازمت سے استعفیٰ دے دوں تو گھر والوں کی زندگی کی گاڑی کیسے آگے بڑھے گی۔ اور نواب تم اگر فیکٹری چھوڑ کر بیس دن کو بھی پاکستان چھوڑ دو تو چالیس پچاس ہزار کا نقصان کون بھرے گا۔ سچ مچ ہم بہت بے سکت ہیں—

تالاب کے اس کنارے پر اکیلے کے ادھر ایک پیلا دائرہ آسمان کے دھندلے پس منظر میں

اوپر اٹھا۔ اس کا نچلا حصہ کچھ بے ڈول تھا۔ آہستہ آہستہ وہ دائرہ مکمل ہوا اور دھیمے دھیمے سرخ ہو گیا۔

دور تالاب کے کنارے کھڑے درختوں پر غنودہ پرندوں نے بیٹھی بیٹھی بوجھل آواز میں پکار کر ایک دوسرے سے کہا کہ پھر سورج نکل آیا۔ پچھم کے کسی گاؤں کے ایک بے خواب کتے نے روتے ہوئے اعلان کیا کہ صبح ہو رہی ہے۔ آسمان میں پرچھائیوں جیسے کچھ پرندے سورج کے آگے ہو کر نکل گئے۔ صبح کا وقت عموماً اتنا غمگین اور اداس نہیں ہوتا لیکن آج تھا کیونکہ ہمارے دکھوں کا تعلق ماحول سے یا وقت کی کیفیتوں سے نہیں ہوتا بلکہ ہمارے دلوں سے ہوتا ہے اور آج ہمارے دل بہت اداس تھے۔

کہرا چھٹا اور تالاب کا پانی آہستہ آہستہ صاف ہوا تو میں نے دیکھا کہ آبی پرندوں کا جھنڈ سلیم اللہ کے کنارے کی طرف ہے۔ دور تالاب میں مرغابیاں ایسی لگ رہی تھیں جیسے کھیت میں مٹی کے ڈھیلے بچھے ہوں۔ ایک طرف گنتی کی قازیں پڑی تھیں۔ چھوتے چھوں کا ایک پرا تالاب پر سرسرا رہا تھا۔ اور تالاب کے دوسرے کنارے پر دو سارس خاموش کھڑے تھے۔

یکایک میں نے محسوس کیا کہ چڑیا ہوشیار ہو گئی ہے یک لخت قیں قیں، کی بہت سی آوازیں ایک ساتھ بلند ہوئیں۔ غلام علی کی طرف سے پہلا فائر ہوا۔ مرغابیاں سرسر کرتی ہوئی اٹھیں اور اس حصے کا پانی ٹیڑھی لکیریں بنانے لگا۔ سلیم اللہ کی طرف سے دو فائر ہوئے اور دو مرغابیاں ڈھیلے بن کر زمین پر آرہیں۔ سائیں سائیں کرتے ہوئے سیخ پر تالاب پر چکرا رہے تھے۔ قازوں نے ایک تکونی صف بنائی اور پورب کے کسی تالاب کی طرف دھواں ہو گئیں۔ سینکڑوں کی تعداد میں چڑیاں آسمان پر چھائی ہوئی تھیں لیکن ہماری بندوقوں کی پہنچ سے دور تھیں۔

''اگر یہ نالائق غلام علی فائر نہ کرتا تو چڑیاں ہمیں موقع دیتیں۔'' میں جھنجھلایا۔

''نہیں۔'' نواب مسکرایا۔ چڑیاں پر تولنے ہی والی تھیں، جبھی غلام علی نے فائر کیا۔

''دراصل زیادہ تر بیچ تالاب میں پڑی تھی۔ اگر کنارے پر ہوتی تو ہماری طرف سے ضرور اڑان بھرتی۔ چلو یہی غنیمت ہے کہ دو مرغابیاں ہاتھ لگ گئیں۔''

تب مجھے سلیم اللہ کی ماری ہوئی مرغابیوں کا دھیان آیا۔ میں نے دیکھا سلیم اللہ بندوق ہاتھ میں اوپر اٹھائے کمر کمر پانی میں چڑیوں کے پیچھے جا رہا ہے۔ مجھے سلیم اللہ بہت لمبا چوڑا دیو زاد سا لگا جو ہاتھ آگے پیچھے کرتا ہوا پانی کاٹتا، چلنے کی رفتار سے بھاگ رہا تھا۔

دوسرے کنارے سے غلام علی بندوق ہاتھ میں اٹھائے اس کا ساتھ دینے کے لئے دوڑا۔

''میں آ رہا ہوں صاحب۔ گھیرے رہنا۔ اڑ جائیں گی۔'' پانی کے اوپر تیرتی ہوئی اس کی آواز ہم تک آئی۔

''نہیں گھبراؤ مت۔ ان کے پر ٹوٹ گئے ہیں یہ اڑ نہیں سکتیں۔'' سلیم اللہ کی یہ آواز پانی کی شررشرر سے زیادہ مہیب اور بھیانک تھی۔

میں نے غور سے دیکھا۔ مرغابیاں پانی کی سطح پر پھڑک رہی تھیں اور زور زور سے پیر چلا رہی تھیں۔ واقعی دونوں کے پنکھ ٹوٹ گئے تھے۔ اچانک سلیم اللہ کا ہاتھ آگے بڑھا اور اس نے مرغابیاں دبوچ لیں۔ ایسا محسوس ہوا، جیسے پورے ماحول میں ایک بے محابا سناٹا چھا گیا تھا۔ میں نے نواب کو دیکھا۔ اس نے میری طرف دیکھا اور ہم دونوں نے پاکستان، ہندوستان، چین اور منگولیا کے اوپر سائبریا کے برفیلے میدانوں میں برف چومتے ہوئے ہزاروں معصوم پرندوں کو دیکھا۔ رنگ برنگے ہزاروں بھولے بھالے پنچھیوں کو دیکھا جو میدانوں میں بارہ سنگھوں کے اوپر قطار اندر قطار اڑ رہے ہیں۔ برف سے زیادہ شفاف جذبوں میں مگن ہیں اور ایک دوسرے کے پروں میں منقار پھرپھرا کر اپنی الفت کا اظہار کر رہے ہیں۔ اچانک برف باری شروع ہوگئی ہے اور برف کے ذرات آسمان سے برسنے لگے ہیں۔ برف میں گھلی ہوئی ہوائیں شدت اختیار کرگئی ہیں۔ موسم ناقابلِ برداشت ہوگیا ہے اور تمام پرندے اپنے انڈے برف میں دبا کر صفیں بنا کر نشیب کے ٹھکانوں کی طرف پرواز کر رہے ہیں، اس گرمی کی تلاش میں جو زندہ رہنے کے لئے ضروری ہوتی ہے اور اپنے دل کے ٹکڑوں کو الوداع کہہ رہے ہیں جو انڈوں کے خول میں بند برف میں دبے ہوئے ہیں، پھر یہ پرندے گرم آب وہوا کے ٹھکانوں تک آتے آتے ایک دوسرے سے جدا ہوگئے ہیں۔ راستے الگ ہوگئے ہیں لیکن منزل ایک ہی ہے۔ وہی منزل جہاں زندہ رہنے کے قابل گرمی میسر آسکے اور اس سے بھی آگے کی وہ منزل جب پھر اپنے برفیلے میدانوں میں سورج کی گرمی سے برف پگھلے اور سردی کم ہوا اور موسم خوشگوار ہوجائے تو واپس برف چومنے اور بارہ سنگھوں کے جھنڈ پر پرواز کرنے کے لئے اپنے گھر واپس آسکیں اور پھر ہم دونوں نے دیکھا کہ ان معصوم پرندوں کے پر توڑ دیے گئے ہیں۔

سلیم اللہ ہم دونوں کے سامنے مرغابیاں دبوچے کھڑا تھا۔ میں نے دیکھا شاید نواب بھی دیکھ رہا ہو کہ ان بھولے بھالے پنچھیوں کی آنکھوں میں برفانی میدانوں سے زیادہ وسیع تالابوں سے زیادہ گہرے اور ان کے پروں سے زیادہ خوشنما رنگوں کے سپنے سجے ہوئے ہیں۔ آنکھیں جو

تھوڑی دیر بعد بند ہونے والی ہیں کہیں دور تک رہی تھیں۔ کچھ تلاش کر رہی تھیں۔ میں نے ان کی گول گول پتھرائی ہوئی آنکھوں میں بہت سے منظر دیکھے جو وہ آنکھیں اب کبھی نہیں دیکھ سکیں گی۔ میں نے ان کی آنکھوں میں جو منظر دیکھا، اس میں نیلی پتیوں والے بہت سے دیو قامت درخت تھے جو برف سے ڈھکے ہوئے تھے۔ ایک دوسرے کے ساتھ کھیلتے بہت سے پرندے تھے جو معصوم جذبوں اور امنگوں میں سرشار تھے۔ نیلے، ہرے اور زرد پروں والے بہت سے ان کے ساتھی، جن کی رفاقت انھیں میسر تھی۔

میں نے دل ہی دل میں کہا۔ الوداع، اے معصوموں الوداع۔ ان رفیقو کو بھول جاؤ۔ ان سرمستیوں کو فراموش کر دو۔ نیلی پتیوں والے درختوں کی بدمست شوخیوں کو دل سے نکال دو۔ ان عزیزوں کو یاد کر کے اپنا دل مت دکھاؤ جنھیں انڈوں کے خول میں بند کر کے تم برف میں دبا آئے تھے۔ اب سب بھول جاؤ۔ تمہارے پنکھ ٹوٹ گئے ہیں نا۔ اب تم وہاں کبھی نہیں جاؤ۔ کبھی نہیں۔

غلام علی پہنچ چکا تھا۔ اس نے اور سلیم اللہ نے مل کر دونوں کو ذبح کیا۔ میں نے نواب کو دیکھا وہ دوسری طرف منہ پھیرے کھڑا تھا۔

''صاحب۔۔۔اب دو پہر کو پھر آئیں گے۔ اس وقت تو چڑیا اٹھ گئی۔ دو پہر کو پھر پڑے گی۔ تب تک گھر چلیے، کچھ ناشتہ پانی کر لیجیے۔''

میں نے تالاب کی طرف ایک نظر دیکھا۔ پانی کفن کے کپڑے کی طرح یہاں سے وہاں تک پھیلا ہوا تھا۔ بالکل خاموش اور گمبھیر۔

سڑک پر سناٹا تھا اور جیپ میں خاموشی۔ ایسے ہی ہم غلام علی کے گھر تک پہنچے۔

''یہ میرا جھونپڑا ہے۔'' غلام علی نے جیپ روک دی۔ ایک پرانا پکی اینٹوں کا مکان تھا جس کا آگے کا چبوترا کچا تھا۔ دروازے کے پیچھے بڑے گھیر کی شلوار پہنے دو ٹانگیں آ کر کھڑی ہو گئیں۔ غلام علی نے چبوترے پر پلنگ نکال کر ہم لوگوں کو بٹھایا اور اندر جا کر واپس لوٹ آیا۔ میرے ذہن کو اتنا یارا ابھی نہیں تھا کہ اس کو منع کر سکوں کہ زیادہ تکلف سے کام نہ لے۔

غلام علی نے مجھ سے کہا:

''صاحب! آپ ذرا اندر چلیں۔ جمیلہ سے مل لیں۔ وہ ضد کر رہی ہے۔''

میں نے نواب کو بتایا کہ اس کی بیوی ضلع ہردوئی کی ہے۔ اسے معلوم ہو گیا ہے کہ میں بھی یو۔پی کا ہوں۔ شاید پاسپورٹ کے لئے کچھ کہے۔

نواب مجھے دیکھتا رہا——

دروازے سے داخل ہو کر میں اندر آنگن میں آ گیا۔ غلام علی نے پکارا تو ایک اڑتیس چالیس سال کی عورت باہر آئی۔ نازک ناک نقشے کی دبلی پتلی سی وہ عورت بڑے گھیر کی شلوار پہنے ہوئی تھی۔ میں نے سوچا غلام علی نے اسے بالکل پنجابن بنا دیا ہے۔ وہ بے جھجک میرے پاس آ کر ایسے بھولے پن سے زمین پر بیٹھ گئی کہ میں بوکھلا گیا۔

''بھیا—— سلام۔'' اس نے مجھے سلام کیا۔ مجھے محسوس ہوا، جیسے میری کسی بہن نے مجھے آواز دی ہو۔

''تم...... تمہیں جمیلہ ہو۔'' میں نے سلام کا جواب دے کر اس سے پوچھا۔

''ہاں۔'' وہ ایسے خوش ہوئی، جیسے کسی سپرنٹنڈنٹ پولیس کے ڈرائیور کی بیوی یہ جان کر خوش ہو سکتی ہے کہ صاحب اس کا نام جانتے ہیں۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا تو مجھے اپنے کمینے پن کا احسا ہوا۔ وہ تو ایسے مسرور تھی، جیسے کوئی یہ جان کر کھل اٹھے کہ اس کا کوئی ہم وطن ناآشنائی کی دیوار کے پرے رہ کر بھی اسے جانتا ہے۔

''میرا پرمٹ بنوا دو بھیا۔ میں ضلع ہردوئی جا کر اپنا گھر دیکھوں گی۔ میں نے ان سے کہا تھا لیکن یہ ان کے بس کا نہیں ہے۔ کہتے ہیں، میں صاحب سے بات کروں گا۔ اب تو میں خود تم سے بنوا کر رہوں گی اپنا پرمٹ۔ میں نے ان سے کہہ دیا ہے کہ میں اپنا کام تم سے خود کرا لوں گی۔''

وہ ایک سانس میں اتنی باتیں کر گئی، جیسے شہر کو جاتے ہوئے باپ سے بیٹیاں چھوٹی چھوٹی چیزوں کی فرمائش کرتی ہیں۔

میں نے غلام علی کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں مجھے وہی اصرار نظر آیا جو رات جیپ میں اس کی آواز میں تھا۔

''صاحب! اس سے سختی سے منع کر دیجئے گا کہ اس کا پرمٹ نہیں بن سکتا۔ میرے چار پان سو اٹھ جائیں گے۔ اسے تو بلا فائدے کا شوق ہے بھارت جانے کا۔''

غلام علی کی آنکھیں ملتجی آواز سے بھیک مانگ رہی تھیں اور اس کی بیوی مجسم کشکول بنی میرے پاس بیٹھی تھی۔

میں پھر بدحواس ہو گیا، کیا میں اس سے اتنا بڑا جھوٹ بول سکوں گا، کیا اتنا بڑا ظلم میری زبان کر سکے گی، کیا میرا ضمیر اس کی اجازت دے گا——؟

غلام علی کی آنکھوں نے پھر اپنے ہاتھ پھیلا دیئے۔

''سنو جمیلہ۔'' میں اسے مخاطب ہوا۔ ''تمہارا پاسپورٹ نہیں بن پائے گا۔ تم گھر نہیں جاسکو گی بہنو۔''

مجھے اپنے ذہن میں شیشے کی کرچیں سی ٹوٹتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ جمیلہ کے معصوم چہرے پر ہزاروں پرچھائیاں آکر گزر گئیں۔

''کیوں...... کیوں بھیا...... کیوں نہیں بن سکتا۔ آپ بھی نہیں بنوا سکتے۔ آپ تو سب سے بڑے داروغہ ہیں۔'' وہ تم سے بات کرتے کرتے ایک دم آپ پر آ گئی، جیسے میں اس ایک لمحے میں بہت اجنبی ہو گیا ہوں۔

''ہاں —— دیکھو لو سب سے بڑا داروغہ خود اپنا پرمٹ نہیں بنوا سکتا تو تمہارے لئے کیسے بنوا پائے گا۔'' میں نے یہ کہہ کر جبڑے اتنی سختی سے بھینچ لیے کہ جبڑے ٹیس کرنے لگے۔

''لیکن وزیرالدین بھائی کی گھر والی نے تو اپنا پرمٹ بنوا لیا تھا'' وہ بولی، جیسے مایوسی کے عالم میں یہی ایک حوالہ اس کا سہارا رہ گیا ہو۔

''ہاں۔'' میں نے پھر اپنے ضمیر کی چھاتی پر بندوق داغی۔ ''بنوا تو لیا تھا لیکن غیر قانونی تھا، جبھی تو وزیرالدین نے جلا دیا۔''

اس سیدھی سادی عورت نے اپنے کمین اور ذلیل بھائی کی گود میں سر رکھ کر اپنے وطن کے حساب میں شاید آخری آنسو بہائے۔

غلام علی یہ دیکھ کر سٹپٹا گیا۔ وہ کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ میں نے اسے روک دیا۔ اچھا ہے رو دھو کر صبر کر لے۔ روز روز کے رونے سے تو نجات ملے گی۔ تھوڑی دیر بعد میں نے اس کا سر اپنے دونوں ہاتھوں سے اٹھایا، اس کے بالوں کو برابر کیا۔ گم سم کھڑے اس کے گول مٹول بچے کی مٹھی میں دس روپے کا نوٹ تھمایا اور باہر نکل آیا۔

بہت دیر کی خاموشی کے بعد میں نے نواب کو یہ سب باتیں بتا دیں۔ وہ خاموش بیٹھا سنتا رہا اور سب کچھ سن کر ایسے مسکرایا کہ انسانوں پر اور انسانوں کے افعال پر اس انداز سے نہیں مسکرایا جاتا۔ ایسا تبسم تو صرف ناہموار معاشرے کے لئے وقت ہوتا ہے۔ ایسی تلخی کی تاب انسان کہاں سے لا سکتا ہے۔ میں بھی نہیں برداشت کر سکا۔ میں نے دوسری طرف منہ پھیر لیا۔ باقی لوگ ناشتے میں مصروف رہے لیکن مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا، جیسے نواب کی تلخ مسکراہٹ پیچھے سے تیز چھری کی

طرح پیٹھ میں داخل ہو رہی ہے۔

میں نے سوچا، تم خود کو کون سا بڑا سورما سمجھتے ہو۔ تم اگر میری جگہ ہوتے تو کیا اپنے ماتحت کی پیسہ پیسہ جوڑ ہوئی کمائی کوس کی بیوی کے بے ہنگم شوق میں تباہ کرنے کے روادار ہوتے۔

میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ نواب بالکل خاموش بیٹھا تھا۔ ہر قسم کے جذبے سے اس کا چہرہ عاری تھا۔ شاید وہ خود بھی یہی سب کچھ سوچ رہا تھا۔

تالاب پر جانے کے جیپیں دوبارہ چل پڑیں۔ گاؤں کے بہت سے لوگ ہمیں دیکھنے آ گئے تھے۔ غلام علی نے بہت مدبرانہ انداز میں ہاتھ ہلا ہلا کر گاؤں والوں کو خدا حافظ کہا جیسے کہہ رہا ہو۔ مجھے معمولی آدمی مت سمجھو۔ میرے گھر سپرنٹنڈنٹ پولیس ناشتہ کرتے ہیں۔ میں نے اس کے انداز پر مسکرانے کی کوشش کی۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ غلام علی کے گھر کی چھت پر ایک عورت کھڑی تھی۔ ضلع ہردوئی کی ایک لڑکی جو یہاں آ کر بڑے گھیر کی شلوار پہننے لگی تھی، اس کے بال بکھر گئے تھے اور دوپٹہ ہوا میں زور زور سے ہل رہا تھا۔

میں نے نواب کو دیکھا۔ اس نے مجھے دیکھا اور ہم دونوں نے اس پنکھ ٹوٹی مرغابی کو دیکھا۔

پرندے تیرے پر ٹوٹ گئے تو اب واپس برف کے میدانوں میں نہیں جا سکتا۔

خدا حافظ اے معصوم عورت! تو کبھی اس سرزمین کو نہیں دیکھ سکے گی، جہاں تیرا شعور بیدا ہوا تھا، جہاں تو نے لوک گیت سنے تھے، جہاں تو نے ساون کے جھولے جھولے تھے، جہاں تو نے لوک گیت اپنی ہم عمر ہم سن لڑکیوں کے ساتھ ہنڈکلیاں پکائی تھیں، جہاں مرغی کے ڈربوں میں چھپ چھپ کر تو نے آنکھ مچولیاں کھیلیں تھیں، جہاں تو نے اپنے ننھے سے دل میں نرم نرم جذبوں کو مٹھی میں پکڑ کر بند کر لیا تھا۔ سب بھول جا میر پیاری بہن۔ وہاں کے نام پر بہائے گئے تیرے آخری آنسو میرے شکاری کوٹ کے دامن میں محفوظ ہیں۔ بس یہ آخری آنسو ہیں۔ اب کوئی آنسو نہ بہے کہ کچھ اور لوگ بھی بے حد اُداس ہیں۔ کہیں ان کی اداسی بھی بے قیمت پانی کی طرح آنکھوں سے نہ بہہ جائے۔ تالاب کی سطح پر پھڑکنے سے فائدہ کیا۔ آڑ میں چھپے شکاری نے تیرے پر کب کے توڑ دیئے۔ اب کیا دھرا ہے۔

میں نے گردن موڑ کر سیٹ سے نکالی۔

جیپ کچے وگڑے پر دھول اڑاتی بھاگتی رہی!

''تم نے شادی کرلی؟ میں یہ پوچھنا تو بھول ہی گیا۔'' نواب کی آواز جیپ کے انجن سے زیادہ پرشور تھی۔ حالانکہ اس نے سرگوشی میں پوچھا تھا۔

ایک انجانے خوف کے باعث میں نے آنکھیں نہیں کھولیں۔ صرف اس کا ہاتھ دبا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔

''بچے کتنے ہیں؟'' اس نے پھر سوال کیا۔

''تین۔'' میں نے مختصر سا جواب دیا۔

''اور اب نواب تم جو پوچھو گے، وہ مجھے معلوم ہے۔ پوچھ لو کوئی بھڑاس نہ رہ جائے تمہارے دل میں۔ آج ساری حسرتیں پوری کرلو۔''

''ان کا کوئی خط آیا کبھی؟'' نواب نے پوچھا۔

شاباش میرے دوست۔ زندہ رہو۔ میں نے کہا نا کہ ابھی میرے پورے زخم کہاں ہرے ہوئے ہیں۔ سو تم نے وہ آخری زخم بھی کرید دیا۔'' کس کا خط؟ میں نے آنکھیں کھول کر نواب کو یوں دیکھا، جیسے میں کچھ جانتا ہی نہیں۔

نواب نے مجھے ایسے دیکھا، جیسے سپاہی چور کو دیکھتا ہے۔ وہ کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ میں نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھ کر اسے خاموش کر دیا کیونکہ میں چور تھا، اس لئے میں نے اس سے نظریں نہیں چار کیں۔ اور آنکھیں بند کرلیں۔ دوپہر کے سورج کی چمک آنکھوں پر براہ راست پڑ رہی تھی اور آنکھوں کے پپوٹوں کو وہ حرارت بہت خوش کن محسوس ہو رہی تھی۔ باہر میں نے ابھی دیکھا تھا کہ کہرا بالکل چھٹ گیا تھا اور کھیت بہت اجلے اجلے نظر آرہے تھے۔ تالاب دور تھا اور ماضی کے آئینہ خانے کا سب سے رنگین عکس میری آنکھوں کے سامنے ناچ رہا تھا۔ وہ عکس جس کے ایک جلوے کے لئے میری آنکھیں خود اپنی سوغات پیش کرسکتی ہیں۔ وہ عکس جس کی تعمیر میں صرف لفاظی کام نہیں دیتی بلکہ اس تصویر کو مکمل کرنے کے لئے خون جگر کی آمیزش کی ضرور ہوتی ہے۔ میری محبت کا عکس میرے سامنے چمک رہا تھا۔

پیدا ہونے سے لے کر نبض رکنے تک یہ جذبہ کتنے روپ بدلتا ہے لیکن اس رخ خوشگوار ہوتا ہے۔ ماں کے دودھ سے محبت ہو یا باپ کی شفیق گود سے بھائی کی محبت ہو یا بہن کی چاہت، دوست سے محبت ہو یا محبوبہ سے۔ کا ہر رنگ دلکش ہے اور میری زندگی کی البم کی سب سے حسین اور سب

سے معصوم تصویر میرے سامنے آگئی۔

گرمیوں کی ایک تپتی ہوئی دوپہر میں ہوائیں اپنی گود میں انگارے بھرے ہوئے نیچے اونچے درختوں سے ٹپک رہی ہیں۔ ایک لق ودق مکان کے کچے، سیلے اور ٹھنڈے ان میں ایک برہم پتر جیسی بپھری اور ہمالیہ جیسی خودخودسر جوان لڑکی کھڑی ہوئی ہے اور وہیں ایک ستون کیک سہارے ایک بیباک لڑکا کھڑا ہے اور وہ اتنا ہی گستاخ ہے، جتنا اس عمر میں ہونا چاہیے۔ ''تو بھیا معلوم یہ ہوا کہ آپ مجھ سے محبت فرماتے ہیں؟'' اس لڑکی نے مذاق اڑانے والے انداز میں اس سے پوچھا:

وہ لڑکا خاموش رہا۔

''کب سے عشق فرمارہے ہیں؟''

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''ہوں۔ تمہیں معلوم ہے میں تم سے بڑی ہوں۔'' لڑکی نے کہا۔

''تو یہ اپنے ہات میں تھوڑے ہی ہے۔'' لڑکے نے منہ کھولا۔

اس معصوم توجیہ پر وہ مسکرائی تھی۔

باہر لو کے جھونکے انھیں دیکھ کر چپ چاپ ٹھہر گئے۔

اور معلوم نہیں کیسے، وہ لڑکی جسے مغرور، بددماغ اور خود پرست جیسے الفاظ سے یاد کیا جاتا تھا، جسے یہ فخر حاصل تھا۔ اگر یہ چیز فخر کے قابل ہے تو، کہ اس کی جوانی کے دامن پر ایک بھی داغ نہیں تھا، آگے بڑھی اور اس لڑکے سے کہا کہ وہ اس کی برہم پتر جیسی جوانی کو بانہوں میں بھر کر اس کے ہمالیہ جیسے سر کو اپنی محبت کے زور سے نیچا کردے۔ وہ لڑکا آگے بڑھا اور اس نے اپنے بچپن، لڑکپن اور شروع جوانی کے اس طویل عرصے میں پہلی بار کسی جوان جسم کے گداز کے لمس کو محسوس کیا اور ان پاک ہونٹوں کو چوم لیا، جن کی تقدیس خود اس کے دل میں تھی۔

ایک سال تک دونوں انھیں معصوم جذبوں میں کھیلتے رہے۔

پھر سینتالیس آیا۔ منہ پھاڑے، دانت نکالے، تقسیم کا حکم نامہ ہاتھ میں لیے۔ کوہِ ندا سے یا اخی یا اخی کی آوازیں آئیں اور جس دن وہ لڑکا سب کچھ چھوڑ کر ایک انجان دیس کو جارہا تھا۔ اس دن وہ اس لڑکی سے ملا، دل بھی قابو میں تھا، جذبات بھی قابو میں تھے، صرف قدم بے قابو تھے جو بلا سوچے سمجھے نامعلوم بےنشان منزل کی سمت اٹھنے والے تھے۔

''تو آپ چل دیے۔'' اس نے پوچھا تھا۔

اس لڑکے کے پاس جواب دینے کو الفاظ تو بہت تھے، پر ہمت نہیں تھی۔

''وہاں جا کر مجنوں فرہاد بننے کی ضرورت نہیں ہے —— جہاں والدین کہیں شادی کر لینا۔ سمجھے۔''

وہ لڑکا لڑکیوں کی طرح رونے ہی والا تھا کہ اس لڑکی نے مردوں کی طرح اسے دلاسہ دیا۔ کھو کھلے دلاسے کہ تم دو چار سال بعد آنا اور مجھے بیاہ کر لے جانا۔

دونوں جانتے تھے کہ یہ ناممکن ہے لیکن دونوں ایک دوسرے کو اطمینان دلاتے رہے کہ اس کے سوا چارہ بھی کیا تھا۔

تو پھر یوں ہوا کہ برف باری ہونے لگی۔ برف کے ذرات آسمان سے برسنے لگے۔ ہوائیں شدت اختیار کر گئیں۔ موسم نا قابلِ برداشت ہو گیا اور پرندوں کا وہ جھنڈ زندہ رہنے کے قابل گرمی حاصل کرنے کے لئے دوسری سرحدوں میں چلا گیا۔ انڈوں کے خول میں بند اپنی عزیز چیزوں کو برف میں دبا کر دوبارہ واپس آنے کی امید میں صفیں کی صفیں پرے کے پرے دوسری بستیوں میں پرواز کر گئے۔

اس لڑکی کا اسے کوئی خط نہیں ملا کیونکہ جس گھرانے کی وہ لڑکی تھی، وہاں کا دستور نہیں تھا کہ غیر لڑکوں کو خط لکھے جائیں، وہ بھی دوسرے ملک میں۔

پاکستان آنے کے بعد وہ لڑکا اس دریا کے کنارے بیٹھ کر ریت پر ایک عرصے تک محل بناتا رہا جس کا پانی دونوں ملکوں میں بہتا ہے۔ محل جب بن کر تیار ہوتا تو دریا کی تند اور ظالم لہریں اس کے محل کو تباہ کر دیتیں کیونکہ دریا کا پانی دوسرے ملک سے بہہ کر آتا تھا۔ اگر دوسرے ملک میں اسی دریا کے کنارے پر کوئی اور لڑکا محل بناتا اور لہریں اسے برباد کر دیتیں تو وہ لڑکا بھی یہی سوچتا کہ پانی دوسرے ملک سے بہہ کر آ رہا ہے۔

محبت کے محل بنتے بگڑتے رہے۔ لیکن دریا کی روانی نے تو بڑے بڑوں کو پسپا کیا ہے۔ اس لڑکے کی کیا حقیقت تھی اور پھر ریت تو ریت ہی ہوتی ہے۔

''کیا سوچنے لگے؟'' نواب کی آواز نے مجھے واپس بلا لیا۔

''کچھ نہیں۔'' میں نے آنکھیں کھول دیں۔

''نواب نے مسکرا کر میرے جھوٹ کو تھپکی دی۔

میں پھر سوچنے لگا۔

مجھے ہندوستان سے آنے کے بیس سال بعد معلوم ہوسکا تھا کہ بیگم کی شادی کسی شرابی اور دق زدہ سے کردی گئی تھی کہ ہمارے ہاں شریف اور ستم رسیدہ خاندانوں میں لڑکیوں کی شادیاں ایسی ہی دھام دھام سے ہوتی ہیں۔

''سنو۔'' نواب نے مجھے پھر پکارا۔

''ہوں۔'' میں نے آنکھیں کھول دیں۔

''بیگم بیوہ ہوچکی ہیں۔ ان کے شوہر کو ٹی۔ بی کا عارضہ تھا نا اور اس پر شراب۔ تمہیں معلوم ہوا تھا یہ؟'' نواب نے میری سماعت میں زہر بھر دیا۔ میرے کانوں کے قریب ہزاروں کی تعداد میں چھوٹے چھوٹے تیر سائیں سائیں کر رہے تھے، جن کی نوکیں بہت تیز اور چمکتی ہوئی تھیں۔

آنکھیں مکمل کھول کر میں نے باہر دیکھا۔ جیپ تالاب کے قریب پہنچنے ہی والی تھی۔ باہر گیہوں کے کھیتوں میں چھوٹے چھوٹے پودوں پر دھوپ برس رہی تھی۔ دور کے درختوں کی چوٹیوں پر ہوائیں بلاؤں کی طرح چلا چلا کر ناچ رہی تھیں۔ سرد کائنات بہت اداس تھی۔

''اے خدا! آج ماحول پر اتنا دکھ کیوں چھایا ہوا ہے؟'' میں اس سے سوال کر رہا تھا جو عام انسانوں کو کچھ نہیں بتاتا جس سے کچھ پوچھنے سکنے لئے پیغمبر ہونا ضروری ہوتا ہے۔

''نواب— بیگم بیوہ ہوگئیں؟'' میں نے نواب سے ایسے پوچھا، جیسے اس سے معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ بیگم کیوں بیوہ ہوئیں؟

''تمہیں اب معلوم ہوا ہے۔ انھیں تو بیوہ ہوئے بھی برسیں گزر گئیں، تو تمہیں تو یہ بھی نہیں معلوم ہوگا کہ میری غزالہ بھی مرگئی۔''

اف........خوب چڑ کے لگا لو آج یہ خبر ہی کون سی کم تھی کہ بیگم بیوہ ہوگئیں کہ تم نے یہ بھی کہہ دیا کہ ہرنی کی طرح معصوم اور چنچل تمہاری غزالہ بھی مرگئی۔ نواب میں تم سے ہرگز یہ نہیں پوچھوں گا کہ غزالہ کیسے ختم ہوئی اور بیگم بیوہ ہوکر کیسے جی رہی ہیں؟ خدا جانے تمہارے ترکش میں اور کتنے تیر باقی ہوں۔

جیپیں رک گئیں۔ سب سے آخر میں ہم دونوں اترے۔

غلام علی نے قریب آ کر کہا۔

''صاحب! اس بار چڑیا اس کنارے پر ہے اور کچھ بیچ میں پڑی ہے۔ اب آپ سوچ لیں کہ کیسے داؤ لگے؟''

سورج کی تیز کرنیں تالاب پر براہِ راست پڑ رہی تھیں اور پرندوں کے خوشنما رنگ چمک اٹھے تھے۔

''میں ادھر ایکھ کے کنارے پہلے والی جگہ پر بیٹھوں گا۔ تم نواب ذرا ہٹ کر ان جھاڑیوں کی آڑ پکڑ لو اور سلیم اللہ صاحب آپ اور غلام علی دوسرے کنارے پر جا کر بیٹھے پہ فائر کریں۔ چڑیا اٹھے گی تو لامحالہ ہمارے سروں پر سے جائے گی، تبھی داب لیں گے ——'' یہ ہدایتیں دے کر میں اپنی جگہ پر آ گیا۔

غلام علی اور سلیم اللہ اپنے کنارے کی طرف چل پڑے۔ وہ دونوں دھیمے دھیمے باتیں کرتے ہوئے چلے جا رہے تھے۔ میں نے کونے میں ایک جگہ بنالی۔ نواب بندوق میں چمکتے ہوئے نئے کارتوس لگا کر جھاڑیوں کی طرف بڑھ گیا۔

چڑیا بالکل غافل تھی کیونکہ اس کنارے سے بہت دور تھی۔ میں نے بندوق تیار کر لی۔

یکا یک میرے سر پر سرسراہٹ ہوئی اور سینخ پر کا ایک پرا آگے جا کر پانی میں پر توڑ کر پڑا۔

تھوڑی دیر تک کچھ شور رہا۔ پانی کی لہریں بنیں اور بگڑیں اور پھر وہی خاموشی اور تالاب کا سکوت۔

ابھی ابھی جب یہ سینخ پر آ کر پانی میں گرے تو میں نے محسوس کیا۔ صرف محسوس کیا کہ ان پرندوں کی آنکھوں میں بھی تو وہی سپنے ہیں جو صبح ان پرندوں کی آنکھوں میں تھے، جن کے پنکھ ٹوٹ گئے تھے۔ وہی اپنے دیس واپس جانے کے سپنے۔ وہی شفاف برف چومنے کے سپنے۔ کتنی دیر اور ہیں یہ خواب ان کی آنکھوں میں۔

تالاب کے ادھر کھیتوں میں کہیں کہیں ایکھ کے پودے غیر معمولی طور سے حرکت کر رہے تھے۔ غلام علی اور سلیم اللہ فائر کرنے کے لئے کھیتوں میں چھپے ہوئے آہستہ آہستہ پرندوں کی طرف بڑھ رہے ہوں گے۔

میں نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ کبھی محسوس ہوتا پانی ساکت ہو گیا ہے کبھی لگتا پرندے بے حرکت ہو گئے ہیں۔ دیر تک پانی پر نظریں جمائے رہنے سے سکوت اور حرکت کا فرق مٹ جاتا ہے۔ سب

ایک جیسا ہو جاتا ہے۔ ہاں ہر فرق مٹ جاتا ہے اور آج اس تالاب پر بیٹھے ہوئے مجھے یہ محسوس ہوا کہ یہ پانی ہی نہیں، کائنات کی ہر چیز ساکت ہو گئی ہے، بالکل بے حرکت ہو گئی ہے۔ اگر حرکت ہے، تو صرف ان سپنوں میں جوان پرندوں کی گول گول بھولی بھالی آنکھوں میں چمک رہے ہیں۔ اگر زندگی ہے تو صرف اس امید میں کہ ہم واپس گھر جائیں گے۔ اگر گرمی ہے تو صرف اس جذبے میں کہ ہم دوبارہ برف چومیں گے۔ اگر جوش ہے تو صرف اس امنگ میں کہ ہم اپنی چھوڑی ہوئی عزیز چیزیں واپس پائیں گے جو انڈوں کے خول میں بند ہمارا انتظار کر رہی ہیں۔

نواب تم اس وقت دور بیٹھے ہو۔ تھوڑی دیر بعد میں تمہیں بتاؤں گا۔ ہاں مجھے ابھی ابھی یہ خیال آیا ہے کہ تمہیں بتاؤں کہ ہم لوگ پنکھ ٹوٹے پرندے ہیں۔ وزیرالدین کی بیوی اور غلام علی کی بیوی کے بھی پنکھ ٹوٹ گئے ہیں اور ہمارے تمہارے پنکھ بھی توڑ دیئے گئے ہیں۔ ہم میں سے کوئی بھی اس قابل نہیں بچا کہ وہاں کا جا کر اپنے ہونٹوں سے شفاف برف چوم سکے۔ نواب احمد! ہم ان پرندوں سے بھی زیادہ لاچار اور بے بس ہیں کہ کم از کم وہ اپنے پنکھ ٹوٹ جانے کے بعد ذبح تو کر دیئے جاتے ہیں اور ہم لوگ۔ ہم لوگ تو لمحہ لمحہ ذبح ہو رہے ہیں۔ ہماری امنگوں لمحہ لمحہ قتل کی جا رہی ہیں۔ ہمیں سسکا سسکا کر تڑپایا جا رہا ہے۔ ہمارا شکار ایک دفعہ میں نہیں ہوتا ڈھیرے ڈھیرے ہوتا ہے۔ ہم اس تالاب میں صرف پھڑک سکتے ہیں، جان نہیں دے سکتے۔ تھوڑی دیر بعد تمہیں سب کچھ بتاؤں گا۔

اچانک دوسرے کنارے پر فائر ہوا اور میں دہل اٹھا۔ محسوس ہوا کہ دھوپ اور تالاب کا پانی بالکل سرخ ہو گئے ہیں۔ پوری فضا بالکل گہری سرخ ہو گئی ہے۔ جانے کتنے تالاب میں پھڑک کے جانے کتنوں کے پنکھ ٹوٹے۔

چڑیا نے اڑان بھری اور چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بٹ کر پرواز کرنے لگی۔

نیچی اڑان کرتا ہوا ایک پرا میرے سر پر گزرا۔ میں نے بندوق اٹھائی تو میں نے دیکھا کہ میرے ہاتھوں پر خون لگا ہوا ہے۔ میں نے غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ اتنا چمکتا ہوا خوش رنگ لہو کسی جاندار کا نہیں ہو سکتا۔ یہ تھکی ہوئی جاگتی آنکھوں کے خوابوں کا خون تھا۔ برف کے میدانوں میں واپس جانے کی امنگوں کا خون تھا۔ ایک دوسرے کے پروں میں منقار پھرا پھرا کر الفت اور رفاقت کا اظہار کرنے کے جذبوں کا خون تھا۔

خدا جانے کیسے بندوق نیچے جھک گئی۔

غلام علی چلا رہا تھا۔ ہم دونوں سے کہہ رہا تھا۔ حضور داغو۔ حضور داغو۔ اوپر آ گئی اوپر۔

میں نے اپنے ہاتھوں کو جن پر خون چمک رہا تھا قریب لا کر پوچھا کہ مجھے بتاؤ کہ میں کس سے پوچھوں کہ بیگم اب کیسے جی رہی ہیں اور جی بھی رہی ہیں یا کسی کچی قبر میں اپنے ارمانوں کے کفن میں لپٹی سو رہی ہیں۔ مجھے کیسے معلوم ہو کہ غزالہ کیوں مر گئی۔ وہ بزرگ اور ماسٹر اب وہاں ہیں یا ان کے شفیق چہرے وقت کی دھول میں اٹ کر کہیں کھو گئے۔ وہ گھر اب گھر ہے یا کھنڈر ہو گیا جہاں ہم نے تاج محل سے زیادہ حسین محل بنائے تھے۔ وہاں کے نوعمر لڑکے اب بھی مئی جون میں اپنے کومل بدن دھوپ میں جھلساتے ہیں یا نہیں۔

لیکن ہاتھوں پر اب خون کہاں تھا۔ وہ تو بس اس وقت جانے کہاں سے آن ٹپکا تھا جب پرندوں پر میں نے بندوق اٹھائی تھی۔

میں نے پرندوں کی ایک صف کو پورب کی طرف دھواں ہوتے دیکھا۔

میں نے ان سے چپکے سے کہا۔

''دیکھو پر سلامت تو لے کر جا رہے ہو لیکن اتنا کرنا کہ ہندوستان پہ سے گزرو تو ان لوگوں کا ماتم کر لینا جو یہاں سے وہاں جا کر بے وطن ہو گئے تھے۔ دیکھو، جرمنی کی طرف بھی ایسے قصے ہیں۔ وہاں سے اگر گزرو تو تھوڑے اداس ہو جانا۔ ہمیں تو تم نے دیکھ ہی لیا۔ لیکن ہم اکیلے تھوڑے ہی ہیں۔ وزیرالدین کی بیوی ہے، غلام علی کی بیوی ہے، نواب ہے۔ ہر جگہ تم کو ایسے کتنے ہی شکستہ پر ملیں گے، جہاں کسی کو دیکھنا تو سمجھ لینا کہ یہ بھی برف چومنے کے سپنے دیکھ رہا ہے۔ بس وہیں تم بھی ذرا دکھی ہو لینا۔ جاؤ اب پہاڑوں کے پیچھے اپنے وطن واپس چلے جاؤ۔ وسیع میدان، نکیلی پتیوں والے دیو قامت خوبصورت درخت اور برف میں دبی ہوئی انڈوں کے خول میں بند تمہاری عزیز چیزیں تمہارا انتظار کر رہی ہیں۔ الوداع ....خدا تمہاری پرواز کا حافظ ہے۔''

پرندوں کا آخری پر ابھی آسمان کی وسعتوں میں دھوئیں کی لکیر بن چکا تھا۔

تالاب چاندی جیسا شفاف ہو چکا تھا۔ غلام علی اور سلیم اللہ ہاتھ ہلا ہلا کر کسی بات پر بحث کرتے ہوئے چلے آ رہے تھے۔ ان کی آوازیں مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی طرح میرے کانوں میں آ رہی تھیں۔

میں ایکھ سے باہر آ گیا۔ میں نے جوتوں سے کیچڑ جھٹکی۔ سامنے سے نواب آ رہا تھا۔

''تم نے فائر کیوں نہیں کیا؟'' اس نے دور سے ہی پوچھا۔

تمام ماحول بیحد پراسرار ہو گیا۔ درختوں اور کھیتوں کی سرسراہٹ بھی بالکل خاموش ہو گی۔ کنارے بیٹھا سارس کا جوڑا بھی چپ ہو گیا۔ پانی کی شررشرر بھی بالکل معدوم ہو گئی۔

''وہ......نواب...... پرانے کارتوس تھے۔ دغا دے گئے، سب مس ہو گئے۔'' میں ایک ساتھ اتنے جھوٹ بول گیا۔

''لیکن سنو۔'' میں نے اسے مخاطب کیا۔

''ہوں، کیا ہے؟'' اس چور نگاہوں سے مجھے دیکھا۔

''تم نے فائر کیوں نہیں کیا؟ ایک آدھ چڑیا تو گرا ہی لیتے کم اَز کم۔ بالکل تمہارے سر پر اڑ رہی تھیں۔''

وہ تھوڑی دیر تک خاموش کھڑا رہا۔ اتنا خاموش کہ مجھے اس کی خاموشی سے ڈر لگنے لگا۔

پھر وہ میرے بہت قریب آ کر ایک ایک لفظ چبا چبا کر بولا:

''میرے ساتھ بھی وہی سب کچھ ہوا تھا جو تمہارے ساتھ پیش آیا۔''

ہم دونوں کی بندوقوں نے ایک ساتھ چار فائر کیے۔ کنارے بیٹھا سارس کا جوڑا اڑ گیا۔ غلام علی اور سلیم اللہ چونک پڑے۔ غلام علی سوچے سمجھے روتا چلاتا ہماری طرف بھاگا۔

حیران کھڑے نواب کے ڈرائیور نے ہمارے ہاتھوں سے بندوقیں سنبھال لیں۔ میں اور نواب ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ دیر تک ایک دوسرے کو سمجھتے رہے اور پھر معلوم نہیں کیسے ہم دونوں نے ایک ہی فیصلہ کیا۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے لپٹ کر خاموش ہو گئے اور اتنی مشکل سے اپنے پہ ضبط کیا کہ بس مزہ آ گیا۔ ہم پانچوں خاموش تھے۔ ہوائیں بہت تیز ہو گئی تھیں اور تالاب کا پانی کناروں سے چھلک آیا تھا۔

Preface

The syllabi of the Two year M.A. Course in Urdu was last revised in the year 1991. Since then Urdu literature has not only increased quantitatively but also evolved in terms of quality. Therefore before the introduction of Semester System of examinations in the M.A. Course it was felt that a revision in the syllabi is a necessary imperative. Such a revision does not mean a complete change and overhauling of the syllabi, hence all the important writers of each age have been included in the revised syllabus. In some cases the pieces that were originally included in the previous syllabi but have not been available till date, have been excluded. A new thrust area involving modernist and postmodern writings has been included and a new group on 'Translation' has been introduced.

With a view to maintaining and upgrading the quality of education the Department of Urdu realized an urgent need to expand the available resources of studying Urdu language and literature. The compilation of the study material in its present form is an attempt to facilitate the students of Urdu. The pieces taken from rare books are now made available as texts through this book.

The undersigned and faculty members of the Department of Urdu are extremely grateful to the Hon'ble Vice-Chancellor of Calcutta University Prof. Suranjan Das without whose keen interest, unstinting support and kind permission this publication could not have become a reality.

I thank the Hon'ble Vice-Chancellor for this act of kindness and co-operation. This is for the first time that the Selections of Urdu Prose & Verse for M.A. students is being published by the University Press.

I thank all my colleagues who helped in preparing the syllabus.

25th December, 2009

Prof. Dr. Shahnaz Nabi
Head, Department of Urdu
University of Calcutta

Professor Suranjan Das
M.A. (Cal.), D.Phil (Oxon)
Vice-Chancellor
University of Calcutta
&
Member, Indian Council of Historical Research
Government of India.

UNIVERSITY OF CALCUTTA
SENATE HOUSE, 87/1, COLLEGE ST.
KOLKATA-700 073, W.B., INDIA
Phone : 2219-3763
Telefax : 2241-3288
E-mail: suranjandas2000@yahoo.co.in
suranjan323@gmail.com

Date : December 25, 2009

Message

I congratulate the Department of Urdu for revising its syllabus and introducing the semester system for its post graduate students. I also express my sincere thanks and gratitude to the Department for taking the initiative of publishing a compilation of study material to enrich the teaching learning process. This will certainly be of great help for teachers and students alike. I particularly thank Professor Shahnaz Nabi and her colleagues for the exercise that the Department has undertaken. The University will certainly support all academic exercises that the department proposes to undertake in future.

Sd/-

(Suranjan Das)

Residence : FE-14, Salt Lake City, Kolkata - 700 106, West Bengal, India, Tele : 2358-2389

MUNTAKHABAT-E-URDU

(URDU SELECTIONS)

Volume - II

PROSE

According to M.A. Urdu Course

2009 onwards

Compiled by :

SHAHNAZ NABI

Head, Deptt. of Urdu, University of Calcutta

UNIVERSITY OF CALCUTTA

87/1, College Street, Kolkata-700073

MUNTAKHABAT-E-URDU

(URDU SELECTIONS)

Volume - II
PROSE

According to M.A. Urdu Course
2009 onwards

Compiled by :
SHAHNAZ NABI
Head, Deptt. of Urdu, University of Calcutta

UNIVERSITY OF CALCUTTA
87/1, College Street, Kolkata-700073